Mr RAVISH SIDD
تنویر
"TANVIR"
MONTHLY

اپنے
حسین بالوں
کی حفاظت
اس مسرت بخش
خوشبودار کوکونٹ ہیر آئل
اور کوکونٹ آئل شیمپو سے کیجئے
A TATA PRODUCT
ٹامکو سیلز ڈیپارٹمنٹ
پی۔ او بکس بمبئی
تیارکنندہ : دی ٹاٹا آئیل ملس کمپنی لمیٹڈ۔ ٹاٹا پورم اور بمبئی
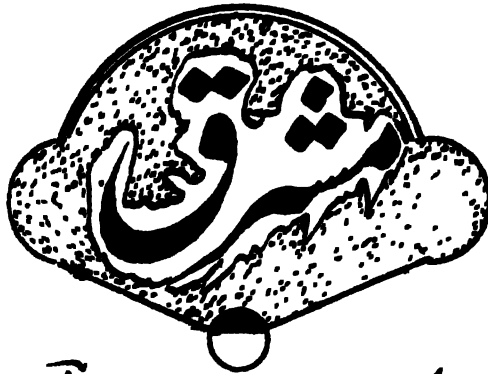
نتیجۂ فکر:- شاعرِ مشرق حضرت روشؔ صدیقی

مرحبا! اے شرفِ روئے زمیں اے مشرق
خم ترے سامنے گردوں کی جبیں اے مشرق

آنکھ آدم کی کھُلی تھی ترے گہوارے میں
زندگی جھول رہی تھی ترے گہوارے میں
شفقِ سُرخ نے اُلٹا تھا یہیں رُخ سے نقاب
صبح بیدار ہوئی تھی ترے گہوارے میں
مُسکرایا تھا یہیں مہرِ مبیں اے مشرق

آفرینش کا تصور کدۂ راز ہے تو
ذہنِ انساں کے لئے منزلِ آغاز ہے تو
کششِ لوح و قلم نازکناں ہے تجھ پر
حسن و رعنائی تخلیق کا اعجاز ہے تو
حُسنِ یزداں سے ترا حسن نہیں اے مشرق

ترے میداں، ترے گلشن، ترے صحرا عجیب
ترے چشمے، تری ندیاں، ترے دریا محبوب

ترے کہسار زر افشاں، ترے دامن گل ریز | ترا ہر منظر محبوب سراپا محبوب
دہر میں تو کسے محبوب نہیں اے مشرق!

صبح ہلکا سا تبسم ترے گلزاروں کا | شام دھندلا سا تصور ترے کہساروں کا
اہل عالم جسے فردوس بریں کہتے ہیں .... | ہے وہ اک خواب گل افشاں ترے نظاروں کا
تیرے ہر خواب گل افشاں سے حسیں اے مشرق

اول روح تفکر یہیں بیدار ہوئی | شمع عرفاں تری محفل میں ضیا بار ہوئی
یہیں انساں نے اٹھایا رخ قدرت سے نقاب | ہر حقیقت یہیں آمادۂ اظہار ہوئی
تو رہا مدرسۂ روح امیں اے مشرق

انبیا نے تجھے خالق کی امانت بخشی | وہ امانت کہ جو ہے حاصل رحمت بخشی
راز توحید ترے قلب کو تفویض ہوا | اور پھر تو نے جہاں کو یہ سعادت بخشی
تجھ سے دنیا کو ملا مژدۂ دیں اے مشرق

کون سرچشمۂ تہذیب خداداد رہا | کون انساں کے لئے مسکن آزاد رہا
کس کے عرفاں سے کھلیں فکر و نظر کی راہیں | کون تصویر کش عالم ایجاد رہا
کس کے جوہر نے تراشے یہ نگیں اے مشرق!

روح جذبات کو پیرایۂ اظہار دیا | دامن شوق دیا، شعلۂ اشعار دیا ......

حسنِ عالم کو دیا تو نے جمال تمکیں | عشق کو درد دیا، سوز دیا، پیار دیا

کر دیا خاک کو افلاک نشیں اے مشرق!

ایک معمورۂ ظلمات نما تھا مغرب | آشنا نامِ خدا سے نہ ہوا تھا مغرب

ہر طرف تیرگیٔ مرگ فزا طاری تھی | زندہ تیری ہی کرامت سے ہوا تھا مغرب

یہ حقیقت ہے کوئی خواب نہیں اے مشرق

دردِ الفت کی قسم، سوزِ محبت کی قسم | روحِ شفقت کی قسم، حسنِ اخوت کی قسم

آج بھی وادیٔ فاراں سے ندا آتی ہے | ارضِ رحمت ہے یہی۔ صاحبِ رحمت کی قسم

اور یہ رحمت کہیں محدود نہیں اے مشرق!

غفلتوں نے تری پستی میں گرایا تجھکو | گردشِ دہر نے مجبور بنایا تجھکو

اس پہ بھی دامنِ ایثار نہ چھوڑا تجھ سے | آسماں نے کبھی بے مہر نہ پایا تجھکو

تو رہا سوزِ محبت کا امیں اے مشرق!

انقلابات ازل سے ہیں یونہی گرمِ رحیل | خود فنا کرتی ہے آثارِ بقا کی تشکیل

کبھی افسونِ خزاں سے کبھی نیرنگِ بہار | دورِ تغیر ہے فرمانِ خداوند جلیل

یہی تغیر ہے بنیادِ یقیں اے مشرق

آج طوفانِ ہلاکت ہے بپا مغرب میں | سخت مصروف ہی عفریتِ فنا مغرب میں

دور و نزدیک برستی ہی چلی جاتی ہے | سرخ شعلوں کی جو اٹھی ہے گھٹا مغرب میں

یہ کہیں قہرِ الٰہی تو نہیں اے مشرق!

رُخ اب اس آتشِ خونیں کا ہوا تیری طرف | کارواں شامِ حوادث کا بڑھا تیری طرف
شکوۂ عالمِ اسباب کا یہ وقت نہیں | کام وہ کر کہ رہے فضلِ خدا تیری طرف

حق پرستی سے خود اک فتحِ مبیں اے مشرق

زندگی جرم نہیں، حفظِ بقا جرم نہیں! | سب کو معلوم ہے، کیا جرم ہے، کیا جرم نہیں
وہ یہ سن لے کہ جسے حفظِ بقا ہو منظور | دہر میں کوئی غلامی سے بڑا جرم نہیں

ہے یہی حاصلِ عرفان یقیں اے مشرق!

بزدلی داغ لگا دے نہ ترے داماں کو | مصلحت سرد نہ کر دے تپشِ پنہاں کو
کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ تجھے ہوش رہے | کھو نہ دینا کہیں اوجِ شرفِ انساں کو

خم نہ کرنا درِ باطل پہ جبیں اے مشرق

(وہ نظم جو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے مشاعرۂ خصوصی منعقدہ ۲۰ راگست میں نشر کی گئی۔
(اشاعت باجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

ریویو:-

نئی زندگی الہ آباد سے ڈاکٹر سید محمود پی۔ ایچ۔ ڈی بار ایٹ لا کی سرپرستی اور جناب انیس الرحمٰن صاحب کی ادارت میں ایک ماہنامہ بریع نئی زندگی کا اجرا ہوا ہے دوسرا اور تیسرا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ لکھنے والوں کے جو نام دیئے گئے ہیں وہ تمام کے تمام اعلیٰ علمی و ادبی قابلیت کے مالک ہیں۔ نئی زندگی نے مضامین کے انتخاب میں جو طرز اختیار کی ہے اُسے نہایت سنجیدہ کہا جا سکتا ہے ایک [illegible] بات جو اس پرچہ میں پائی جاتی ہے وہ ادب کے ایک حصہ یعنی نظم کا فقدان ہے

نئی زندگی میں نثر ہی نثر ہے صرف سرورق پر ایک شعر لکھا ہوا ہے۔ ؎
ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم / از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس
جو قابل مدیر کے حسنِ انتخاب پر دلیل ہے چونکہ شمارہ مذکور میں بہت سے تحقیقی مقالات تو ہیں جو قصۂ سکندر و دارا کے تحت آ سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اگر نہیں ہے تو کوئی ایسی چیز جو زیر حکایتِ مہر و وفا کے آ سکے۔ یہ پرچہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے ہر مہینہ وقت سے شائع ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ پانچ روپیہ فی پرچہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- "نئی زندگی" ۴/۱ سپلیمنٹری۔ زیرو روڈ۔ الہ آباد

خاص تنویر کے لئے

ماں کی گود اور بچہ

از جناب ڈاکٹر رادھاکرشن صاحب گرودر بی۔ ایس۔ سی (آنرس) ایم۔ بی۔ بی ایس (آنرز)

بچہ جب ماں کے شکم میں ہوتا ہے تو اُسے ماں کے جگر کے نیچے بڑی آرام دہ، نازک، اور نرم جگہ رہائش کے لئے میسر ہوتی ہے دُنیا کی چوٹوں کی پہنچ ...... سے دور مست بے پروا فقیر کی طرح گہری نیند کا مزہ لے رہا ہوتا ہے۔ اچانک نو ماہ کے بعد اسے اس سخت دنیا میں آنا پڑتا ہے۔ لیکن قدرت پہلے سے ہی اس کے آرام کا مکمل انتظام کر چکی ہوتی ہے وہ ماں کے رحم یعنی بند جگہ سے نکل کر اب ماں کی گود میں آتا ہے جو کھلی، ہوادار، پُر از محبت، عرش بریں کی مانند ہے پیار اُس کی بھوک اور پیاس مٹانے کے لئے ماں کے دودھ کی دھاریں ہیں اُس کی خدمت کے لئے ماں کے نازک ہاتھ اور آرام کے لئے چھاتی پیار کے لئے ماں کے شیریں لب، اور اُس کے دُکھ درد دھونے کے لئے ماں کے آنسو ہیں۔ ماں کی گود کی یاد کس کو نہیں تڑپاتی۔ دُنیا کے دکھوں سے بے حال ہو کر کون ماں کی گود کو یاد نہیں کرتا۔ بوڑھے بھی جو موت کے بالکل نزدیک ہوتے ہیں۔ مُنہ سے آہ نکالتے ہوئے "ماں ماں" ہی کہہ اُٹھتے ہیں۔

بچہ ماں کی گود میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے اور نہایت اطمینان اور بے فکری سے گود میں لیٹ کر ماں کا دودھ پیتا ہے۔ جب یعنی خوفزدہ ہوتا ہے تو جھٹ گود کا آسرا لیتا ہے۔ کون ہے جو اس سکھ کو چھوڑنا چاہتا ہے کون پرندے کا بچہ ہے جو والدین کے گھونسلے سے نکلنا چاہتا ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ بچہ کہیں گود کا عادی ہو کر ہمیشہ گود کا ہی نہ بن جائے۔ ماں اُسے گود سے اُتارتی ہے۔ پرندے بچوں کو چونچیں مار مار کر گھونسلے سے نکال گھر سے بے گھر کر دیتے ہیں۔ پرندہ ایسی حالت میں بے یار و مددگار اِدھر اُدھر بھٹک بھٹکا کر آخر میں اپنے لئے جائے رہائش ڈھونڈ لیتا ہے اور چند ہی یوم میں والدین کے گھونسلے کو بھول کر اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماں بھی بچہ کو گود سے اُتارنے کی کوشش کرتی ہے۔ جنھوں نے بچے پالے ہیں انھیں معلوم ہے کہ بچہ کو گود سے جُدا کرنا بچہ اور ماں کے لئے کتنا دل ہلانے والا موقع ہوتا ہے۔ بچہ روتا ہے۔ بلکتا ہے، تڑپتا ہے۔ بار بار ماں کی گود میں آتا ہے اور اُتارے جانے پر نگاہ یاس سے اُسی گود کو دیکھتا ہے جس میں اس نے بڑے لاڈ پیار دیکھے تھے اور جس میں وہ ماں کے خوش ذائقہ دودھ کی ندیوں میں شرابور ہوا تھا۔ ماں کے لئے یہ وقت بڑی آزمائش کا وقت ہے۔ اگر وہ بچہ کو گود سے جُدا نہیں کرتی تو بچہ کو ہمیشہ کے لئے اپاہج بنا دیتی ہے۔ وہ ہمیشہ آسرا ڈھونڈنے والا۔ دوسروں کا دست نگر رہنے والا بن جاتا ہے نہ اس کی اپنی ہمت ہوتی ہے نہ حوصلہ نہ اپنی کوشش اور نہ ہی اپنا ضمیر، وہ دوسروں کا غلام ہے۔ آسرا لے تو جی سکتا ہے نہ ملے پر ڈانواں ڈول ہو کر بہت مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اگر ماں بچہ کو گود سے جُدا کر دیتی ہے تو اُس کی عارضی تکلیف کو دیکھ نہیں سکتی۔ اُس کا دل بیٹھنے لگتا ہے اور وہ کبھی اپنے دودھ پر

کڑوی چیز لگاتی ہے، کبھی دھوڑالتی ہے۔ اگر ماں نے ذرا کمزوری دکھائی تو اپنے فرض سے گر جاتی ہے اور بچے کی زندگی ہمیشہ کے لئے خراب کر ڈالتی ہے
سچی ماں بچے کو اپنی گود سے اسی طرح جدا کرتی ہے کہ وہ ہنستے کھیلتے کھیل میں ہی گود کو چھوڑ دے اور اس کا دل بھی بھرا رہے۔ بچہ اپنے اندر خلا محسوس نہ کرے۔ ایسا بچہ گود کی لالچ نہیں کرتا بلکہ گود کو عزت اور محبت سے یاد کرتا ہے وہ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرتا ہے۔ اور بہادر انسانوں کی طرح انسانی ہمدردی دل میں لے کر ہر ایک مشکل سے مشکل کام میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ ماں، باپ، قوم اور ملک اس پر بجا فخر کر سکتے ہیں۔ ایسے بچے ہی عورتوں کی عزت کرتے ہیں۔

ماں اگر ان معنوں میں ناخواندہ ہے یعنی وہ اس علم سے بے بہرہ ہے کہ بچہ کو کسی طرح گود سے نہایت عمدہ طریقہ سے الگ کرنا ہے تو وہ اپنے بچہ کا بچپن ہی نہیں بلکہ ساری زندگی تباہ کر دیتی ہے کئی مائیں تو بچہ کے جھوٹے پیار کے بس میں ہو کر بچہ کو کئی کئی سال گود میں رکھتی ہیں اور دودھ پلاتی رہتی ہیں۔ لیکن کئی مائیں نہایت جھٹکے کے ساتھ بچہ کو گود سے جدا کرتی ہیں۔ اس طرح سے گود سے الگ ہونے پر بچے کے دل میں بار بار اسی گود میں جانے کی خواہش بنی رہتی ہے اور اس خواہش کے پورا ہونے پر بچے کی عادتوں پر بڑا نمایاں اثر پڑتا ہے۔

بچہ کو گود میں دو چیزیں ملتی ہیں۔ نازک نرم جائے رہائش۔ اور چوسنے کے لئے ماں کی چھاتی۔ جب بچہ کو یہ دونوں چیزیں نہ ملیں تو وہ ان سے ملتے جلتے حالات پر قناعت کرتا ہے لیکن ان کا آسرا نہیں چھوڑتا۔

ماں کی چھاتی چوسنے کو نہیں ملتی تو بچہ اب اپنے انگوٹھے کو ہی چوسنا شروع کر دیتا ہے کئی مائیں گود چھڑانے کے بعد خود ہی بچہ کو انگوٹھا چوسنے کی عادت ڈال دیتی ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ماں بچے کو صرف اپنی گود سے ہی جدا کرنا چاہتی تھی۔ بچہ کو قدرتی گود کی بجائے مصنوعی گود دینے میں اسے کوئی اعتراض نہیں۔ بچہ پر کتنا ظلم ہے۔ ہم ماں کو ظالم نہیں کہتے۔ کیونکہ ماں ظالم کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ماں لاعلم ہے اور اس لاعلمی میں ہی بچہ کی زندگی بے جانے بوجھے تباہ کر دیتی ہے۔

خیر۔ بچہ انگوٹھا چوستا ہے۔ اس کی یہ عادت چھڑانا مشکل ہو جاتی ہے۔ وہ روتا ہے تو اسی انگوٹھے کا سہارا لے کر چپ ہو جاتا ہے وہ تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ وہ تکلیف کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اتنی عقل ہی نہیں ہوتی، بلکہ جیسے دنیا کی چوٹوں کی برداشت کی تاب نہ لا کر لوگ شراب پی کر ان چوٹوں کے اثرات کو بھولنا چاہتے ہیں۔ جس طرح کبوتر بلی کو دیکھ کر کسی جگہ سر چھپا کر سمجھ لیتا ہے کہ بلی نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ بچہ مصیبتوں سے بھاگ کر ماں کی جھڑکیوں۔ بھائی بہنوں کی مار سے بیتاب ہو کر اسی انگوٹھے کا آسرا لے کر آرام اور چین محسوس کرتا ہے۔ ایسا بچہ ہمجولیوں میں کھیلنے کے لائق نہیں رہتا۔ اور اس کا انگوٹھا افیمی کی افیم کی طرح ہو جاتا ہے

کاش ماں جانتی کہ وہ اسی غلطی سے وہ بچہ کی زندگی کیسے خراب کر رہی ہے کئی والدین تو جان بوجھ کر بچہ کو گویا زہر پلاتے ہیں جبکہ وہ بچہ کو کھلونے لا کر دیتے ہیں جنہیں چوسا جاتا ہے۔ انگوٹھے کی جگہ کھلونا۔ دونوں ایک سا ہی کام کرتے ہیں وہ نہایت منحوس دن تھا اور وہ آدمی قوم کا دشمن تھا۔ جس نے کھلونے کی شکل میں چوسنیوں کو رائج کیا تھا۔ کاش والدین جانتے کہ کھلونے بچہ کی آئندہ زندگی پر کیا اثر پیدا کرتے ہیں۔ کیا وہ نئے ملک جو جاپانی بچوں کے لئے چوسنے کے کھلونے بنا کر بیچتے ہیں۔ کبھی اپنے بچوں کو بھی ایسے کھلونے دیتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔

انگوٹھا جوں جوں چوسنے سے نرم اور پتلا ہوتا جاتا ہے

سمجھ لیں کہ اسی نسبت سے بچے کے اندر سے بہادری اور انسانیت نکل جاتی ہے۔

دوسری چیز جو بچہ سے چھینی گئی ہے ماں کی گود ہے۔ یہ گود چوڑا میدان نہیں ہے۔ بلکہ چھوٹی سی جگہ ہے جو بچے کے چوڑے میدان کی خوف وہ حالتوں سے بچاتی ہے۔ جب گود چھن گئی۔ اور بچہ میں کھلے میدان میں بے دھڑک اور بےخوف جانے کی عادت نہ ہو تو وہ مجبوراً کوئی ایسی جگہ ڈھونڈے گا جو گود سے بہت کچھ ملتی جلتی ہو سائیکولوجسٹ (PSYCHOLOGIST) تو یہاں تک کہتے ہیں کہ خوف اُس کے دل کو اتنا کمزور کر دیتا ہے کہ وہ اُس جگہ کا متلاشی ہو جاتا ہے جو ماں کے شکم کے مشابہ ہو۔ مطلب صاف ہے کہ بچہ کھلی جگہ، کھلے میدان میں جانے سے ڈرتا ہے وہ گود کی یاد میں کمرہ کے اندر ہی گھستا جاتا ہے۔ جہاں تاریکی ہوئی کہ وہ چارپائی بھی چھوڑ نہیں سکتا۔ کھلا میدان، تاریکی، اُسے ڈراتے ہیں اور اگر خدانخواستہ کسی نے بھوت پریت کا ڈر پیدا کر دیا۔ تو اُس بچہ کا خدا ہی حافظ ہے ایسا بچہ ہمدردی کے الفاظ کا متلاشی رہتا ہے۔ کسی نے جھوٹوں ہی پیار کیا تو اُسی کو اپنا سمجھ کر اُس کے پیچھے لگ گیا۔ یا ایسے بچے دوسری حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ ماں کی گود چھوٹ جانے پر انھیں کسی پر بھی اعتبار نہیں رہتا اور ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب ماں نے دھوکا دے کر اُس کا سب کچھ لوٹ لیا تو وہ اب اور کس پر اعتبار کر سکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر تو بچے ڈرپوک ہو جاتے ہیں۔

ماں کی گود کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ جب کمرہ اور چارپائی پر بھی انھیں چین نہ لینے دیا جائے۔ یعنی ماں باپ اُسے زبردستی بہلانے کے لئے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے پر مجبور کریں تو ایسے بچوں میں ایسی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو قوم کو غارت کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ اگر بچہ دوسرے بچوں میں ملنے کے بالکل ناقابل ہو اور دوسرے بچوں سے پٹتا رہے تو وہ اب اپنی خیالی دُنیا میں گھس جاتا ہے وہی دنیا اُس کی ماں کی گود کی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ کوشش یہی کرتا ہے کہ بچوں سے الگ ہی رہے۔ اکیلے بیٹھا بیٹھا وہ اپنی کمزوری کو چھپانے اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے اپنے تصور میں گھومتا ہے وہ تصور کرتا ہے کہ وہ راجا ہے جس کی فوج ہے۔ وہ اسی فوج کا سردار ہے یا وہ لڑکوں کی پارٹی کا کپتان ہے۔ اپنی پارٹی کو حکم دے کر جدھر چاہے لے جا سکتا ہے۔ دوسرے لڑکوں کو پٹوا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ اسی طرح وہ خیالی دنیا میں اصلی دنیا کی اپنی کمزوری کے بدلے بہادر اور شہسوار بن کر اپنا دل خوش کرتا ہے ایسے ہی لڑکے بڑے ہو کر صرف پڑھاکو (نام کے تعلیم یافتہ) بی۔ اے۔ بن جاتے ہیں اور دنیا کی چوٹوں کی برداشت کھو بیٹھتے ہیں اپنی خیالی دنیا کی جگہ وہ اب کتابوں کی دنیا کو دے دیتے ہیں۔

اس خیالی دنیا میں بچے کبھی کبھی اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ اصلیت کو بھول جاتے ہیں۔ جب وہ اپنے تصور میں کسی شیر کو مارتے ہیں تو سچ مچ انھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں شیر آیا تھا اسی شیر کا ذکر جب وہ اپنے بھائی بہن یا ماں باپ سے کر بیٹھے تو وہ سب اُس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یا اُسے جھوٹا سمجھ لیتے ہیں۔ درصل بچہ جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ تو مغالطے میں ہے۔ اُس بچہ پر رحم آتا ہے کہ خدایا کوئی اُس کے دل کو سمجھ نہیں سکتا۔ ان حادثوں کے بعد یا کبھی کبھی جھوٹ کہنے پر پٹ جانے کے سبب وہ اور زیادہ اپنے مصنوعی خیالی قلعہ میں گھس جاتا ہے اور اب کسی سے ذکر کرنے سے بھی ڈرتا ہے۔ اب اُسے اس قلعہ سے نکالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے بچوں کے لئے پریوں اور شہزادوں کی کہانیاں نہایت مضر ثابت ہوتی ہیں کیونکہ یہ اُن کے تصور کو اور تقویت دے دیتی ہیں۔ اگر ایسے بچہ کو خیالی دنیا میں بھی گھومنے کی اجازت نہ دی جائے اور انھیں اکیلے بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملے تو ماں کی گود

اب انھیں گی ، وشکل ہیں ن ے خو بو تی ملتی ہے ۔ ان کے
خواب کی دنیا ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ تصور کی خیالی دنیا ۔
ماں کی گود کی حرص ان بچاروں کو کہیں بھی چین نہیں لینے
دیتی وہ اب ان کے اندرونی ذہن Sub Conscious Mind
میں گھس جاتی ہے ۔ ان کے ہر ایک کام پر جھلکتی ہے ۔ وہ ماں کا
پیار لینے کے لئے بڑے حلیم اور بھولے بن جاتے ہیں شرارتیں
نہیں کرتے ۔ گویا بہت بڑے غور اور محو ۔ پڑھتے ہیں جب
استاد ان کا ۔ اپنے ہیں ۔ کھیلوں میں حصہ نہیں لیتے ۔ جس سے
لوگ اُن کو آوارہ نہ سمجھیں ۔ اپنے ہم جماعتوں کی مدرسین سے چغلی
اور غداری کرتے ہیں تاکہ اُستاد ان سے خوش رہیں ۔ زندگی میں
داخل ہو کر پولیس اور سرکار کے خوف سے ایسے کام کرتے ہیں جس سے
سرکار خوش رہے ۔ آہ ..... ماں کی گود ! ماں کی بے پروائی نے
اُس بچے کو کہیں کا نہ چھوڑا ۔

بچہ پیدا کرنا آسان ہے ۔ ماں بننا نہایت مشکل ہے
خوش قسمت ہے وہ ماں جس نے اپنے بچے کو اپنی گود میں ایسی پرورش
دی کہ وہ بچہ گود چھوڑنے پر ہمیشہ کے لئے گود یا گود کا آسرا دینے
والی حالت کو ہی زندگی بھر ڈھونڈتا نہیں پھرتا ۔ ماں کی گود
کی میٹھی یاد بُری نہیں لیکن ہمیشہ اسی گود یا اس کے مشابہہ
کسی آسرے کو ڈھونڈتے رہنا ۔ بچے کا بچپن اور انسانیت نیست
و نابود کرتا ہے ۔ کاش مائیں اپنے فرائض کو سمجھ سکتیں ۔ اور بچوں
کو شیر مرد بننے میں مدد دیا کرتیں ۔ جس سے وہ اپنے پیروں پر
آپ کھڑے ہونے کے لائق ہو کر ملک کو آزادی کے راستے پر لے جائیں ۔

آدمی آدمی نہیں

(افکارِ تازہ، مسٹر آصف علی صاحب بار ایٹ لا (دہلی)

یاں ہیں غلام و شہریار، آدمی آدمی نہیں || بانو ہما کا کیا شمار، کرگسوں کی کمی نہیں

کیا ہیں قیامتیں بپا، یومِ نشور ہوگیا || حشر کی نفسی نفسی ہے، دورِ ہماہمی نہیں

سینہ گداز زخم زخم، شعلۂ اشکِ شمعِ بزم || مجلسِ سوز و ساز ختم، اب یہاں خرمی نہیں

موجِ عدم سے ہمکنار اب بھی ہے دہر کی بنا || صرفِ خزاں ہے غنچہ زار، بوئے ازل رمی نہیں

کس لئے تازہ کاہشیں، کس لئے آفرینشیں؟ || عرصۂ کائنات میں بسملوں کی کمی نہیں

سینۂ کائنات پاش، رازِ درونِ پرخراش || یہ ہے اجل کا ارتعاش، اور وہاں برہمی نہیں

خلوتِ کائنات میں، انجمنِ صفات میں!

سازِ طرب نہ مل سکا، بزمِ ازل جمی نہیں

(خاص)

از جناب جے۔ آر۔ ڈیسائی صاحب

کچھ عرصہ پہلے میں ایک ٹرین کے ذریعہ سفر کر رہا تھا۔ کب اور کدھر، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری منزلِ مقصود بہت دُور تھی اس لئے ہمیں ٹرین میں بہت دیر تک بیٹھنا پڑا۔ ایک شام۔ خلاف اُمید ہماری ٹرین ٹھہر گئی — ایک معمولی اسٹیشن پر، اور ہم سے کہا گیا کہ ہمارا سفر یہیں ختم ہوگا! —— گارڈ نے آکر تمام دروازے کھولدیئے اور بہ آوازِ بلند کہا کہ ہم سب نیچے اُتر جائیں۔ مسافر تو بڑی تعداد میں تھے۔ جن میں ہر درجہ اور ملت کے آدمی تھے۔ فرسٹ کلاس سکینڈ اور تھرڈ کلاس کے علاوہ ایک خاص ڈبہ تھا۔ کئی وزراء، ڈائرکٹرز اور ججوں کے علاوہ کابل نوجوانوں اور عورتوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ساتھ ہی ایک ڈیوک اور چند بھی تھے۔ اُنھوں نے نہایت نفیس لباس پہن رکھا تھا۔ فرسٹ کلاس یا درجۂ اول میں تمام ذی اقتدار اور وزراء ہونے کی وجہ سے وہاں پر آسائش کے تمام سامان مہیا کر دیئے گئے تھے۔ ہمارے ڈبہ میں (درجہ دوم) بڑے بڑے سیٹھ، لفٹننٹ اور پروفیسر لوگ تھے، جنھوں نے محض دل کو بہلانے کی خاطر سفر اختیار کیا تھا۔ درجہ سوم یا تھرڈ کلاس اوسط درجے کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس میں غریب لوگ بھی تھے جن میں سے اکثر نوکری کی تلاش میں جا رہے تھے، بعض بر ڈھونڈنے اور بعض لڑکی کی کھوج میں تھے۔ چند فقیر اور معذور بھی تھے۔ جو ہمیشہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو جایا کرتے ہیں۔

ہمیں یہ سُن کر کہ ہمارا سفر یہیں ختم ہو گیا (حالانکہ منزلِ مقصود دور تھی) بہت تعجب ہوا اور ہر شخص سراپا سوال بنا ہوا تھا۔ تمام نواب اور دولت مند اشخاص ڈبوں سے نیچے اُتر گئے۔ اور اپنے اپنے نوکروں کو آواز دینے لگے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے ہی نوکر جو ان کے سامنے سے گزر کر جا رہے تھے۔ اُن کی آواز کی طرف کان نہیں دھر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا وہ کسی کے نوکر نہیں ہیں — بلکہ خود اپنے خرچ سے سفر کر رہے ہیں۔ ایک بھکارن ڈچس کو دھکا دیتے ہوئے گزر گئی۔ ڈچس اس وقت بہت پریشان تھی اس لئے کہ اس کا نوکر باوجود بار بار پکارنے کے نہیں آ رہا تھا — تمام لوگ پریشان ہو کر اسٹیشن ماسٹر کو پکارنے لگے — ایک نوجوان بہت ہی پریشان نظر آ رہا تھا اس لئے کہ آج اُسے جانا ضرور تھا۔ وہ اپنے مرحوم بھائی کی جائداد پر قابض ہونا چاہتا تھا — ایک بنکر نے چلا کر کہا کہ آج اگر ٹرین اُسے نہ لے جائیگی تو لاکھوں روپیہ کا نقصان ہو جائے گا — ایک سیٹھ نے گارڈ کے بازو کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا کہ آج ٹرین کو آگے بڑھنا ہی چاہئے۔ ایک بوڑھی ماں بہت ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کے جانے سے پہلے اس کی لڑکی بغیر اجازت دوسرے لڑکے سے شادی نہ کرے — کیونکہ آج وہ اس کے لئے ایک اچھا بر ڈھونڈ لائی تھی۔ غرض سب ہی کسی نہ کسی وجہ سے بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ لیکن درجہ سوم کے ڈبوں سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی! — انھیں ٹرین کے رُک جانے سے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی — وہ تمام بہت مسرور نظر آ رہے تھے! ادھر ان نوابوں کی چیخ و پکار کو کسی نے نہ سنا — اتنے میں اسٹیشن ماسٹر نے ایک وسیع ویٹنگ روم کھول دیا۔ اور تمام مسافروں کو حکم دیا گیا کہ اس میں چلے جائیں۔ جہاں کے ان کے سامان کا امتحان ہونے والا تھا — ایک بوڑھے نے نہایت برافروختہ ہو کر بلند

آوازیں کہا "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمیں آگے نہیں جانے دیں گے؟"
"آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا" ۔ اسٹیشن ماسٹر نے متبسم ہو کر جواب دیا ۔۔۔ ویٹنگ روم میں ایک بڑا سا ٹیبل تھا جس پر ہمارے سامان رکھوا دیئے گئے تھے ۔ ہم سب اپنے اپنے سامان کو دیکھنے لگے ۔ لیکن افسوس کہ ہم اپنا سامان پہچان نہیں سکتے تھے ! ۔۔۔ تمام سامان تین درجوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا ۔ نوابوں اور بیگموں کا وہ تمام قیمتی سامان کہیں نظر نہ آتا تھا تمام لوگوں نے پکارنا شروع کیا ۔ لیکن اسٹیشن کے تمام کارکنان ایسی آوازیں سننے کے عادی ہو گئے تھے ۔۔۔ اسٹیشن ماسٹر نے بعد میں کہا کہ تمام سامان آگے بھیج دیئے جائیں گے ۔ اب یہ نواب اور بیگمات ان کے مالک نہیں ہوں گے بلکہ وہ سامان ان کے دوستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ! میرا تو کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا البتہ بڑے بڑے سیٹھ اور دولتمند لوگ نہایت پریشان تھے اور سوم درجہ کے لوگ زیادہ پریشان نہ تھے ، کیونکہ وہ ایسے واقعات کو بہت دیکھ چکے تھے ۔۔۔ میں نے اپنا نام ایک اجنبی کے صندوق پر دیکھا ! ۔۔۔ غرض حالات بہت پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے ۔ اور ہر شخص کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا ۔

کچھ دیر کے بعد تھرڈ کلاس کے مسافروں سے کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے صندوق کھول دیں ۔ حکم کی تعمیل کی گئی ۔ لیکن صندوقوں میں بجائے کپڑے جوتے اور دیگر سامان کے ان کے کاموں کے نمونے تھے ۔ اس کے علاوہ باقاعدہ طور پر ان کے اعمال کا حساب بھی تھا ۔۔۔ جس سے سعادتمندی اطاعت گزاری ، بیوی بچوں سے محبت ، شفقت ، سچائی اور ایمانداری کا پتہ لگتا تھا ۔۔۔ یا بد اعمال ۔۔۔ مثلاً چوری ۔۔۔ دھوکا ۔ دغابازی جھوٹ بولنا وغیرہ ۔۔۔ مگر بعض کے صندوق تو بالکل خالی تھے ! ۔۔۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں کچھ نہ کیا تھا ۔۔۔ یعنی انھوں نے اپنی روزی محنت سے نہیں کمائی تھی بلکہ دیگر ذرائع اختیار کئے تھے ۔۔۔ ایسے لوگوں کو ایک علیحدہ صف میں کھڑا کر دیا گیا ۔۔۔ اس کے بعد ان لوگوں کو بلایا گیا ۔ جو متمول اور دولت مند تھے ۔ یعنی درجہ اوّل کے لوگ ۔ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور کہا کہ وہ اور اس کے دوست ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے ۔ انھیں ہر چیز مہیا تھی ۔ انھیں کسی نے کام کرنے کے لئے نہیں کہا کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس لئے کہ کام تو صرف غریبوں کے لئے ہے ، کیونکہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ۔ اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں کام اور محنت کرنا ان کا فرض ہے ۔۔۔ نوجوان نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جو بھی چیز خریدی اس کی قیمت ادا کر دی ہے ۔ نہ انھوں نے کسی سے کچھ لیا اور نہ کسی کو کچھ دیا اور اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ۔ جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے ۔ "جنٹلمین !" چیف آفیسر نے کہا " ہم نے ایسی باتوں کو کئی دفعہ سنا ہے ۔ بار بار یہی دہرایا جاتا ہے ۔۔۔ تم ایک ایسی دنیا میں ہو جہاں زندگی کی شرط " کام " ہے ۔ کام کے بغیر تم کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ۔۔۔ کوئی [illegible] خود کام نہ کرے ، روزی نہیں کما سکتا ۔ جو محنت کرتے ہیں وہی آرام کی زندگی کے مستحق ہیں ۔ اور جو کام کرنا نہیں چاہتے انھیں بھوکا رہنا ہوگا ۔ زندہ رہنے کے لئے انسان ان تین میں سے کوئی ایک ذریعہ اختیار کر لیتا ہے (۱) کام (۲) چوری (۳) بھیک ۔ جو شخص پہلے ذریعہ سے زندہ رہنا نہیں چاہتا وہ باقی دو میں سے کوئی ایک ذریعہ اختیار کرے گا ۔۔۔ اس لحاظ سے تم بھی چوروں کی صف میں کھڑے رہنے کے قابل ہو ۔۔۔ تم چاہے اپنے کو کتنا ہی بڑا سمجھو لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ۔ جب تک کوئی معقول جواب نہ ملے ۔ تم اور تمھارے دوست یہاں سے آگے نہیں جا سکتے تم لوگ کام سے پہلے انعام حاصل کر چکے ہو ۔۔۔"

" انعام " ! ۔۔۔ نوجوان نے کہا " ہم کسی کے نوکر نہیں ہیں ۔ جو انعام

بھول گئے۔ جو کچھ کہ ہم نے خرچ کیا وہ ہمارا تھا۔ اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ جب تک آپ اپنے افعال و اعمال کو نہ سدھاریں آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ ایسے تمام لوگوں کو جن میں لوگ اور ڈچز بھی شامل تھے چوروں اور بیکاروں کی صف میں کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا۔ ڈچز نے معصومانہ انداز میں کہا کیوں۔ میں تو لوگوں کو نہایت نفیس ایٹ ہوم دیا کرتی تھی :

اب ہماری باری آئی (درجہ دوم کے لوگ) ہم میں سوداگر پادری، افسانہ نگار، ناول نگار شامل تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی لوگ تھے جنھوں نے اپنی زندگی بیکاری میں نہیں گزارا تھا لیکن مشکل سوال یہ تھا کہ ہم نے اپنے کاموں کے صلے میں کیا انعام حاصل کیا تھا! —— اور آیا وہ ہمارے قابل تھا کہ نہیں —— بعض نے تو کام سے زیادہ انعام ہی حاصل کئے تھے ہم میں سے بھی چند حضرات کو چوروں کی صف میں بھیجا گیا جن میں بعض فلاسفر بھی تھے جو فضول بکواس کیا کرتے ہیں اور بعض وکلا جو جھوٹی باتوں کو سچ بنا کر رقم لوٹ لیتے ہیں —— اب ان تمام گوالوں کو یاد آنے لگا کہ انھوں نے دودھ میں کتنا پانی ملایا تھا۔ اور شکر میں مٹی۔ اب دکانداروں کو خیال آنے لگا کہ انھوں نے کپڑا ناپنے کی لکڑی کو چھوٹا کر دیا تھا۔ اور وزن کے باٹوں کو چھوٹا بنایا تھا —— غرض ہر شخص کو اپنی مکاریاں یاد آنے لگیں —— ان کو بھی آگے جانے کی اجازت نہیں دی گئی ۔ میرا بکس بھی کھولا گیا۔ گو کہ مجھے اپنے کام کے صلے میں بہت کم انعامات ملے تھے —— تاہم میں نے کوئی بڑے کام نہیں کئے تھے —— میرے تمام رنگین مضامین اور میری وہ تمام کتابیں جن پر مجھے فخر حاصل تھا۔ غائب تھے! —— لیکن مجھے معلوم کر کے کہ مجھے آگے جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ تعجب ہوا ——

اتنے میں ایک ریل گاڑی اسٹیشن پر آئی اور وہ تمام لوگ جنھوں نے اپنی زندگی میں کچھ نہ کیا تھا بلکہ بیکار ثابت ہوئے تھے ان سے کہا گیا کہ وہ پھر سے اپنی زندگی شروع کر دیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو اچھے کام کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد انھیں اس گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ لیکن جانے سے پہلے ان سے سوال کیا گیا کہ آخر وہ اس قدر بیکار کیوں ثابت ہوئے۔ تو چند حضرات نے جواب دیا کہ ماحول ہی ایسا تھا کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی سوسائٹی ہی ایسی تھی۔ جہاں نیک کام کی کوئی وقعت ہی نہ تھی۔ ایسی حالت میں مجبور ہو کر انھیں بھی اپنی سوسائٹی کا ساتھ دینا پڑا —— نوابوں اور متمول لوگوں نے کہا کہ انھیں کوئی ضرورت نہیں پیش آئی کہ وہ کوئی کام کرتے۔ کیونکہ بیٹھے جگہ پر سب چیزیں انھیں مل جایا کرتی تھیں۔ چوروں اور بیکاروں نے جواب دیا کہ ان کی مرضی کے خلاف انھیں اس قسم کا بنا کر دنیا میں بھیج دیا گیا تھا —— زندہ رہنے کے لئے انھیں کوئی مہذب طریقہ نہ مل سکا اس لئے انھوں نے مجبور ہو کر ایسا طریقہ اختیار کیا۔ اگر سماج اور سوسائٹی کے لوگ کوئی کام ان کے سپرد کر دیتے۔ تو کبھی وہ بدمعاش نہ بنتے —— سوسائٹی تو انھیں دھتکارتی تھی۔ وہاں غریبوں اور لاچاروں کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ غرض اس طرح مختلف بہانے کر کے وہ اپنے کو بچانا چاہتے تھے۔ ان سب کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انھیں ایک اور موقع دیا گیا ہے —— کہ وہ اچھے کام کریں —— غرض ان کے افعال اور اعمال کے مطابق ان کی زندگیاں بخشی گئیں —— ٹرین نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔

اس کے بعد ایک اور گھنٹی بجی —— اور یہ سین یکایک بدل گیا اور اب ہمارے سامنے چار سنجیدہ اور رعب دار اشخاص تھے —— انھوں نے ہمیں یکے بعد دیگرے بلایا۔ تاکہ ہمارے کاموں پر نظر ثانی کی جائے ہم میں سے ایک جس نے اپنی زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کیا تھا ان چار حضرات سے کہا کہ انھیں اس کے متعلق زیادہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی —— اس لئے کہ وہ بچپن سے جانتا تھا کہ اسے دنیا میں کیا کرنا چاہئے ۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی عقل بھی کام کرتی گئی اور

اچھی اور بُری باتوں پہچان کرنے لگا۔ لیکن ایسے کام جو اس کے بس کے باہر تھے۔ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ ممتحن نے اس کی طرف رحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا ـــــ لیکن ـــــ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی چیز غیر ممکن نہ ہو ـــــ اور اگر تم نے اس کام کو پورا نہیں کیا ہے جو تم سے نہ ہو سکا تو کوئی پرواہ نہیں۔ ہم تم پر کوئی تہمت نہیں لگاتے۔ انسان اس دنیا میں جب قدم رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے اور وہ زندہ رہنا اسی طرح سیکھتا ہے۔ جیسے دوسرے علوم۔ پہلے پہل ہر شخص غلطی کرتا ہے لیکن تجربے کے بعد وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ بچپن میں تم کو اچھی طرح چلنا نہیں آتا تھا بار بار گر پڑتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تم نے چلنا سیکھ لیا اسی طرح تم زندہ رہنا بھی سیکھتے ہو لیکن ہم ان پر تہمت نہیں لگاتے۔ جنھوں نے بُرے کام کئے ہیں ـــــ کیونکہ انھیں تعلیم ہی ایسی دی گئی۔ ان کی سوسائٹی ہی ایسی تھی کہ وہ اچھے کام نہیں کر سکتے تھے۔

کچھ دیر بعد میری باری آئی ـــــ مجھے وہاں جا کر اپنا تعارف کرانیکی ضرورت نہیں پڑی اس لئے کہ وہ میرے متعلق بہت کچھ جانتے تھے میں نے اپنی زندگی میں سوائے لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا تھا۔ مجھے اگر اپنے کاموں کے متعلق کچھ کہنا تھا تو صرف وہ کتابیں تھیں۔ جنھیں ان کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے بھی اپنا بیان دیا لیکن مجھے بھی کچھ جھوٹ کہنا پڑا ـــــ دفعتاً میرے سامنے کی دیوار آئینہ کے مانند چمکنے لگی۔ اور اس میں وہ تمام جانور اور پرندے نظر آنے لگے جنھیں میں نے شکار بنایا تھا ـــــ وہ تمام مجھے کوستے ہوئے دکھائی دے رہے تھے ـــــ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان میں سے ہر ایک میرے خلاف گواہی دینے کے لئے آیا ہے ـــــ میں نے ان سب کو کھا لیا تھا ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے اپنی زندگی کے لئے اس کی زندگی کو ختم کیا۔ جیسے ہر شخص کو اپنی زندگی عزیز ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی ہے۔ لیکن اس سنگدل نے ہمیں مار دیا ـــــ ضرورت نہ ہونے پر بھی۔ یہ ہمیں شکار بناتا رہا تاکہ آئندہ نام آ سکے ـــــ اس کے بعد تمام پرندے آواز کرنے لگے ـــــ اس گڑبڑ کو سن کر میں جاگ اٹھا۔ میں دوبارہ ریل کے ڈبے میں تھا۔ ـــــ

(آزاد ترجمہ)

ختم شد

زندگی اور موت

از

جناب جذبی صاحب فیض آبادی

زندگی بے ثبات انساں کی
موت اَبدی حیات انساں کی

زندگی اِک سَراب فطرت کا
موت ہی راز ہے حقیقت کا

زندگی صرف اک حسیں عنواں
موت تکمیل قصۂ انساں

زندگی اِک حباب در طوفاں
موت ہے ایک بحرِ بے پایاں

زندگی ایک نیم گفتہ بات
موت تفسیر داستانِ حیات

زندگی ابتدا بتاتی ہے
موت انجام بن کے آتی ہے

زندگی ہے تو موت لازم ہے
موت ہی سے حیات سالم ہے

طبعزاد

مزدور

سمندر کی سطح سے نکلی ہوئی دیوقامت چٹانیں صدیوں سے سمندر کی کمزوریوں کو حقارت سے دیکھ رہی ہیں۔ لہریں کبھی جوش میں آ کر ٹکراتی ہیں مگر اپنا سر پھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ آہنی چٹانوں میں جنبش تک نہیں ہوتی۔ بھولی چٹانوں کو کیا خبر کہ سمندر کی لہریں اندر ہی اندر انھیں کھوکھلا کر رہی ہیں۔ اور وہ دن قریب ہے جب ساحل پر سمندر ہی سمندر ہوگا ــــ ــــ ــــ

مزدور ہی مزدور ہیں۔ یہاں سے وہاں تک ہزاروں کے غول ہیں۔ ملوں میں، کھیتوں میں، کا[illegible] سڑکوں پر ــــ کسان اپنا خون پانی ایک کر رہا ہے۔ زمین کی سیوا میں لگا ہے۔ اُسے گیتوں میں ــــ اپنی درد بھری داستان سناتا ہے۔ کبھی حسرت سے آسمان کی طرف ٹکٹکی لگاتا ہے۔ آرزو پوری ہوئی۔ کھیت تیار ہو گیا۔ گھر لا کیا؟ ابھی تو سرکار سے اور زمیندار کے ہاتھ پاؤں جوڑتا ہیں۔ مہاجن کی خوشامد کرتا ہے ــــ معمار ہے۔ دھوپ جسیں کالے پڑ جاتے ہیں۔ اسکی کھوپڑی پر چمک رہی ہے۔ ماتھے سے پسینہ کا سوتا پھوٹ رہا ہے۔ مگر وہ ہے کہ پتھر کاٹے جا رہا ہے۔ گویا: موتی پروئے جا رہا ہے۔

ایک جھونپڑے میں چیتھڑوں کے ڈھیر میں ایک بچہ رو رہا ہے جس نے ننگی زمین پر جنم لیا ہو۔ اُس کے لئے اس سے اچھا پالنا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ نیا مزدور ہے ــــ بدبودار غلیظ گندے کوڑے کے پاس ایک ٹوٹے مکان میں سامان پڑا ہوا ہے۔ کونے میں اُس کی بڑھیا ماں۔ یہ نوجوان گریجویٹ ہے اور بڑھیا ساری رات بھر سلائی کر کے اُسے گریجویٹ کرنے والی۔ دونوں کو اپنی محنت کا ایک سا پھل ملا۔ بیکاری، کنگالی ــــ ٹوکریوں پر ٹوکریاں اُٹھا اُٹھا مٹی ڈالی جا رہی ہے۔ کوڑی پھیرا ہے۔ ہزاروں مزدور۔ پھٹے کپڑے، پھٹی آنکھیں، سوکھے پیٹ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ مزدور بھی ہیں۔ کسان بھی۔ پڑھے لکھے بھی ہیں۔ جاہل بھی۔ ایک ڈھیر ایک کوڑی، ایک مزدور کا سر چکرایا۔ گر پڑا۔ سر پھٹ گیا۔ الگ لٹا دیا گیا۔ اپنی کوڑیوں سے بھی گیا ــــ

اونچے عالی شان محل۔ بڑی بڑی کوٹھیاں۔ شاندار موٹریں۔ اُن کے مالک سرمایہ دار مزدور کو حقارت سے دیکھنے والے اپنی دولت و ثروت پر نازاں۔ سمجھتے ہیں کہ دنیا مع اپنے اسباب و تاریخ کے اُن کی غلام ہے۔ لڑائی ہے خونریزی ہے۔ فساد ہے۔ جھگڑے ہیں سب پیسوں کا کھیل ہے۔ کہو پیسے کے زور سے اِسے جاری رکھیں کہو بند کر دیں ــــ

ان سرمایہ داروں کو خبر نہیں کہ مزدوروں کی مسلسل کوششیں۔ ان تھک جانفروشیاں اندر ہی اندر اُن کو کھوکھلا کئے دے رہی ہیں۔ ختم (بمبئی)

ذکر و فکر

مقصود زاہدی صاحب کے چند مضامین اور چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ تعارف جناب ساغر نظامی صاحب نے لکھا ہے۔ مقصود صاحب کی یہ اولین کوشش قابل مطالعہ ہے اور چھوٹے چھوٹے خاکوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ زاہد صاحب نے زندگی کو دور کھڑے ہو کر اس کی سطح ہی پر نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ زندگی کی تلخیاں بھی چکھ چکے ہیں۔ کتاب پاکٹ سائز ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی گوارا ہے۔ قیمت آٹھ آنے رکھی گئی ہے

اور مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ یا شرما ہدی برادرز ۱۶ زاہدیان سے
دستیاب ہو سکتی ہے

خاص "تنویر" کیلئے

بجواب پیغام خواتین انگلستان

از خامۂ مسز زیب عثمانیہ لودیانوی

آپ کا پیغام پہنچا مادرانِ ہند تک ۔۔۔ یاد فرمائی کا بیحد شکریہ بعد از نیاز

غرب کی اُن دُخترانِ آسماں پرواز کو ۔۔۔ یاد آئیں کسطرح ایں شرقیانِ خاک باز

گرچہ ہُشیاری بھی ہے دنیا میں اک وصفِ مفید ۔۔۔ ہے مگر اہلِ نظر کو اس سے لازم احتراز

ہم نے مانا شرق ہے مغرب کے مقصد میں شریک ۔۔۔ ہے مگر کیا انتظامِ فطرتِ دانائے راز؟

دوسروں کے حق میں جو اب تک ہے غنیہ بگوش ۔۔۔ وعظِ آزادی میں اپنی ہے زباں انکی دراز

ہے عبث انکو ڈرانا آہ جورِ چرخ سے ۔۔۔ جو ہوں پہلے ہی کسی کے زیرِ مشقِ تیرِ ناز

جُرأتِ خیرہ ہے ان سے شکوۂ امدادِ غیر!

جو نہ ہوں اپنی اعانت کے بھی دنیا میں مجاز

مسلسل ناول

انجمن محبت

ابراہیم بے، اس تمام گفتگو کو
کچھ اس طرح سُن رہا تھا، گویا کسی دوسرے شخص کے بارے میں یہ
باتیں ہو رہی ہیں۔ یا وہ مرچکا ہے اور اُس کے جنازے کے پاس
بیٹھے ہوئے لوگ اُس کا ذکر کر رہے ہیں۔ ابراہیم بے اسی سوچ میں
تھا کہ شومبرگ کے سوال سے چونک اُٹھا۔

شومبرگ :۔ تم اس ابراہیم بے کو جانتے ہوگے؟

ابراہیم بے :۔ ہاں میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں

بیگم لولو نے بڑے اشتیاق سے پوچھا

تو ذرا تفصیل سے بتاؤ، کہ اس کو پھانسی کی سزا کیوں
ملی؟ .... اس انقلاب کی آگ میں کیوں کودا؟

ابراہیم بے :۔ میرا خیال ہے کہ کسی کی محبت نے اُس کو باغیوں کی صف
میں کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔

بیگم : انجمن اتحاد و طاقت کی محبت نے؟

ابراہیم بے : نہیں کسی عورت کی محبت نے

مس ڈیفنی جواب تک خاموشی سے سُن رہی تھی، قطع کلام کرتے
ہوئے بولی۔

ابراہیم بے بڑا دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہے مجھے تو اُس سے ہمدردی
ہوگئی ہے ..... وہ عورت کون ہے! تم جانتے ہو؟

ابراہیم بے :۔ ہاں میں جانتا ہوں، ابراہیم بے میرا پرانا
دوست ہے، وہ میرے رگ و ریشہ سے واقف ہے اور میں اس کے
ہتھکنڈوں سے آشنا۔ یا یوں سمجھ لو، کہ اُس کی آوارہ نگاہی
کی کوئی تفصیل مجھ سے
چھپی ہے نہ میری نظر بازیوں کی آماجگاہیں، اُس سے پوشیدہ
ہیں۔ کس طور سے اُس پر بجلی گری، کس شمع انجمن نے مجھے....
پروانہ بنایا۔ اس سے ہم دونوں آشنا ہیں۔ اس ترکی انقلاب میں
وہ بیچارہ جس کے طفیل پھنسا وہ شادی شدہ عورت ہے۔

مس ڈیفنی :۔ کیا نام ہے اُس کا؟

ابراہیم :۔ مس ڈیفنی، عدالت بھی کسی شادی شدہ عورت
کا نام بتانے پر مجبور نہیں کرتی۔ میں صرف یہ بتلا سکتا ہوں، کہ اس کا
شوہر عجیب قسم کا آدمی تھا، اُس سے نباہنا ناممکن ہی تھا۔

مس ڈیفنی :۔ تم تو بڑی خوفناک باتیں سنا رہے ہو۔ دلچسپی
اور حیرت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

بیگم لولو نے بات کاٹتے ہوئے کہا

کیا دنیا میں ایسے شوہر بھی ہوتے ہیں، جن سے نبھ سکے یا جنکو
برداشت کیا جاسکے۔

۔ بیگم لولو بولنے کو تو بول گئیں، مگر زبان سے نکلا ہوا تیر اُن
کے شوہر کونٹ مانٹرکیپ کے دل میں ترازو ہوکر رہ گیا ابراہیم بے
موقع کی نزاکت کو سمجھ کر بولا۔

"غالباً تمہارا اشارہ ہم لوگوں کی طرف نہیں ہے، ہم لوگ تو معقول
شوہروں کی فہرست سے مستثنیٰ ہیں، ہے نا؟

بیگم لولو۔ (مسکرا کر) ہاں تو اور کیا۔

مس ڈیفنی: سنا معقول شوہر کس کو کہتے ہیں؟ وہ، جو اپنے ازدواجی دائرے سے باہر قدم رکھے؟ یا وہ جو اپنا روپیہ، اپنی بیوی کی ساڑی اور فراک پر خرچ کرنے کی بجائے، ادھر اُدھر پھینک آئے۔

ابراہیم بے نے، مخصوص انداز سے، ڈاکٹر شومبرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ان سے پوچھو، میرا خیال ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ اُس کے شوہر کا علاج بھی کیا ہے۔ یہ اُس سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔

شومبرگ اور ابراہیم بے کی چشمک بازیاں چل رہی تھیں مجلس میں کوئی اور تو سمجھ نہیں سکتا تھا، لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے طنز آمیز فقروں کو سمجھتے تھے، اور اس کی چوٹ سے دل سوسس کر رہ جاتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم بے کا یہ فقرہ کہ شومبرگ، اُس عورت کے شوہر سے واقف ہیں۔ شومبرگ کے دل میں چبھ کر رہ گیا۔ وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ اب ابراہیم بے کی باری ہے وہ کوئی تیر پھینکنے والا ہی ہے۔ فوراً گلاس میں بچی کھچی ہوئی شراب کو ختم کر کے بولا کہ:-

یہ صحیح ہے کہ میں اُس عورت کے شوہر سے واقف ہوں۔ میں اس موقع پر بھی اُس کے پاس تھا جب وہ اپنی بیوی کی بیوفائیوں سے تنگ آگیا تھا اور بے انتہا پریشان خاطر اور دل برداشتہ ہو رہا تھا میں اُسی وقت اس نتیجہ پر پہنچا کہ یقیناً دنیا میں ایسے شوہر بھی ہیں۔ جو اپنی بیویوں کی بے وفائیوں کے شکار ہوتے ہیں۔ جن کی تلخ کام زندگی کی ذمہ دار ان کی بیوفا بیویاں ہیں:

کونٹ ونسنٹ کیمپ، کو ڈاکٹر شومبرگ کی تقریر بہت پسند آئی۔ اور انھوں نے فوراً اپنی بیگم لولو کو مخاطب کر کے کہا کہ "سنتی ہو دنیا میں ایسے شوہر بھی ہیں جن کے دل دُکھے ہوئے ہیں۔

شومبرگ: بیگم لولو، میں نے اُس بدقسمت شوہر کو دیکھا ہے وہ اپنی بیوی کو دیوانہ وار چاہتا تھا۔ وہ سر تا پا دل تھا، اور وہ دل بیوی کی محبت سے لبریز۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ بیوی کی تصویر اُس کے ہاتھوں میں ہے، اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں اور یہ اُس بیوی کے لئے جو اُس کو چھوڑ کر چلی گئی ——— چلی گئی ایک غیر مرد کے ساتھ۔ اگر میں سمجھا بجھا کر اُس کے غصہ کو فرو نہ کرتا، تو وہ انتقام کے جوش سے ایسا دیوانہ ہو رہا تھا کہ اپنے رقیب کا ابتک اُس نے قصہ پاک کر دیا ہوتا۔

عین اُس وقت، ابراہیم بے بات کاٹ کر طنز آمیز تبسم کے ساتھ بولا۔

"معاف کرنا، یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رُخ بھی دیکھنا چاہئے۔ اور وہ مجھے معلوم ہے، اور وہ میں نے براہ راست ابراہیم بے سے سنا ہے۔

تم ڈاکٹر ہو، اور اس پیشے کی شرافت کا یہی اقتضا ہے کہ اپنے مریضوں کی کمزوریوں اور نقائص پر پردہ ڈالو۔ یا کم کر کے دکھلا دُ۔ مجھے تو اپنے دوست سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کی محبوبکا شوہر ایک بے حس انسان تھا اس میں جذبات کا نام و نشان تک نہ تھا خاموش، متکبر اور درشت مزاج شوہر تھا۔ بیوی کا اُس کو چھوڑ کر چلا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اُس کی بے حسی، اور زندگی کی بے کیفی سے تنگ آگئی تھی۔

مس ڈیفنی:- تب تو واقعی شوہر ہی قصوروار ہے۔ شومبرگ نے تو اس طرح اس کی تعریف کے پل باندھے تھے کہ میں اس کی ہمدرد ہو چلی تھی۔

بیگم لولو کب چپ رہنے والی تھیں، کہنے لگیں کہ "تب تو ابراہیم نے ٹھیک ہی کیا کہ اُس کی بیوی کو فرار کر کے لے گیا۔

ابراہیم بے فاتحانہ مسرت سے ڈاکٹر شومبرگ کو دیکھنے لگا جو اپنی بے بسی اور رسوائی پر دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا۔ شاید اسی حالت

کا نقشہ داغ نے یوں کھینچا ہے ؎

قاتل رحم ہے اُس شخص کی رسوائی بھی
پردے ہی پردے میں جو شخص کہ رسوا ہو جائے

کچھ توقف کے بعد ابراہیم بے نے ایک دوسرے کو ٹالنے کے لئے شونبرگ سے کہا :-

"[illegible] میری رائے سے متعلق نہ ہو۔ یہ تمہیں اختیار ہے۔"

مس ڈیفنی کو سٹیلا سے خاص تعلق نہ تھا۔ مسٹر بیرنز جو اب تک خاموشی سے سُن رہے تھے، بولے کہ :

"[illegible] شونبرگ نے کہا ہے کہ انھوں نے اُس عورت کے شوہر کا غصہ ٹھنڈا کیا اور نہ وہ انتقام لینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس سے انتقام لینے [illegible] رقیب سے ؟"

"[illegible] بات تو پوچھنے کی ہے۔"

ڈاکٹر شونبرگ :- اس میں پوچھنا ہی کیا ہے؟ بات تو صاف ہے کہ وہ رقیب سے انتقام لیتا۔

مس ڈیفنی تیزی سے بولی۔

"کیوں، رقیب سے کیوں؟ اپنی بیوی سے بدلا لینا چاہیے تھا!"

شونبرگ :- اگر میں بھی اپنی بیوی کو کسی کے آغوش میں دیکھتا تو میں اپنی بیوی کو مارتا نہیں بلکہ نہایت ملائمت سے کہتا کہ یہ اطوار ہم دونوں کی زندگی کو تباہ کر دے گا"۔

ابراہیم بے :- یہ سب بچوں کی باتیں ہیں۔

مس ڈیفنی :- معلوم نہیں ڈاکٹر کہ تمہارا مریض واقعی اپنے رقیب سے انتقام لے گا یا نہیں؟

شونبرگ، سگریٹ کی ڈبیہ جیب میں رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"مستقبل کی تو کسی کو خبر نہیں۔ لیکن شاید ہم لوگ کسی دن یہ سُن لیں کہ ابراہیم بے کو اپنا حساب چکانا پڑا۔"

مس ڈیفنی۔ مسٹر الخازان، تم ایسی حالت میں کیا کرتے ؟

الخازان (ابراہیم بے)۔ مس کو سٹیلا ! مجھ سے کیا پوچھتی ہو، میں تو شادی ہی نہیں کرتا، میرا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے میرے خیال میں تو عورت ایک معمہ ہے، مرد، اُسی وقت عورت کو سمجھتا ہے، جب ہو، خالی الذہن اور بیکار ہو، اور عورت کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ اسی لئے میں عورت کو سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کرتا عورت مجھے چاہتی ہے۔ یہ میرے لئے کافی ہے۔

شونبرگ نے پھر اصل موضوع پر گفتگو شروع کی کہ :-

"ایک عجیب بات یہ ہے کہ اُس عورت کا دوسرا شوہر شاید ہی اپنی حرکات پر اب بھی پشیمان ہو۔ کون حق پر ہے اور کون غلط۔ اس کا فیصلہ نہ تم کر سکتے ہو نہ میں، تم اُس کے عاشق کے دوست ہو، اور میں اس کے بدقسمت شوہر کا دوست ہوں۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ میرے سمجھانے بجھانے کے باوجود، اُس کے شوہر کے دل میں انتقام کی آگ سلگ رہی ہو"

ابراہیم بے :- ایک طویل انتقام ؟

شونبرگ :- ہو سکتا ہے۔ انتقام کے کئی طریقے ہیں۔

بیگم لولو نے ہنستے ہوئے مس ڈیفنی سے پوچھا تو اگر تم شوہر ہوتیں تو کیا کرتیں ـــــ؟

مس ڈیفنی :- میں کیا کرتی؟ کسی خوفناک مرض میں اپنے آپ کو مبتلا کر دیتی۔ اور پھر یہ مرض اپنی بیوی کے ذریعہ اپنے رقیب تک پہنچا کر اُس کا خاتمہ کر دیتی ـــــ تم کیا کرتیں؟

بیگم لولو :- میں اپنی بیوی کو قتل کر دیتی اور واقعات کو اس طرح ترتیب دیتی کہ لوگ میرے رقیب کو قاتل سمجھیں

رات کا وقت تھا۔ صاف، شفاف آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے، چاند کا عکس سمندر کی سطح پر تھرتھرا رہا تھا۔ ابراہیم بے تنہا عرشے کے کنارے کھڑا ہوا اپنی گزشتہ زندگی پر غور کر رہا تھا۔ ایامِ جنوں کی یاد، جوانی کے مشغلے

عورتوں کی چھیڑ چھاڑ۔ قاہرہ میں اس کا بچپن، باپ کی بے انتہا شفقت
ماں کا لاڈ پیار ـــــ یہاں پہنچکر وہ سوچنے لگا کہ اچھا ہوا کہ آج اس کے
والدین زندہ نہیں ہیں ورنہ اپنے بیٹے کی دردناک زندگی سے اُن کے
دل بھی کُڑھتے۔

وہ کل عورتیں، جنھوں نے اس کا تعاقب کیا یا جن کے پیچھے
یہ خود دوڑتا، سب کی تصویریں یک ایک کرکے، اس کے خیال میں آتی گئیں
اور پھر وارسا کے راستے میں بیگم ماروا سے اتفاقی ملاقات، دوستی، محبت
پھانسی کا تختہ، جیل سے فرار ہونا، سب باتیں آناً فاناً اس کے دماغ میں
آئیں۔ کتنی شادکام زندگی تھی۔ خوشیوں کے دن، تمناؤں کی راتیں، کسی حسینہ
کی آغوش، کسی دوشیزہ کا بوسہ،
ماروا کا خیال آتے ہی وہ بے چین سا ہو گیا۔ جیسے کسی نے نشتر چبھو
دیا ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ . . . . . .

کیا ہوئی؟ کیا پھر کبھی اس سے ملاقات ہوگی۔ کیا وہ اب پہلے سے
بھی زیادہ محبت نہ کرے گی۔ اس کی خاطر جان کی بھی بازی لگا دی
وہ سوچ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ماروا اور اپنی محبت
روٹھنا منانا، اس کے بوسوں کی [illegible] یاد ہے سب سے یاد تھے
وہ سوچ رہا تھا کیا ماروا اسکی ہو سکتی ہے [illegible]
لیکن کیا وہ اس جدائی پر ثابت رہ سکے گی۔ پنجرہ کا دروازہ اگر یکبارگی
کھل جائے تو وہ کون پرندہ ہے جو پھر پنجرے میں بند
ہونا چاہے گا۔ آخر سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہنچا
کہ اس کا حشر کچھ بھی ہو، اب تو اس نے اپنی محبت پر
جان کی بازی لگا دی ہے اب ہار ہو یا جیت۔

(باقی)

میری دُنیا

افکار مبلغ شاعرِ انسانیت جناب آنند نرائن صاحب مُلّا ایڈووکیٹ (لکھنؤ)

(۱)

بزمِ جہاں میں تیرے قابل نہ بن سکوں گا
افسردہ دل ہوں زیبِ محفل نہ بن سکوں گا

تیرے چراغِ محفل دل ہیں جلے ہوؤں کے
نغموں کا زیر و بم ہے تاروں پہ آنسوؤں کے

اِک عارضی نمائش روحِ نظام تیری
رنگینئ تصنع جانِ کلام تیری

جو تشنگی بجھائے تجھ میں وہ شے نہیں ہے
ساغر تو خوشنما ہے، ساغر میں مے نہیں ہے

میری نظر میں تو ہے اِک معبدوں کا مردہ
ظاہر ترا شگفتہ، باطن ترا فسردہ

چہروں پہ تن کے جھوٹی سُرخی سی ہے خوشی کی
چوٹیں ہیں اُن کے دل میں ضرباتِ زندگی کی

شعلوں میں زندگی کے اخلاق جل گئے ہیں
بازارِ دوستی کے سکّے بدل گئے ہیں

طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں تیرے صنم کدوں میں

سینچی ہوئی لہو سے سب تیری کیاریاں ہیں
مسروقہ دولتوں پر سرمایہ داریاں ہیں

انساں اتر رہا ہے رسمِ درندگی پر
تہذیب آ گئی ہے حدِ برہنگی پر

کیا جہدِ زندگی میں طبعِ بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر جینا اگر یہی ہے

(۲)

اِک بار دورِ گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک مے کش صہبا بہ جام بھی ہو

مظلوم کا کلیجہ تیرِ ستم نہ ڈھونڈے
ایوانِ شادمانی بُنیادِ غم نہ ڈھونڈے

اِک آرزوئے باطل فکرِ سکوں نہ ٹھیرے
اُلفت فقط مذاقِ اہل جنوں نہ ٹھیرے

تصویرِ نامرادی نقشِ جبیں نہ نکلے
راحت ۔ دلِ حزیں کا خوابِ حسیں نہ نکلے

کھوٹے تکلفوں میں اُلجھی نہ گفتگو ہو
دل کی کھری زباں میں اظہارِ آرزو ہو

انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو
پیشانی بشر کا تیور پلٹ چکا ہو ....

برفِ خرد میں جھلکر دل سُن نہ ہو گئے ہوں
آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے نہ جم چکے ہوں

غیروں کے درد پر بھی دل میں دراسک ہو
خونِ سفید میں کچھ سُرخی کی بھی جھلک ہو

انسانیت کا پودا اٹھ ٹھرے نہ جس ہوا میں
دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا ہو

ایسی زمیں بھی کوئی کیا زیرِ آسماں ہے
میرے خیال بتلا دُنیا مری کہاں ہے؟

انتخاب

از جناب [illegible] بھوپال

"انگریزی کی ایک مثل ہے۔
"No life without a companion" یعنی شریک زندگی نہیں تو لطف زندگی نہیں! اور واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی زندگی میں مسرتوں کے مواقع اوّل تو ویسے ہی بہت کم پیش آتے ہیں اور جو آتے بھی ہیں تو شریک حیات کی غیر موجودگی میں بالکل پھیکے ہوجاتے ہیں۔ جب چاروں طرف غم و اندوہ کے بادل چھا جاتے ہیں ہر طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے تو اس وقت صرف عورت کی مسکراہٹ ہی مردہ جسم میں جان ڈال سکتی ہے" شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاہد صاحب! خوشنما الفاظ کے پردہ میں آپ حقیقت کو نہیں چھپا سکتے۔ آپ نے تصویر کے ایک ہی رُخ پر نظر کی ہے دوسرا رُخ دیکھنے کی شاید آپ کے اندر ہمت نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی کے تاریک پہلو پر نظر ڈالنے سے شاید آپ کے دلکش اور سُہانے خواب دھوئیں کے مانند ہوا میں غائب ہوجائیں گے۔ لیکن پھر سوچئے کہ اگر آپ حقیقت سے دور بھاگیں گے۔ تو کیا حقیقت، حقیقت نہ رہے گی" لطیف نے سنجیدگی سے کہا۔

"مسٹر لطیف! آپ کا نام تو لطیف ہے لیکن آپ کے اندر ذرہ لطیف کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، میں آپ کی گفتگو کا مقصد نہیں سمجھا۔ آپ شادی کے خلاف ہیں۔ یا صنف نازک ہی سے آپ کو کوئی پرخاش ہے؟ ذرا صاف گفتگو کیجئے" شاہد نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "مجھے ایسی ذہنی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے جو کبھی حقیقت کو سمجھنے کا موقع ہی نہ دے۔ آپ زندگی کے مسائل کو بھی شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہد صاحب!

آپ نے کبھی اُن ہستیوں پر بھی نظر کی، جن کی زندگی شادی کے بعد ہی وبال جان ہوجاتی ہے۔ جن کو کبھی شادی کی برکات سے واقف ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اُن گھروں کا بھی کبھی آپ نے جائزہ لیا۔ جو آپ کی صنف نازک نے تباہ کردیئے۔ ممکن ہے کہ عورت کی مسکراہٹ مردہ جسم میں روح پھونک دیتی ہو۔ لیکن ہم تو ابھی تک یہی دیکھ سکے ہیں کہ بہت سے گھر محض ازدواجی زندگی کے باعث دوزخ کا نمونہ بن گئے" لطیف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آپ نے جو کچھ فرمایا۔ اس کو درست تسلیم کرنے کے بعد بھی ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا؟" شاہد نے تیزی سے دریافت کیا۔

"محض اس وجہ سے کہ شریک زندگی کا انتخاب غلط اصولوں کے تحت ہوتا ہے۔ خاندانی شرافت، حسن صورت اور اعلیٰ سیرت ہی پر زندگی کی مسرتوں کا دارو مدار نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز میلان طبع اور خیالات کی یکسانیت ہے یعنی اگر طرفین کی طبائع میں یکسانیت پائی جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمخیال واقع ہوئے ہوں۔ تو اُن کی ازدواجی زندگی بھی کامیاب ثابت ہوسکتی ہے" لطیف نے پُر زور لہجہ میں کہا۔

"بس یہی تو آپ کی بنیادی غلطی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد و عورت کے ہم خیال ہونے سے زندگی بالکل ہی پھیکی اور بے مزہ ہوجاتی ہے۔ مرد نے کہا "یہ اچھا ہے" عورت نے کہا کہ "اس میں کیا شک ہے" مرد نے کہا "یہ بُرا ہے" عورت نے کہا "آپ بجا فرماتے ہیں" چلئے قصہ ختم، نہ کوئی اختلاف ہے نہ دلچسپ خیال آرائیاں! حالانکہ انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ زندگی میں کچھ چہل پہل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ طبیعت کی نیرنگیوں کا

ظاہر ہے اس کے اندر جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اگر طرفین میں اختلاف آرائیاں ہوں اور وہ کبھی ایک نقطے پر جمع نہ ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں بلکہ ان کی دلچسپ اور رنگین گفتگو حقیقی معنوں میں ان کو ایک دوسرے کے اندر جذب کر دیتی ہے اور اسی کا نام زندگی ہے!" شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا:-

"یہ آج آپ اُلٹی گنگا بہانے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں۔ آپ کی تمام گفتگو کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر مرد کہے "یہ دن ہے" تو عورت کہے نہیں! یہ رات ہے" ——— اگر کسی وقت مرد کی طبیعت چائے پینے کو چاہے تو عورت کی خواہش ہو کہ آئس کریم کھایا جائے ——— مرد چاہتا ہو کہ دوستوں کے ساتھ کہیں تفریح کو جائے لیکن عورت کا تقاضہ ہو کہ سینما چلئے" وغیرہ وغیرہ ——— غرضیکہ اس طرح سے کھانے پینے اُٹھنے بیٹھنے اور لکھنے پڑھنے میں اختلافات کی ایک زبردست خلیج حائل ہوتی جائے۔ اگر ایک کی خواہش پوری ہو تو بھی تکمیل خواہش دوسرے کے لئے کوفت کا باعث بن جائے۔ پھر آپ ہی بتلائیے کہ زندگی کا کیا خاک لطف آئے گا۔ روزانہ کے جھگڑے، شکر رنجیاں اور ناخوشگوار گفتگو سے زندگی میں کونسی رنگینیاں پیدا ہو جائیں گی؟ کاش کہ آپ کو ایسی زندگی کا تجربہ ہوتا تو یوں آگ اور پانی کو ایک جگہ جمع کرنے کی رائے ہرگز نہ دیتے" لطیف نے پُرجوش لہجہ میں کہا:- دوست شاہد! زندگی میں اگر نشیب و فراز نہ ہوں تو جینے کا لطف ہی کیا۔ بچہ جب تک ٹھوکریں نہیں کھاتا چلنا نہیں سیکھتا۔ پُرپیچ اور دُشوار گذار راستے مصائب و تکالیف، رنج و غم ہی تو زندگی کا اصل نام ہیں۔ ورنہ آرام و آسائش عیش و عشرت کی قدر ہی ہم نہیں کر سکتے۔ بقول کسے

ہر اک چیز کی قدر ہوتی ہے ضد سے

اگر زندگی میں صرف عیش و آرام ہی ہوتا تو ہم کبھی اس سے لطف اندوز نہ ہو سکتے۔ تکلیف کے بعد ہی راحت کا احساس بھلا معلوم ہوتا ہے پھر ہم مصائب اور تکالیف سے کیوں دور بھاگیں؟ میں تو ان کو دعوت دینا ہی زندگی کا مقصد سمجھتا ہوں:-

پھر اگر زندگی میں کچھ چہل پہل نہ ہو اور طرفین ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملا کر زندگی گذار دیں تو یہ جینا بھی کوئی جینا ہے؟" شاہد نے پُرزور لہجہ میں کہا۔

"اگر آپ کا نظریۂ حیات یہی ہے تو غالباً شریک حیات کا انتخاب کرتے وقت بھی آپ اسی قسم کی باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھتے ہونگے اور ہماری سوسائٹی جن مسلّمہ اصولوں کو مدّنظر رکھ کر انتخاب کو عمل میں لاتی ہے۔ شاید ان سے بھی آپ کو اختلاف ہوگا!" لطیف نے طنزیہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"سوسائٹی سوسائٹی سُنتے سُنتے کان پک گئے۔ زمانہ نے کتنی کروٹیں بدلیں۔ انقلاب پر انقلاب رونما ہو گئے اور آپ ہیں کہ ابھی تک سوسائٹی کے ہی گن گا رہے ہیں۔ کبھی آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ ہماری سوسائٹی کے وضع کردہ اصول و قوانین کس قدر عجیب ہوتے ہیں۔ صرف عجیب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متضاد بھی! ——— اچھائی اور بُرائی میں تمیز کرنے کے لئے جو الفاظ وضع کئے جاتے ہیں وہ کس قدر مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ میں اس وقت زیادہ اہم مسائل کو چھیڑنا نہیں چاہتا صرف روزمرّہ کے نظریات پر ہلکی سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ بطور مثال کے میری شخصیت ہی کو لیجئے۔ میں اگر ہر ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش آتا ہوں بہت جلد بے تکلف ہو کر ہنسی اور مذاق کا سلسلہ شروع کر دیتا ہوں تو وہ لوگ جو میرے گرویدہ ہیں کہتے ہیں: "یہ شخص بہت زندہ دل خلیق اور ملنسار واقع ہوا ہے" برخلاف اس کے وہ لوگ جو مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں "یہ شخص اپنے مسخرہ پن کے باعث ہر ایک کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہتا ہے۔ خودداری اور ذاتی وقار کا اس کو ذرا بھی احساس نہیں ہے" ——— پھر تھوڑی دیر کے لئے فقرہ

کیجئے کہ میں کم سخن واقع ہوا ہوں اور دوسروں سے بہت کم ملتا جلتا ہوں تو ایک گروہ میرے متعلق یہ رائے قائم کرے گا کہ "نہایت سنجیدہ اور سمجھدار آدمی ہے۔ فضول گوئی سے اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں ہے" دوسرا گروہ کہے گا "یہ شخص کس قدر بداخلاق اور مغرور ہے۔ کسی سے بات کرنا بھی اپنی شان کے خلاف تصور کرتا ہے" ــــ یا پھر کوئی یہ کہے گا کہ اس کو تو بات کہنے کی بھی تمیز نہیں ہے" ــــ اب بتلائیے کہ آپ کس کے فیصلہ کو ترجیح دیں گے؟ اور کیوں؟ ــــ اسی لئے تو عرض کرتا ہوں کہ سوسائٹی خود ہی چند اصول وضوابط مرتب کرتی ہے .... اور پھر خود ہی اُن کو توڑ دیتی ہے۔ جس کو جیسا چاہا کہہ دیا۔ اور جیسا چاہا سمجھ لیا خواہ حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو اور صرف یہی نہیں بلکہ ہم جو فیصلہ کرتے ہیں اس کو دوسروں سے تسلیم کرانا بھی اپنا اولین فرض خیال کرتے ہیں۔ گویا ہماری ہر بات حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جوں جوں حالات اور واقعات بدلتے جاتے ہیں۔ توں توں ہمارے نظریات بھی تبدیل ہوتے جاتے ہیں اس کے باوجود ہم اپنے عارضی اور وقتی فیصلوں کو حقائق و معارف سے تعبیر کرتے ہیں۔ خواہ ان فیصلوں میں کتنی ہی ترمیم و تنسیخ کیوں نہ ہو جائے۔ پھر آپ ہی بتلائیے کہ ان مضحکہ خیز اصولوں سے ہماری تہذیب اور معاشرت کو کتنا فائدہ پہنچا؟ یا پہنچ سکتا ہے؟ ان نام نہاد مسلّمہ اصولوں نے کہاں تک انسانی زندگی کی تعمیر میں حصہ لیا؟ تو پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم کسی اصول کے پابند ہی نہ رہیں اور صرف اپنے ضمیر کو اپنا رہنما بنائیں......!"

شاہد ابھی اور کچھ کہنے والا تھا کہ لطیف نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ارے حضرت یہ آپ شریک حیات کے انتخاب پر گفتگو کرتے کرتے کیسے بہکے کہ سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا شروع کر دیا۔ سوسائٹی کو تو اپنے حال پر چھوڑئیے اور یہ بتلائیے کہ پھر آخر ہم کو شریک حیات کا انتخاب کیوں کر کرنا چاہئے؟" لطیف نے دریافت کیا۔

"کیونکہ شریک حیات کے انتخاب میں سوسائٹی کے وضع کردہ اصول و قوانین کا بہت زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے۔ اس لئے مجھے لامحالہ یہ بحث چھیڑنا پڑی ــــ لیکن انتخاب کا سوال پیدا کر کے آپ نے اور بہت سے سوال کھڑے کر دیئے اور بغیر اُن پر نظر کئے ہوئے انتخاب کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ پہلے آپ یہ بتلائیے کہ ہمارے ہندوستان جنت نشان میں کتنی شادیاں ایسی ہوتی ہیں۔ جن میں طرفین کی رضامندی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مرد تو پھر بھی اپنی ہونیوالی رفیقۂ حیات کے بابت کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہے لیکن عورت کی زبان پر تو شرم و حیا کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ وہ اپنے رفیق زندگی کو پسند کرنا تو درکنار یہ بھی نہیں جانتی کہ جس ہستی کے ساتھ اُسے زندگی کے بلند و پست راستوں کو طے کرنا ہے وہ کن خصوصیات کی حامل ہے۔ کیا انتخاب کا حق صرف آپ کو ہی حاصل ہے اور بحیثیت انسان ہونے کے اُس بے زبان کو عورت کو نہیں۔ جیسے آپ مثل گائے بیل کے بازار سے خرید کر لے جاتے ہیں؟ ــــ جس طرح کہ ایک جانور کو خریدتے وقت اُس کی آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ دیکھے جاتے ہیں بالکل اُسی طرح آپ عورت کے متعلق بھی ان تمام باتوں کا اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ آیا اس میں کوئی جسمانی نقص تو نہیں پایا جاتا۔ پھر جانور کو خریدتے وقت تو صرف جسمانی نقائص ہی دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن ایک عورت کی زندگی کا سودا کرتے وقت آپ اور بھی بہت سی باتیں جاننا چاہتے ہیں۔ اچھا خاندان ہو۔ سیرت کے لحاظ سے یکتا ہو اور اگر وہ کسی متمول گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ تو کیا کہنا ہے۔ سونے پر سہاگہ ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ کیا عورت کی حیثیت بے زبان جانور سے بھی گئی گذری؟ ــــ سچ تو یہ ہے کہ آپ شریک حیات کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ کسی کمزور اور بے بس زندگی کو اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتے ہیں کاش کہ ایک عورت #

کی زندگی کا سودا کرتے وقت آپ اپنی زندگی کی قیمت کا بھی اندازہ کر لیا کریں [illegible]

پھر اگر آپ ترجیح نہیں دے سکتے تو نہ سہی کم از کم اس کو تباہ ہونے سے تو بچا سکتے ہیں :

شاہد یہیں تک کہنے پایا تھا کہ لطیف نے سلسلۂ کلام شروع کیا "اگر آپ مجھ کو بھی کچھ کہنے کا موقعہ دیں تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تمام الزامات صرف مرد پر ہی عائد نہیں ہوتے اس میں بہت کچھ عورت کی بے حسی، کمزوری اور جہالت کو دخل ہے۔ کیا مرد یہ چاہتا ہے کہ عورت جاہل رہے یا وہ کسی جاہل عورت کو اپنا شریک زندگی بنائے؟ کیا مرد یہ چاہتا ہے کہ عورت بالکل گونگی اور بہری بن کر یا بینائی سے محروم ہو کر خود کو مرد کے حوالہ کر دے؟

کیا مرد کبھی بھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ اُس کی رفیقۂ حیات آلام و مصائب میں گرفتار ہو اور وہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہے؟ مرد کے سینہ میں بھی ویسا ہی گوشت پوست کا دل ہے جیسا کہ عورت کے سینہ میں! ـــــ پھر مرد کو مورد الزام قرار دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے مزید برآں کیا عورت اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتی؟ کیا وہ قدم قدم پر مرد کی محتاج ہے پھر اگر واقعی اُس کی حیثیت مردوں نے بہت زیادہ گرا دی ہے تو عورت کو احساس نہیں ہے؟ اگر وہ بھی محسوس کرتی ہے تو کیوں نہیں اُبھرنے کی کوشش کرتی؟؟ وہ خود کیوں پستی کی حالت میں رہنا پسند کرتی ہے؟؟؟ آخر اُن سوالوں کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟" لطیف نے اپنا پورا زور تقریر صرف کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنا ہے گویا آپ نے اپنے نزدیک تو ایسے اعتراضات کر دیئے جن کا کوئی جواب ہی نہیں ہے! ـــ کون نہیں جانتا کہ ہندوستانی عورت ہمیشہ سے مرد کی مطیع و فرمانبردار رہی ہے۔ مرد نے جیسا چاہا اُس کو بنا دیا جس راستہ پر لگایا وہ چلنے لگی۔ محبت، رحم، ہمدردی اور انکساری کے باعث اُس نے مرد کا مقابل

بننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مرد نے اس کو علم سے بے بہرہ رکھا وہ خاموش رہی اُس نے تمام حقوق کو غصب کر لیا۔ تب بھی وہ اُف نہ کر سکی اُس کو کمزور جنس قرار دیا اور خود قوی بن گیا۔ اُس کو ضعیف العقل بتایا اور خود علم و عقل کے خزانہ کا مالک بن بیٹھا۔ پھر اگر برسوں تک عورت جہالت کے باعث اپنی پستی اور زبوں حالی کو نہ محسوس کر سکی تو یہ قصور مرد کا ہے جس نے اس کو تعلیم و تربیت کی ہوا بھی نہ لگنے دی اور دنیا کے حالات سے بے خبر رکھا۔ جس نے اس کو کبھی اُبھرنے کا موقعہ ہی نہ دیا جس نے اس کو چہار دیواری میں قید کر دیا۔ جس نے اس کو جانور سے بھی بدتر تصور کیا ـــ آہ عورت! بدنصیب عورت!! جو پیدا ہی اس لئے ہوتی ہے کہ ظلم سہے اور اُف نہ کرے۔ ہمیشہ آنکھیں بند کر کے مرد کی اطاعت کرے ـــ کیوں؟ (طنزیہ لہجہ میں) اس لئے کہ عورت کمزور ہے۔ بے بس ہے اور اس کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ مرد کی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرے۔ مرد کیلئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دے ہاں ـــ لیکن مرد کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ عورت کی خاطر اپنے مردانہ وقار پر ذرا بھی فرق آنے دے۔ کیونکہ مرد کے نزدیک تو عورت مثل ایک کھلونے کے ہے۔ جس سے جب تک چاہا کھیلا اور جب چاہا توڑ کر پھینک دیا! مذہب، قانون اور اخلاق کا نام لے لے کر جس قدر قیود اور پابندیاں عاید کی جاتی ہیں تو عورت پر ـــ کیونکہ مذہب، قانون اور اخلاق کے اصول و ضوابط بنانے والا بھی مرد ہی ہوتا ہے وہ عورت کے لئے جس قسم کی حدود چاہے قائم کر سکتا ہے پھر اگر کوئی عورت اخلاق کے اُس معیار پر پوری نہ اُتر سکی ہو جو مرد نے اُس کے لئے بنا لیا ہے یا اُن حدود سے باہر ہو گئی ہو جنکے لئے نسوانی وقار، عفت و عصمت جیسے الفاظ وضع کئے گئے ہیں تو اُس کی سزا کا بھی مرد کو ہی اختیار ہے بہر حال عورت کو کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں۔ کیونکہ وہ محکوم ہے اور مرد حاکم! بلکہ وہ لونڈی ہے اور مرد اُس کا مالک!! ہندوستان کی عورت تو ہمیشہ سے یہی سمجھتی آئی ہے کہ مرد ہی ....

اُس کا مجازی خدا ہے اور اُس کے تمام جا و بیجا احکام کی تعمیل عورت کا ازلی فرض ہے۔ شوہر کی اطاعت اور خدمت گزاری ہر عورت کا مقصد زندگی ہے! پتی کے لئے ہی مرنا اور پتی کے لئے ہی جینا ہندوستانی استری کا دھرم ہے!! ـــــ یہ ہیں وہ مسلّمات جو مرد نے مذہب کی آڑ لے کر بنائے ہیں۔ اور جو عورت کی پیدائش سے لے کر موت تک بار بار دُھرائے جاتے ہیں۔ ان قوانین کو نہ صرف عورت کے دل و دماغ میں پیوست کیا جاتا ہے بلکہ اُس کی رگ رگ میں ان کو سرایت کرنیکی کوشش کی جاتی ہے اور انھیں اغراض کی بنا پر بمقابلہ مرد کے عورت کے لئے مذہبی تعلیم ضروری قرار دی گئی ہے! ـــــ کیا اب بھی یہ تبلانیکی ضرورت ہے کہ ہم کو شریک حیات کا انتخاب کیونکر کرنا چاہئے۔ اگر آپ عورت کو بھی اپنے ہی جیسا گوشت و پوست اور دل و دماغ کا انسان تصور کرتے ہیں تو یقیناً آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس طرح آپ اس کو منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح اس کو بھی منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ جس سلوک کی آپ اُس سے توقع رکھتے ہیں۔ وہی سلوک آپ کو اُس کے ساتھ کرنا پڑے گا تب تو صحیح معنوں میں آپکا انتخاب کامیاب ثابت ہو سکتا ہے اور آپ کی ازدواجی زندگی خوشگوار بن سکتی ہے ورنہ

وہی مخشار بیدا منگا جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ والا مضمون رہے گا!"
شاہد نے اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے لطیف کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا!

"شاہد صاحب! طبیعت تو چاہتی تھی کہ اسی وقت آپ کی آنکھوں سے اس مغربی عینک کو اُتار کر حقیقت کا مشاہدہ کراتا تاکہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب! ہر چیز جو چمکتی ہے وہ سونا نہیں ہو سکتی۔ کاشکہ آپ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے اپنی آنکھوں سے کام لیتے! کیا۔ آپنے نہیں سنا کہ چلا جب چال کوا ہنس کی اپنا چلن بگڑا ـــــ لیکن نہیں اس وقت میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا۔ کسی آئندہ صحبت میں اس کا جواب آپ کو مکمل دیا جائے گا۔ فی الحال اگر آپ اس مناظرہ کی فتح پر مسرور نظر آتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ اپنے دوست کی مسرتوں کو پامال نہ ہونے دوں۔ ہاں جب آپ کا یہ نشہ اُتر جائے گا۔ تب کچھ کھری کھری سن لیجئے گا۔

(یعنی حضرت مجازؔ لکھنوی کی غزل پر گوٹ کنار)

از جناب مولانا محمود اسرائیلی صاحب

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
طفلی کا زمانہ بھول گئے وہ عہدِ دبستاں بھول گئے

وہ دَورِ جوانی ختم ہوا اب کاوشِ ہجراں یاد نہیں
وہ زُلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے. نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں!
اے ذوقِ مژہ افسوس کہ اب ہم لذتِ پیکاں بھول گئے!

مانا کہ تری رنگ آمیزی سے حُسن میں جان آجاتی ہے
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے!

اُس گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اب یادِ مراد آئے بھی تو کیا، ہم وصل کا ارماں بھول گئے

اے خندۂ گل ہم کو نہ ہنسا، اے مُرغِ چمن نغمے نہ سنا
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
اوروں کے تو نقصاں یاد رہے اور اپنا ہی نقصاں بھول گئے

دامانِ تمنّا سب کے بھرے اور آپ تہی داماں ہی رہے...!
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

اسلامی دُنیا کا آج کل دھوپ چھاؤں کا سا نقشہ ہے کہ نہ تو اُسکا کرۂ قومی سارا کا سارا مجلاّ ہے اور نہ سارا کا سارا تاریک۔ یعنی اگر ایک جگہ ظلماتی دامن اُس پر چھایا ہوا ہے تو دوسری جگہ نورانی شعاعیں بھی تابندہ ہیں۔ اس کی مثال اُس بچے کی سی ہے جو کہ ابھی اپنے بستر راحت پر نیم خوابیدہ پڑا ہے نہ سوتا ہے نہ جاگتا ہے۔ کبھی تو وہ آنکھیں مل کر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر کسلمندی اور غلبۂ خواب سے کبھی پھر بستر پر لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ غرضیکہ کروٹیں بدل رہا ہے نہ سوتا ہے اور نہ جاگتا ہے یہی مثال اسلامی دنیا کی حالت کی آج کل ہو رہی ہے۔ مطلب یہ کہ ابھی وہ اقوام دیگر کی طرح کافی ہوشیار ہوکر ترقی کے میدان میں خاطر خواہ گامزن نہیں ہے کچھ افراد اگر ہوشیار ہو بھی گئے ہیں تو کچھ تو قومی حالت کی پیچیدگی اور کچھ رفتار زمانہ کی وجہ سے، گو وہ ساعی تو ہیں مگر اب تک کافی کامیابی حاصل نہیں کر سکے ہیں اس کی تنقیح کے لئے ہم کو اپنے اسلامی عروج کا اور موجودہ اسلامی پستی کے زمانہ کا مقابلہ کرنا لازمی اور ضروری ہے تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ وہ کیا کیا باتیں تھیں جنھوں نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو تمام اقوام پر ترجیح دے کر ممتاز کر دیا تھا اور کر رکھا تھا۔

پس جب قرونِ اولیٰ اور قرنِ موجودہ کے مسلمانوں کی حالت پر ہم ایک متبصرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو صاف اور یقینی طور پر جو مابہ الامتیاز معلوم ہوتا ہے وہ حسب ذیل باتیں ہیں جو قرونِ موجودہ کے مسلمانوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی سی نہیں ہیں یعنی قرن حاضرہ کے مسلمانوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا سا اخلاص ہے نہ ایثار ہے نہ خودداری اور رواداری اور نہ جانفروشی۔ اسی وجہ سے وہ ترقی قوم میں نہ تو تن۔ من۔ دھن سے ساعی ہوتے ہیں اور نہ ہو سکیں گے جب تک قرونِ اولیٰ کا سا اخلاص۔ محبت۔ ایثار و خودداری وغیرہ وہ اپنے آپ میں پیدا نہ کر لیں گے۔ اور جب تک اوصاف مزبورہ اُن کے جسد خاکی میں محلول نہیں ہوں گے۔ تب تک قوم کا بیڑا منجدھار میں ڈگمگاتا ہی رہے گا۔ البتہ جب اوصاف مذکورہ قوم میں پیدا ہو جائیں گے تو وہ بیڑا منجدھار سے فوراً نکل کر ساحل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اور میں خوشی سے یہ بات لکھتا ہوں کہ اب ان میں بیداری پیدا ہونے لگی ہے اور وہ کروٹ بدل کر ہوشیار ہونے لگے ہیں۔

اب میں مختصراً اخلاص وغیرہ مزبورہ کی یہاں توجیہ کرتا ہوں تاکہ کافۃ الناس بالعموم جو کہ زیور علم سے کافی طور پر آراستہ نہیں ہیں وہ بھی اُن سے واقف ہو جائیں۔

اخلاص وہ پاک اور بے لوث محبت ہے جس میں منافقت کا شائبہ تک نہ ہو۔ اور انسان جو بھلائی اپنے واسطے چاہے وہی اپنے دوسرے بھائی کے واسطے بھی چاہے بقول ایک انگریزی ضرب المثل ذیل کے

Do as you would be done by.

(ترجمہ، (اوروں سے ایسا ہی سلوک کرو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ سلوک کریں) مگر یہ بات مشکل ہے دس پندرہ فیصدی

مسلمانوں میں اس وقت ہو تو ہو، بلکہ میرے خیال میں تو اس سے بھی کم تر حالت ہے بقول حالی علیہ الرحمۃ کے ؎

بہت ہیں مدعی ہمدردیٔ اسلام کے لیکن
ٹٹولیں گے اونھیں گر یار خالی پائیں گے اُن کو

ایثار:- یہ وہ اعلیٰ صفت ہے جس کا کلام مجید اور احادیث صحیحہ میں جا بجا ذکر ہے۔ مگر مجھ کو شرم آتی ہے یہ لکھتے ہوئے کہ آج کل سگے بھائیوں میں بھی یہ صفت نہیں ہے چہ جائیکہ قوم کے ہر فرد میں یہ صفت ہو۔

خودداری:- اس کا بھی وجود ہماری قوم میں بہت کم فی زمانہ پایا جاتا ہے۔ جہاں اغراض ذاتی کی حصول کا موقع ہوتا ہے وہاں بہت کم ایسے اشخاص پائے جائیں گے جو کہ اپنی خودداری اور قومی فوائد پر اپنی ذاتی غرض کو ملیا میٹ کر دیں بلکہ اکثر اس کے برخلاف دیکھا جاتا ہے کہ ناجائز خوشامد اور ارذل طرق سے اپنا حصول مدعا کیا جاتا ہے۔ خدا ہم کو توفیق نیک دے۔

جانفروشی:- اس کا تو وجود ہماری قوم میں تقریباً مفقود ہے۔ جان فروشی کا مطلب دو شخصوں کا کسی وجہ خاص سے لڑ بھڑ کر مر جانا نہیں ہے۔ بلکہ اپنی خودداری، قومی عزت اور دین کی عزت کے لئے جان قربان کرنا ہے جس کا ثمرہ دین دنیا میں اظہر من الشمس اور حروف طلائی کی طرح دیباچۂ دنیا پر تجلا ہوتا ہے اور صدیوں تک وہ ورد زبان خلائق رہتا ہے بلکہ جریدۂ عالم پر وہ یادگار رہتا ہے یہ نہیں کہ کسی ذاتی غرض کے واسطے دو شخصوں یا گروہ اشخاص کو غصہ آیا اور وہ ملا بھا اور جھگڑے کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو کر ہلاک اور زخمی کرنے پر ایک دوسرے کو آمادہ ہو گئے۔ اور کسی کو ہلاک اور کسی کو زخمی کر دیا۔

اب سر دست میں یہاں تنظیم اسلامی کے بابت کچھ لکھ کر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ گو بشرط ضرورت دو فرصت شاید پھر کبھی موقع لکھنے کا آجائے۔

اب ہماری قوم کو چاہئے کہ باہمی فروعی و مذہبی اختلافات کو چھوڑ کر آپس میں اتفاق اور ہمدردی پیدا کر کے تنظیم اسلامی کریں جیسا کہ بزرگان سلف و فدایان قوم مثل سر سید احمد خان مرحوم - محمد علی جوہر و سر محمد اقبال مرحوم ہدایت کرتے چلے گئے ہیں یعنی سب مسلمان ایک قوم میں متحد ہو کر ضرورت زمانہ کے موافق عمل کریں۔

۱۔ تعلیم حاصل کرنے میں پورا اجتہاد کریں جس کی نسبت بزرگان سلف کا مقولہ ہے اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّين (علم کو حاصل کرو خواہ اس کے حصول کے لئے تم کو چین یعنی کسی دور دراز کا سفر اختیار کرنا پڑے)۔

۲۔ اقتصاد یعنی کفایت شعاری سے کام لیا جائے فضول خرچی اور فضول رسمیات کو قطعاً ترک کر دو۔ اور شادی اور غمی کی رسمیات سادہ طور پر حسب ہدایت شرعی کرو۔ کچھ ضرورت نہیں کہ ذرا سی دیر کی واہ واہ کے لئے ذاتی اور قومی بہبود آئندہ کے لئے ذرائع منقطع اور معدوم کر دو۔

۳۔ اخلاق درست کرو بڑے سے ادب لحاظ سے پیش آؤ۔ اور چھوٹوں سے محبت و خلوص سے۔ ہر ایک سے بلحاظ اُس کے ذاتی مناصب کے سلوک کرو۔ کسی سے تکبر و نخوت شعاری سے پیش نہ آؤ۔ اور یہ سمجھ لو کہ سب انسانوں کو خدا نے حقیقتاً یکساں بنایا ہے۔ پس عمل میں بھی یکسانیت ہی رہنی چاہئے۔

۴۔ مذہب میں گو فروعی اختلاف ہو بھی، تب بھی اس میں رواداری اختیار کرنے سے اسلامی جمعیت فروغ پاتی ہے اور اقوام دیگر پر اس کا بہت رعب شان اثر پڑتا ہے۔

۵۔ زمانہ موجودہ کے کرتب بھی حاصل کرنا قومی بہبود کے دوام کے لئے ضروری ہیں یعنی مرد اور عورت ہر دو صنف کو جنگی قواعد سے ہر کہ و مہ کو آج کل واقف ہونا ضروری ہے، ہر قسم کے ہتھیاروں کا استعمال بھی اب سیکھنا چاہئے۔ غرضیکہ کل جنگی کرتب مروجہ زمانہ حال سے واقف ہونا قیام ہر قوم کے لئے ضروری اور لابدی ہے یعنی کہ ضرب و حرب اور تحفظ و بچاؤ کے ذرائع مروجہ زمانۂ حال سے واقفیت بھی حفظ ما تقدم پر عامل ہے ۔*

---

* میں نے ایک فرکیٹ مسلم موسوم بہ تنظیم اسلامی لکھا ہے جو کسی اور موقع پر نذر ناظرین کرنے کا یقین ہو سکے۔ کیونکہ اس وقت اس کی اشاعت سے بہت طوالت مضمون معلوم ہوا ہو جاوے گی۔ پس وہ کسی اور موقع پر پیش کرنا کیا جاسکے گا۔

غزل

از جناب محمد عبد الحمید صاحب صدیقی لکھنوی

ہوا یاد کا یہ اثر چپکے چپکے — کہ آئی نسیم سحر چپکے چپکے
بنا ہی لیا دل میں گھر چپکے چپکے — رگ و پے میں ڈوبی نظر چپکے چپکے
کیا شوق دل نے اثر چپکے چپکے — وہ ہو ہی گئے باخبر چپکے چپکے
میں سمجھا میں سمجھا وہ آئے وہ آئے — بڑھی دل کی دھڑکن مگر چپکے چپکے
وہ ہونے لگے مہرباں رفتہ رفتہ — ہوا جذب دل کارگر چپکے چپکے
ترے ہجر میں اب مرے دل کا یہ عالم — جلے جیسے شمع سحر چپکے چپکے
خدا جانے دیکھا تھا کیسی نظر سے — کہ دل بن گئی وہ نظر چپکے چپکے
جنوں نے یہ کیا کر دیا حال میرا — وہ روئے مجھے دیکھ کر چپکے چپکے
نثار ان کے ہر گام پر جان و دل ہوں — وہ آئیں اگر میرے گھر چپکے چپکے
مٹا فرق ناز و نیاز محبت — ادھر چپکے چپکے ادھر چپکے چپکے
پہنچ تو گئی ہے اب آگے مقدر — نظر تا بحد نظر چپکے چپکے

حمید اُن کے دامن کی تاثیر دیکھو
بنے اشک میرے گہر چپکے چپکے

بچوں کا صفحہ

ایک لاکھ روپئے کا مصرف

از عزیزہ ناہید، عمر ۱۳ سال

میں ایک غریب خاندان کی لڑکی ہوں۔ اگر قدرت مجھے ایک لاکھ روپیہ عطا فرمائے تو اسے میں اپنے زیورات و کپڑوں پر صرف نہیں کروں گی۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ظاہری آرائش و زیبائش ہی سے انسان کی عزت ہوتی ہے۔ اور فی زمانہ ایسا ہوتا بھی ہے۔ مگر یہ اُن لوگوں کی کم فہمی ہے۔

سب سے پہلے میں اپنے والد کے افکار کو اس طرح رفع کروں گی کہ انھیں کسی قسم کا تردد ہم لوگوں کے متعلق نہ رہے۔ اور ان کی زندگی کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچاؤں گی۔ پھر اس کے بعد اپنی بڑی بہن کی شادی کروں گی جس کا ارمان میرے بابا کو بہت ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی بہنوں سے اور ایک میری عزیز ترین سہیلی سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت ہے۔ یہی ہستیاں مجھے بہت زیادہ عزیز ہیں۔ دھوم دھام کی شادی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر شرعی باتوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جائے۔ مثلاً آتشبازی وغیرہ وغیرہ پر۔ بلکہ میرا مقصد یہ ہوگا کہ جب ہماری پوری جماعت کو مدعو کیا جائے گا تو سب کو لازمی آنا ہی پڑے گا۔ ایک تو یہ سبب ہے کہ میرے والد جماعت کے سردار ہیں اور ہمیشہ ہر ایک کی رنج و خوشی میں شریک ہوتے رہے ہیں اس طرح جب پوری جماعت ایک جا جمع ہوگی۔ تو میں ان تمام بیہودہ رسموں کو جو کہ ہمارے یہاں عموماً ہوا کرتی ہیں۔ اپنے یہاں نہیں کرنے دوں گی۔ اور ان لوگوں کو سمجھا کر ان کی تمام برائیاں بیان کروں گی اور ان پر یہ واضح کردوں گی کہ ہم نقش قدیم کی کورانہ تقلید کے باعث دنیا میں ذلیل و خوار ہیں اور مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ وہ ہماری یہاں کی سادہ و پاکیزہ اصلاح پر کاربند ہوں گے۔ اس طرح سے رفتہ رفتہ ان پر بھی اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا کہ واقعی برائی فی نفسہٖ برائی ہے۔

پھر اس کے بعد میں اپنے چھوٹے بھائیوں کو اور بھانجے کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گی۔ تاکہ وہ مستقبل میں قوم و ملک کے لئے مفید ثابت ہوں۔

میں دیکھتی ہوں کہ ہم لوگوں میں مائیں عموماً جاہل ہوا کرتی ہیں۔ اور وہ نہیں جانتیں کہ بچوں کی پرورش کس طرح کرنی چاہئے۔ ان کو گلیوں میں آوارہ پھرنے کی اجازت دیتی ہیں۔ نونہالان چمن کو بھوت پریت جیسی مہمل چیزوں سے ڈراتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ بچے باہمت دلیر بہادر بنیں بزدل بن جاتے ہیں۔ اہل خرد کا یہ مقولہ ہے کہ آغوش مادر انسان کا ابتدائی مدرسہ ہے۔ ماؤں کی جہالت کے سبب آج اس قوم کے بچے جن کے آباؤ اجداد کبھی

تلواروں کے سامنے میں نہیں گھبراتے تھے۔ آج اندھیرے
اور بھوت پریت جیسے تخیلی ناموں سے ڈرتے ہیں اور
اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان غلامی کے طوق و سلاسل میں
جکڑا ہوا ہے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ ایک ایسا تربیت
خانہ بناؤں جہاں معصوم بچوں کو رکھا جائے اور ان کی تعلیم
و تربیت صحیح اصولوں پر ہو۔ کیونکہ اب بڑے لوگوں کو شدھانے
سے رہے ان کی گھٹی میں جو بات پڑ چکی اب اس کو نکال کر پھینکنا قریبًا
ناممکن سا ہے۔ مگر بچے کی مثال اس شاخ کی مانند ہے کہ جس طرف
چاہو موڑ سکتے ہو۔ کیونکہ بچے کا دماغ ایک کیمرہ کی طرح سے ہوتا
ہے۔ جیسا منظر ان کے سامنے پیش کیا جائے گا ان کے دماغ میں
نقش ہوتا جائے گا۔ اگر ان کے سامنے ایسی باتیں کی جائیں جس
میں قومی مذہبی، اخلاقی تعلیمی باتیں ہوں تو ان کے دل و دماغ
میں بھی وہی باتیں تمام عمر رہیں گی۔ اسی طرح سے جسمانی حالت پر
توجہ دیں تو یقینًا وہ آگے چل کر مضبوط قوی ہوگا۔ میں عمومًا دیکھتی ہوں
کہ ہر ایک بچے میں قدرتی طور پر کھیل کا مادہ ہوتا ہے۔ مگر ایک تعلیم یافتہ
خاندان کا بچہ ہاکی، کرکٹ وغیرہ اقسام کے کھیل کا کھیل میں امتیازی
درجہ حاصل کرتا ہے۔ مگر جاہل خاندان کا بچہ پتنگ کے پیچھے اوجھا
دشمن بھاگتا ہے۔ اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ آیا
موٹر آرہی ہے یا ٹرام۔ مگر لوگ اس کے ذوق کی داد نہیں دیتے بلکہ
یہی کہتے ہیں کہ ابھی موٹر میں دب جاتا تو سارا شوق نکل جاتا۔ اس
لئے میں چاہتی ہوں کہ اپنی قوم کے بچوں کے کردار میں وہ تمام
باتیں بھر دوں جو کہ ایک بیدار قوم کے بچوں میں ہونا چاہیئے
تاکہ آگے چل کر وہ غیور، خوددار بنیں اور ان کو اپنی ہستی اور غلامی
کا احساس ہو ان کے دل میں آزادی کا جوش اُمنڈے
اور وہ بکری کی دس سالہ بے غیرتی کی زندگی پر شیر کی دو روزہ
بہادرانہ زندگی کو ترجیح دیں۔

اس کے علاوہ کچھ روپوں سے تجارت کروں اور
اس کا منافع طلباء کے لئے وقف کر دوں تاکہ وہ آرام
سے تعلیم حاصل کر سکیں۔ کیونکہ بعض غریب طلباء روپیہ
نہ ہونے کے سبب سے اسکول یا کالج چھوڑ دیتے ہیں
اور ان کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے اور کچھ ادھر ادھر
سے کوشش کر کے کتابیں حاصل بھی کر لیتے ہیں تاہم اس
اثناء میں جب تک ان کے پاس کتابیں نہیں ہوتی ہیں تو انہیں
معلموں کی جھڑکیاں سننا پڑتی ہیں کہ "جب کتابیں نہیں
ہیں تو اسکول کیوں آتے ہو"۔ اور اس وقت طلباء کے
دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا خدا ہم نے کون سا گناہ
کیا تھا جو تو نے ہمارے والدین کو دولت نہ دی کہ ہم
بھی اطمینان سے تعلیم حاصل کرتے۔ لیکن یہ شکایت خدا
سے بجا نہیں ہے کیونکہ قصور خدا کا نہیں ہے بلکہ اس
سرمایہ دارانہ نظام کا ہے۔

اس کے علاوہ کچھ روپیہ میں اپنی ایک عزیز ترین
سہیلی کے نام کر دوں گی۔ تاکہ وہ اس سے بہ آرام تعلیم
حاصل کر سکے۔

نمبر خریداری	(بقیہ چندہ ختم ہو چکنے کی تاریخ)	
۱۰۷۷	مسز طاہر حسین صاحبہ (میرٹھ)	مارچ ۱۹۴۱ء
۱۰۸۶	محترمہ حاجرہ بائی (بنگلور)	مارچ "
۱۱۵۲	محترمہ بشیر سلطانہ سردار مرزا (حیدرآباد)	ستمبر "
۱۰۹۳	اے۔ احسن اختر (مہندرو)	جون "
۱۱۰۰	سکریٹری بزم مصطفیٰ کمال (بھنبیری)	مئی "
۱۱۰۲	مسز محمد محی الدین صاحبہ (اجمیر)	مئی ۱۹۴۰ء
۱۱۰۴	مسٹر ایس۔ این رضوی (مین نگر)	جون ۱۹۴۰ء
۸۰۰	مرزا رضی الدین احمد صاحب (میدک)	جولائی ۱۹۳۹ء

ڈائرکٹر سہراب مودی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ
کئی ہزار اصحاب نے منروا مووی ٹون کے اس تاریخی شاہکار کا شاندار خیر مقدم کیا
وہ کہتے ہیں آج تک "سکندر" جیسا عظیم الشان فلم ان کی نظروں سے نہیں گذرا
۴
چوتھا ہفتہ
MINERVA PRODUCTION
سکندر
کی عظیم الشان فتح
اداکاران، سہراب مودی، پرتھوی راج، ونمالا، شیلا، مینا، صادق علی، ظہور راجہ
لالہ یعقوب، کے۔ این سنگھ۔ گجند یشا کر۔ جلو بائی۔ غلام حسین۔ ابوبکر وغیرہ
روزانہ تین کھیل
۴ - ۷ - ۱۰ بجے شب کو
سنیچر، اتوار، اور بدھ ۴ کھیل
منروا ٹاکیز
لیمنگٹن روڈ
کو ٹھیوں سے دن کو
اعلیٰ درجوں کے ٹکٹ صبح ۱۰ بجے
سے مل سکتے ہیں۔

پٹرول کی تکمیم

از محترمہ سیدہ مظہر صاحبہ سال سوم ـ زنانہ کالج ـ حیدرآباد دکن

جو دیس میں یورپ کے بڑی جنگ چھڑی ہے
آفات کا طوفان مصیبت کی لڑی ہے!

جان لیوا "تبہ کن" بڑی بے ڈھنگ کڑی ہے
اُف کیسے بتاؤں یہ بلا کتنی بڑی ہے!!!

چمکے نہیں یہ ظلم و ستم تیشۂ جلاد
میں کہتی ہوں ہٹلر کی کہیں آنکھ لڑی ہے!

بمباری سے ہر روز کی کیا عرض کروں میں
پٹرول میں کس درجہ کمی آ کے پڑی ہے

اس قحط کے پٹرول کے پھیلے ہیں جراثیم
اور ان کی بلا آ کے ہر اک سر پہ پڑی ہے

مانے کہ نہ مانے کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے
پر ہند کی قسمت بھی تو یورپ سے جڑی ہے

اس میل کے صدقے میں بھلا چھوٹے گا کیوں ہند
بس اسکی کرامت کی تھی یہ ایک تڑی ہے

یعنی کہ ہے اب ہو گئیں "پٹرول کی تکمیم"
پھر کیا کریں جب مقطع میں بات آ کے پڑی ہے

سُن لیجئے اب مختصراً عرض کروں گی
گو اصل میں پوچھو تو حکایت یہ بڑی ہے

صندل سے جو کالج میں ہمارے دو بسیں ہیں
اک چھوٹی پرانی ہے نئی ایک بڑی ہے

اُف گشت کی ہر روز بڑی ان پہ تھی آفت
گیراج میں ہر اک بڑی راحت سے کھڑی ہے

یہ پوچھو کہ نعمت ہوئی کیسے یہ میسر؟؟
"پٹرول کی تکمیم" کی برکت کی گھڑی ہے

مل جائے گا پٹرول تو بس آئیگی کل بھی!
اس شرط پہ بس آ کے یہاں بات اڑی ہے

پنٹو نے کہا جیسے ہی ہے منہ کو بنا کر
ہم بس کے نشینوں کیلئے آپ ہی کہئیے
اُمید میں ہم بس کہ بہت جلد ہی آئے
کاروں کی صداؤں سے گرج جاتا تھا کمپونڈ
"تانگہ نہیں ملتا ہے تو گھر کیسے میں جاؤں؟"
اِک روز تھا ہم تانگوں کو جھوٹوں منہ تھے تکتے
مجبور ہیں دیتے ہیں کرایہ اِنھیں دُگنا
اللہ کی رحمت سے ہمیں مل گیا تانگہ!

یہ بات تو ہر ایک کہ بس دل میں گڑی ہے
کس درجہ مصیبت زدہ یہ بات کڑی ہے
ورنہ یہاں مشہور ہی کالج کی گھڑی ہے
پر آج تو تانگوں ہی کی آواز بڑی ہے
اس بیچ میں ڈوبی ہوئی ہر لڑکی کھڑی ہے
پر آج تو قیمت بھی چڑھی خوب بڑی ہے
قسمت تو بچاروں کی بڑی آج لڑی ہے
سب کو بھی ملے جنہ مصیبت یہ بڑی ہے

اصرار تھا ہم پر تو کہی ہم نے بھی اِک نظم
اب آپ سمجھ لیں یہ کھڑی ہے کہ پڑی ہے

نوٹ:۔ اس نظم میں شاید چند نامانوس سے الفاظ ملیں گے مثلاً تڑی اور دھڑی وغیرہ۔ مگر پہلا لفظ "کیمپ" کو دیکھ لیجئے۔ اصل میں یہ لفظ کسی تنے ڈھالا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی سمجھے یہ غلط ہے مگر "کیمپ" کی موسیقی ہمیں پسند ہے اور مطلب بھی کما حقہ نکل آتا ہے۔ بہرحال۔ یہ نظم لکھائی گئی ہے۔ ایک واقعہ سے متاثر ہو کر۔ جس کا احساس کسی نے اور بھی دل میں بڑھا دیا تھا اور اصرار کیا تھا کہ اس واقعہ کو نظم کیا جائے۔! "تنویر" ناظرین کی دلچسپی کے لئے بھیج رہی ہوں۔

سید مظہر

"تنویر" کے ہمدرد خریدار توجہ فرمائیں:۔ آپ صفحہ ۵۴ کی لسٹ میں اپنا نام دیکھ کر اگر آپ کے ذمہ چندہ واجب الادا ہے تو جلد از جلد رحمت فرما کر اپنے تنویر کی اس آزمائشی دور میں اخلاقی مدد فرمائیے۔ اور ادارہ تنویر کو شکر گزار کیجئے۔

مینیجر تنویر۔ نمبر ۵ ڈسانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸

شہر سے ۱۵ میل دور مضافات میں تفریح کی ایک نہایت خوشنما و دلچسپ جگہ ہے۔ سمندر کا پانی زمین کے اندر تک گھس آیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے لاتعداد سلسلے ہیں جن کے نشیب میں ناریل کے درخت کثرت سے ہیں۔ یہاں کا شام و صبح کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔

اتوار کے دن لوگ اکثر اس مقام پر آتے ہیں۔ مسٹر و مسز فلپ کسی کام کے سلسلے میں ہفتہ بھر کے لئے باہر گئے ہیں۔ نجمہ کو طبیعت کی ناسازگی کی وجہ سے یہیں چھوڑ گئے ہیں۔ آج نجمہ کا دل بہت گھبرا رہا تھا اس لئے وہ مصوری کا سامان لے کر دل بہلانے کی خاطر اس جگہ چلی آئی۔

ادھر مہاراجہ کے جاسوس نے اطلاع دی۔ لہٰذا خورشید مرزا مہاراجہ بیر سنگھ اور ایک اندور ملازم موٹر میں سوار ہو کر اسی جگہ پہنچ گئے۔ پہلے تو نجمہ گھبرائی کہ کمبخت لوگ بغیر اتوار کے بھی یہاں آتے ہیں تنہائی میں ذرا دل بہلتا اب تو یہاں سے کسی دوسری جگہ ہی چلنا پڑے گا مگر جب خورشید کو دیکھا تو اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی کہ شکر ہے ...... دیدار نصیب ہوا۔ ورنہ کوئی امید نہ تھی۔ خدا کے کارساز کے صدقے اس نے صورت دکھائی۔

نجمہ سوچتی جاتی تھی اور نیچی نظروں سے تصویر بناتی رہی۔ کبھی کبھی نظریں بچا کر خورشید کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی اس کی طرف دیکھتا ہے۔ سوچنے لگی شاید محبت کا اثر ہوا ـــ اتنے میں مہاراجہ اور خورشید مرزا ٹہلتے ہوئے اس کے پاس سے گذرے۔ مہاراجہ ٹھہر گئے۔ آہا! ہم نے آپ کو کہیں دیکھا ہے سوچتے ہوئے خوب یاد آیا ...... آپ نے ہی تو مسوری کا گانا گایا تھا۔ واللہ آپ کو موسیقی میں کمال حاصل ہے۔ بیٹھتے ہوئے ...... آپ کا اسم شریف؟

حضور! مجھے نجمہ کہتے ہیں۔ مہاراجہ قریب جھکتے ہوئے آپ کو بھی ہیں؟ تصویر لیتے ہوئے خوب! آپ بہت ماہر فن معلوم ہوتی ہیں آپ کیا مسز فلپ کی رشتہ دار ہیں؟ نہیں جناب میں تو ان کی ملازمہ ہوں۔

افسوس آپ جیسی اہل فن اور ملازمت؟ مہاراجہ نے کہا۔ کیوں نہیں اپنے فن کی مدد سے کام لے کر شہرت، عزت، آرام و عشرت حاصل کرتی ہیں۔

نہیں حضور! آپ کی نوازش ہے جو ایسا خیال کرتے ہیں ورنہ میں اس لائق ہرگز نہیں۔

نواب صاحب! ان کی شکل آپ کی عزیزہ سے کس قدر ملتی جلتی ہے محترمہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کا فوٹو لے لیں۔ یہ میرے دوست ہیں اور ان کی ایک نہایت عزیز رشتہ دار ہو بہو آپ کی ہم شکل تھیں جو اپنے ماں باپ کے ساتھ افریقہ چلی گئی ہیں اور تصویر کھنچوانا پسند نہیں کرتیں۔ یہ انہیں دیکھنے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ آپ کی نوازش ہوگی تو یہ مرحلہ طے ہو جائے گا۔ "بنا نہیں ہے" جو معاوضہ آپ چاہیں ہم دینے کو تیار ہیں۔

نجمہ کی امیدیں خاک میں مل گئیں دل میں کہنے لگی اوہ..... اب میں سمجھی کہ یہ کس لئے مجھے تکتے ہیں۔ آہ میں کس قدر مغالطے میں تھی۔ اُف!! اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ دل کو سنبھال کر جواب دیا کہ حضور معاف فرمائیے گا۔ میں نے اپنی تصویر نہ بنانے کا عہد کیا ہے۔ میں مجبور ہوں۔

خورشید سب باتیں غور سے سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ باتیں تو بالکل کملا کی طرح کرتی ہے۔ وہی طرز کلام وہی لہجہ ہے۔ [illegible] تھا۔

لیکن اب نہایت لجاجت آمیز لہجہ میں کہنے لگا۔ محترم خاتون میری زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے میری خاطر اتنا ایثار کیجئے کہ اپنا عہد واپس لے کر مجھے تصویر اتارنے کی اجازت دے دیجئے۔ یہ ایثار کیا ہوا؟ کہ ایسے کچے عہد

تمہارے دل میں کیوں کر ڈال دوں کی تمنا کو

بجنہ کی زبان رک گئی، گلا بھر آیا...... اُف.... میں بھی آپ سے
کم بدنصیب اور کم مصیبت زدہ نہیں ہوں...... خورشید.... خورشید
.... میرے لئے دو غم ہیں کہ جسے میں چاہتی ہوں وہ دوسرے کا ہو چکا
ہے.... آہ..... بجنہ بعینہ یہی حال میرا بھی ہے۔ خورشید نے کہا۔
..... بجنہ بجنہ... سنو.... میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ جیسے ناکارہ انسان
سے محبت کرتی ہیں...... میں نے آپ کی وہ باتیں بھی سن لی ہیں جو سمسل
سمندر پر اُس رات کو آپ خود بخود کر رہی تھیں۔ مجھے ندامت ہے
کہ مجھ جیسے معمولی شخص کی اتنی قدر و منزلت آپ کے نازک دل میں ہے۔
مگر مہربان بجنہ خدا کے لئے مجھے اور نیچا گرانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے
اپنی ملک کا وفادار رہنے دو۔ (اُس کی سانس پھول جاتی ہے) میں آپ سے
درخواست کرتا ہوں کہ اس پُرخطر راستے سے بچیں..... ورنہ کہیں کی نہ رہیں گی
آپ کی باتیں کلیجہ شق کئے دیتی ہیں.... میں اس درد سے آشنا ہوں مگر آہ
خدا کے لئے مجھ سے کبھی نہ ملئے۔ مجھے آپ کی تصویر ہرگز نہ چاہئے
نہیں.... خدا کے لئے مجھے اپنا چہرہ بھی کبھی نہ دکھائیے......
اور مجھے بھول جائیے، مجھے جانے دیجئے اُف اُف! سر کو تھامے ہوئے
لڑکھڑاتا ہوا خورشید مرزا تیز رفتاری سے جا کر موٹر میں بیٹھ گیا اور بجنہ کو
لئے بغیر خود موٹر چلا کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ بجنہ دل کو تھام
کر رہ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا...... اُف آج اُس نے
میری کتنی بے عزتی کی ہے۔ خیر۔ مجھے اُس سے محبت ہے۔ اور میری
محبت ضرور رنگ لائے گی۔ خورشید! میرا دل کہتا ہے کہ ایک بار تو میرے ہی لئے
تڑپے گا۔ اس کے قدموں کے نشانوں کی مٹی ہاتھ میں لے کر۔ قسم کھاتے ہوئے
۔۔ یاد رکھو میں تجھے کبھی نیچا نہ گراؤں گی میری محبت مادیت پر مبنی نہیں وہ ایک
روحانی کیف ہے.... تیرے سوا کسی شخص پاک کی قسم تجھ سے الگ تنہا میں شادی
نہ کروں گی۔ تڑپے گی اور مر جائیگی اور اپنی بے لوث محبت کا نشتر تیرے دل پر
جما جائیگی.... خاک اُس نے منہ پر مل لی۔

× × × ۱۵ × × ×

آہ کن کن مشکلوں سے دل کو سمجھایا تھا۔ مگر بجنہ کی شباہت نے
پھر تباہ کر دیا۔ کملا..... کملا.... سات سال ہو گئے۔ چپہ چپہ ڈھونڈ
ڈالا۔ تیرا پتہ نہ ملا۔ اب یارائے صبر نہیں۔ ضبط کا بند ٹوٹا جا رہا ہے
اب تو اس بے مزہ زندگی سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ اُسی جھیل میں
ڈوب کر مر رہوں گا جہاں آج سے سات سال پیشتر میرا صبر و سکون دل
خوشی و مسرت، بے فکری و مستی، عیش و عشرت، صبر و قرار غرق ہو چکے
ہیں..... پرسوں پورے سات سال ہوتے ہیں۔ دن بھی وہی
ہے۔ بس اُسی دن اس زندگی سے ہاتھ دھو کر روح کو قفس عنصری
سے نجات دلا دوں گا۔ میں اس جسم کثیف کے ساتھ تجھے نہ ڈھونڈھ
سکا۔ چونکہ تو لطیف تھی جنت کی حور تھی۔ پیاری کملا میری روح
تجھے ضرور ڈھونڈھ لے گی۔ اور تیرے ارد گرد رہے گی ——

مسٹر تاج آفریدی
پرنٹر پبلشر نے اجمل پریس بمبئی نمبر ۳ سے
چھپوا کر دفتر رسالہ "تنویر" تھرڈ سانکلی اسٹریٹ
بمبئی نمبر ۸ سے شائع کیا

کر دو تو تنا بھی جا سکے" آپ کی خاطر توڑ دوں! میں مجبور ہوں" کہہ کر نجمہ نے تصویر کو درست کرنا شروع کر دیا۔

نواب صاحب تم خود نجمہ کو دیکھتے ہوئے "جہاں پناہ صاحب پانی کی طرف چلے گئے"..... خورشید نجمہ کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا..... نجمہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ بھی نیچے اُتر کر بیٹھ گئی۔ جذبات اُلفت اُسے بے قابو کئے دیتے تھے مگر اپنی پوری طاقت سے انھیں دبائے ہوئے اس امر کی کوشش کر رہی تھی کہ خورشید نہ دیکھ لے۔ آنکھیں وہ اٹھاتی ہی نہ تھی کہ کہیں نظریں افسانۂ دل نہ کہہ دیں۔ وہ خورشید کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ مگر حیا اُسے روکتی تھی ہاں ایک یہ خیال اُس کے لئے سوہان روح تھا کہ خورشید کسی اور کو چاہتا ہے وہ اس سے قطعی بے خبر تھی کہ وہ اُسی کے خیال کی پرستش کرتا ہے، اُسی کو چاہتا ہے اُسی کی خاطر تباہ ہو رہا ہے۔ .....

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی ہاتھوں سے تصویر کو چھیڑ رہی تھی مگر دل میں سوچتی جاتی تھی کیسی خوش قسمت ہے وہ ہستی جسے خورشید کی محبت حاصل ہے۔ آہ مجھے تو محض اس کی تصویر حاصل کرنے کے لئے ایک کھلونا بنایا جا رہا ہے۔ خوشی و مسرت اندوہ و غم۔ وفور رشک کے جذبات سے اس کے جسم پر ایک خفیف سی لرزش تھی۔ چہرہ پر بشاشت کے آثار پیدا کرنا چاہتی تھی مگر کوشش ناکام ہو جاتی تھی اور چہرہ مضمحل اور بے چینی کے آثار ہویدا تھے۔ آخر طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے خورشید مرزا نے کہا..... مجھ پر احسان کرو اور اپنے حالات زندگی سے آگاہ کرو۔ میں بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں نجمہ! شاید جو بوجھ میرے دل پر ہے اُسے تم کچھ ہلکا کر سکو۔ "میرے حالات زندگی نہایت سیدھے سادے ہیں" نجمہ بولی۔ اور پریشان ہو کر رومال سے پسینہ کو صاف کرنے لگی۔ چاند جیسی پیشانی پر بالوں کا گچھا ہٹتے ہی ایک طرف چوٹ کا داغ خورشید کو نظر پڑا۔ دفعۃً اُسے یاد آیا کہ لالہ جب جھیل کی طرف دوڑی تھی۔ تو میرے پکڑنے سے پہلے ایک پتھر پر گر چکی تھی اور بہت سا خون نکلا تھا اور جب گئی ہے تو داغ ماتھے پر موجود تھا۔ مگر اُس نے پوچھا کہ یہ داغ کیسا ہے..... حیرت ہے کہ یہ داغ بھی آپ کے ماتھے پر! اگر کسی قدر برا معلوم ہوتا ہے

نجمہ نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا "معلوم نہیں میری والدہ کہتی تھیں بچپن میں کھیلتے ہوئے چوٹ لگ گئی تھی۔"

نجمہ جو بات منہ سے نکالتی تھی کچھ ایسے لہجے میں نکلتی تھی کہ یقین کرنا ہی پڑتا تھا۔ اب تو خورشید کو یقین ہو گیا کہ اتفاقی امر ہے کہ داغ اور صورت شکل و عادات و اطوار لالہ سے ملتے جلتے ہیں ورنہ یہ لالہ نہیں ہے۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ اسے اپنے گھر لیجائے اور اپنی محبوبہ کی ہمشکل کی پرستش کرے ...... لیکن وفا اور غیرت کا تقاضہ یہ تھا کہ خواہ کتنی ہی ہمشکل و ہم صفت کیوں نہ ہو اُس کے پاس بیٹھنا اور اُس سے باتیں کرنا بھی وہ اپنے کیرکٹر کی کمزوری محسوس کرتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور جلدی سے جانے لگا لیکن نجمہ نے اس کے دامن کو پکڑ کر کہا۔

"کیا آپ تصویر بننے پر پشیمان ہو گئے؟" "نہیں" خورشید نے جواب دیا "اچھا یہ تو بتلائیے کہ آپ جس کی خاطر میری تصویر چاہتے ہیں وہ کون خوش نصیب ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ کو اُس سے محبت ہے....." "ہاں" "مگر" نجمہ اصرار کر رہا تھا۔ منہ پھیرے ہوئے خورشید نے کہا..... آپ تصویر کیا کریں گی۔ جب کہ میں آپ کی محبوبہ کی ہمشکل ہوں آپ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، مایوسی اور نا اُمیدی کے دریا میں غوطہ زن ہو کر نجمہ بولی..... تھوڑی دیر کے لئے محبت نے حیا پر فتح پائی۔ خورشید نے یہ سن کر بے اختیار نجمہ کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں وہ نجمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں..... "نجمہ! میرا دل نہیں چاہتا کہ میں تمہیں خیال کی حسین ملکہ کے سوا کسی کو دیکھوں..... میں دل سے تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم میری معصوم لالہ کی ہمشکل ہو..... کہتے ہوئے اُس نے نظریں نیچی کر لیں۔ "تب تصویر کیسے دیکھو گے؟ یہ کیا بے معنی گفتگو ہے؟" خورشید مرزا..... کاش آپ میرے دل کی حالت سے واقف ہو سکتا

اُف! زبان اظہار سے قاصر طبیعت ضبط سے عاجز

آس

از جناب سردار محمد صاحب ثاقب

دس برس ہو گئے۔ حکومت نے اس کے اکلوتے بیٹے کو فوج میں بھرتی کر کے محاذ جنگ پر بھیج دیا تھا ــــ اس کے بعد آج تک کوئی خبر نہ مل سکی کہ وہ کہاں ہے۔ لڑائی ابھی تک جاری ہے۔ غریب ماں دن بھر دروازے میں کھڑی اس کی راہ تکتی ہے، مگر وہ نہیں آتا۔ رات کو جب تمام دنیا پر سکوت کی فرماں روائی ہوتی ہے۔ اس کا دل کسی آہٹ کا منتظر رہتا ہے۔ مگر کوئی نہیں آتا۔ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے۔ مگر اس کا نسیم نہیں آتا۔ موسم آتے ہیں۔ موسم جاتے ہیں اور اپنے مقررہ وقت پر لوٹ آتے ہیں۔ مگر نسیم جا کر واپس نہیں آیا۔

اسی طرح اس کے منتظر دل میں اس کے اندر آس کی جھلک نمایاں ہے جیسے نرگس ہمیشہ سورج کی طرف تکتی ہے اسی طرح اس کی آنکھیں ہر وقت اس کی تصویر بنی رہتی ہیں۔

جیسے ندی ہر حال میں سمندر کی اوٹ بہتی ہے۔ اسی لئے اس کے دل میں بار بار خیالات کی موج پیدا ہو کر اس ساحل پر پہنچتی ہے اور اس سے ہمکنار ہو کر اسی میں جذب ہو جاتی ہے۔

آس !........ اُمید !!ــ..... انتظار.. ......

ایک مدت .... بارہ برس !!!

کیا آس کو انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق ہے ؟

جیسے ٹھنڈی راکھ میں اب بھی کوئی چنگاری دبی پڑی ہو۔ اور اپنے بجھتے ہوئے دل میں ایک دفعہ پھر بھڑک کر روشنی دینے کی تمنا لئے ہو۔ ایسے ہی وہ سوختہ تقدیر گھر کے ایک غیر مانوس گوشے میں بیٹھی کسی خیال میں کھوئی رہتی ہے۔ انقلاب زمانہ نے اس کی زندگی کو مشکلوں کا شکار کر دیا ہے۔ مگر اس کا بجھتا ہوا دل ایک دفعہ پھر بھڑک اٹھنے کے لئے بیتاب ہے۔ زمانے نے اسے ٹھکرا دیا ہے۔ ہاں وہ سماج کی اسیر ہے۔ تاہم اس کے شکستہ دل میں امید کی اب بھی ایک ہلکی سی کرن چمک رہی ہے۔ جو شاید کبھی ان بڑھتے ہوئے جہالت کی تاریکی پر چھا جائے۔ وہ اسی آس پر زندہ ہے ماں یہی آس اس کی زندگی کا راز ہے۔

جیسے اندھیری رات اپنی سیاہی میں روشنی کی تمنا چھپائے ہو

نصف الملاقات

مجھے افسوس ہے کہ اس بار کئی وجوہ سے نصف الملاقات کا صفحہ نہیں دیا جا سکا۔

انشاء اللہ تعالیٰ ماہ آئندہ سے آپ یہ صفحہ ضرور تنویر میں موجود پائیں گے۔

مسز ڈاکٹر شروانی صاحبہ ۔ سیدہ مظہر صاحبہ ۔ زیب عثمانیہ صاحبہ ۔ حسینی علی مرزا صاحب اور کئی بھائیوں اور بہنوں کے خطوط کے جوابات دونوں صفحوں میں دیئے جائیں گے۔ تاکہ اس مرتبہ کی بھی تلافی ہو جائے۔

ــ سحر

رنجیت موویٹون کی لاثانی پیشکش
۱۳
تیرہواں ہفتہ
اداکار :-
مادھوری۔ موتی لال۔ خورشید
ایشور لال۔ ڈیکشٹ
عوزی وغیرہ
شادی
اوقات روزانہ
۴۔ ۷۔ ۱۰ بجے شبکو، سینچر
اتوار اور تہوار کے دن ۱ بجے زائد شو
رائل اوپیرا ہاؤس

لمعات

ماہ صیام

روزہ دین اسلام کا ایک رُکن ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے اس کا مقصد انسان کو انسانیت کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچا دینا ہے۔ روزے سے انسان اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کرتا ہے۔ صرف بھوکا پیاسا رہنے کا نام روزہ نہیں ہے۔ جب ہم روزہ رکھتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو خدا سے بہت قریب پاتے ہیں اور ایک پاکیزہ ماحول اپنی ہستی کے ذرّے ذرّے پر چھایا ہوا پاتے ہیں۔ یہ پاکیزہ ماحول ہمیں برائیوں سے بچائے رکھتا ہے۔ چونکہ نیکی سے نیکی پھیلتی ہے اور بدی سے بدی پھیلتی ہے۔ روزہ دار ہونے کی حیثیت سے ہم بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں۔ اور اس طرح بدی خود اپنی موت مر جاتی ہے۔ روزے میں ہم خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ جس سے ہماری روح قوی ہوتی ہے اور نفس پر فتح حاصل کر لیتی ہے۔ نفس امّارہ کی خواہشیں سر نہیں اٹھا سکتیں۔

روزے میں ہم بھوکے پیاسے رہتے ہیں۔ جس سے ہمیں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ربوبیت اور مہربانی ہم پر منکشف ہوتی ہے۔ اُس کی لاانتہا نوازشیں اور کرم و لطف و عنایات کا احساس کر کے ہم اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور وہ خوف ”جو رہنمایانِ دین نے ہمارے دلوں میں اس منبعِ رحم و کرم کی طرف سے پیدا کر دیا تھا اور خود خدا و بندوں کے درمیان حدِ فاصل بن گئے تھے، دُور ہو جاتا ہے خوف دور ہونے پر ہم خدا سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کے غریب نادار بندوں کی تکالیف کا احساس کر کے ان کی مدد کے لئے طیار ہو جاتے ہیں۔ جس سے انسانی ہمدردی کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ جو ہر مذہب کی جان ہے۔

روزے سے انسان کی جسمانی صحت بھی سُدھر جاتی ہے۔

غرضکہ روزہ انسان کی دنیا اور دین دونوں کو سنوارتا ہے۔ مگر افسوس کی جا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی عبادتوں کی اصل روح کو کھو دیا ہے وہ مذہبی احکام کو صرف رسماً ادا کرتے رہے ہیں۔ اور اس لئے عبادت کی غرض و غایت پوری نہیں ہوتی، یہی سبب ہے کہ کلمہ طیبّہ پڑھتے ہوئے بھی مسلمان مشرک ہیں، وہ ذاتی اغراض کے لئے مکّار انسانوں کے سامنے اُن کا سر جھکتا ہے۔ خودداری و خود اعتمادی کی روح ان میں سے جاتی رہی۔ موجودہ پستی اُن کی مذہبی غلط روی کا بیّن ثبوت ہے۔ روزہ رکھتے ہوئے بھی وہ محبتِ الٰہی، انسانی ہمدردی اور پاکیزگی نفس سے محروم ہیں۔ اپنی انفرادی زندگی کے آرام کی خاطر اپنے ہی بھائی مسلمان کی مصیبت کے موقعہ پر مُنہ سے اُف تک نہیں کر سکتے کہ مبادا ہمیں کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔ آگے تھے اتحادِ انسانی کرنے یہاں اسلامی اتحاد بھی پارہ پارہ ہو چکا ہے مگر ہم ٹس سے مَس نہیں ہوتے۔

طُرفہ تماشا یہ کہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں۔ مگر یہ عبادتیں ہمیں زندہ اور سچے انسان نہیں بنا سکتیں یہی ایک سب سے بڑی چوٹ باطل کی طرف سے اسلام پر کی گئی ہے کہ اسلام کی آخری حربہ عبادتوں کی رُوح ان میں سے چھین کر ان کی لاشیں ہمارے حوالے کر دی گئیں کہ تم ان میں اُلجھے رہو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔

چنانچہ آج کل روزہ اس چیز کا نام رہ گیا ہے کہ سحری کو اُٹھ کر باسی یا تازہ سالن روٹی یا اور کسی قسم کی غذا سے پیٹ کو خوب ٹھونس کر بھر لیا جائے منشیات کے عادی انسان اس وقت بھی از قسم سگریٹ، بیڑی، حقہ تمباکو چائے کے استعمال سے باز نہیں رہتے۔ اور دن بھر ان مضرِ صحت چیزوں

کی محرومی کے خوف سے پوری مقدار میں اسی وقت استعمال کر لیتے ہیں۔
سحری کھا کر بجائے عبادت کے پھر سو رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھانا سینہ
پر کھار رہتا ہے اور کھٹی ڈکاروں کی وجہ سے طبیعت بدمزہ ہوتی ہے۔ صحت
بگڑتی ہے، مزاج بگڑتا ہے۔ جب دیکھو ہر ایک سے لڑنے کو تیار، مار پیٹ
بد زبانی۔ غرضکہ کوئی فعل ایسا نہیں ہوتا جو تہذیب نفس اور روزے کی غرض
و غایت کو پیدا کرتا ہو۔ بلکہ ہر بات مرضیٔ الٰہی کے برعکس ہوتی ہے۔ مسلمانوں
کو چاہیئے کہ وہ اپنی حالت پر غور و فکر کریں کیونکہ یہ ماہ مبارک غور و فکر
کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ کاش مسلمان آنکھیں کھولیں اور
اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں ورنہ وہ دن دور نہیں کہ ہمیشہ کیلئے
صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔

عید اور دیوالی

کئی سال سے دیوالی اور عید ساتھ ساتھ آ رہی ہیں اس
سرزمین ہند کے رہنے والوں کو اتحاد و محبت کا پیغام سنا رہی ہیں
ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان بحیثیت ہندوستانی وہ
ایک دوسرے کی قسمت کے ساتھی ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو
ایک دوسرے کے لئے قابل اعتماد بنائیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد
کریں۔ اپنے حقوق سے بڑھ کر ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت
کریں اور مادر وطن کو غیر اقوام کی قید و غلامی سے آزاد کرائیں اُس وقت
سچے معنوں میں عید "عید" اور دیوالی "دیوالی" ہوگی۔

آج ہم خوشی کس طرح منا سکتے ہیں۔ جب کہ ہمارے دیس
میں جہالت، افلاس، ناسمجھی، پست ہمتی، بد دیانتی، بیروزگاری
بیماریوں، باہمی لڑائی جھگڑوں نے قدم جما رکھے ہیں۔ ایک دن کی
خوشی منانے کی قیمت ہمیں برسوں کی فکر و فاقے کی صورت میں ادا
کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے ملک میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ ہمارے اصول
زندگی دینی و دنیوی طور پر کسی سے کم نہیں پھر بھی ہم غلام ہیں اور
غلامی کی بدولت ہر قسم کی نکبتوں اور فلاکتوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے
اس لئے سب سے پہلے اس ملک کے رہنے والوں کو اس
غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار دینا ہوگا۔ دیوالی اور عید تو
گلے مل چکیں۔ اب ہندو مسلم بھی گلے مل لیں۔ تو حقیقت میں دونوں
کے لئے عید اور دیوالی کی برکتیں اور خوشیاں آسمان سے نازل
ہوں گی۔

مسٹر ایمری

وزیر ہند نے گزشتہ دنوں امریکہ والوں کو ہندوستان
کے متعلق مطمئن کرنے کیلئے ایک پروگرام براڈ کاسٹ کیا ہے۔ جس میں
آپ نے جج گریفتھس کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ
"انگلستان ہندوستان سے کسی قسم کا ٹیکس نہیں لیتا ہے اور
ہندوستان کی تمام آمدنی اسی کی بھلائی اور تحفظ پر صرف کر دی
جاتی ہے۔ بلکہ برطانیہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے لاکھوں
روپیہ اسے دیتا ہے"

اب سوال یہ ہے کہ اگر واقعی برطانیہ ہندوستان سے کچھ
نہیں لیتا بلکہ اس پر خود اپنا روپیہ خرچ کرتا ہے تو اس سوال کا کیا
جواب ہے کہ ہمارے ملک کی زمین جو سونا اگلتی ہے اور جو دنیا کا
سب سے زیادہ زرخیز ملک ہونے کی وجہ سے "سونے کی چڑیا" کہلاتا ہے اس ملک
کا کروڑوں ٹن اناج یہاں کی سرسبز چراگاہوں میں چرنے والی لاکھوں
کروڑوں گائیں، بھینسوں کا دودھ، مکھن، یہاں کے پھل اور
میوے اور دیگر قسم کی پیداوار کہاں جاتی ہے؟ ہم لوگوں کی صحت اور عمر
اور اوسط آمدنی، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہمارے ملک کی پیداوار کی
نعمتیں ہمارے مصرف اور استعمال میں نہیں آتیں اور ہم ان سے

محروم ہیں۔ پھر آخر یہ کس کے مصرف میں آتی ہیں؟ اور کہاں چلی جاتی ہیں؟ اور ڈیڑھ سو سال سے جو آپ ہندوستان پر قابض ہیں اور اس کے حق میں بھلائی کرتے چلے آرہے ہیں اس بھلائی کے نمونے ہیں تو یہی دکھائی دیتے ہیں اور مسٹر امری اور امریکہ والوں کو ہمارا چیلنج ہے کہ سرکاری طور پر نہیں بلکہ پرائیویٹ طور پر آپ آئیے تاکہ ہم آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپکو ہندوستان کی اصلی حالت آپکو دکھائیں اس وقت آپ دیکھیں گے اور مان لیں گے کہ ہمارا ملک ننگا، بھوکا ہوگیا ہے۔ چھ چھ برس کے معصوم بچے جنکی عمر تحصیل علم اور کھیل کود میں صرف ہونا چاہئے تاکہ انھیں روحانی اور جسمانی بالیدگی حاصل ہو۔ آج آپ کی حکومت میں پیٹ بھرنے کی فکر میں سرگرداں ہیں اور یا تو مزدوری محنت کرتے ہیں یا خوانچہ لگانے پھرتے ہیں یا پھر بھوک سے تنگ آکر چوریاں کرتے یا خودداری کو بیچ کر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ اس پر بھی ان کی جائز ضروریات پوری نہیں ہوتیں سو انھیں ناکافی اور خراب و خستہ پہنچا یئں گے۔ غذا کی کمی کی وجہ سے اُن کی پسلیاں گن سکیں گے ——— آپ کے ہندوستان میں آنے سے پہلے جو ہماری اوسط عمر تھی اب اس کی نصف رہ گئی ہے۔ بیماریاں بڑھ گئی ہیں۔ آپ کی تجارت کے طفیل ہمارے بچے چشمے لگائے پھرتے ہیں ستر فیصدی ہندوستانیوں کے دانت ناقص ہیں تفکرات نے یہاں کے نوجوانوں کو بوڑھا کر دیا ہے۔ ان کے سر میں سفید بالوں کی کھچڑی پائی جاتی۔ جب کہ پہلے یہاں سفید بال کو "پیغام مرگ" کہا جاتا تھا۔

دن بدن ہندوستانیوں کے قد و قامت اور جسم گھٹتے چلے جاتے ہیں روحیں بھی کچلی جا چکی ہیں۔ نہ اخلاق درست ہے نہ چال چلن۔ دماغ اور سمجھ بوجھ، تحمل و بردباری سب ہی رخصت ہو چکے، دوست و دشمن میں تمیز نہ رہی نیکی و بدی کا مفہوم ہی بدل گیا۔ ایک ایک گھر دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے جس کی بنیاد صرف تنگدستی اور مفلسی ہے۔ قومی تنزل کا مرض ایسا لاعلاج ہو چلا ہے کہ طبیبوں کے چھکے چھوٹ گئے ہیں۔ مذہب کی طاقت بھی آپ نے سلب کر لی ہے جو کہ ہمارا آخری سہارا تھا اب تو آپ کا فرمان ہی مذہب سمجھا جاتا ہے اور جو بات آپ کے عیش و عشرت میں مخل ہو وہ دنیا کے تمام مذہبوں کے خلاف مانی جاتی ہے۔ تعلیم بالکل صفر کے برابر ہے اور جو برائے نام ہے بھی تو اس قدر ناقص کہ زندگی تباہ اور قدرتی طاقتوں کو بھی مفلوج کر دیتی ہے چنانچہ آج ایک ڈاکو، ظالم اور جاہل تو کسی طرح اپنا پیٹ بھر لیتا ہے مگر بی۔اے اور ایم۔اے پاس کو سوائے خودکشی کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں دکھائی دیتا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ اگر کوئی اور بھلائی آپنے ہندوستانیوں کے ساتھ کی ہو اور ہم لکھنا بھول گئے ہوں تو آپ یاد دلا دیجئے! اگر آپ درحقیقت ہندوستان سے کوئی بھلائی کرنا چاہتے ہیں تو ایک بات ہمیں بھی بتا دیجئے۔ وہ یہ کہ کیا کوئلہ اور برف سے کوئی ایسی کیمیاوی غذا طیار ہو سکتی ہے جو ہم ہندوستانیوں کے سوکھے مرجھائے جسموں کو تر و تازہ کر دے۔ چونکہ ہندوستان کے مقابلہ میں آپکے ملک میں پیداوار کچھ بھی نہیں ہے۔ جغرافیہ کہتا ہے کہ آپکے یہاں کوئلہ اور برف کے سوائے کچھ نہیں ہے اس پر بھی آپکے یہاں کے انسان چھ چھ فٹ لمبے، اُن کی اوسط عمر اسی سال اور ان کے جسم بھی خوب مضبوط اور تر و تازہ ہیں۔ روحانی طاقت کا سوال نہیں جسمانی طور پر آپ اپنے ملک کے سب سے بڑے آدمی مسٹر چرچل کو لے آئیں اور ہمارے ملک کے سب سے بڑے آدمی مہاتما گاندھی کو لے لیجئے اور وزن کر کے دیکھئے کہ کوئلہ کی پیداوار اور خالص دودھ مکھن کی پیداوار میں کتنا فرق ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ جس ملک میں دودھ، گھی کی ندیاں بہتی ہیں وہاں کے آدمیوں کی تو پسلیاں گنی جا سکتی ہیں۔ ہڈیوں کی بالیدگی کا یہ عالم ہو کہ اگر تھوڑے دن آپ اسی طرح ہماری بھلائی کی زحمت اور اٹھاتے رہے۔ تو ہم مکھی و مچھر، یا بر اور ان کی اولاد بالشتیہ بن کر رہ جائینگی۔ اور انڈیا لٹل [illegible] بنجائے گا اور آپ جیسے ملک ہی کچھ نہ کر سکا [illegible] ہندوستان سے آپ کچھ لیتے نہیں ہر بات میں یعنی آرام، عیش، طاقت، صحت، تعلیم میں ہم سے زیادہ ہیں اس کچھ نہ کچھ تو کہیں بھی تو جانے سے (مدیر)

اعلان ضروری

خریداران تنویر توجہ فرمائیں

اُمید کہ منذجہ ذیل خریداران تنویر اس ماہ میں بنام حاجب الاداچندہ بذریعہ منی آرڈر برمحبت فرما کر ادارہ کو شکر گزاری کا موقع عطا فرمائیں گے۔ اور اپنے تنویر کی جائز اخلاقی مدد سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ چندہ کے لئے فرداً فرداً لکھنا یا وی پی کرنا اس زمانہ میں ادارہ کے لئے سخت مشکلات اور نقصان کا باعث ہوگا

اُمید کہ تنویر کے ہمدرد خریدار رسالہ کی سہولت اور مفاد کا خیال رکھتے ہوئے رقم چندہ مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

نمبر خریداری	نام	چندہ ختم ہونے کی تاریخ
۲۰۹	مسز سید صابر علی صاحب	ستمبر ۱۹۴۰ء
۲۱۱	لفٹنٹ سلطان عالم خان صاحب (قاضی گنج)	" "
۲۱۴	مسز قاضی سراج الدین صاحب (قلم)	مارچ "
۲۳۸	تنویر جہاں بیگم (میرٹھ)	ستمبر "
۲۴۴	مسز حاجی اسمٰعیل سیٹھ صاحب (کلکتہ)	دسمبر "
۱۰۴۷	مسٹر حیات صاحب (لکھنؤ)	ستمبر "
۵۴۵	مسز یو آر آدم سیٹھ (کالی کٹ)	دسمبر "
۷۷۲	صدیقہ بیگم صاحبہ (بمبئی)	ستمبر ۱۹۳۹ء
۷۸۵	محمد اللہ پاشا (گوبر...)	مئی ۱۹۴۲ء
۷۹۴	رضیہ بیگم صاحبہ حیدرآباد دکن	جون "
۷۹۵	بیگم صاحبہ عزیز احمد صاحب گورکھپور	جون "
۱۰۰۲	مسز فاروقی صاحبہ (جموں)	جولائی "
۱۰۰۲	عبدالحق صاحب نئی دہلی	مارچ ۱۹۴۲ء
۱۰۰۴	محمد یوسف صاحب (سکندرآباد)	ستمبر ۱۹۴۰ء
۱۰۰۹	ڈاکٹر وینکٹ چند صاحب (حیدرآباد)	جولائی ۱۹۴۱ء
۱۰۱۷	جناب این ای احمد (پٹنہ)	جولائی ۱۹۴۲ء
۱۰۵۶	جناب جعفر عبدالرحمٰن سیٹھ (ٹاکنڈ)	اکتوبر ۱۹۴۲ء
۱۱۰۵	سید انوار الحسن صاحب گورکھپور	جون ۱۹۴۰ء
۱۱۰۷	مس سید افتخار حسین صاحب (حیدرآباد)	" "
۱۱۰۸	ہیڈ مسٹریس صاحبہ محمودیہ نسواں اسکول (ڈاگر)	اگست ۱۹۳۹ء
۱۱۰۹	مسز محمد ابراہیم سیٹھ (بنگلور)	جون ۱۹۴۰ء
۱۱۲۴	بیگم ظل الرحمٰن صاحب (کانپور)	فروری ۱۹۴۱ء
۱۱۳۲	جناب غلام حبیب صاحب (ناندیڑ)	مارچ ۱۹۴۱ء
۱۱۳۳	غلام محمد یعقوب صاحب (ناندیڑ)	" "
۱۱۳۵	محترمہ رضیہ عثمان صاحب (بدایوں)	" "
۱۱۳۶	مولوی چاند صاحب (ناندیڑ)	اپریل ۱۹۴۱ء
۱۱۳۸	مسز مسیح الدین صاحبہ (پوسٹ)	جون ۱۹۴۱ء
۱۱۴۹	مس خالدہ جمیل صاحبہ (الٰہ آباد)	مئی ۱۹۴۱ء
۱۱۵۰	محترمہ رفیعہ صاحبہ (میرپور پنجاب)	جون ۱۹۴۱ء
۱۱۵۱	محترمہ منیرہ قریشی صاحبہ احمد آباد	جولائی ۱۹۴۱ء
۱۱۲۲	مس زبیدہ احمد (بنگلور)	نومبر ۱۹۴۰ء
۱۰۶۶	مس تصدق فاطمہ صاحبہ (حیدرآباد دکن)	جنوری ۱۹۴۰ء
۱۰۶۹	مسز رحمت اللہ صاحبہ (کریم آباد)	دسمبر ۱۹۳۹ء
۱۰۷۷	محترمہ سرور سلطان صاحبہ (گونڈہ)	فروری ۱۹۴۲ء

بقیہ برصفحہ ۴۲

پربھات کا جدید ترین شاہکار
سکھو بائی
ساس بہو کی کشمکش کا دلچسپ ترین مرقع
(۱) گھیدی ایک کامیاب ترین ساس
(۲) ہنسا ایک شگفتہ بہو
(۳) گلکارنی ایک ڈھلمل یقین شوہر
ہدایات
داملے
فتح لال
اور
راجہ نینے
اداکاران
ہنسا واڈکر
گوری
گلکارنی وغیرہ
نمائش کار:-
فیمس پکچرز لمیٹڈ
سنٹرل سینما
روزانہ ۱۰-۷ بجے
سنیچر، اتوار اور تعطیل کے دن
۴ اور ۱۰ بجے

Film News تازہ فلمی خبریں

رنجیت فلم کمپنی: "شادی" نہایت کامیابی سے چل رہا ہے آئندہ آنے والی فلم "سسرال" ہوگی اور اس کے بعد "ڈھنڈورہ"۔
چارلی مشہور مزاحیہ اداکار نے "ڈھنڈورہ" کو خود ہی ڈائرکٹ کیا ہے اور اس میں کام بھی کیا ہے۔ کمپنی میں دو تصاویر اور تیار ہو رہی ہیں جن کے نام "سبیتی" اور "چاندنی" منتخب کئے گئے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ مشہور ڈائرکٹر و مکالمہ نویس مسٹر کیدار شرما بھی رنجیت میں شریک ہو گئے ہیں۔

واڈیا موی ٹون: ۱۰ اکتوبر کو میٹرو سینما میں واڈیا کی انگریزی فلم "دی کورٹ ڈانسر" پیش کر دی گئی یہ پہلی ہندوستانی انگریزی فلم ہے لوگوں نے اسے بہت پسند کیا ہے

نیشنل اسٹوڈیوز: اسٹوڈیو میں کئی تصاویر بیک وقت نمائش کے لئے تیار ہیں جس میں سے "کسوٹی" ۱۸ اکتوبر کو نمائش کے لئے پیش کر دی جائیگی۔ کسوٹی میں مس معنز نے نہایت اعلیٰ اداکاری پیش کی ہے اس کے بعد "نردوش" "نئی زندگی" "غریب" اور "بدوٹی" پیش کی جائیگی۔ "بدوٹی" کو مسٹر محبوب نے ڈائرکٹ کیا ہے اس میں شیخ مختار اور ستارہ نے کام کیا ہے۔

منروا موی ٹون: سہراب مودی کے تازہ ترین شاہکار "سکندر" نے جو شہرے کے تہوار پر بیک وقت تین سینما میں ریلیز کیا گیا تھا۔ پبلک میں دھوم مچا دی ہے اور سب لوگوں نے اسے بہت پسند کیا ہے۔ اب کمپنی کوئی سوشیل تصویر تیار کریگی۔

پرکاش پکچرز: "اکیلا" کے بعد منگلش ٹاکیز میں کمپنی کی تیار شدہ تصویر "درشن" پیش کی جائے گی۔ درشن نے شمالی ہندوستان میں کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اس کے بعد ڈائرکٹر وجے بھٹ اپنی تصویر "بھرت ملاپ" پیش کریں گے۔ اس میں درگا کھوٹے اور چندر موہن کام کرتے ہیں۔ یہ تصویر دو زبانوں یعنی ہندی مرہٹی میں تیار کی جائے گی۔

پربھات پکچرز: کی تازہ نیم مذہبی تصویر "سنت سکھو" نمائش کے لئے پیش کر دی گئی ہے۔ سنٹرل ٹاکیز بمبئی پر لوگوں کا ہجوم تصویر کی مقبولیت کو ظاہر کرتا ہے۔ کمپنی کی آنیوالی تصویر "کالیداس" یا "رام شاستری" ہوگی۔ سنا گیا ہے کہ مشہور ڈائرکٹر مسٹر فتا لال نے پربھات کمپنی سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔

چترا پروڈکشن: "تماشگی" نہایت مقبول ہوا ہے اور لیلا چٹنس کی اداکاری اور رقص کو عوام نے بہت پسند کیا ہے۔

فضلی برادرس لمیٹڈ: "معصوم" قریب الاختتام ہے اور عنقریب نمائش کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد کمپنی "مجھدہگی" اور اس کے بعد "سہراب رستم" فلمانے کا خیال رکھتی ہے

بمبئی ٹاکیز: ۲۷ ستمبر کو کمپنی کا تازہ ترین شاہکار "انجان" ناولٹی سینما میں پیش کر دیا گیا ہے اس میں دیویکا رانی اور اشوک کمار کام کرتے ہیں۔

سرکو پروڈکشنز: مسٹر کاردار عنقریب "سوامی" تیار کر کے پیش کریں گے اور اس کے بعد "نئی دنیا" پیش کی جائیگی۔

تاج محل پکچرز: مسٹر منتو نے اپنی کہانی کا نام "صبح و شام" کی بجائے "نجات" کر دیا ہے مکالمے کمال امروہی نے لکھے ہیں اور کاسٹ میں بیشتر نوواردان شامل ہیں۔

✽ مبارک، اور پریتا داس گپتا ایم۔ اے خاطر ہیں

LEELA CHITNIS

See her in Chitra Production's wonderful film KANCHAN at Imperial Cinema

Cover Printed at the Lakshm Art Printing Works Sankli Street Byculla, Bombay 8

TANVIR, Bombay.

Regd No. B. 4013

حُسن کے لئے پہلی لازمی شرط

واقعی خوش نصیب وہی خاتون ہے۔ جس کو قدرت نے حوروں کی طرح حُسن دیا ہے۔ لیکن بہترین خدوخال کے علاوہ بھی ایک چیز ایسی ہے جسے حُسن میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ ہے ملائم و شفاف جلد۔ حسین چہرہ کئی دلفریب چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے لیکن ان میں سے ایک بھی اتنی اہم نہیں جتنی جلد کی حفاظت۔ اور یہی حُسن کے لئے پہلی ضروری شرط ہے اگر آپ جلد کا رکھ رکھاؤ کریں تو آپ کا حُسن بھی دلفریب ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے آپ اس چکناہٹ اور میل کو دور کریں جو مسامات میں لفافہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے صابن اور پانی کافی نہیں

آپ پانڈس کولڈ کریم لگائیے یہ مسامات میں سرایت کر کے اندر اور باہر کا تمام میل صاف کر دیتا ہے۔ ہر صبح اور رات کو چہرہ اور گردن پر کولڈ کریم لگائیے کچھ دیر رہنے دیجئے تاکہ وہ مسامات میں سرایت کر جائے۔ پھر پونچھ ڈالئے۔

دوسری بات یہ کہ دن میں اپنی جلد کی حفاظت کے لئے آپکو پانڈس وینشنگ کریم لگانا چاہئے یہ آپکے چہرے پر ایک لطیف و نازک اور بغیر چکناہٹ کے جھلی سی چڑھا دے گا جو دھوپ آندھی اور گرد و غبار سے آپ کے چہرے اور گردن کی حفاظت کرتی رہے گی۔ فوراً پانڈس کریم کا استعمال شروع کر دیجئے چند ہی ہفتوں میں آپ کا چہرہ پھول کی کلی کی طرح ملائم اور چکنا ہو جائے گا

پانڈس کریم

ماہنامہ
ہمایوں
HUMAYUN
VOL. 6
NO.
SEPTEMBER

چہرے کو حسین کس طرح بنایا جائے

اپنے چہرے کو دلکش بنانا تقریباً ہر عورت کے اختیار میں ہے۔ چہرے کے رکھ رکھاؤ کی طرف سے غفلت کرنا اپنے حسن کے ایک حصے کو دانستہ برباد کرنا ہے۔

ایک زمانے سے عورت کے حسن کو دوبالا کرنے والی متعدد چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں لیکن جب جلد ہی بھدی ہو اور اس میں دلکشی نہ ہو تو یہ تمام چیزیں بیکار ہیں۔ چکنی صاف اور ملائم جلد ہی حسن و جمال کی ضامن ہے۔

مسامات میں جو میل جمع ہوتا رہتا ہے وہی بھدے پن، مسامات کے پھیل جانے اور مہاسوں کا باعث ہوتا ہے اور خشکی اور کھردرا پن آفتاب کی تمازت اور خشک ہوا سے پیدا ہوتا ہے۔ پانڈس کے دونوں کریموں کا باقاعدہ استعمال آپکی جلد کو گلاب کی پنکھڑیا کی طرح تر و تازہ اور ملائم بنا دیگا۔ ان کریموں میں ایسے اجزا ہیں جو نہ صرف جلد کو اندر اور باہر کی طرف سے صاف کرتے ہیں بلکہ وہ جلد کو مضر اثرات سے محفوظ بھی رکھتے ہیں۔

ہر رات اور ہر صبح پانڈس کولڈ کریم کا استعمال کیجئے۔ اسے انگلیوں کے پوروں سے چہرے اور گردن پر آہستہ آہستہ ملئے، کچھ دیر لگا رہنے دیجئے تاکہ وہ مسامات میں جذب ہو کر میل کو ڈھیلا کر دے اس کے بعد پونچھ ڈالئے۔ دن کے وقت پانڈس وانشنگ کریم استعمال کیجئے۔ آپ کے چہرے اور گردن پر ایک نہایت لطیف تہہ چڑھا دیگی جو دھوپ آندھی اور گرد و غبار سے یقینی طور پر حفاظت کرے گی۔

پانڈس کریمس کا استعمال فوراً شروع کر دیجئے کچھ ہی ہفتوں میں آپ کا چہرہ ملائم اور پر شباب نظر آئے گا۔

★ پانڈس کریمس ★

'SECUNDUS'
مکمل اعتماد کے لئے
تسلیم شدہ
WEST END
WATCH Co
BOMBAY CALCUTTA
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی۔ بمبئی۔ کلکتہ

لمحۂ فکریہ

حضرت شاد عارفی

وہ دَورِ نَو ۔ بہ فیضِ انقلاب عام آپہنچا
پیامِ یک دلی ہندوستاں کے نام آپہنچا

مئے ساقی شرابِ حُریت انجام آپہنچا
لبِ سرشارِ جرأت کیلئے انعام آپہنچا

نظر کے سامنے ہے انتہائے پستیٔ منزل
مقامِ امتیازِ کوشش ناکام آپہنچا

نہیں کوئی کشش باقی فسونِ خود فریبی میں
نمودِ صبحِ مغرب پر سوادِ شام آپہنچا

سیاست کی نئی چالیں تھکن محسوس کرتی ہیں
کوئی گتھی اگر سلجھی کوئی الہام آپہنچا

زبانِ نعرۂ حق پر خوشامد اب نہیں سجتی
گئے وہ دن کہ حضرت بندۂ بے دام آپہنچا

سُلگتا ہے دلِ سرمایہ داری سوزِ باطن سے
"وہ عہدِ نو" وہ دَورِ مشتعل اقدام" آپہنچا

یہاں گوں گوں سے خوش ہوتا ہے آئینِ جہانبانی
یہاں جس نے زباں کھولی کوئی الزام آپہنچا

"پریشانی میں ہے" ہندوستاں زادوں کی آزادی
جہاں یکجا ہوئے صیاد لے کر دام آپہنچا

قطعہ

مصیبت فی الحقیقت عیش کا خمیازہ ہوتی ہے
خمارِ دل شکن بعد از مئے گلفام آپہنچا

جہاں آرام کی حد ہو گئی تکلیف آپہنچی :
جہاں تکلیف کی حد ہو گئی آرام آپہنچا

غنیمت ہے وطن اب بھی ہوا بیزار مجھکو مئی
یہ کیا کم ہے کہ بھولا صبح کا گھر شام آپہنچا

چلو خوش ہے غلامی کا جنازہ اٹھنے والا ہے
اُٹھو پیغامِ آزادی ہمارے نام آپہنچا

ناگپور ۱۹ر اگست ۱۹۴۱ء

مائی ڈیر بھائی دُکھی پریمنگری یا پُر درد الفت پوری

جگ جگ جیو اور خوش رہو!

اگر دو وقت پیٹ بھر جانا پھٹے پرانے کپڑے پہننا اور بیمار نہ ہونا خیریت ہیں شامل ہیں تو ہم سب خیریت سے ہیں اور خدا اپنے بندوں کو اس نیستی سے بچائے اور تم کو بھی اس خیریت سے محفوظ رکھے، دیگر احوال یہ ہے کہ تمھارا خط ملا۔ کسی چیز پر یقین کرنا مشکل ہو گیا کیونکہ تمھارے خطوط ایک دوسرے کے مقابلہ میں شمشیر بکف نظر آتے ہیں مجھے کیا تحریر کرتے ہو اور دوستوں کو کیا ــــ کیا معلوم ہے اور پھر تمھارے خطوط ادب سے پُر کیا معنی لبریز ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھو خط کیا ہوتے ہیں مکمل لٹریچر اور وہ بھی حساس ادیب، پُر درد۔ الفت پوری۔ دُکھی۔ پریمنگری کے حسرت نواز نذرِ قلم سے، اب تم ہی بتاؤ کہ اس دقت ہوئی افسانہ نگاری سے یہ اندازہ کیسے لگے کہ تم کس حال میں ہو، شروع کرتے ہو تو بجائے بھائی جان کے صرف بھیا لکھتے ہو۔ جیسے ڈر کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمھارا کوئی گلا گھونٹ رہا ہو۔ اور مرنے سے پہلے تم کو صرف بھیا ہی کہنے کی فرصت ملی ــــ آہ میرا بھیا ــــ میں بہت دور تمھاری مدد نہ کر سکا۔ بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے اور جب خط کے اختتام پر پہنچتا ہوں تو "دُکھی" غط سے جو دل کو دُکھ پہنچتا ہے بیان سے باہر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابھاگی بیچارا پردیس میں جا کر بیمار ہو گیا دانے دانے کو محتاج مُنہ پر ناک اور غلاظت اور تعفن کے ساتھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ، میلے پھٹے چیتھڑوں میں مٹی کے کنارے "بابا دیتے جاؤ" کہہ رہا ہے۔ یہ تو صرف دو لفظوں "بھیا اور دکھی" کے اثر بلکہ مختصر اثر کو تحریر کر رہا ہوں ورنہ درمیان کی عبارت پڑھ کر دل پر جو گزرتی ہے نہ پوچھو۔

> میں تو جنوں میں آ کر سو بار جان دے دوں
> لیکن تری محبت مرنے سے روکتی ہے

ہاں یہ تو بتاؤ کہ آخر خدا ــــ یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ تو نہیں ہے میں تجھے نہیں مانتا کاغذی پیرہن والے تمھارے پیکر تصویر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم اب کچھ موٹے ہو گئے ہو اب پھر ماننے لگو حرج ہی کیا ہے۔ خیر مگر کیا یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ ادب کے ماں باپ یعنی یہی ادیب، شاعر، مضمون نویس، افسانہ نگار وغیرہ وغیرہ جو اپنے کو بڑا حساس سمجھتے ہیں یہ لفظ حساس تھوڑی دیر بعد ہٹائے ہوتو سے ہو یا تری رح جائے حلقی ہے جسے "حلوائی والی رح" بھی کہتے ہیں۔ شمار کیجئے گا۔ جہاں تک دُکھی میرے لئے تو یہ اتنا ہی مشکل سوال ہے کہ کوئی حساس ادیب پوچھے کہ ہاتھی کے کھانے کے اور دکھانے کے دانتوں میں کیا فرق ہے۔ خیر میں دونوں "ہیجوں" سے لکھے دیتا ہوں۔ ہاں تو جناب حساس ادیب صاحب[1] حساس کے معنی آپ لوگوں نے یہ کیوں لئے ہیں کہ کسی کے لئے کچھ کر دو تو مت بس دل میں ایک جھوٹ موٹ کا درد لے کر آہ اُف کرتے رہو اور یہ سمجھ لو کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ بس کام چل جائے گا۔ اور ساری قوم کیا نوع انسان مزے میں ہو جائیگی

[1] بھائی پریم آفریدی مٹھائی کے بڑے شوقین ہیں اسی لئے انھوں نے "حائے حطی" کا نام "حلوائی والی ح" رکھا ہے۔ (ایڈیٹر)

کیونکہ سارے ہی اس کا...... ؟ خوب ـ بڑا اپاڑ کر رہے ہیں آپ لوگ جھوٹی سچی کہانیاں گھڑ کر رنگ برنگی بندشوں کے خیالی گیت لکھ لکھ کر پھولوں کو انگارے بنا بنا کر سماں باندھ کر تصویریں کھینچ کر آرٹ وادب کی رٹ لگا لگا کر خدا ایسی حساسی اور ایسے ادب اور آرٹ و تہذیب کو غارت کرے ناک ہی میں دم نہیں۔ بلکہ پیٹ کے بھی لالے پڑ گئے۔ واہ یہ بڑے حساس ادیب و شاعر ـ ! ایک بھوکے کو کھانا تو کھلاتا نہیں۔ ننگے کو کپڑا تو پہناتا نہیں۔ مریض کو دوا تو مہیا نہیں کرتا کمزور کو سہارا دیتا نہیں بلکہ ان سب کے بجائے ایک افسانہ یا ایک گیت لکھ دیتا ہے۔ ایک آدھ کوئی نظم گڑھ لیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے۔ اس کا پیٹ بھر گیا اس کا تن ڈھک گیا۔ اب اس سنسار میں کوئی بھوکا نہیں کوئی ننگا نہیں۔ کوئی بیمار نہیں کوئی دکھی نہیں۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مسٹر حمید بھی حساس ہوتے ہوتے رہ گئے۔ گو وہ ہیں تو بہت کچھ کیونکہ شاعر ہیں مگر پیں بھی گھنگھرو پاؤں میں بندھ نہ سکے۔ ہوا یہ کہ ایک دن بڑے زور شور سے کہنے لگے کہ ایک بہت اچھا پلاٹ ذہن میں آیا ہے (یہ ذہن میں آنے پر غور کرنا) پھر کہنے لگے کہ بات یہ ہے کہ میں شہر جا رہا تھا تو ریل کے پل پر لوگوں کو جمع دیکھا میں بھی وہاں جا کھڑا ہوا دیکھا تو ایک فقیرنی کی لاش پڑی ہوئی تھی لیکن کوئی شناخت ایسی نہ تھی کہ جس سے پتہ چلتا کہ آیا وہ مسلمان تھی یا ہندو اس لئے ہندو چاہتے تھے کہ مسلمان اٹھائیں اور مسلمان چاہتے تھے کہ ہندو اٹھائیں نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے لاش اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور بالآخر میونسپلٹی کی کوڑے والی لاری آ کے اسے اٹھا لے گئی۔ کہو کیسا پلاٹ ہے یہ کہہ کر آپ جو پھولے سے گئے۔ ویسے تو واقعہ بڑی رقت سے سنایا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جی ہاں آپ کے افسانہ لکھنے سے یا تو لوگ مرنا چھوڑ دیں گے یا ہندو لاش کو مسلمان اور مسلمان کی لاش کو ہندو ثابت کر کے رہیں گے ورنہ اگر آپ زیادہ حساس شاعر ہوتے۔ تو جا کر لاوارث نعش کی تجہیز و تکفین اور کریا کرم کا انتظام کر سکتے تھے۔ مگر ہمارا مجبور حساس

شاعر و ادیب یہ نہیں کرتا۔ وہ تو فوراً کوئی نظم گیت یا افسانہ لکھ مارتا ہے یا اگر کاہل ہوا تو لوگوں کو سنانے پر ہی اکتفا کرتا ہے اور سمجھتا ہے سب کچھ ہو گیا سب ٹھیک ہے اب دنیا میں کبھی اور کہیں ایسا نہ ہوگا۔ واہ ـــ ہمارا ادب اور واہ ہمارے حساس شاعر و ادیب ! ارے بھائی ہر سیر قدم پہ تلتے پھرتے جیتے جاگتے افسانے کہانیاں گیت نظمیں آرٹ۔ ادب کیا کچھ نہیں ملتا ان کو لکھ لکھ کر اور وہ بھی بری طرح کیوں لوگوں کی ہمتوں کو پست کرتے ہو۔ تم نہیں سمجھتے کہ تمہارے لکھنے کا کیا اثر ہوتا ہو گا انسانوں کی زندگیاں تمہارے افسانوں کو پڑھ پڑھ کر بیکار ہوتی جا رہی ہیں۔ لوگوں کے مسکراتے ہوئے لبوں سے مسکراہٹ چھین لینا کوئی بڑا کمال نہیں۔ انھیں ہنسنے دو زندگی کو ہنسی خوشی گزارنے دو کیوں رلاتے ہو۔ تم پھولوں کو سونگھتے ہیں دیکھتے ہیں توڑتے ہیں اور پھینک دیتے ہیں۔ کچلے ہوئے پھولوں پر آنسو نہیں بہاتے۔ پھولوں کو سڑک پر ان راستوں سے بھی گزرتے ہیں جو تعفن گندگی اور راہ اہل کا گہوارہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی پھول ہاتھ سے ایسی جگہوں پر چھوٹ بھی جاتے ہیں اس وقت کیا تم ان پر نظم لکھو گے۔ خدا کی قسم تم حساس نہ ہوئے! تم شاعر ہو! ادیب ہو! ارے وہ گویا مٹی ہیں۔ جو کمرے کی چھپی ہوئی فاختہ کے پیچھے ہیں تو شہر جا گئے ہیں جو ڈرتے ہیں اور لے جاتے ہیں اس کو پکڑ کر اس کے پر سیدھے کرتے ہیں جو چونچ منہ میں لے کر اس کے پر پہنچاتے ہیں اور مارا دیتے ہیں۔ مجبور ہو جانے وہ بڑھیاں جو کسی کو ٹھوکر لگا کر جانے پر اٹھا دیتے ہیں وہ تم لوگوں سے زیادہ حساس ہیں وہ دیہاتی بچے جو گلہری کو گود میں بٹھا کر زندگی بخشتے ہیں تم کہیں زیادہ دردمند اور حساس ہیں۔ خدا کو دیکھو تو الگ رنج ہوتا ہے کیا ایسی ہی نظمیں نوجوانوں کو زندگی اور ملک کو تہذیب و اخلاق سے نوازیں گی ؟

ہلوا مسٹر کمل نئے ہو گئے ابھی ابھی تمہارا دوسرا افسانہ آیا ہے جامعی نے لکھا ہے۔ پڑھو اچھا ہوا ورنہ معلوم نہیں کیا کیا لکھ جاتا۔ واہ بھئی ـ ادیب شاعر وہی ہے کہ جو لکھے وہ کرے بھی ورنہ پھر اس درد نگوئی سے فائدہ ؟

کیوں دوسروں کو اور خود کو دھوکا دیا جائے۔ خط طویل ہو گیا ورنہ آپا کا بھی مذاق اڑانا تھا یہی قوم کو ایک پلیٹ فارم پر لا رہی ہیں ان کا پرچہ بھی گیا ہے اور ہندوستان کے رسائل اور ان کے ادیب۔ جن کی تحریر قول اور فعل میں زمین آسمان کا بُعد ہے۔ خدا بچائے ان سے۔ خیر ایک دفعہ لکھوں گا ضرور۔ تمہارے احباب تمہیں یہ دیکھتے ہیں۔ اور میں بھی ———

تمہارا بھائی پریم آذر یری

بہاروں نے پھر آ کے مژدہ سنایا
گریباں کے ٹکڑے کئے جا رہے ہیں

یہیں ایک دن جشن امید ہوگا
جہاں غم کے قصے کئے جا رہے ہیں

یہ کس نے کیا ذکر ان کا کہ غنچے
پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں

مری زندگی کے طربناک نغمے
ترے غم میں آنسو ہوئے جا رہے ہیں

کبھی ہم نے دیکھی نہ تصویر الفت
زمانے سے قصے سنے جا رہے ہیں

مرے دل کی بے تابیاں بڑھ رہی ہیں
وہ جتنی تسلی دئے جا رہے ہیں

سسکتی امیدیں، بکھری آرزوئیں
یہ کچھ زندگی ہے جئے جا رہے ہیں

نہ پوچھ آہ دنیا تری انجمن سے
تمنائیں کیا کیا لئے جا رہے ہیں

یہیں ایک دن جشن امید ہوگا
جہاں غم کے قصے کئے جا رہے ہیں

نہ پھر یاد کرنا شمیم حزیں کو
تری بزم سے ہم اٹھے جا رہے ہیں

عالم تنہا

از حضرت روشن صدیقی

یہی غارت گر محفل مری محفل ہو جائے
کاش اب دردِ محبت ہی مرادِ دل ہو جائے

نکہتِ حور اسے ہوش میں کیا لائے گی
جو تری یاد کے آغوش میں غافل ہو جائے

یہ بھی اس جانِ تغافل سے گوارا نہ ہو
کہ تغافل ہی نصیبِ کششِ دل ہو جائے

لا کہیں سے وہ نظر بھی کہ جو اے ذوقِ نظر
کہیں جلوہ، کہیں پردہ، کہیں محمل ہو جائے

اُسے کیا ہوش کہ کہتے ہیں کسے ہجر و وصال
جسے ہر عالمِ تنہا تری محفل ہو جائے

عشق وہ خواب نہیں ہے جو پریشاں ہو کبھی
حسن وہ سحر نہیں ہے کہ جو باطل ہو جائے

ہائے خود خضرِ رہِ منزلِ محبوب ہو دل
خود رہِ منزلِ محبوب میں حائل ہو جائے

کشتیٔ شوق کی تعبیر ہے طوفان بکنار
ورنہ جس موج سے گذرے وہی ساحل ہو جائے

کوئی پایاں بھی ہے اس ذوقِ سفر کا یارب
سرِ منزل بھی جو بیگانۂ منزل ہو جائے

ہائے کیا شے ہے وہ اک حسرتِ روپوش روشن
جو کبھی درد بنے اور کبھی دل ہو جائے

غیر مطبوعہ

خاص برائے تحریر

"گاڑی کتنی دیر میں آئی بابوجی؟"

دفتر کا بابو بڑا رحم دل ہوتا ہے۔ لڑکے کی خراب اور خستہ حالت اور فقیرانہ لہجہ نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا، نرمی سے پوچھا۔

"کہاں جائے گا؟"

"لکھنؤ بابوجی!"

"کہاں سے آیا ہے؟"

"پھدگدیہ سے!"

"پھدگدیہ سے؟" ــــ یہی تو بابوجی کی بھی جنم بھومی ہے۔ جہاں گئے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہے، مگر جاتے ہی کہاں؟ پتا کو تو اس نے دیکھا ہی نہیں۔ ماں کے ناتے سے پھدگدیہ کا تعلق تھا۔ سو وہ ہی نہیں رہی۔ ہوئے اُس کے دل میں کیسی کیسی آشائیں تھیں کہ بیٹا پڑھ لکھ کر کہیں ملازمت کرے گا تو عزت ملے گی۔ اور سکھ بھوگے گی۔ کھیت جب پک کر تیار ہوا تو کسان کی آرزوؤں پر پالا پڑ گیا۔ ماں کی یاد نے میٹھی دی خیالات کی گاڑی سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ اب تو وہ پھوس کا کچا گھر بھی گر پڑ کر برابر ہو گیا ہوگا بچپن کے نقوش اُبھر آئے۔ سرلا سسرال ہوگی، اور منوہر جوان ہو گیا ہوگا ــــ یکایک جمعدار نے لائین کلیر کی گھنٹی بجائی، بابوجی جیسے چونک پڑے!۔

"لکھنؤ کیوں جا رہا ہے؟" بابوجی نے دور پلیٹ فارم پر۔ "ستونی لیمپ کے تھرتھراتے ہوئے شعلے کو دیکھ کر کہا۔ جس کی سرخی دسمبر کی برفانی ٹھنڈ سے سپید پڑ رہی تھی۔

لڑکا کانپ کر بولا ـــ "نوکری کی کھوج میں بابوجی!"

"ماں باپ نہیں ہیں؟"

"جی نہیں پرلوک سدھار گئے۔"

کسی آنے والی گاڑی کی روشنی سے پٹری چمکنے لگی، لڑکا ہوسے سے بولا ـــ "اِی گاڑی کہاں جائی بابوجی؟"

"یہ ـــ" بابوجی نے سامنے آتی ہوئی گاڑی پر ایک پھیلتی ہوئی نظر ڈالی، پھر لڑکے کو دیکھ کر کہا ـــ "یہ تو مال گاڑی ہے۔ لکھنؤ جانے والی گاڑی تو بھور بھئے آئے گی۔ رات بھر اس ٹھنڈ میں کہاں سوئے گا؟"

"کہیں پڑ رہب بابوجی بھنہرے تک"

"مگر تیرے پاس تو اوڑھنے کی چادر بھی نہیں ہے"

"سب ٹھیک ہے بابوجی، ایک رین کی تو بات ہے گذر ہی جائی"

یقین کرو جیسے کسی نے بابوجی کا دل مسل دیا۔ یہ عمر، کمسنی، کھیلنے کودنے، کھانے پینے کا زمانہ مگر پیٹ کی آگ نے سارے سکھ کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ جب دن رین اتنے ابھاگے ہوں تو جیون سے لابھ؟ اس مضحکہ خیز جنم کا مطلب؟

اتنے میں دفتر سے اسٹیشن ماسٹر برآمد ہوئے، چھوٹتے ہی گرجے

"دل ہوئی بابو تم ایاں واک کر رہا ہے، تو مارو سات انسپکشن

کے لئے تشریف لا رہے گا۔ تمہارا ایک ورق ٹھیک نہیں۔ تم کس ہوا پھنک پر پڑ رہا ہے؟"

بابوجی نے مجرم کی طرح سر جھکا لیا اور بغیر جواب دیئے ہوئے دفتر کے اندر چلے گئے۔

ایک "بابو" کی حیثیت ہی کیا؟ کاغذوں کا کیڑا بنا رہنا۔ روکھا جیون، پھیکا چہرہ، سوکھا بدن، نہ کھیل سے غرض، نہ احباب سے سروکار، موٹے موٹے رجسٹروں اور کاغذوں کے بیچ بیٹھا۔ انبار میں گم رہنا، بس یہی اس کی ساری زندگی کا ماحصل ہوتا ہے۔ کسان بیل سے کھیت جوتتا ہے، مگر دفتر کا بابو بالکل زندہ لاش ہوتا ہے، یا بے حس بیل سے کہیں بدتر، کام کی بھرمار، اور روٹی اتنی کم کہ دن بھر آنکھوں کے سامنے تارے ناچتے رہتے ہیں۔ دوران سر تو معمولی دکھ ہے، بسیا سوکھے کیرے کا گودا ہو کر رہ جاتا ہے۔ چلنے میں قدم لڑکھڑاتے ہیں، دیکھنے میں چاروں طرف اندھیرا اندھیرا سا معلوم ہوتا لیکن ان باتوں کے ذکر سے حاصل؟ دل کی بھڑاس تو شاید نکل جائے مگر نشاط روح اور جسم کے آرام کے لئے تو اطمینان اور روٹی چاہئے۔ کسی کو کیا غرض ہے کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے اور کچھ ہمدردی اور چارہ جوئی کرے، جس کے پیٹ میں آگ۔ "" گو وہ ناچار جوئے میں گردن ڈالے گا۔ کام کی گاڑی میں جتے گا، نہ دائیں بائیں دیکھے گا، نہ ادھر ادھر دیکھے بھالے گا۔ بس سر جھکائے مورت کی طرح ایک ہی منزل کا منہ گھورتا رہے گا۔ یہاں تک کہ جیون دیا بجھ کر رہ جائے گا!

کل صاحب تشریف لائے ہیں، چھن بھر کے لئے اطمینان نصیب نہیں، جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ دن رات سب برابر ہے۔ اور ڈانٹ پھٹکار مصیبت کے ساتھ، ایسی تنزلی سے بچنا بھی محال ہی نظر آتا ہے۔ کل صاحب کے بنگلے پر کتنے کیسے آرام سے گملوں پر رونق افروز تھے، کتنی کیسی گرم مزہ ہو۔ ۔ گو آج تو صاحب نے ٹھوکریں نہیں لگائیں، وہ کہتے سنا ہے۔ روز روز دھمکاتے ہیں۔ اور سیروں اسے کھاتے

ہیں اور دیکھا تو خود بھی ہے کہ سنہری زنجیروں کے زیور سے آراستہ میم صاحبہ کی گود میں بیٹھ کر شام کو تفریح کرتے ہیں، انہیں ابھی کبھی موٹر پر سیر نہیں کی ہے، لڑکا بڑا ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ سرلا کو تو جانتا ہی ہوگا۔ جانے کبھی سرلا اُس کو یاد کرتی ہوگی؟ پتی کی آغوش میں کسی استری نے اپنے پریمی کو یاد کیا ہے، کون جانے؟ وہ تو اُسے بہت یاد کرتا ہے۔ شاید عورت بڑی بیوفا ہوتی ہے۔ آہ! وہ مہندی تلے، آنگن میں جب اس نے سرلا کا پہلا بوسہ لیا تھا۔ تو اس نے کہا تھا کہ اب ہم تمہاری ہیں، تو کیا ناریاں ایک کی ہو کر پھر دوسرے کی ہو سکتی ہے۔ مگر تو وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے، کل صاحب آ رہے ہیں وہ کس ہوا پھک پر پڑ رہا ہے۔ قہقہہ!

تقریباً ایک بجے کا وقت تھا۔ بابوجی اپنے خیالات سے چونکے تو ایک بڑا سا رجسٹر اٹھا کر میزان اور میزان کل میں کھو کر رہ گئے۔

دیوار گھڑی کھڑکھڑائی، ایک دفعہ کچھ کہہ کر خاموش ہو گئی، اور رفتہ رفتہ بابوجی کی آنکھوں نے طلب حقوق کے معاملہ پر بغاوت کی طرف اقدام شروع کیا۔ انہوں نے نرمی اور گرمی سبھی حربے استعمال کئے مگر آنکھیں نہ سخت انگلیوں سے ہراساں ہوئیں۔ نہ پانی کے چھینٹوں سے کھلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ بابوجی دل سے سفارش کے طالب ہوئے مگر وہ خود بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کہ ذرا ڈھیل ہو تو اپنے دور اس زمانے میں جا پہنچے جب وہ بھی سرلا کے ساتھ کھیتوں کی مینڈوں پر آزاد گھوما کرتا تھا۔ آخر تنگ آ کر بابو نے رجسٹر پر سر رکھ دیا۔ اور نیند نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

جھونپڑے میں ایک چھ برس کا لڑکا ساری کا آنچل کھینچتے ہوئے ماں سے ٹھنکا—

"دے"

"دیکھ موہن ایک ڈبل پیسہ نہیں ہے، پھول بیں ریں نہ کر"

ماں نے لڑکے کے اطمینان کے لئے اپنا سارا بدن ٹٹول ڈالا مگر لڑکا ان باتوں سے کب ماننے والا تھا۔ پیسے نہیں تب تو وہ کیا کرے۔ اس کو تو ضرورت ہے اور وہ اس کی ماں ہے جہاں سے ہو سکے مہیا کرے۔ آج میلہ ہے، بغیر پیسے میلہ کیا؟ زیادہ نہیں تو چار پیسے تو ٹینٹ میں ہوں، ایک — دو — تین — چار — ایک پیسے کی تو کورنی چٹپٹی سی پڑیا ہو اور پیسے کی کڑا کا چور ریوڑی، منہ کا سواد بدلنے کے لئے۔ باقی دو پیسوں کے کھلونے۔ تاشے والی گاڑی جسے لے کر وہ دوڑے گا تو تڑا تڑ کی آواز ہوگی اور کندھے پر بندوق رکھے ہوئے مٹی کا سپاہی۔ بس ختم ہو گئے چار پیسے۔ ماں وہ ان کھلونوں کو کسی کو چھونے تھوڑے ہی دے گا۔ نہ رامو کو نہ منوہر کو، سرلا کو البتہ تھوڑی دیر کے لئے دل بہلانے کے واسطے دیدے گا۔ پر ابھی تو ماں پیسے ہی دینے میں کسالا کر رہی ہے۔

"اوں اوں" لڑکے نے دوبارہ ساری کا پلو کھینچتے ہوئے پیسے کا مطالبہ کیا۔ ماں جھلا اٹھی۔ گال پر ایک طمانچہ جما دیا۔ لڑکا تکلیف سے بلبلا اٹھا لیکن مار کھا کر مطالبے سے دست بردار ہو جانا کہاں کی مردانگی تھی۔ اس کے اور ہوریت کے لیڈروں کے طرزِ عمل میں ذرا فرق تھا۔ اس کی پیٹھ ہی مضبوط نہ تھی بلکہ ہاتھ میں بھی قوت تھی۔ جس سے وہ ساری کی اب دھجیاں اڑا دینا چاہتا تھا۔ اتنے میں سامنے سے میلہ جاتے ہوئے ایک لڑکا گزرا۔ ماں کی ممتا دل میں لہرا گئی۔

"اچھا ٹھہر، دیکھ جاتی ہوں۔ شاید منوہر کی مہتاری سے پیسے اُدھار مل جائیں" ماں نے اپنی چودہ آنے کی ساری موہن کی مٹھی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

منوہر کے گھر پر اس وقت تالا پڑا ہوا تھا۔ وہ منشی جی کے یہاں اپنے باقی پیسے لینے گئی تھی۔ آخر اس کا لڑکا بھی تو میلہ دیکھے گا۔

ماں نے گاؤں کے تمام گھروں کی کنڈی کھٹکھٹائی مگر اسے کہیں بھی تو پیسے اُدھار نہ ملے۔ سبھی لڑکے میلہ دیکھنے جائیں گے اور ہر گھر میں پیسوں کا کال تھا۔

مایوس ہو کر وہ لوٹ رہی تھی کہ منوہر کی ماں آتی ہوئی نظر پڑی۔ لال لال بھر بھرائی بھر بھرائی سی۔ سوگ اور غصے میں مگر اس سے کیا ہوتا ہے اس کی مٹھی میں آج بہت سے پیسے نظر آ رہے تھے۔

اُدھار مانگنے کی اُمید مسکرا اٹھی۔

"کیا ماں لائی؟" بغل سے منوہر نے نکل کر پوچھا۔

منوہر کی ماں نے منہ دبا کر ایک ٹھنڈی سی سانس لی، اور دو تانبے کے پیسے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے،

"اور دے ماں بہت سے تو ہیں"

پیمانہ لبریز ہو گیا — "جا نہیں تو ٹیٹوا دبا ڈالوں گی۔"

اُدھار مانگنے والی آگے بڑھی — "دیدو نا چار پیسے کی ضرورت ہے۔"

منوہر کی ماں نے چپکے سے اکنی اس کے نذر کر دی اور جلدی سے گھر چلی گئی۔

لوگ جمع تھے، بہت سے آدمی سڑک پر، بازار میں، پارک کے اندر ننگے سر ننگے پاؤں، اندر ننگے پیٹ، جیسے بہت سے مردے ابھی قبروں سے ابل پڑے ہوں،

ایک گول بدن اور خوش پوش حضرت ایک اونچی جگہ پر کھڑے تھے یکایک گلا پھاڑ کر چیخ اٹھے۔

"کیا تم ان برکتوں کو نظر انداز کر سکتے ہو جو تم کو اس اول حکومت کے عہدِ زریں میں حاصل ہیں؟"

مجمع چلا یا — "کن برکتوں کا ذکر ہے؟"

وہ بولے — "پہلے چوریاں ہوتی تھیں، عصمت و عفت پر دن دھاڑے ڈاکہ پڑتا تھا مگر اب جان اور مال سب محفوظ ہے۔"

"خود اُٹھا — دھن ہی نہیں نقب کہاں لگے؟"

ایک حلقے سے آواز آئی "تم ہٹ جاؤ، ہم تمہاری باتیں نہیں

سنیں گے۔"

ایک کھدر پوش حضرت ڈائس پر تشریف لائے۔ اور مخلصانہ انداز سے بولے "دھیرج رکھو دھیرج! سمے آرہا ہے جب ہماری کٹھنائیں دور ہو جائیں گی اور ہم سونتنترتا کے گیت گائیں گے۔"

مجمع چلا اٹھا "پیٹ بھر کھانا ملتا ہی نہیں سنترے کہاں سے کھائیں گے۔"

کھدر پوش بولے "ارے ہم نے سنترے کھانے کی بات نہیں کہی ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ ذرا صبر سے کام لیں۔ وقت آرہا ہے جب ہمارے دکھ دور ہو جائیں گے اور ہم آزادی کے گیت گائیں گے۔"

"صبر کہاں تک کریں، پچیس برس سے صبر کرتے چلے آرہے ہیں مگر نتیجہ؟ کھیتوں نے اناج پیدا کرنا چھوڑ دیا ہے، بارش کبھی وقت پر نہیں ہوتی، مچھلی کا دیش میں پتہ نہیں، مزدوری ڈھونڈھے نہیں ملتی، سوکھی ہڈیوں سے کب تک ... پرورش ہو؟"

موہن بابو کی رگیں پھول گئیں، آنکھیں ... زندگی ... پیچھے سے آگے بڑھے اور ڈائس پر آکر ... لاؤڈ اسپیکر پر بولے

"اب صبر کا وقت گیا۔"

"تم بیچ میں دخل در معقولات کرنے والے کون ہو؟" کھدر پوش نے آنکھیں نکال کر کہا

مجمع جوش سے بھر کر چلا پڑا "تم جیسے بابو لوگوں کو ... اب ہم تمہارے جال میں نہیں پھنس سکتے۔"

بابو دردمند لہجے میں بولے۔ "تم دھیان رکھو، تمہارے کھیتوں میں اناج پیدا ہوگا، بارش وقت پر ہوگی، تمہارے دیش میں مچھلی پیدا ہو جائے گی۔ مگر اس کے لئے تمہیں ہاتھ پیر ہلانے ہوں گے، جانیں قربان کرنی پڑیں گی، حکومت کی نیت پر ... جڑ سے اکھاڑنا پڑے گا، دیش میں اسی وقت ہریالی نظر آئے گی جب ان ...

کا گندہ ہمارے درمیان نہ ہوگا۔"

ہر طرف سے آواز آئی "ہم اپنے دیش کو سرسبز بنانا چاہتے ہیں ہم کیا کریں؟"

"تمہارے پیروں میں قوت ہے کہ ہمارے ساتھ چل سکو؟"

"ہے"

"دل میں ہمت و جوش بھی ہے؟"

"ہے"

"اور ہاتھوں میں ناخن بھی ہیں؟"

"ہیں"

"آؤ ہمارے ساتھ کہو، یہ دیش ہمارا ہے"

مجمع چیخ دیا۔ "دیش ہمارا، دیش ہمارا، دیش ہمارا . . ."

نوجوان بابو گرجے "دھرتی اپنی دیش ہمارا تیز بڑھے ..." بلو

مجمع بولا...

"دھرتی اپنی دیش ہمارا تیز بڑھے چلو"

دیش اب غلام نہ تھا، سکھ اور شانتی چاروں طرف منڈلا رہی تھی۔ چمن شاداب تھا، پیٹ میں روٹی تھی اور زبان پر آزادی کے نغمے۔ بابو جی اپنے شاندار دفتر میں صوفے پر بیٹھے دیش کی اصلاح کے بارے میں کچھ سوچ رہے تھے۔ صبح کا سہانا وقت تھا، ایک لڑکا مسرت سے بھرپور کمرہ میں داخل ہوا

"نمستے منتر مہان راشٹر پتی"

"نمستے! بھارت کے سپوت!! آپ نے کیسے تکلیف کی؟"

"کیا آپ مجھے بھول گئے ہیں" "ارے تم! ابھی۔ مبارکباد!"

"مبارک باد"

"وہ بابو تم سو رہا ہے" اسٹیشن ماسٹر بیدردی سے بابو کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخے

بابو چونک کر آنکھیں ملنے لگے ... کاغذوں کا انبار جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ لکھنؤ کی گاڑی کب کی جا چکی تھی مگر بابو کا ابھی تک سکرٹ سا ہوا رہا تھا۔ فقط

سردیوں کا موسم تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ہندوستان کی راج دھانی کے راج محل کے پائیں باغ میں گلاب کا ایک سرخ پھول ... شاخ پر جھولا جھول رہا تھا۔ یکایک اس نے جھوم کر اور اپنی خوشبو ... خون ... رنگ پر فخر سے مسکرا کر سامنے آم کے درخت کی طرف دیکھا جہاں ایک بلبل اس کی تعریف میں گیت گا رہی تھی۔ گلاب اس کے نغموں کو سن کر ... اور ... پھر بھی کی یاد ... اور وہی ٹھنڈی سانس! ... بلبل نے ... لہجہ میں کہا "تمہیں کیا معلوم محبت کا گہرا درد اور اس درد کا راز ... میرا دل تمہیں آغوش میں لینے کے لئے کس قدر بیتاب ہے ... اس شاخ پر بیٹھ سکتی۔ جہاں تم جھول رہے ہو۔ کاش ... تمہیں چھو سکتی" ... نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئی۔

"تو ... آؤ ..." پھول نے شرما کر ناز سے بلبل کی طرف پلکوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں" بلبل نے کہا "مجھے ڈر لگتا ہے ------ ؟"

"کیوں ڈر کاہے کا ------ کیا خار کے چبھ جانے کا" پھول نے شوخی سے پوچھا!

"نہیں تو ... " بلبل نے اداسی سے کہا "تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے قریب آجانے سے دنیا میں گل و بلبل کا افسانہ کس قدر بدنام ہو جائے گا:"

"باتیں بنا رہی ہو ... صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ کانٹوں سے ڈرتی ہو۔ محبت میں کانٹوں سے ڈرنا زیبا نہیں مگر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیشہ کانٹوں سے خار چھپے ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں"۔ پھول نے کہا "اب تم جو کچھ بھی سمجھو لیکن وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا کہ کس کو کس سے کتنی محبت ہے اور کون کس کے لئے کتنا ایثار کر سکتا ہے" "تم اس درد اور اس کی لذت سے واقف نہیں جو تم سے دور رہ کر تمہاری محبت میں مجھ کو ملتی ہے۔ میں اس درد کو کسی قیمت پر فروخت نہ کروں گی۔ اس درد کا مول خود تم بھی نہیں دے سکتے۔ سچ گلاب تم بھی نہیں ...! سنا نہیں ؎

گل کے خیاباں تو نظر آئے بہت عطر فروش ہیں
طالب زمزمہ بلبل شیدا نہ ملا

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں تم کانٹوں کی تکلیف سے خود کو بچانے کے لئے ایسا کہہ رہی ہو۔" اتنا کہہ کر گلاب نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ بلبل نے بھی ایک سرد آہ کھینچی اور پرواز کر گئی۔ گلاب کا پھول اب بھی اس کی بے رخی سمجھا۔ وہ اس کی محبت کو نہ سمجھ سکا۔ یہی سوچتا رہا کہ بلبل کیوں ایسی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے۔ اس قدر اداس ہے۔ صد مرتبہ مشتاق ہے۔ پھر بھی میرے قریب آنا پسند نہیں کرتی مجھے یقین ہے کہ اسے خار کا ڈر ہے ------ ہونہہ ------ محبت کے دعوے! اس نے اپنی پنکھڑیوں کو ایک اضطراری جنبش دی اور خاموش ہو گیا

تمام دنیا چاندنی میں نہا رہی تھی۔ گلاب کا پھول شبنم کے موتیوں سے کھیل رہا تھا کہ بلبل نے سامنے کے درخت سے اپنا پسندیدہ راگ

پی — پیو — پیو —! ایک خوبرو شخص مرمریں حوض سے اٹھا۔ اور بیتابی سے دوشوں پر ٹہلنے لگا معلوم ہوتا تھا کہ بلبل کے دلگداز نغمہ نے اس کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا ہے —— وہ سوچ رہا تھا — کاش نیلم میری بات مان لیتی۔ — آہ کتنی حسین ہے وہ — مگر کتنی الڑھ اور کس قدر ضدی — آہ میں ایران سے کس لئے ہندوستان آیا تھا میری طبیعت بھی کیا ہے —— بالکل بھونرے سی — کچھ بھی ہو۔ مگر ہزار حسن ہو مگر آخر دربار کی ایک اچھوتی رقاصہ ہی ہے۔ کاش وہ میرے ساتھ ایران چل سکے۔ مگر آہ! اس نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ میرے حُسن کو تیری دولت نہیں خرید سکتی۔ اور وہ صرف دو شرطوں پر اپنے دل کا سودا کر سکتی ہے۔ یا تو میں اپنی حرم سرا کو خالی کر دوں یا اس کے لئے ایران میں گلاب کے سُرخ پھول مہیا کروں۔ اور دونوں شرطیں قریباً ناممکن سی ہیں۔ شاہی باغ کے مالی نے کتنی دفعہ کوشش کی کہ سُرخ گلاب کے پودے بارآور ہوں مگر بیسود۔ جب میں اس سے محبت کا تذکرہ کرتا ہوں تو وہ شمع و پروانے اور گل و بلبل کی پاک محبت کے من گھڑت افسانے لے بیٹھتی ہیں۔ بھلا ایک جوان مرد اور عورت میں اس طرح کی تخیلی محبت کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ عجیب پریشانی ہے کل آخری دن ہے۔ پرسوں مجھے ہر حالت میں ایران واپس ہو جانا ہے۔ نیلم کو کس طرح شیشہ میں اتارا جائے۔ اس کمسنی میں یہ خردمندی کی باتیں! اسے اُس روز کی بات یاد آ گئی۔ جب نیلم نے اس سے کہا تھا۔ آپ صرف میرا نازک و حسین جسم چاہتے ہیں۔ آپ مرد ہیں اور مرد عورت کو ایک حسین پھول سمجھتے ہیں۔ جب تک پھول میں بو، رنگ اور لطافت باقی ہے وہ اسے سینے سے لگائے رکھتے ہیں لیکن رنگ و بو کے جاتے ہی وہ اسے قدموں سے روند کر خاک میں ملا دیتے ہیں۔ مردوں نے محبت کو ایک کھیل سمجھ رکھا ہے۔ وہ تو زندگی میں نہ جانے ایسے کتنے کھیل کھیلتے ہیں مگر انہیں کیا معلوم کہ عورت تو تمام زندگی میں ایک ہی مرتبہ یہ کھیل کھیلتی ہے اور اس پر اپنی تمام زندگی نچھاور کر دیتی ہے۔ اگر یہ بوٹی [illegible] تو ٹھیک ورنہ محبت کی ہار اُس کے جیون کی ہار ہوتی ہے۔ [illegible] تو [illegible] کوشش کروں گا پھر قسمت یا نصیب کسی بھی طرح وعدے کر کے اسے ایران تو لے چلنا چاہیئے۔ وہاں پھر دیکھا جائے گا۔ ابھی خیال [illegible] کہ شہزادے نے دیکھا کہ افق پر سورج کی سنہری کرنیں شروع ہو گئیں جھلملانے لگی ہیں — یکایک آم کے درخت پر بلبل نے اپنا پر [illegible] پھیرا پیو — پیو — پی پی! اور پھر پر تول کر کسی نامعلوم سمت کی طرف اڑ گئی۔ جاتے ہوئے اس نے ایک نگاہ واپسیں اپنے ویران آشیانہ پر ڈالی جہاں اس نے ساون کے دن گزارے تھے۔ بادنوا کا شور سنا تھا جہاں اس نے گلاب کے پھول سے محبت کرنا سیکھا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ گھنٹوں اپنے محبوب پھول کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ اس نے فضا میں پرواز کا ایک دائرہ بنایا اور پھر پھول کے خوابیدہ لبوں پر ایک مہک [illegible] بوسہ دے کر ایک طرف اُڑ گئی اور پھر کبھی واپس نہ آئی۔ [illegible] دیر بعد مالی آیا اور دوسرے پھولوں کے ساتھ اس گلاب [illegible] کو بھی گلدان کی زینت بنانے کے لئے لے گیا۔ مگر گلاب کے [illegible] پھول کی پنکھڑیاں منتشر ہو کر اس کے قدموں پر آ رہیں۔ تخیل نے مدد کی اور نسیم سحر ان پنکھڑیوں کو دوش پر لئے ہوئے ایران [illegible] میں پہنچی۔ جہاں بلبل نے اپنا نیا آشیانہ تعمیر کیا تھا۔ [illegible] بہت اُداس رہتی تھی کیونکہ اس کا خیال غلط ثابت ہو چکا تھا [illegible] نے سوچا تھا کہ جلوۂ محبوب سے دور ہو کر اس کی محبت اور چہک جانے کی یاد گلاب کے پھول کو قطعاً فراموش کر سکے گی مگر اس دوری نے تو [illegible] اور بھی نزدیک کر دیا تھا۔ اس کے سینہ کی آرزوئیں ہمیشہ بیدار رہتیں اور [illegible] گلاب کی باتیں اس کی شوخیاں ہنسنا مسکرانا غرضکہ ایک ایک ادا [illegible] آتی۔ یاد آتی اور تڑپاتی —— بلبل کے نئے آشیانہ کے پیچھے ہی شاہی باغ [illegible] مالی نے ایک گلاب کا گملا رکھا تھا۔ اور جب بلبل اپنے پھول کی یاد میں چاندنی

راتوں کو اپنے آنسوؤں سے اور بھی جگمگا دیتی تو یہ آنسو اس گملہ میں گرتے اور پودے کو سیراب کرتے جس سے پودا جلدی جلدی بڑھنے اور پھولنے پھلنے لگا۔

شہزادہ اور نیلم ایران آچکے تھے، نیلم مان گئی تھی۔ کیونکہ شہزادے نے وعدہ کیا تھا وہ ایران میں اسے گلاب کا سرخ پھول مہیا کرے گا۔ دونوں حوض کے پاس کھڑے چمن کی بہار سے لطف اندوز ہو رہے تھے یکایک نیلم نے کہا۔

"شہزادے تمہارے چمن میں یوں تو ایک سے ایک اچھے اور طرحدار رنگ برنگے پھول ہیں مگر افسوس کہ سرخ گلاب کا ایک پھول بھی نہیں آپ مجھ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ مجھے ہر شب گلاب کا تازہ سرخ پھول بالوں میں لگانے کو ملے گا۔ ورنہ میں کل واپس ہندوستان چلی جاؤں گی۔"

شہزادہ نیلم کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ لیکن دل کی کیفیت کو چھپاتے ہوئے بولا "ہاں مجھے اپنا قول یاد ہے۔ — نیلم کے بالوں میں آج شب کو گلاب کا سرخ پھول ضرور اتر آئے گا مگر شب تو ہونے دو — شہزادے نے نیلم کو کمرہ میں چھوڑ کر مالی کو طلب کیا۔ اور اس سے کہا "تم سے اتنے دن ہوئے ہم نے کا سرخ پودا لگانے کو کہا تھا — اس کا کیا ہوا — کیا تم قابل ہو کہ آج ایران اپنے شہزادے کو گلاب کا ایک سرخ پھول پیش نہیں کر سکتا۔ مالی نے عرض کی "حضور کا اقبال بلند رہے۔ ناچیز نے آپ کے ہونے کے بعد ایک گملہ میں گلاب کا پودا لگایا تھا کچھ دنوں تک تو وہ پودا بالکل نہ بڑھا لیکن چند روز سے خوب بڑھا اور آج صبح ہی میں نے دیکھا کہ ایک ننھی سی گلابی کلی ہوا میں رقص کر رہی تھی بہت ممکن ہے کہ وہ اب تک پھول بن چکی ہو — " شہزادہ یہ سن کر بہت مسرور ہوا اور مالی سے کہا جلد جاؤ اور دیکھو اسے فوراً توڑ لاؤ۔ مگر خیال رہے ہمیں گلاب کا گلابی پھول نہیں چاہئے۔ بلکہ سرخ خون کی رنگت والا۔ سمجھ لو کہ آج تمہارے شہزادے کی سب سے بڑی تمنا کا خون ہو جائے گا۔ مالی پھول لینے چلا گیا

اور شہزادہ تردد کے عالم میں نیلم کے کمرے کے پاس ٹہلنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر پھول عام پھولوں کی طرح گلابی ہوا اور نیلم کو پسند نہ آیا تو کیا ہوگا؟ اتنے میں مالی نے واپس آکر کہا "حضور کلی کھل تو ضرور گئی ہے مگر ابھی پھول بننے میں عرصہ ہے — یکایک پازیب کی آواز آئی اور نیلم اٹھلاتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر نکلی — نیلم کو دیکھتے ہی شہزادہ پر اور افسردگی چھا گئی۔ وہ سوچنے لگا میرا اس سے آدمی رات کا وعدہ ہے۔ پھول نہ جانے کب کھلے گا۔ اگر میں اسے پھول نہ دے سکا تو — وہ واقعی چلی جائے گی اور میں یہاں اکیلا اس کی جدائی میں آنسو بہانے کے لئے رہ جاؤں گا۔

نیلم نے آتے ہی کہا — "شہزادے میرا پھول۔ رات کی چوٹی کم ہو کر گنبد سے ڈھل چکی ہے۔ شہزادے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا — ہاں نیلم مجھے معلوم ہے۔ مگر ذرا توقف کرو۔ پھول ابھی آیا ہی چاہتا ہے۔

"بہتر ہے قدرے اور راہ دیکھتی ہوں ورنہ پھر کل رخصت۔ ہمیشہ کے لئے —" نیلم نے سرد مہری سے کہا —

"ایسا نہ کہو پیاری نیلم — تمہیں شہزادے پر ذرا بھی ترس نہیں۔ میں ضرور — باقی جملہ کو "پیو پیو — " کی دلگداز چیخوں نے سننے نہ دیا۔ کوئی بلبل بری طرح چیخ رہی تھی جیسے کوئی اس کے کلیجہ میں نشتر چبھا رہا ہو۔

بلبل کی آواز سنکر نیلم چونک اٹھی۔ اور شہزادے سے کہا — "ارے یہ کیا — یہ تو ہندوستانی بلبل کی آواز ہے اور بغیر جواب دیئے چمن کے صحن میں اتر آئی اور اس طرف چلدی جدھر سے آواز آئی تھی — شہزادہ کہتا رہا کہ — ایران میں کیا نہیں تم سمجھتی ہو کہ ہندوستانی بلبل یہاں نہیں مل سکتی۔ جس طرح ہندوستانی سرخ گلاب نہیں مل سکتا

مگر ایران تمام ملکوں سے حسین ملک ہے اور غزالوں کی دنیا کا جیتا جاگتا نقش مشہور ہے ـــــ ۔ شہزادے نے نیلم کو راستہ میں جا لیا ـــ بلبل پھر چیخی ـــــ ۔ پیو ـ پیو ـــ پی ـ پی ـــــ مگر اس دفعہ اسکی آواز گھائل تھی اور بدستور دھیمی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

نیلم نے کہا :- تمھیں یاد ہے جب تم میری فرقت میں میرے باغ میں جھروکے کے نیچے راتیں گزارا کرتے تھے ۔ اس وقت بھی ایک بلبل یونہی چیخا کرتی تھی شہزادے کو بھی وہ رات یاد آگئی جب ایک بلبل کی پیہم چیخوں نے اس کے دل کی دنیا میں زیر و زبر ڈال دیا تھا ۔ نیلم فوارے کے پاس اداس کھڑی تھی شہزادے نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور کہا ــ اداس نہ ہو کچھ گاؤ ناچو ـــــ دل بہلے ـــ مگر اس کا اصل مطلب نیلم کے دل سے گلاب کے پھولوں کے خیال کو بہلانا چاہتا تھا ۔ نیلم نے بغیر گھونگروں کے رقص کیا ۔ اور ایک اداس راگ الاپا ۔ ابھی گیت کے بول ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ آخری مرتبہ پاس ہی سے کسی نازک سے پرندے کی ایک کراہ فضا میں ... بیہوش اور کھو گئی ـــ نیلم بے اختیار صدا کی سمت دوڑ پڑی ـــ اور شہزادے اور نیلم نے دیکھا کہ نہایت سرخ گلاب چاندنی میں شاخ پر ڈول رہا ہے ۔ نیلم نے مڑ کر ... بے چیخ کر کہا ـــــ گلاب کا سرخ پھول میرے بالوں کے لیے ! شہزادے نے نیلم کو آغوش میں لے لیا اور پھول توڑنا چاہا مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک بلبل پھول کے اوپر والی شاخ سے لپٹی ہوئی ہے اس کے سینہ میں ایک بڑا سا کانٹا چبھا ہوا ہے اور وہاں سے خون کے قطرے ٹپک ٹپک کر گلاب کے پھول کو سرخ بنا رہے ہیں ۔ نیلم نے بھی دیکھا ـــــ بلبل کی محبت اور ایثار ۔ اس نے بلبل کو اٹھا لیا اور روتے ہوئے اسی گلاب کے گملے میں ... کی قبر میں دفن کر دیا اور ایک تختی پر یہ شعر لکھ کر لگا دیا ۔

ایک دن بلبل سے پوچھا درد فرقت کا علاج
شاخ گل سے گر پڑی تڑپی تڑپ کر رہ گئی

آج اس گملے کے پودے پر گلاب کے سرخ پھول جھومتے ہیں اور اپنی نازک پتیاں بلبل کی قبر پر نچھاور کرتے رہتے ہیں ۔ اور نیلم اور شہزادے کو اکثر چاندنی راتوں میں ایک آواز آتی ہے جیسے بلبل کراہ رہی ہو۔

پیو ـــــــ پیو ـــ پی !

تاریخ ہند کا ایک سنہری ورق
منروا پروڈکشن
سکندر
سہراب مودی
پرتھوی راج
ونمالا
منروا موویٹون ایک زریں شاہکار کی شکل میں پیش کر رہی ہے
مینا
شیلا
موت اور خون کے اس ڈرامہ کی کہانی جو کئی ہزار سال پہلے
سکندر اور پورس کی ہدایت کاری میں ہندوستان کی
اسٹیج پر کھیلا گیا ہے
ظہور راجہ
لالہ یعقوب
کے این سنگھ
جگدیش وغیرہ
ڈائرکٹر:
سہراب مودی
عنقریب بپردہ سیمین پر پیش کیا جائے گا

نغمۂ موت

مسلسل

از جناب مولانا عبدالباری صاحب

"نہیں مس کوسٹیلا! میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک پُرانی ضرب المثل کی تردید کرنا تھا۔ تم نے یہ فقرہ تو سنا ہی ہو گا کہ جو ایک بار پی چکا ہے وہ پھر پیئے گا۔ مگر میرا خیال بالکل اس کے برعکس ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جس نے ایک بار محبت کی۔ وہ دوبارہ محبت کے دام میں گرفتار ہونا نہ چاہے گا۔ کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے"

بیگم مانٹرکیپ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ :-

تم تو بڑے مزے کی باتیں کرتی ہو۔ محبت سے تمہارا انکار کچھ قابل یقین نہیں معلوم ہوتا۔ حسن طلب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک اشتہار دیکھا تھا کہ جو شخص اس ڈبہ کے گوشت کو کسی طرح بھی مضر صحت ثابت کرے گا اُس کو ایک ڈبہ مفت دیا جائے گا۔

"یعنی" ابراہیم بٹ نے مستفسرانہ انداز سے پوچھا۔

بیگم مانٹرکیپ نے کچھ تبسم سے جواب دیا۔

"تم تو بڑے بھولے بنتے ہو۔ یعنی تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ جب تک کوئی تمہیں اپنی محبت میں گرفتار نہ کرے تم "گرفتار" ہونا تسلیم نہ کرو گے

مس کوسٹیلا نے ذرا بھویں چڑھا کر عجب ناز سے کہا

"لولو! دیکھ لیا نا کتنے بھولے ہیں، اور.... .... میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ جو مرد دیکھنے میں خوبصورت بھولے بھالے ہوتے ہیں ہمیشہ محبت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

لولو :- تم کو یہ تجربہ کب ہوا؟

مس کوسٹیلا :- لندن کی ٹیکسی گاڑیوں میں۔

ابراہیم بے نے مسکراتے ہوئے کہا کہ :-

نہ میں خوبصورت ہوں اور نہ دام محبت میں گرفتار۔ اس لئے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بیگم لولو : لیکن تم اتنے اُداس کیوں معلوم ہوتے ہو

مس کوسٹیلا :- میں شرط بد سکتی ہوں کہ مسٹر الخازان کا دل بھی چوٹ کھایا ہوا ہے۔

مس کوسٹیلا پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور نہایت بے تکلفی سے ابراہیم کی کلائی کو پکڑ کر اُس نے پوچھا۔

"بتاؤ تو۔ آخر تمہارا دل کہاں اُلجھا ہے؟

زخم خوردہ دل کی کہانی سننے میں مجھے بہت مزہ آتا ہے بیشکستہ ساز سے بڑے دلریش نغمے نکلتے ہیں۔ کچھ کہو تو.... ... تم تو چپ ہو..... بولتے کیوں نہیں (کلائی کو جھٹکتے ہوئے) وہ کون خوش نصیب ہے، جسے ایسا اچھا شکار ملا۔

مس کوسٹیلا! دل کا راز کہا نہیں جاتا ؎

محبت میں جگر ٹکڑے ہوا، آنکھوں سے لہو ٹپکے
مگر لب پر نہ آئے حرف جس سے آرزو ٹپکے

تمہاری اور اپنی محبت کا افسانہ اگر میں لوگوں کو سناتا پھر تو تم کیا سمجھو گی؟

میں تو بہت خوش ہوں گی، شہرت کا اس سے بہتر ذریعہ کیا ہوگا

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر شومبرگ اور نواب مانٹرکیپ بھی آ گئے۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ سب لوگ کھانے کے کمرے کی طرف چلے۔ راستے میں چپکے سے مس کوسٹیلا نے الخازان یعنی

ابراہیم بے سے کہا کہ وہ اُس کے پاس کی کرسی پر بیٹھے۔

کھانے کا وقت، زیادہ تر نواب مانٹر کیپ نے لے لیا۔ وہ ٹکٹ کے اوپر مضمون تیار کر رہے تھے۔ اور انھوں نے سارا وقت ٹکٹ کے متعلق، ابراہیم بے سے سوال کرنے میں ضائع کر دیا۔

کبھی کبھی بیگم لولو اور مس کوسٹیلا، اپنی شوخیوں سے فلسفیانہ ماحول میں زندگی پیدا کر دیتی تھیں۔ کبھی لولو، اپنے حصہ کا انگور کھانے پر ابراہیم بے کو مجبور کرتی۔ کبھی کوسٹیلا، اپنے حصے کی چیز اُس کی پلیٹ میں رکھ دیتی؛

کھانے کے بعد، سب لوگ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور وہیں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔

بیگم لولو۔ ہوٹل میں تو جی اکتا گیا ہوگا۔ شہر میں فتنہ و فساد برپا ہو تو دل خاک لگے گا۔

ابراہیم بے۔ بیگم لولو، تم نے ٹھیک سمجھا، میں تو تنگ آ گیا تھا اگر میرے دوست ڈاکٹر اُس وقت نہ آتے تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔

ڈاکٹر شوبرگ:۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تمھارے جیسا دوست مجھے ملا۔

ابراہیم بے (تشکر آمیز لہجہ میں) اب زیادہ مجھے نہ ستاؤ ورنہ میں سمندر میں کود جاؤں گا۔

بیگم لولو۔ (سادگی سے) مردوں کی دوستیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ چیز دیکھنے میں آتی ہے۔ مشرقیوں کا یہ خاص امتیازی وصف ہے کہ وہ دوستوں کے لئے اپنی جان تک دے دیتے ہیں برعکس اس کے ہم لوگ، دوستی اور محبت کو بازار میں خریدتے اور بیچتے ہیں۔ دوستی، غرض کے لئے کرتے ہیں، غرض پوری ہوئی اور دوستی کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ مغرب کے دوست تو ایسے ہی ہوتے ہیں کہ آنکھ بچی اور بگڑی غائب! بلکہ آج کل تو ایسے دوست بھی ہیں کہ دوست کی بیوی تک کو لے اُڑتے ہیں"

مس لولو نے تو قطعی ناواقفیت سے یہ فقرہ کہا تھا لیکن ابراہیم بے جھینپ گیا۔ اپنی خجالت مٹانے کے لئے اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔ ہم مشرقیوں کے نزدیک "دوستی" ایک نہ ختم ہونے والے جذبہ کا نام ہے۔

اتنے میں نواب مانٹر کیپ نے، ابراہیم بے کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی مس کوسٹیلا نے، چپکے سے ڈاکٹر شوبرگ سے پوچھا کہ کیا آپ ان کو بہت دنوں سے جانتے ہیں۔

شوبرگ:۔ نہیں ہماری دوستی کو صرف دو برس ہوئے ہیں

مس کوسٹیلا۔ صرف؟

شوبرگ:۔ محبت اور دوستی، پر وقت کی کمی یا زیادتی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مساعد ماحول، اور موافق، طبائع ہیں۔ محبت کی پرورش کا فطری سامان موجود ہوتا ہے، یہ پیدا ہوتے ہی اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے۔..... لیکن افسوس یہ بیچارہ، بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا'۔

مس کوسٹیلا:۔ (تعجب آمیز حسرت سے) کیوں!

ڈاکٹر شوبرگ:۔ اُس کو بادی ناسور ہے۔

مس کوسٹیلا اور بیگم لولو نے ایک دوسرے کو تبسم آمیز نظروں سے دیکھا، اور پھر مس کوسٹیلا نے پوچھا۔

تو کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

ڈاکٹر:۔ بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں مگر وہ میرے زیر علاج ہوتا، تو اپنے پیشے کے دستور کے مطابق اس کی بیماری کا راز ظاہر نہیں کر سکتا تھا لیکن اُس کا معالج کوئی دوسرا ڈاکٹر ہے۔..... خود ابراہیم بے کو اپنی مہلک بیماری کا حال معلوم ہے

"تو کیا اُس کو معلوم ہے کہ وہ کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس سے

جائز نہیں ہو سکتا۔ ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے تو اس سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ ایک برس سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔

دونوں عورتوں کے دل میں ہمدردی کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں اس انکشاف سے متردد اور ملول نظر آتی تھیں لیکن اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح اس دلچسپ اور رومان پسند آدمی کی مدد کریں مس کوسٹیلا تو اس درجہ متاثر ہوئی کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ بھرائی ہوئی آواز میں اُس نے لولو سے کہا۔

"اتنا حسین آدمی، اور ایسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ وہ اب بھی ہمیشہ ہنستا کھیلتا رہتا ہے۔ اُس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اُس کو اپنی بیماری کا حال معلوم ہے زندگی کے دلچسپ مشاغل میں وہ اُسی آزادی اور بے فکری سے مشغول رہتا ہے جیسے اُسے کچھ تکلیف ہی نہیں۔ کتنا حیرت انگیز ضبط ہے۔

ڈاکٹر شومبرگ:۔ یہ مشرقی تقدیر کے بڑے قائل ہوتے ہیں۔ اُن کا پختہ عقیدہ ہوتا ہے کہ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ پھر تقدیر کے لکھے پر رنج کر کے اپنی بقیہ زندگی کے ایام کو اور زیادہ غمگین کیوں بنائیں۔

بے فکری میں گفتگو کا سلسلہ دراز ہوتا ہی ہے۔ بات سے بات نکلتی رہی، اور انقلاب قسطنطنیہ سے بات، رابندرا ناتھ ٹیگور تک پہنچی ناممکن ہے کہ مشرق کا تذکرہ ہو، اور ٹیگور کا خیال نہ آئے۔

شومبرگ نے ٹیگور کے ایک اہم بیان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"ڈاکٹر ٹیگور کا عقیدہ ہے کہ انسان ہمیشہ معرفت الٰہی کی جستجو میں ہے۔ ذہانت، علم اور سائنس بیکار اور غیر ضروری چیزیں ہیں۔ صرف طمانیت قلب، اور محبت، انسان کے لئے کافی ہیں۔ شانتی نکیتن میں جو ٹیگور کی تعلیم کا مرکز ہے، اسی عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے کہ انسانیت کی بنیاد محبت ہے اور اس کی غرض و غائت محبت ہے، لیکن اسی محبت کی تعلیم کے پردے میں، انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت کا بیج بھی بویا جاتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور کی یہ خواہش ہے کہ مغرب کی قومیں، ایک دوسرے کا گلا کاٹ کر ختم کر دیں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس شخص میں ایک خاص قسم کی وجاہت اور جاذبیت ہے۔ جو سامعین پر اثر انداز ہو [illegible] ہے، ورنہ اُس کے فلسفے میں دھرا ہی کیا ہے جو لوگ اُس کے گرویدہ [illegible]۔"

ابراہیم بے:۔ ٹیگور یورپ کے قومی تعصب کو بُرا کہتا ہے اور یہ کچھ غلط تو ہے نہیں۔

شومبرگ:۔ لیکن اپنے ہم قوموں [illegible] میت کو بھی تو وہ سراہتا ہے۔ اُچھالتا ہے، یہ کہاں کا [illegible]۔ قومی تعصب بُرا ہے تو دونوں کے لئے بُرا [illegible]۔ میں تو اس [illegible] سے قاصر ہوں، بعض یورپین جو مشرق کے گرویدہ [illegible]۔ فلسفۂ محبت کو سراہیں تو سراہیں، مگر میں تو اس سے تنگ [illegible]۔ یہ کونسا فلسفہ ہے کہ ریل گاڑیاں بند کر دو، فیکٹریاں توڑ دو [illegible] ترقی اور تمدن کے کل نشانات مٹا ڈالو۔ یورپ کی زندگی مشینی [illegible]۔ ایشیا کی زندگی روحانیت ہے۔ کیسی حماقت آمیز باتیں ہیں [illegible] من رولینڈ کو تو دیکھو وہ بھی گاندھی جیسے پست سطح کے انسان کو [illegible] سمجھتی ہے، اتنی بلند پایہ ادیبہ اور اس قدر پست خیالات۔ یہ روحانیت کا مرض کتنی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ یہ ہماری سائنس اور علمی ترقی کا ہی کرشمہ ہے کہ آج ٹیگور کا ملک، پلیگ اور ہیضہ سے پاک ہے۔ ہمارے احسانوں کا یہ انوکھا شکریہ ہے کہ ہمیں برا بھلا کہا جائے، ہمارے تمدن کا مضحکہ اڑایا جائے اور ہمارے لئے بددعائیں کی جائیں۔"

ابراہیم بے دلچسپی سے سنتا رہا۔ اس کو ٹیگور یا اُس کے فلسفے سے تو کوئی دلچسپی تھی نہیں۔ البتہ ایک مشرقی ہونے کی حیثیت سے اپنے ہم قوم

کی بُرائی سے اُس کا خون کھول گیا اور ذرا طنز آمیز لہجہ میں بولا کہ "معاف کیجئے ...... یہ صحیح ہے کہ یورپ نے ہمیں پلیگ اور ہیضہ سے بچنے کی تدبیر بتائی لیکن یہ بھی تو ماننا ہوگا کہ امرت کی بوتلوں کے ساتھ یورپ نے ہمارے مُلک میں بندوق، توپ اور گولے بارود بھی بھیجے۔

تم یورپ کی تعریف کرتے ہو لیکن یہ تعریف پھبتی نہیں ہے۔ میں نہر سویز کے دونوں طرف رہ چکا ہوں اور دونوں طرف کے رسم و رواج تہذیب و تمدن سے واقف ہوں۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری تہذیب ایک دن خود تمہارا گلا گھونٹ دے گی۔ تم کہتے ہو کہ یورپ میں آزادی ہے، سکون ہے، راحت ہے۔ یہ تمہارا فریب تخیل ہے جس کو دیکھو وہ طمع، حرص، اور سعی لاحاصل میں مبتلا ہے۔ غیر معمولی نفع، زیادہ سود، بڑی تنخواہ، تمہارا مطمح نظر اور تمہاری زندگی کی غرض و غایت ہے یہ سب مادہ پرستی کی انتہا جس پر تم کو ناز ہے......

بیگم لولو قطع کلام کرتے ہوئے بولیں!

"تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی فیکٹریوں کو جلا دیں، کپڑوں کی تعلیم کے مطابق، اپنی اصلی فطرت کی طرف لوٹ جائیں کیوں ڈیفنی تمہارا کیا خیال ہے؟"

مس ڈیفنی :- گذشتہ سال، چائے بناتے ہوئے، میرا ایک موتی کھو گیا تھا۔ مجھے بڑی اذیت ہوئی، اس سے تو میں بھی خیال کرتی ہوں کہ میں سیدھی سادھی غریبی کی زندگی جس کی تعلیم گاندھی، ٹیگور، اور ٹالسٹائی دیتے ہیں۔ مجھ سے نہیں ہو سکتی۔"

شوبرگ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ان دونوں عورتوں نے بھی اُسی کی تائید کی۔ اور خوشی سے چلا کر بولا۔

"شاباش، تم نے ٹھیک کہا۔ میں تو صاف صاف کہتا ہوں کہ مشرق اور مغرب کو وہی ملا سکتا ہے جو مینڈک کی چیخ اور ستار کے ساز میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

ابراہیم بے۔ تم ہم لوگوں کو مینڈک سے تشبیہ دیتے ہو؟ کیا اچھا اخلاق اور کتنی اچھی انسانیت ہے۔

عین اُسی وقت ایک خادمہ اسکی پیغام کا لفافہ لیکر پہنچا جس میں تازہ خبریں تھیں۔

شوبرگ نے لفافہ چاک کرکے، خبریں سنانی شروع کر دیں

"اب موسم خوشگوار آنے والا ہے۔ شمال سے ہلکی ہوا چلے گی۔ پیرس چیمبر نے ڈیوٹیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس خبر سے سارے مُلک میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔

لندن۔ آج ایک چوبیسویں مرتبہ ولیعہد لندن گھوڑے سے گر گئے۔

قسطنطنیہ۔ قسطنطنیہ کی بغاوت فرو کر دی گئی۔ سرغناؤں کو گرفتار کرکے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم بے جس کے لئے پھانسی کی تجویز ہوئی تھی، وہ اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ بھاگ کر بلغاریہ کی سرحد میں چلا گیا۔ پولیس اُس کے سُراغ میں لگی ہوئی ہے۔"

خبریں ختم ہو گئیں تو کونٹ ماٹر کمپ بولے

"ابراہیم کے نام سے تو میں واقف ہوں۔ یہ وہی مصری امیر زادہ تو نہیں جس کے بانکپن، اور سج دھج کی تعریفوں سے یورپ کا ہر ہوٹل اور ہر کلب گونج رہا ہے؟ تم اُس کو جانتے ہو ڈاکٹر۔

ڈاکٹر شوبرگ :- میں نے کبھی اس کو دیکھا تو نہیں ہے۔ لیکن تعریفیں بہت سنی ہیں۔ لیکن یہ عجیب حیرت کی بات ہے کہ یہ بانکا سجیلا جوان، حسن و محبت کی شاداب وادیوں سے نکل کر خارزار انقلاب میں کیسے پھنس گیا۔

(باقی باقی)

از خطیب العلماء حضرت مولانا انجمندی صاحب مدظلہ

ہیبتِ حق سے ناگہاں۔ لینے کے دینے پڑ گئے
کفر کی ہوئی داستاں۔ لینے کے دینے پڑ گئے

جلوۂ شاہِ بحر و بر۔ صحنِ حرم میں دیکھ کر
مٹ گئی شوکتِ بتاں۔ لینے کے دینے پڑ گئے

وحدتِ حق کے سامنے پردۂ شرک کیا جمے
اُڑ گئیں اُس کی دھجیاں۔ لینے کے دینے پڑ گئے

فتحِ مبیں کی دھوم سے عقل کے طوطے اُڑ گئے
مانگ رہے ہیں سب اماں۔ لینے کے دینے پڑ گئے

دیکھ کے اہلِ دیں کا جوش گم ہوئے ہر عدو کے ہوش
آئے جو شاہِ دو جہاں۔ لینے کے دینے پڑ گئے

چھا گیا رعبِ مصطفیٰ کانپ رہے ہیں جابجا
دشمنِ حق ہے نیم جاں لینے کے دینے پڑ گئے

باغِ جہاں میں ہر طرف پھیلا بہار کا شرف
دیکھے حالتِ خزاں لینے کے دینے پڑ گئے

سُن کے کلامِ کبریا۔ جملہ فصاحت آشنا
رہ گئے کیسے بے زباں لینے کے دینے پڑ گئے

کبر و غرور سینہ چاک۔ سر پہ اڑا رہے ہیں خاک
مٹتے ہی خانہ جنگیاں لینے کے دینے پڑ گئے

اہلِ فساد کو کہیں جائے اماں ملی نہیں
حُسنِ عمل سے خوفتاں لینے کے دینے پڑ گئے

واہ! انجمندیؔ ادیب، ہیں تری جدتیں عجیب
نعتِ نبی کہاں۔ کہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے

انسان مجبور ہے یا مختار

از جناب امام اکبر آبادی صاحب

(خاص)

عقل و حس

یوں تو انسان مختلف قوتوں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے اندر قوتِ عقل و فہم بڑی طاقت ہے۔ ایسی جس سے حقیقتاً یہ مافوق مخلوقات ہے۔ اور اس کا یہ دعویٰ کہ میں اشرف المخلوقات ہوں صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ جوہر عقل نے اس کا درجہ بلند ترین کر دیا ہے۔

جس لمحہ سے اس کو یہ احساس ہوا ہے کہ کائنات کی ہر ہر چیز بالواسطہ یا بلاواسطہ میرے لئے ہے۔ اسی لمحہ سے اس کی کوشش و جد و جہد جاری ہے کہ یہ نہ صرف زمین بلکہ کائنات کی تمام چیزوں پر بھی قابض ہو جائے۔ چنانچہ اس کی فہم زمین سے آسمان تک پہنچ رہی ہے اور یہ جو رہا ہے اس بات کا کہ عالم بالا کے حالات معلوم کر کے وہاں بھی اپنی حکومت قائم کرے اور عجب نہیں کہ یہ کسی زمانہ تک اپنے اس خیال کی تکمیل کرے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب تک یہ زمین پر اور زمین کے اجزا و عناصر پر پوری طرح قابض نہ ہو جائے گا۔ عالم بالا پر قابض ہونا ناممکن ہے۔

دورِ حاضر

کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ ترقی کا زمانہ ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کا دماغ بتدریج ترقی کر رہا ہے اور یہ صحیح بھی ہے کہ اس نے قدرت کے بہت سے راز اور بھید پائے ہیں آب و آتش، اور خاک و باد پر یہ قابض ہو چکا ہے۔ بہت سے عناصر و جراثیم کے اثرات سے بھی واقف ہو چکا ہے۔ اور پیدائش کے روک دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ باوجود اس کے ابھی یہ طفل مکتب ہے اس لئے کہ کائنات میں سے کوئی چیز لئے بغیر یہ کوئی کام نہیں کر سکتا یعنی مادّی اشیاء سے مستعار لئے بغیر نہ تو یہ پانی کا قطرہ بنا سکتا ہے، نہ خاک کا ذرہ، اور نہ ہوا کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ جھونکا پیدا کر سکتا ہے۔ تاہم یہ آگے بڑھ رہا ہے اور بڑھتے چلا جا رہا ہے۔ قدیم ترین زمانے میں جن چیزوں کی ساخت ادنیٰ درجہ کی تھی آج وہ ترقی یافتہ صورت میں نمایاں ہیں۔ اکثر مضرت رساں جراثیم کا دفعیہ اور مفید جراثیم پر قابو پا چکا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ تک لامحدود و غیر فانی ترقی حاصل کر کے۔ انسان مجبور نہ رہے گا، بلکہ مختار ہو جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کب؟ لاکھوں کروڑوں برس گزر جانے کے بعد تو ابھی یہ طفل مکتب معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ زمانہ کب آئے گا کہ یہ مختار ہو گا!

کشاکش

اس کے لئے بڑے صبر و استقلال کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی انسان ذہنی و مادّی قوت کی کشاکش میں مبتلا ہے یعنی یہ کبھی روحانی قوت کے نام پر قابض ہونا چاہتا ہے اور کبھی مادّی قوت کے ذریعہ۔ دونوں قوتیں ساتھ ساتھ کام کر رہی ہیں۔ کچھ دن پہلے روحانی قوت کا زور تھا یعنی اس کو یہ سبق دیا گیا کہ اخلاق و انسانیت بڑی چیز ہے خلوص، صداقت، ایثار و ہمدردی، نیکی و بھلائی، انسانی فرائض میں داخل ہیں سبق دینے کے لئے وقتاً فوقتاً پیغامبر، رشی، منی، خدا پرست، اور علماء آتے رہے اور اپنی تقریروں تحریروں، اشاروں، کنایوں سے اپنے مقاصد کی تا حدِ امکان نشر و اشاعت کرتے رہے۔ نصیحت، وصیت کا کوئی پہلو اور نفسیات و اخلاقیات کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے ذریعہ آدم کی اولاد کو یہ سبق نہ دیا گیا ہو۔ اس گروہ کے بانیوں نے اپنی عمریں گزار دیں وقف کر دیں کہ خدا سے واصل ہونے کا طریقہ و تدبیر یہی ہے کہ اس کی یاد

یعنی انسان محو ہو جائے۔ کھو جائے، اس سے ڈرے اور خوف کھاتا رہے پھر اس کو پائے گا۔ انسانوں نے اس پر عمل کیا، لیکن یہ آگے بڑھ کر پھر پیچھے ہٹتا رہا۔ اس طرح گویا اس کے سامنے کوئی عمیق ترین غار ہے، جس میں آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں یہ پہلے تھا وہیں آج بھی ہے اور ضعف و توہم کی جس منزل میں یہ پہلا سانس لے رہا تھا اب بھی لے رہا ہے روحانیت کا یہ سبق اس کے لئے فطرت سے جنگ کرنے کے مرادف ثابت ہوا کیونکہ مدت مدید گزر جانے کے بعد بھی یہ درندگی سے باز نہ آیا۔

انسانی فطرت

چونکہ انسان کی فطرت اور اس کی جبلت خوف آلودہ ہے، اور اکثر و بیشتر انسان ذرا سے حادثے سے بھی خائف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی اس پر طاقت کا دباؤ پڑتا ہے چیخ اٹھتا ہے۔ جب کبھی قوی سے مقابلہ ہوتا ہے، دب جاتا ہے اور اغلباً ضعف کا یہ مادہ اس لئے ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی اس نے قوت کی پرستش شروع کر دی، اور یہ ضعف اس درجہ بڑھا کہ معمولی سی معمولی قوت کے روبرو بھی یہ سر جھکانے لگا۔ اگر اس میں ضعف کا مادہ نہ ہوتا تو یقیناً یہ خدا کی قوت کے روبرو بھی نہ جھکتا۔ پس جس نے آدمی کی اس کمزوری کو محسوس کر کے عمل کیا۔ وہ کامیاب ہوا، اور غالب آیا اور جو اس نکتہ کو حل نہ کر سکا وہ ہمیشہ مغلوب رہا۔ اس بنا پر کسی عقلمند نے "لاٹھی" اور "بھینس" کا مقولہ پیش کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمین کے رہنے و بسنے والے اس پر عمل کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک کہ ساری دنیا میں امن قائم نہ ہو جائے۔

قانونِ فطرت

قدرت کا قانون ہے کہ طاقتور کمزور کو دبا لے۔ قوی ضعیف کو نگل جائے۔ اور قوی کے روبرو ضعیف طواف کرے۔ جمادات و نباتات سے لے کر حیوانات بلکہ ساری کائنات میں یہی قانون جاری و ساری ہے۔ پانی کے قطروں کو، ندی نالے، ندی نالوں کو دریا، اور دریاؤں کو سمندر، ہر وقت جذب کرتے رہتے ہیں۔ چھوٹے ذرے بڑے ذروں کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ بڑے ذرے چٹانوں میں، اور چٹانیں پہاڑوں میں جذب ہوتی رہتی ہیں ببر اپنی طاقت کی وجہ سے جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے اور آدمیوں میں ذی فہم قوی سب پر حکومت کرتا ہے۔

پانی کی طاقت جب امنڈ آتی ہے تو مضبوط سے مضبوط درخت کو اس کی جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے، اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر دیتی ہے، ہوا کی طاقت جب اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو سمندر میں مد و جزر پیدا کر دیتی ہے، آگ جب اپنے غصہ و جلال کی طاقت کو بروئے کار لاتی ہے تو زمین کا سینہ چاک کر کے پہاڑوں کے ٹکڑے اڑا دیتی ہے۔ لیکن آدمی کے اندر فہم و ادراک کی ایک ایسی قوت ہے کہ وہ ان سب پر غالب ہو جاتی ہے۔

مستقبل

چونکہ انسان میں شے لطیف کا مادہ موجود ہے اور یہی چیز اس کو آگے بڑھا رہی ہے اور بڑھائے گی۔ اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل بعید میں جب یہ اپنی دانائی سے زمین اور زمین کی تمام چیزوں پر قابض ہو کر اس کی ہیئت ترکیبی معلوم کر کے، اور مضرت رساں جراثیم کو فنا کر کے یہ اور آگے بڑھے گا۔ تو اس کا حوصلہ اس درجہ بلند ہو گا کہ یہ عالم بالا کی قوتوں سے بھی نبرد آزما ہو گا۔ چنانچہ اس کی ابتداء شروع ہو گئی ہے یعنی چاند سورج اور ستاروں پر یہ قابض ہونا چاہتا ہے۔ خلاؤں پر تیرنے لگا ہے۔ موت کے جراثیم کو فنا کر کے بقائے دوام کی جدوجہد میں مصروفِ کار ہے۔

پس جب، اور جس وقت یہ اس میں کامیاب ہو جائے گا تو یہ زعم و پندار کے ساتھ اپنے چاروں طرف دیکھے گا کہ کوئی ہے جو میری ہمسری کا دعویٰ کر سکے؟ اس وقت اس کے اعلان کا یہ مفہوم ہو گا۔

موت

اے لوگو! دنیا کے جن بڑے آدمیوں نے یہ سبق دیا تھا کہ موت کوئی چیز نہیں ہے۔ موت کے بعد حیات ہے ایسی حیات جو موجودہ حیات سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ زندگی و موت لازم و ملزوم ہیں۔ موت کو کوئی نہیں روک سکتا۔ موت سے ڈرنا بزدلی ہے

اور موت وحیات سوائے خدا کے کسی انسان کے قبضہ میں نہیں ہیں۔ ایسے لوگ مجبور تھے۔ ضعیف تھے۔ اور عاجز تھے۔ اُن کا دماغ اس سے آگے نہیں چلتا تھا۔ اُنھوں نے یہاں تک تو غور کیا تھا کہ انسان اپنی غلطی سے مرتا ہے۔ یہ کوشش بھی کی تھی کہ تازہ لاش میں وہ حرکت پیدا کر کے اسے کچھ وقفہ کے لئے زندہ کر دے۔ لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ کر سکا۔

اور جب اس نے اپنے تئیں مجبور دیکھا تو موت کی تعریفیں کرنے لگا اس نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ موت انسان کے لئے انتہائی ذلت وتحقیر ہے۔ انسان کو اور موت آجائے؟ ناممکن ہے۔

اگلے زمانے کے بڑے لوگ جب مجبور ہو جاتے تو لوگوں کو طفل تسلیاں دیتے رہتے۔ حالانکہ ان کے دلوں میں، دلوں کی گہرائیوں میں یہ خواہش تھی کہ اگر موت کا وجود نہ ہوتا۔ تو اچھا تھا۔

پھر وہ کہے گا کہ دیکھو انسان پہلے پیدائش کو نہیں روک سکتا تھا لیکن تھوڑی سی کوشش اور تدبر و تفکر کے بعد وہ اس پر قادر ہو گیا کہ جب چاہے سلسلۂ توالد و تناسل کو روک دے اور جب چاہے جاری کر دے۔ حالانکہ اُسے کامل یقین تھا کہ موت وحیات پر قابض ہونا ناممکن ہے۔

لیکن جس وقت اسکو اپنی شکست کا احساس ہوا، اور دیکھا کہ کیسے کیسے جری و بہادر، کیسے کیسے دانا و فرزانہ، کیسے کیسے حسین ترین مجسمۂ اخلاق و انسانیت کے پیکر، محبت نواز ہستیاں، خوبصورت ترین نقش و دلکش تصویریں، پیدا ہوتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں ہر پیکر، تصویر کا پیرہن کاغذی ہے۔ جب چاہا پھاڑ ڈالا۔ تو اس نے اپنی ذلت و توہین محسوس کی، اور محسوس کیا کہ قدرت کا یہ فعل نہیں ہو سکتا۔

دائمی حیات

پس اُس نے اس دردناک ذلت، اور توہین آمیز شکست کو دور کرنے کے لئے اپنی انتہائی کوشش شروع کی اور اس میں کامیاب ہو گیا۔

پس اسے دانا یان دہر، جس طرح پہلے انسان پیدائش پر قادر نہ تھا۔ پر اس کے بعد ہو گیا۔ اسی طرح اس کے پاس موت کا کوئی علاج نہ تھا۔ لیکن مبارک ہو کہ آج اس کی تکمیل سے انسان کامل انسان ہو گیا۔ اور لاتعداد برس گزر جانے کے بعد اس کی اشرفیت قائم ہو گئی۔

خدا تو قوت وحیات کا نام ہے، موت کا فعل اس سے سرزد نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو انسان کی غلط کاری اور نادانی سے وابستہ تھا

صورتِ انساں خدا را دیدہ ام

بقیہ "شکیلہ" سلسلہ صفحہ ۲۹

رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے تعلیم کے بند دروازے خود تو ڑ کر کھول دیں۔ تاکہ ہماری بہنیں بھی چاردیواری کی تاریک و مسموم کوٹھریوں سے نکل کر زندگی کی روشن فضا میں آزادی سے سانس لے سکیں ..... ہندوستان کی بیٹیوں میں قابل دماغوں کی کمی نہیں۔ محض تعلیم کا قحط ہے.........؟

استے میں شکیلا چاء کی پیالی سنبھالے پھر میرے پاس موجود تھی۔ میں نے شکریہ کے ساتھ چاء کی پیالی شکیلا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے تجسسانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بارعب چہرہ اس کے اعلیٰ اخلاق اوصاف اور زبردست دماغی قوت کا مرقع پیش کرتے تھے معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کی ایک بہت بڑی عورت بننے والی ہے۔

"پڑھ لکھ کر کیا کرو گی شکیلا؟" میں نے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"میں لیڈی ڈاکٹر بنوں گی" شکیلا کا برجستہ جواب تھا۔ اس جرأت اور اعلیٰ ارادے پر میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ بے اختیار ہو کر میں نے شکیلا کو گلے سے لگا لیا۔ اور کہا "بیشک تم ہندوستان کی لائق بیٹی ہو۔ مادر وطن تم جیسی ہی ہونہار اور پرجوش بیٹیوں کی تلاش میں ہے۔"

مگر......... اس کے بعد سورج اور آسمان نے دیکھا کہ غریب شکیلا پر کیا گزری۔

علم

از جناب شباب مینائی بمبئی

یہ سمجھ لیجئے "بے علم" ہے اس طرح بشر
جیسے اک سیپ کہ پیدا نہ ہوا جسمیں گہر

"روشنی رہتی نہیں، ہوتا ہے جب چاند گہن"
"بے بصیرت ہے" جو بے علم ہے واللہ بشر

اس زمانے میں ہے "بے علم" کا جینا بے سود
ہے وہ بیکار شجر" جسمیں نہ گل ہو نہ ثمر

یوں تو دولت بھی زمانے میں اثر رکھتی ہے
"علم" کی بات نرالی ہے زمانے سے مگر

علم ہے "زینت و آرائشِ بزمِ دنیا"
"علم" کی روشنی پھیلی ہے جہاں میں گھر گھر

کبھی ہو جاتی ہے "شمشیر بھی" محتاجِ قلم
"علم" والے ہی ہوا کرتے ہیں حاکم اکثر

علم انسان کو انسان بنا دیتا ہے
"علم" سے کھلتے ہیں انسان کے پنہاں جوہر

بستی میں، شہر میں، جنگل میں جہاں بھی جاؤ
یہ وہ دولت ہے کہ جسکو نہیں کچھ چور کا ڈر

ہاتھ میں "علم کی تلوار" ہے جس کے، واللہ
رہزنِ عقل "جہالت" کا نہیں کچھ اُسے ڈر

مشعلِ علم "شبِ تار" میں ہے خضر نما"
ہاتھ میں جسکے ہو بھٹکے وہ اِدھر سے نہ اُدھر

خوب فرمان ہے، فرمانِ رسولِ عربی صلعم
"علم" کا سیکھنا ہے فرض ہر اک مسلم پر

مرد عورت کی نہیں اس میں ذرا بھی تفریق
فرض فرمایا برابر بخدا دونوں پر

نور پھیلا تو اسی شمع سے پھیلا ہر سو
علم جس گھر میں نہیں گویا ہے تاریک وہ گھر

مختصر یہ ہے کہ انسان کو لازم ہے شباب
طلبِ علم میں انسان کی ہو عمر بسر

اس بات کو بارہ برس ہو گئے۔ تب شکیلہ کی عمر مشکل سے پانچ برس کی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک کشش تھی۔ حسن کے ساتھ ذہانت اور رعب کے ساتھ بھولاپن! .... —

وہ قدرت کی رعنائیوں کا بے نظیر مرقع تھی۔ وہ ایک حساس طبیعت اعلیٰ اخلاق اور محبت بھرا دل رکھتی تھی۔ وہ ہونہار تھی۔ اس کی پیشانی پر ایک شاندار مستقبل کی جھلک نمایاں تھی... مگر.... کاتب تقدیر کے سوا دوسرا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی قسمت میں کیا ہے۔ غریب شکیلہ ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھی جن کے نزدیک جہاں اعلیٰ تعلیم سے لڑکیوں کے کیریکٹر کے لئے "طرح طرح کے خطرات" کی ذمہ دار گنی جاتی ہے اور روائتی اعتقادات کے زیر اثر عورتوں کو چاردیواری کے اندر بند رکھنا اور انہیں زندگی کے ہر میدان سے خارج کر دینا مذہب کی بھاری خدمت سمجھتے ہیں۔ غرض شکیلہ کے لئے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا مگر اس تاریکی میں روشنی کی صرف ایک دھیمی سی کرن چمکتی تھی۔

محترمہ ایک تعلیم یافتہ روشن خیال مضبوط ارادہ اور اعلیٰ کیریکٹر رکھنے والی نہایت بیدار مغز ماں تھیں۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں اُن کے خیالات بہت وسیع اور قابل ستائش تھے۔ علم کی پیاس انکو ہمیشہ سرگرداں رکھتی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ برادری کا قدامت پرست طبقہ ان کو اچھی نظروں سے نہ دیکھتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر چند مشکلات اور اندرونی مخالفت کے باوجود شکیلہ کی تعلیم کے لئے میرا پرائیویٹ ٹیوٹر مقرر ہونا انہیں کی لگاتار کوشش اور ضد کا نتیجہ تھا۔

تھوڑے ہی دن میں شکیلہ مجھ سے بالکل بے تکلف ہو گئی۔ جب میں آتا۔ قاعدے کر میری گود میں آ بیٹھتی اور بڑی اچھی اچھی باتیں کرتی۔ اس کی ننھی سی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اس قدر پیارے اور بھلے معلوم ہوتے کہ میں اکثر بے اختیار ہو کر اس کے خوبصورت سنہرے بالوں کو چوم لیتا اور وہ بھی اپنے ننھے ننھے ہاتھ میرے گلے میں ڈال دیتی۔ اور اپنے ننھے ننھے ہونٹ میری پیشانی پر پیوست کر کے میری زیادتی کا "بدلہ" لیتی۔ رفتہ رفتہ شکیلہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ روز چھ بجے گیلری میں آ کر کھڑی ہو جاتی اور میری راہ دیکھتی رہتی۔ جب کبھی اتفاق سے مجھے دیر ہو جاتی۔ تو اداس ہو کر والدہ کے پاس آتی اور کہتی "اماں جان! آج جناب نہیں آئے؟" (بمبئی میں جناب سکول ماسٹر کو کہتے ہیں۔ میں اسکول ماسٹر تو نہ تھا مگر شکیلہ رسمی طور پر اسی نام سے میری عزت افزائی کیا کرتی تھی) مجھے یاد ہے ایک دفعہ انھوں نے مذاق میں کہہ دیا "اب وہ کیا کرنے آئیں گے تم نے تو کل انہیں ناراض کر کے بھیجدیا" بس پھر کیا تھا میں آیا تو شکیلہ نے گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ آخر میں نے پیار کیا منہ چوما تسلی دی تب کہیں شکیلہ خاموش ہوئی....

... یہ تھی شکیلہ کی محبت! شکیلہ کو کہانیاں سننے کا شوق بہت تھا اس لئے بیگم بہن نے (میں ان کو بہن کہا کرتا تھا) اور کتابوں کے علاوہ کہانیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اور ان کو الماری کے اندر اور اوپر اس شان سے سجایا تھا کہ ان کا چھوٹا سا کمرہ ایک اچھی خاصی لائبریری معلوم ہوتا تھا۔ جب کبھی وقت ملتا بچوں کو لے کر بیٹھ جاتیں اور علمی ادبی اخلاقی کہانیاں آسان زبان میں پڑھ پڑھ کر سنایا کرتیں۔ اسی طرح ایک دن

کہانی سنا رہی تھیں۔ اس میں ایک لڑکی کا نام "پروین" تھا۔ شکیلہ کو یہ نام ایسا پسند آیا کہ اپنے نام کے ساتھ ملا لیا اور گھر میں سب کو کہہ دیا کہ آج سے مجھے شکیلہ بیگم نہیں بلکہ شکیلہ پروین کہا کرو۔ میں آیا تو مجھے بھی یہی حکم ملا مگر میں شکیلہ کے متعلق اپنے ذاتی خیالات رکھتا تھا۔ اس لئے میں نے شکیلہ کا نام "ملکہ" رکھا۔ اور سنئے "ملکہ" بعض اوقات بڑے دلچسپ اور معنی خیز سوالات کرتی مثلاً الیکٹرک کے بلب میں آگ کہاں سے آجاتی ہے؟ غسلخانے کے نل میں پانی کہاں سے آتا ہے۔ گرامو فون کے اندر گاتا کون ہے۔ بادل بغیر پاؤں کے کیوں کر چلتے ہیں اور نیچے کیوں نہیں گر پڑتے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات علم سائنس سے تعلق رکھتے ہیں اور عام قابلیت کے بچوں کے دماغ کو آسانی سے متوجہ نہیں کر سکتے۔ شکیلہ کے دماغ میں ان سوالات کا ابھرنا ان تنکوں کی مانند تھا جن کو دیکھ کر ہوا کی سمت معلوم ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا وہ ان سوالات کا پورا جواب سمجھنے کے لئے ابھی بالکل نوعمر ہے پانچ برس کی عمر ہی کیا ہے! تاہم میں آسان زبان میں اس کی بہت کچھ تشفی کرنے کی کوشش کرتا۔ اور باقی کو اس وقت کے لئے محفوظ رکھتا جبکہ قدرے بڑی ہوکر سائنس کے ان پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے قابل ہو جائیگی۔

شکیلہ کو پڑھنے کا شوق بہت تھا۔ اگرچہ کم سنی کی وجہ سے اسکول تو نہ جاتی تھی مگر سارا دن سلیٹ پنسل اور قاعدہ لئے لکھنے کے شوق میں گم رہتی۔ ا۔ ب کی تختی کو قاعدہ سے دیکھ دیکھ کر سلیٹ پر نقل کرتی مگر حروف کی اشکال کو کسی قدر بے ڈھب بے ترتیب اور کسی قدر غیر مانوس پاکر مٹا دیتی۔ اسی طرح دوسری طرف ایک سے لے کر دس تک ہندسے لکھتی اور ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتی یعنی عجیب غریب اور بے قاعدہ شکلیں دیکھ کر بددل ہو جاتی، مٹاتی اور پھر لکھتی۔ کہتی ہیں تو اچھا لکھنا چاہتی ہوں مگر ہاتھ ہل جاتا ہے"۔ ننھی شکیلہ کا خیال تھا کہ اس کے ہاتھ اس کو دھوکا دے رہے ہیں۔ معصوم کو معلوم نہ تھا کہ وہ مبتدی ہے اور اچھا لکھنے کے لئے کافی مشق کی ضرورت ہے۔ تاہم اس کا بے پناہ جذبۂ اشتیاق اس کی مشکلات پر پوری طرح غالب آچکا تھا وہ شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی۔ تمام دن صبح سے شام تک اس عمل کو جاری رکھتی آخر کار سلیٹ کو خوب مل مل کر دھوتی۔ اور اچھی طرح صاف کر کے پہلے سے بھی زیادہ مستعدی اور توجہ سے دونوں طرف لکھتی اور مجھے دکھانے کے لئے محفوظ رکھ دیتی۔

شکیلہ کی چھوٹی بہن کا نام سلمیٰ تھا۔ تین برس کی عمر مگر بلا کی نٹ کھٹ دونوں یکساں ہی ماں کی آنکھوں کی دو پتلیاں تھیں۔ مگر دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شکیلہ بھولی بھالی اور صلح پسند تھی۔ سلمیٰ شوخ اور جھگڑالو۔ بڑی بہن کو مار کر خود ہی منہ کے گلے سے رونے دھونے بیٹھ جاتی۔ اور ماں کے سامنے خود کو مظلوم ظاہر کرنے کی کوشش کرتی دونوں کی جھڑپ اکثر کتابوں کے بارے میں ہوا کرتی تھی۔ سلمیٰ تصاویر دیکھنے کا شوق رکھتی تھی۔ مگر شکیلہ کو شکایت تھی کہ سلمیٰ کو ابھی کتاب کے ورق پلٹنے کی بھی تمیز نہیں۔ اس لئے اس کے ہاتھ میں کتاب دینا گویا کتاب سے ہاتھ دھونا ہے۔ صرف یہی نہیں سلمیٰ شکیلہ کو لکھتے دیکھتی رہتی جب موقع ملتا آنکھ بچا کر اس کی پنسل اڑا لیتی۔ اور جو کتاب یا رسالہ ہاتھ لگ جاتا اس پر بندر کی طرح نقل اتارنا شروع کر دیتی۔ جب نوک ٹوٹ جاتی چپ چاپ پنسل وہیں رکھ الگ ہو جاتی۔ اتنے میں شکیلہ کو ضرورت پڑتی...... ادھر دیکھو۔ ادھر دیکھو۔ پنسل غائب! آخر ملتی مگر نوک ٹوٹی ہوئی...... اور شکیلہ چھوٹی بہن کی زیادتی پر احتجاج کرتے ہوئے رو دیتی۔ شکیلہ کا رونا اس کی والدہ کو بہت جلد متوجہ کر لیتا تھا مگر جب وہ آتیں سلمیٰ بھیگی بلی بن کونے میں دبک اس طرح بیٹھ جاتی گویا واقعات سے بالکل بے خبر ہے۔ وہ ابھی سوال بھی نہ کرنے پاتیں کہ سلمیٰ پکار اٹھتی "دیکھو اماں جان! مجھے کیا خبر شکیلہ کیوں رو رہی ہے میں نے تو کچھ بھی نہ کہا" ماں کو اس مصنوعی بھولے پن پر ہنسی تو بہت آتی مگر مسکراہٹ کو محبت آمیز غصے میں تبدیل کر کے دانت پیس کر کہتیں "تم مجھے بہت دق کرتی ہو"

ایک دن شامت جو آئی تو "بانگ درا" پر یہی حرکت شروع کر دی۔ اتفاق سے مریم بہن کی نظر جو پڑی تو سراسیمہ ہو کر کہنے لگیں "کمبخت یہ کیا کر رہی ہو؟" اور جلدی سے آگے لپکیں۔ سلمیٰ فوراً سہم کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈر کے مارے کانپتے ہوئے کہنے لگی "میں تو خالہ جان کو خط لکھ رہی تھی"۔

"مگر یہ کتاب تمہارے خط لکھنے کے لئے ہے؟"..... ...

اور سلمیٰ فرش پر بیٹھی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔

ایک دن میں حسبِ معمول چھ بجے آیا لیکن توقع کے خلاف شکیلا دروازے پر ہونے کی بجائے اندر کچھ رونا دھونا کر رہی تھی۔ میں نے سنا وہ والدہ سے شکایت کر رہی تھی "سلمیٰ نے میرا لکھا ہوا سب خراب کر دیا اب میں جناب کو کیا دکھاؤں گی"۔ اور والدہ لاڈلی بیٹی کے جذبۂ اشتیاق سے متاثر ہو کر پیار سے کہہ رہی تھیں "رو نہیں جان! آنکھیں خراب ہو جائیں گی دیکھو تو کس قدر لال ہو گئی ہیں۔ میں جناب سے کہہ دوں گی وہ کچھ نہیں کہیں گے" میں نے دروازے پر انگلی کی ہلکی سی ضرب سے اپنے آنے کی اطلاع دی شکیلا نے ذرا دیر سنکی اور رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے فوراً دروازے کی طرف لپکی۔ اب شکیلا سے میری محبت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس کے دل کا ہلکا سا رنج مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس وقت اس کے پھول سے چہرے پر درد کے آثار دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ گود میں اٹھا لیا اور اندر آ کر منہ چومتے ہوئے پیار سے پوچھا "اداس کیوں ہو شکیلا" شکیلا نے اپنے جذبات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اور کہنے لگی "میں نے آپ کو دکھانے کے لئے لکھ کر رکھا تھا۔ میں باورچی خانے میں اماں جان کے پاس چائے پینے کے لئے گئی اتنے میں دیکھئے" (مجھے سلیٹ لا کر دکھاتے ہوئے) "سلمیٰ نے ایسا کر دیا" میں نے سلیٹ کو ہاتھ میں پکڑ کر دیکھا سلمیٰ نے پنسل سے دونوں طرف خوب نقش و نگاری کی تھی اس کے نیچے لکھے ہوئے الفاظ کی دھندلی سی شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ تاہم معلوم ہوتا تھا کہ بیچاری نے واقعی بہت شوق اور محنت سے لکھا ہے

مجھے ننھی کی اس ستم ظریفی پر ہنسی آ گئی میں نے منہ بنا کر کہا "بس اتنی سی بات پر یہ رونا دھونا"۔ لیکن ننھی شکیلا کی تشفی نہ ہوئی آہستہ سے کہنے لگی "آپ نے تو کہا تھا اچھا لکھو گی تو انعام دوں گا۔ اب یہ اچھا کہاں رہا؟" اب مجھے یاد آیا کہ کل جاتے وقت میں نے شکیلا سے کیا وعدہ کیا تھا: "ہاں! ٹھیک ہے واقعی تم نے ایسا خوبصورت لکھا ہے کہ انعام کی مستحق ہو" کہتے ہوئے میں نے قمیص کی جیب سے ایک روپیہ نکال کر دینا چاہا لیکن شکیلا مایوسانہ نظروں سے میرا منہ دیکھنے لگی۔

"یہ تو روپیہ ہے" شکیلا نے حیرت آمیز لہجہ میں کہا۔

"تب کیا لینا پسند کرو گی؟" میں نے پیار سے پوچھا

"انعام" شکیلا نے سنجیدگی سے میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا یکایک میں نے اپنے آپ کو لاجواب پایا..... "لیکن یہی تو انعام ہے" میں نے اس عارضی صدمے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"یہ انعام نہیں روپیہ ہے" شکیلا نے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے نظریہ کو ہر چند دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مگر شکیلا کا اصرار یہی تھا کہ یہ انعام نہیں بلکہ روپیہ ہے۔ ایک ننھی بچی کی قوتِ ارادی کا اس سے شاندار مظاہرہ میرے خیال میں اور کسی طرح نہ ہو سکتا تھا۔ دفعتہ مجھے یاد آیا کہ ۲۰ جنوری کو شکیلا کی سالگرہ ہو گی۔

"بہت خوب ملکہ؟" میں نے شکیلا کے خوبصورت چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان دباتے ہوئے کہا "تمہاری سالگرہ کے دن تم کو ایک بہت خوبصورت انعام لا دوں گا۔ جس پر شکیلا مطمئن ہو گئی۔

چنانچہ جب سالگرہ کے دن میں نے سچ مچ ایک خوبصورت ریشمی سوئٹر لا کر دیا تو ننھی ملکہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ سارا دن ساتھ ساتھ لئے پھرتی رہی۔ ہر ایک کو دکھاتی لیکن اگر کوئی ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنا چاہتا تو اسے پہلے ہاتھ دھونے کا حکم ملتا۔ رات کو بھی ساتھ لیکر سوئی۔ صبح کو پھر وہی حال تھا۔ آخر والدہ کی خواہش پر تہ کر کے حفاظت سے بکس میں رکھ دیا گیا کہ

شکیلا نے مجھے کہا تھا کہ وہ اسے پہن کر کبھی خراب اور پرانا نہ کرے گی میرا خیال ہے اگر وہ سوئٹر کسی حادثہ کی وجہ سے ضایع نہ ہو گیا ہو تو میری یادگار کے طور پر آج تک اس کے بکس کی زینت ہوگا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں آج سے بارہ برس پرانے واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ آج ہر چند میری آنکھیں شکیلا کے لئے ترس رہی ہیں۔ مگر...... وہ میری نظروں سے دور...... بہت دور ہے۔ ہاں! آج وہ سماج کی اسیر ہے اور......!

خیر! اس مقام پر ایسی باتوں کا گلہ کرنا قارئین کرام کے ذوق سلیم کو ٹھیس لگاتا ہے اس لئے میں اپنی پرانی کہانی کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں

..... ہاں تو ننھی شکیلا میری نظروں میں قدرت کا ایک معجزہ تھی

.. حسن! محبت!! ذہانت!!! قدرت نے اپنے تینوں عطیے شکیلا کو بخش دیے تھے۔ ایک دن میں ٹیوٹس کو انگریزی نظم پر سبق دے رہا تھا پاس ہی شکیلا ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھی لکھ رہی تھی اس کے خوبصورت ریشمی بال جو ابھی مشکل سے شانوں تک پہنچتے تھے کبھی کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ فضا میں رقصاں ہو کر اس کی شان معصومیت کو دوبالا کر رہے تھے بالوں میں سفید رنگ کا ربن۔ بدن پر اسی رنگ کا فراک۔ زانو پر کاپی ہاتھ میں ایک لمبی سی پنسل، اس پر یہ مصروفیت!...... وہ ایک خوبصورت گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شکیلا نے سر اوپر اٹھایا اور ایک لمبی انگڑائی لی۔ معلوم ہوتا تھا تھک گئی ہے۔ ساتھ ہی ہاتھ کی انگلیوں کو سہلاتے ہوئے کہنے لگی "انگلیاں بھی درد کرنے لگیں"۔

"اچھا لاؤ تمہارے ہاتھ کو دبا کر ٹھیک کر دوں" میں نے کتاب میز پر رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

شکیلا اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک تشکر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ غالباً مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت میرے احساسات کیا تھے۔ ..... مگر میں نے اس ہاتھ کو چوم لیا۔ ہاں میں نے دیکھا اس کی درمیانی انگلی پر ایک سرخ رنگ کا چھالا تھا جس کی تکلیف سے ہاتھ میں پنسل تھامنا دشوار ہو گیا تھا۔

"یہ کیونکر ہوا" میں نے شکیلا کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

ابا جان نے جو پنسل لا کر دی تھی۔ اچھی نہ تھی پھر اماں جان نے جو دی وہ بھی ایسی ہی خراب تھی۔ اس لئے اس سے لکھتے لکھتے میرے ہاتھ میں چھالا پڑ گیا" شکیلا نے کسی قدر تکلیف کا اظہار کرتے ہوئے کمال بھولے پن سے کہا۔

یہ سن کر میں تڑپ اٹھا۔ میں جانتا تھا یہ چھالا خراب پنسل کی وجہ سے نہیں بلکہ انتھک محنت کی وجہ سے پڑا ہے۔ .. ..

"شکیلا جان!" اتنے میں باورچیخانہ سے آواز آئی۔ اور شکیلا مجھ سے اجازت لے کر چلی گئی۔

"ایسی ذہین اور محنت کرنے والی لڑکی" شکیلا کے جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا "اس کا مستقبل کیا شاندار ہونا چاہئے۔ ایسی ہونہار لڑکیاں ملک و قوم کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ہمارے درمیان ان کی موجودگی ہمارے عظیم الشان مستقبل کی بہترین گارنٹی ہے اگر ان کو سونے چاندی کی بجائے اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دیا جائے تو بڑی ہو کر ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتی ہیں مگر بدقسمتی سے ہماری سوسائٹی کا برسراقتدار طبقہ لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کی اہمیت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ کہنہ خیالی، فرسودہ روایات اور دقیانوسی رسم و رواج نسوانی تعلیم کی راہ میں بھاری پتھر بن کر اس کا راستہ روک رہے ہیں۔ لیکن آزاد خیالی حریت ضمیر اور مساوات کا جو سیلاب دنیا کے گوشہ گوشہ سے اٹھ چکا ہے۔ اس کی لہریں اب ہندوستان کے ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ ہندوستان کی بیٹیاں اس طوفان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گی۔ اس لئے وقت ہے کہ ہماری سوسائٹی کے کرتا دھرتا تاریخ سے سبق سیکھیں اور کسی قدر

رباب ہستی

خاص
ماہنامہ تنویر کیلئے

از محترمہ فاطمہ قیصری بھوپال

خاموش ہوگیا ہے تارِ ربابِ ہستی
ہے آئینہ میں میرے تصویر خوابِ ہستی

" ربابِ ہستی " کے معنوں میں دنیا کی ہر آواز آسکتی ہے ! ــــ ہم باتیں کرتے ہیں۔ یہ کیا ہے ؟ ربابِ ہستی کی آواز ـــ ! ہوا چلتی ہے اور پتیاں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں جس سے ایک قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے ، وہ کیا ہے ؟ ربابِ ہستی کا ایک میٹھا نغمہ ــــ بلبل مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھتی ہے اور اُس کی بیکسی پر مرثیہ پڑھنے لگتی ہے اُس کا مرثیہ کیا ہے ؟ ربابِ ہستی کا دلسوز نغمہ ــــ ! بارش سے پہلے بہت سے مینڈک اپنی خوشی کا اظہار ٹرا ٹرا کر کرتے ہیں جس سے آسمان اور زمین گونج اُٹھتے ہیں۔ یہ کیا ہے ؟ ربابِ ہستی کی ایک کرخت آواز ــــ !

بیتاب دریا کنارے پر سر ٹپکتا ہے اور ناکام واپس چلا جاتا ہے اُس وقت اُس کی ہلکی سی چیخ نکل جاتی ہے یہ چیخ کیا ہے ؟ ربابِ ہستی کا الم انگیز گیت ــــ !

رات تمام دنیا پر مسلط ہے اور ربابِ ہستی کا ہر تار خاموش ہے آدمیوں نے بولنا۔ ہوا نے چلنا۔ بلبل نے گانا۔ مینڈکوں نے ٹرانا ۔ دریا نے سر پٹکنا اور مالی نے محنت کرنا چھوڑ دیا ہے اور ان سب پر رات کا جادو چل گیا ہے ۔ اس لئے سب خاموشی سے ہمکلام ہیں مگر شاعر ــــ دل کے ہاتھوں مجبور اس ہونے کے عالم میں خاموش بیٹھا ہے ــــ رات شاعر کو دیکھتی ہے اور متعجب ہوتی ہے کہ اس وقت جبکہ تمام کائنات محوِ خواب ہے یہ کیوں جاگ رہا ہے ! وہ دریافت کرتی ہے کہ " اے شاعر ! تو اس وقت کیوں جاگ رہا ہے جب کہ ربابِ ہستی کا ہر تار خاموش ہے جہاں بھی میرا سایہ پڑا ایک بے پناہ سکوت طاری ہوگیا ۔ میری چاندنی کے شفاف آئینہ میں کائنات کا ذرہ ذرہ چمک اُٹھا۔ پھر اس عالم خود فراموشی میں تیری بیداری کیا معنی رکھتی ہے ؟ "

شاعر کی دردناک آواز کچھ دیر کے لئے فضا میں ہلچل پیدا کردیتی ہے ۔ صرف ایک شعر کے ذریعہ وہ تمام منظر کی تصویر نظروں کے سامنے کھینچ دیتا ہے ۔

خاموش ہوگیا ہے تارِ ربابِ ہستی
ہے آئینہ میں میرے تصویر خوابِ ہستی

اس طرح شاعر نے چند لفظوں میں تمام کائنات کی کیفیت بیان کردی " خاموش ہوگیا ہے تارِ ربابِ ہستی " کہہ کر اُس نے دنیا کو کوزہ میں بند کردیا اب اگر وہ ایک ایک چیز کی خاموشی کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتا تو ایک طویل نظم مرتب ہوجاتی ۔ اور شعر کا وہ لطف بھی جاتا رہتا جو اس میں موجود ہے ۔ اسی طرح اس خاموشی کا عکس جو چاندنی میں نظر آرہا ہے ۔ شاعر کس خوبصورتی سے اس مصرعہ میں بتاتا ہے

ہے آئینہ میں میرے تصویر خوابِ ہستی !

یہ ہیں ہمارے اقبال ... اس شعر کی تفسیر مندرجہ ذیل شعر سے بھی ہوسکتی ہے :-

سکون و خاموشی کا دور دورہ ہر طرف ہے
جہاں میں یک شاعر اور اک شب کی سیاہی ہے۔

بلا تکلیف بال اڑانے کا
دھوکے بازوں سے بچنا
نام پڑھ کر لینا
بادشاہی
بال صفا
ہر جگہ ملتا ہے
سی سی۔ مہاجن اینڈ کمپنی سوتر چال۔ بمبئی نمبر ۲

نیشنل سٹوڈیوز کی قابل دید فلم
NATIONAL STUDIOS
پانچواں ہفتہ ۵
جس میں :- ڈائرکٹر محبوب کی بلند پایہ ہدایت کاری
اور شیخ مختار و نلینی جیونت کی جذباتی
تمثیل نگاریوں نے دل کو تڑپا دینے والی کشش پیدا کر دی ہے
دیگر اداکاران :- سروپ رانی نگار - حسن بانو - ہریش
کنہیا لال
بہن
پاتھے سنیما
افسانہ :- ضیاء سرحدی
بابو بھائی مہتہ
مکالمے :- مرزا وجاہت لکھنوی
گانے :- آہ سیتاپوری
رنجیت کی تازہ ترین پیش کش
آٹھواں ہفتہ ۸
SHADI
شادی
اداکاران :-
مادھوری - موتی لال
خورشید - ایشور لال
ڈیکشٹ - غوری وغیرہ
ڈائرکٹر :-
جینت ڈیسائی
رائل اوپرا ہاؤس

خزانچی
کی عمر بمبئی میں چھ مہینے ہوگئی
بہت جلد دھوم دھڑکے سے
جشن جوبلی منائی جائیگی
روزانہ :-
۴-۷ اور ۱۰ بجے
سنیچر ۔ اتوار اور
تعطیل کے دن ۱ بجے
میٹنی شو ......
کرشنا سینما
پیش کش ۔ پنچولی آرٹ پکچرز
نمائش کار ۔ فیمس پکچرز لمیٹڈ
پربھات کے سلسلۂ
"سنت"
کی
تیسری قسط
سنت سکھو بائی
کی نمائش بہت جلد تمام ملک میں شروع ہوجائیگی
اداکاراں :-
ہنسا واڈکر
گوری ۔ کلکارانی
شانتا معظم دار
وغیرہ
ڈسٹری بیوٹرز
واملے اور فتح لال

خاص

بچوں کے چھپے غم

از جناب ڈاکٹر ... ماکرشن گروور بی ایس سی آنرز ایم بی بی ایس آنرز

گھر میں ننھے منے کی آمد والدین کے لئے کتنی مسرت کا باعث ہے ننھے کی آمد سے پہلے ہی ماں اُس کے لئے چھوٹے چھوٹے نفیس کپڑے چپکے چپکے بناتی ہے۔ کئی قسم کے کھلونے اکٹھے کرتی ہے۔ جب گھر میں بچہ آجاتا ہے تو ماں باپ کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ بچے کے لاڈ و پیار میں وقت گزرنے لگتا ہے۔ بچہ بھی ماں باپ کی محبت بھری آغوش میں پرورش پا کر ترقی کرتا ہے۔ لیکن قدرت کے قانون کے مطابق اب دوسرے بچے کی آمد آمد شروع ہو جاتی ہے۔ پہلا بچہ بھی خوش خوش نظر آتا ہے کیونکہ اُس کو بتایا جاتا ہے کہ اُس کا چھوٹا بھائی ایک زندہ کھلونا اُسے ملے گا لیکن بات کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

چھوٹے بھائی کے آتے ہی بڑا بچہ اُداس ہو جاتا ہے۔ بات بات پر رو اُٹھتا ہے۔ ناراض ہوتا ہے۔ ضدیں کرتا ہے اور گھر میں ایک عذاب بنجاتا ہے۔ والدین حیران ہوتے ہیں۔ کہ یہ تبدیلی کیوں اور کیسے ہو گئی۔ انہیں کچھ علاج نہیں سوجھتا سوائے اس کے کہ بڑے بچے کو سمجھایا جائے اور اگر وہ نہ مانے تو جسمانی سزا دی جائے۔

والدین کے اس سلوک کی اس تبدیلی سے بچہ گھبرا جاتا ہے وہ اسے محسوس کرتا ہے لیکن اُس کو یہ عیاں نہیں ہوتا کہ تبدیلی کیا ہے اور کیوں ہو گئی جیسے کوئی آدمی دانت کا درد محسوس کرتا ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ درد دانت کے کس حصہ میں ہے۔ اسی طرح بچہ یہ تو محسوس کرتا ہے کہ وہ دکھی ہے لیکن کیا دکھ ہے وہ اس کو جان نہیں سکتا۔ کچھ تو دماغ کی نازک حالت ہونے کے سبب اور کچھ ناتجربہ کاری کی وجہ سے۔ والدین کے سلوک میں تبدیلی سے بچہ کے رویّہ میں تبدیلی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ضدی فطرت کا ہے تو گھر میں کہرام مچ جاتا ہے۔ چھوٹے بھائی کو پیٹتا ہے۔ تنگ کرتا ہے اور اگر والدین پاس نہ ہوں تو اُسے جسمانی اذیت بھی پہنچاتا ہے۔ گھر کی چیزوں کو توڑنے اور گندگی پھیلانے میں اُس کا وقت گزرنے لگتا ہے۔ آخر میں والدین اُسے لاعلاج سمجھ کر اُس کی طرف سے نراش ہو جاتے ہیں۔ اور مجبوراً اُس کے اِس رویہ کو برداشت کرتے ہیں۔

اگر بچہ بھولا بھالا اور قدرے شریف طبیعت کا ہوا تو وہ دوسرے بچوں سے کھیلنا بند کر دیتا ہے۔ چھپ چھپ کر چپکے چپکے سسکیاں بھرتا ہے۔ ہر وقت اُداس رہتا ہے اور والدین کے سامنے آنے سے ڈرتا ہے۔

والدین دونوں حالتوں میں پہلے بچے سے تنگ آجاتے ہیں اور اپنی محبت زیادہ سے زیادہ چھوٹے بچے کو دکھاتے ہیں۔

دونوں حالتوں میں بچے کے جذبات سب پنہاں اور پوشیدہ ہیں۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ بچہ کے دل میں کیا درد ہے۔ اُس کے دل کی کوئی سننے والا نہیں۔ نہ وہ بیان کر سکتا ہے اندر ہی اندر وہ والدین کی لاعلمی کا شکار بن کر گھٹتا رہتا ہے۔ اُس کی ہمت ٹوٹ

جاتی ہے اور اُس کی دماغی ترقی رُک جاتی ہے۔

دُنیا سینما اور ناولوں میں مظلوموں کی آہوں پر آنسو بہاتی ہے لیکن دنیا کو یہ معلوم نہیں کہ ایک طبقہ "ایک فرقہ" ایسا بھی ہے جو اپنے جذبات عیاں کرنے میں قاصر ہے اور بڑا بھاری دلی دُکھ برداشت کرتا ہے اگر ہم بچوں کے چھپے ہوئے دلی عذاب کا خیال کریں تو سچ مچ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پریمیوں کی آہیں اگر کچھ زیادہ لمبی ہو جاتی ہیں تو دنیا تڑپ اُٹھتی ہے لیکن گھروں میں ہمارے جگر کے ٹکڑوں کے جگر پاش پاش ہو رہے ہیں اور ہمارے اندر ذرا بھی کوئی حِس پیدا نہیں ہوتی۔

آخر بچوں کی اِن کلفتوں کا اصلی سبب کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تک دوسرا بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ پہلا بچہ گھر کا ہی نہیں بلکہ اپنی ماں اپنے باپ اور اپنی ماں کے دودھ کا کُلی مالک ہوتا ہے۔ اُس کی ایک ایک ادا پر والدین واری جاتے ہیں۔ اُس کی ہر ایک خواہش پوری کی جاتی ہے۔ وہ ذرا بھی بسورے تو والدین بلائیں لیتے ہیں اور ہر ممکن طریقہ سے اُسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے بچے کے آنے پر جب اچانک والدین پہلے بچے کی خبرداری میں کوتاہی کرتے ہیں تو بچہ چاہے شکایت نہ کرے لیکن وہ اِس تبدیلی کو محسوس کرتا ہے۔ اُس کے اندر غصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے وہ اپنی عقل کے مطابق اس کا سبب ڈھونڈتا ہے کیا دیکھتا ہے کہ جس گود میں وہ بلا شرکت غیرے بیٹھا کرتا تھا آج وہ گود اُس کے لئے نہیں ہے۔ جس دودھ پر اُس کی واحد ملکیت تھی آج وہ دوسرے کے منہ میں ہے۔ والدین کا لاڈ۔ پیار پر جو اُسی کے لئے مخصوص تھے آج وہ ایک دوسرے کے لئے ہیں اُس کے ننھے سے دل میں انتقام کی آگ اُٹھتی ہے اگر اُس کا بس چلے تو وہ اپنے دشمن کی جان لے لے۔ اور ایسا دیکھنے میں آیا بھی ہے۔ کہ والدین کی غیر حاضری میں بڑا بچہ چھوٹے کو اتنی اذیت پہنچاتا ہے کہ کبھی کبھی اُس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کیونکہ ایسا کرنا ہر بچے کے لئے ممکن نہیں، وہ چھوٹے بچے سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ لیکن لے نہیں سکتا۔ اُس کے بدلہ کی آگ اُس کے دل کے اندر ہی اندر دب جاتی ہے لیکن بجھتی نہیں۔ اور یہ آگ اُس کی ہر ایک حرکت میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اگر والدین عقلمند ہوں اور موقع اور حالت [illegible] ں تو بات سلجھ جاتی ہے ورنہ نتیجہ نہایت اندوہناک اور دردناک ہوتا ہے۔

بچے کا دل غم اور بدلہ کی بھٹی بن جاتا

دل میں غصہ اور غم کو چند دن چھپانا پڑے تو ہم ادھ موے ہو جاتے ہیں لیکن جب اُس کے ننھے پھول جیسے نازک دل کو غصہ اور غم کو دنوں کے لئے نہیں بلکہ مہینوں اور سالوں کے لئے پینا پڑے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دل پر والدین کی ذرا سی لاپرواہی اور لاعلمی کی وجہ سے کیا گزر رہی ہوگی۔

بچہ اب والدین کا اور ننھے بچے کا دشمن ہو جاتا ہے۔ والدین کا اس لئے کہ انھوں نے اُس کا حق چھین کر ایک نئے گوشت کے لوتھڑے کو دیدیا۔ اور ننھے بچے کا اس لئے کہ وہی تو اُس کے سکھ لوٹنے کا کارن ہے۔ اب بچہ بات بات پر ضد کرتا ہے۔ کھانا کھانے سے انکار کرتا ہے اور روتا ہے یہ سب اس لئے کہ مبادا پھر والدین کو رحم آ جائے اور وہ اُسے گود میں لے کر پہلے کی طرح پھر پیار پچکار کر اُس کی سلطنت اُس کو واپس کر دیں۔ جب بچے کا یہ طریقہ بے کار ہو جاتا ہے تو وہ اب یا تو علانیہ دشمن بن جاتا ہے۔ یا پھر چھپا مار آستین۔ اب وہ والدین کا بدلہ اپنے بھیوں سے لیتا ہے۔ اُن کو مارتا ہے۔ پیٹتا ہے اور والدین کو کئی طرح کی شکایتیں پڑوسیوں اور دوستوں سے سننی پڑتی ہیں۔ اِن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ والدین اور زیادہ ناراض اور اُداس ہو جاتے ہیں۔ جب بچہ اسکول جاتا ہے تو والدین کی جگہ مدرسین کو پا کر اُن سے اپنے والدین کا بدلہ لیتا ہے ہر طرح سے اُن کو ستانے

اور اسکول کے ڈسپلن توڑنے میں حظ لیتا ہے۔ والدین کا بدلہ بڑے ہونے پر سماج سے لیا جاتا ہے۔ وہی بچہ پورا ڈاکو اور بدمعاش بن جاتا ہے۔ بچہ چاہے کمزور طبیعت کا ہو تب بھی حسد اور غصہ کی آگ اس کے اندر بھی اپنا کام کرتی ہے۔ وہ اداس ہو جاتا ہے کسی سے بولتا تک نہیں۔ سوتے سوتے پیشاب سے بستر خراب کر دیتا ہے اور خدانخواستہ اگر وہ کبھی بیمار پڑ جائے۔ اور والدین کی محبت امنڈ پڑے۔ تو اسے اچانک پتہ لگ جاتا ہے کہ بیماری سے والدین کی کھوئی ہوئی محبت دوبارہ مل سکتی ہے۔ چنانچہ وہ اب بیمار رہنے لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لڑکیوں کو ہسٹیریا یا [illegible] ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے اسکول میں جا کر دوسرے لڑکوں سے ہمدردی کے بھکاری ہو جاتے ہیں۔ ان میں بہادری معدوم ہوتی ہے اور اگر ان کو تعریف یا حوصلہ نہ ملے تو وہ بے پیندے کے لوٹے کی طرح ادھر ادھر لڑھکتے رہتے ہیں۔ یہ بچے زندگی میں ناکامیوں کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ قوم ان پر کسی قسم کا فخر نہیں کر سکتی۔ وہ اسی زمانہ سے گندھے ہوئے آٹے کی طرح ہیں جس کی شکل جس طرح کوئی چاہے بدل سکتا ہے۔

بچوں کی دلی کلفتوں پر ماہرین نے کافی روشنی ڈالی ہے اس مختصر مضمون سے بھی عیاں ہے کہ ان بچوں کی حالت قابل رحم ہے جن کو والدین نے دوسرے ننھے بچے کی پیدائش پر لاپروائی دکھائی ہو۔ والدین اگر ذرا عقلمندی سے کام لیتے تو یہی بچے قوم کے ہونہار فرزند ہو سکتے تھے۔ قوم کو آگے ترقی کی شاہراہ پر لے جاتے اور خود بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق بنکر قوم کے رکن ہو جاتے۔ طریقہ نہایت آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ننھے بھائی کے آنے پر بڑے بچے کو بھی گود میں رکھا جائے یا اس کو بھی دودھ پلایا جائے بلکہ اس کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ اب بڑا ہے۔ چھوٹے بھائی کا محافظ اور مددگار ہے۔ اس کو بھی چھوٹے بھائی کی پرورش میں حصہ لینے اور مدد کرنے کا موقعہ دیا جائے اور جب ضرورت ہو یا گاہے بگاہے ماں اس کو بھی اپنی گود کا آنند لینے دے۔ بچہ محسوس کرے گا کہ وہ چھوٹے بھائی کا راہبر ہے اور اپنی گود چھوٹے بچہ کے لئے خالی کر کے اس نے ایک قابل تعریف قربانی کا کام کیا ہے۔ وہ چھوٹے بھائی کو چومے گا۔ پیار کرے گا۔ اس کے اندر حسد اور غصہ کا جذبہ نہ رہے گا۔ وہ گھر میں مالک کی طرح رہیگا اور اپنے چھوٹے بھائی کی حفاظت ہر ممکن طریقہ سے کر کے یہ ثابت کرے گا کہ وہ سچ مچ بڑا ہے۔ چھوٹے بھائی کو کھلائے گا۔ کتے بلی اور دوسرے بچوں سے بھائی کو محفوظ رکھے گا۔ وہ ننھے کو اپنی ملک سمجھے گا۔ ماں کی گود کی ملک چھن جانے پر بھی اسے ایک اور زندہ کھلونے کی ملکیت مل گئی۔ جس سے اس کا دل بھرا رہے گا۔ وہ اپنے اندر خلا محسوس نہیں کرے گا۔ اور والدین کا مددگار بن کر گھر میں شانتی اور سکھ کا راج لے آئے گا۔

کیا مائیں اپنے ان اہم فرائض کو محسوس کریں گی جو دوسرے بچے کے آنے پر پہلے بچہ کی طرف سے عاید ہوتے ہیں اس لاعلمی سے قوم بگڑتی ہے اور عقلمندانہ رویہ سے بچوں کی زندگی بن جاتی ہے۔ کاش مائیں جانتیں کہ ان کی لاپروائی سے بچوں کے چھپے غم ان کی زندگی کو کتنا تباہ کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی لاعلمی سے اپنے ہی جگر کے ٹکڑوں پر ظلم کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

حجامت؟

از جناب سردار محمد ظفر بی۔ اے ہوشیارپوری

حجامت بنوانے کے بارے میں اور شریف آدمیوں کی طرح ہمارا بھی عقیدہ ہے کہ جس وقت محلے بھر کے بچے ہمارے سر کو دیکھ کر ڈر کے مارے بھاگنا شروع کر دیں تو اُس وقت ہمیں احساس ہونا شروع ہوتا ہے کہ بال واقعی بہت بڑھ گئے ہوں گے۔ اور اُنہیں جلدی کٹوانا چاہئے۔ لیکن اب کی دفعہ تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہماری گھر والی نے ایک دن سویرے سویرے ہمارے بڑھے ہوئے بالوں پر دو تین فقرے ایسے چُست کر دیئے کہ آخر کار ہمیں فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ آئندہ اتوار کو بال ضرور کٹوانے چاہئیں اور اس امر میں خدا بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ ورنہ گھر میں نقضِ امن کا خطرہ ہے۔ اس اعلان کی بیگم صاحبہ کو کافی خوشی ہوئی اور ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ ایک تو ہم ماشاءاللہ چشم بدور شکل و صورت کے بھی بُرے نہیں ہیں اور دوسرے جس دن ہم بال کٹوا لیتے ہیں تو ہم بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور اُس دن ہماری بیگم صاحبہ نفسِ نفیس تقریباً یہی چاہتی ہیں کہ ہم اُن کے سامنے بیٹھے رہیں اور وہ ہمیں دیکھتی رہیں۔ اس حقیقت کا اظہار وہ دبے دبے الفاظ میں کئی دفعہ کر چکی ہیں جس کے لئے ہم بہت مشکور ہیں۔ اور اب کے تو اُن کی خاص مہربانی تھی کیونکہ بالوں کو کٹوانے کی تحریک اُنہی کی طرف سے ہوئی تھی۔

خیر فیصلہ ہو گیا، بات آئی گئی ہو گئی۔ اتوار بھی آ گیا، اور بیگم صاحبہ نے ہمیں یاد بھی دلا دیا۔ ہم نے ناشتہ وغیرہ کیا اور قریب دس بجے کے بال کٹوانے کی غرض سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ کتنی دور نکل گئے۔ کئی ہیر کٹنگ سیلون راستے میں آئے لیکن ہمیں طبیعت نہ جمی۔ کسی کے بورڈ کا عنوان خراب دیکھا، کوئی بورڈ پرانا نظر آیا۔ اور بعض تو ایسے ایسے دقیانوسی بورڈ نظر آئے کہ وہ صرف بورڈ ہی تھے اور ادب کے نام و نشان کبھی کے راہیِ ملکِ بقا ہو چکے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک مقام پر پہنچے: "دلبر ہیئر کٹنگ سیلون۔ بال حسبِ منشاء کاٹے جاتے ہیں۔ اُجرت واجبی"۔ خبر نے اُس وقت کن خیالات میں غرق تھے۔ دلبر کا نام پڑھ کر طبیعت بالکل ہی کِھل گئی اور دل نے فوراً فیصلہ صادر کر دیا! "کہ جا این است"۔

لیکن جوں ہی اندر داخل ہوئے۔ ساری خوشی کِرکری ہو گئی۔ وہاں حالت بالکل ہی برعکس نظر آیا۔ چار آدمی بنچوں پہ لیٹے ہوئے تھے۔ اور چہروں سے بے وقوف سے معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اُن میں سے ایک آدمی شیر کی طرح اُٹھا اور ہماری طرف بڑھ کر کہنے لگا: "شیو ہوگا صاحب"؟

ہم "اِدھر اُدھر دیکھ کر"۔ "ارے بھئی شیو دیو بھی دیکھا جائے گا پہلے ہمیں ایک اور کام کرنا ہے۔"

وہ:۔ یعنی

ہم:۔ بال

ہمارے مُنہ سے بال کا لفظ نکلا ہی تھا کہ اُن میں سے ایک مُشٹنڈا سا حجام نما آدمی اُٹھا اور قصاب کی طرح ہمارے گرد ہو گیا۔ لیکن ابھی ہم کرسی پر بیٹھے تھے کہ ہمیں کچھ افسوس سا ہونا شروع ہو گیا کہ ہم ایسے سیلون میں کیوں آ گئے۔ وہ کمبخت اُسی طرح بیماروں کی طرح بنچوں پر لیٹے ہیں اور ایک مُشٹنڈے آدمی کے حوالے کر دیئے گئے اور یہ بیچارا اتنا کوتاہ قامت کہ

بالکل ہی کچھ نہیں۔ ایک تو سیلون کی کرسی کچھ ہماری حقیقت سے اونچی۔ اور پھر اُس پر ہم جیسا غضب کا قد آور قسم کا آدمی تشریف فرما۔ ذرا سمجھ نہ آئی کہ یہ حجامت کیسے کرتا ہوگا۔ پھر خیال آیا شاید یہ کرسی پر کھڑا ہو کر بال کاٹتا ہوگا۔ یا شاید اُن میں سے کوئی اِس کو گود میں اُٹھاتا ہوگا۔ پھر خیال آیا کہ ہم اونچی جگہ پر بیٹھے ہیں۔ شاید اسی لئے ہمیں وہ چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے۔ خیر دو ایک منٹ میں بہت سی مضحکہ خیز باتیں ذہن میں آئیں اور ابھی ہم اسی سوچ میں تھے کہ حجام صاحب نے پاؤڈر جو گھسے ہماری گردن پر پھینکے تو سارا کا سارا ہمارے منہ پر۔
"ارے بھئی یہ کیا بیہودہ پن ہے گردن سامنے ہوتی ہے یا منہ کے پیچھے" ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ "اتنی بھی تمیز نہیں تمہیں"

یہ بات سن کر اُن میں سے ایک آدمی اٹھا۔ اُس نے تولیا لیا۔ ہمارے چہرے سے پاؤڈر وغیرہ صاف کیا۔ اور پھر اُسی پر دراز۔ بہت غصہ آیا۔ دانت پیس کر رہ گئے ہونی شدنی جو بات ہونی ہو وہ ٹلتی کبھی نہیں۔ قہر درویش برجان درویش۔ دم بخود ہو کر پھر بیٹھ گئے لیکن غصہ ختم نہیں ہوگیا۔ ابھی ہمیں کئی آزمائشوں میں پڑنا تھا۔ تو سنئے۔ اب حجامت شروع ہوگئی۔ قینچی سے بال کاٹے جا رہے تھے۔ اور کنگھی کانوں پر ہونے کی طرح ہم جیسے ہی گردن پر قینچی کی نوکیں چبھتی جا رہی ہیں۔ اور اِدھر یار اُٹھا خدا کر کے گردن تو کبھی اس طرف موڑ رہے ہیں اور کبھی اُس طرف۔ اور ہم نے سمجھ لیا کہ آج گھر کو جنازہ ہی جائے گا اور اگر خدا نے فضل کیا تو علیحدہ بات ہے۔ ایک اسکول ماسٹر تھے۔ خدا اُن کو جنت نصیب کرے جب کبھی کسی کو سوال نہ آتا تو کہتے "ارے تو آدمی ہے یا حجام" ہم اس بات پر بہت غور کیا کرتے تھے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ حجام کیا آدمی نہیں ہوتے۔ آدمیوں کی طرح باتیں کرتے ہیں آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں۔ شادیاں کرتے ہیں اور پھر اُن کے بچے بھی ہوتے ہیں۔ ابھی ہم یہ سب کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ کان پر اس زور سے کنگھی پڑی کہ بس جان ہی نکل گئی اور سارے خیالات ہرن ہوگئے۔ اس دفعہ تو ہم بالکل نہ برداشت کر سکے۔ تنگ آکر کہا "ارے یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہمارا سر اور کان لکڑی کے نہیں ہیں۔ ان میں جان ہے جان۔ اور گردن بھی ہماری ربڑ کی نہیں ہے"

وہ۔ صاحب تمہارا سر بہت اونچا ہے۔ ہم کیا کریں

ہم۔ ارے تو ہم اپنا سر کیسے نیچے کر دیں۔ یہ مانا کہ تم چھوٹے ہو لیکن باقی مرے ہوئے ہیں۔ اور تمہارے ہاں سب ٹھنگنے آدمی ہی آتے ہیں کیا؟

ان میں ایک دو۔ صاحب معاف کیجئے گا۔ ابھی یہ صاف نہیں ہوا کام سیکھتا ہے۔ کبھی اچھا ہو جائے گا۔ آپ ہی بتائیں کہ اگر اس کو اس طرح موقع نہ دیا جائے تو یہ سیکھے گا کیا۔ ہم۔ سب کچھ ٹھیک سہی مگر اس مشق کے لئے ہمارے سر کو کیوں منتخب کیا گیا؟ سر ہے۔ بینگن نہیں ہے کہ جب چاہو کھا لو اور جو چاہو بنا دو۔ بڑے بڑے بیوقوف دیکھے۔ لیکن تم لوگوں جیسے یتیم العقل آدمی نہ کہیں دیکھے نہ سنے

وہ۔ صاحب بمبئی ہے۔ سب کچھ چلتا ہے۔ یہاں تو۔

ہم۔ عجیب آدمی ہو۔ تمہارے ہاں آئے تو کوئی شکل و صورت کو ذرا ٹھیک کرانے۔ اور تم بیچارے سر کا حلیہ بگاڑ کے۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے؟

وہ۔ صاحب آپ جو ہیں کہیں۔ ویسے تو ہم بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہمارے دادا ایک راجے کے شاہی حجام تھے۔ اتنے کاریگر اور ماہر تھے کہ ایک دن راجہ سویا ہوا تھا اور ہمارے دادا جان سوتے میں ہی حجامت کر کے آگئے اور راجہ کو ذرا بھی علم نہ ہوا۔

ہم۔ ہمیں تو یقین نہیں آتا۔ یا تو راجہ زندہ نہیں ہوگا۔ یا یہ بات جھوٹی ہے اچھا یہ بتلاؤ کہ تم سر منڈائی کیا لیتے ہو۔ اور اگر ہم تمہیں دگنی اُجرت دیں تو جان بخشی کی صورت ہو سکتی ہے؟

وہ۔ ابی صاحب! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوگئے۔

ہم۔ ایک بات بتلائے دیتے ہیں کہ اگر کوئی قسمت کا مارا ہماری طرح

بال کٹوانے یہاں آپہنچے۔ تو آئے کو رو نادم ہو گھاو یا کرو۔ کم از کم اتنی تحقیق تو نہ ہو۔

وہ۔ آپ بھی بس عجیب ہیں۔ یہاں کوئی آپریشن تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

ہم۔ اور یہ عمل تمہارے خیال میں آپریشن سے کیا کم ہے؟

ہم نے اُس کے ہاتھ پر ایک اٹھنی رکھی اور جان بخشی چاہی۔ اُسی طرح عجیب حالت میں، کان اور مُنہ سُرخ، گردن زخمی۔ چہرے پر گھبراہٹ سیلون سے عجیب غریب حلیہ میں نکلے اور گھر کی راہ لی۔ جونہی گھر میں داخل ہوئے۔ بیگم صاحبہ نے حسب معمول بسم اللہ کہا اور ہمیں دیکھ کر مُسکرائیں۔ اور ہم جواباً مسکرائے اور نہ ہی کچھ مُنہ سے بولے۔ گردن اور کانوں پر جو اُن کی نظر پڑی تو بس کلیجہ تھام کر رہ گئیں اور کہنے لگیں ابھی اتنا بھی کیا ہے۔ ہماری جان پر بنی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ کچھ کہتے ہی نہیں اور یہ گردن پر دانتوں کے نشان کیسے ہیں۔ خدانخواستہ کسی کتے نے کاٹ کھایا کیا؟

"پیاری ستم ظریفی کی بھی حد ہوتی ہے" ہم نے کہا۔

"کتا اور کاٹنے کہاں آیا۔ گردن پر۔ وہ تفصیلات! جان من۔ کتے وغیرہ نے کاٹا واٹا کچھ نہیں۔ ایک حجام نے بال کاٹتے وقت صرف قینچی کی نوکیں چبھوئیں۔ قسمت سیدھی تھی کہ ہم زندہ آ گئے۔ یوں کہئے کہ ہم خود چل کر آ گئے۔ ورنہ خیریت نہیں تھی"

اس واقعہ کو کتنی دیر ہو گئی ہے۔ لیکن اب بھی جب کبھی اُس سیلون کی طرف کبھی گذر ہو جاتا ہے۔ تو کان سُرخ ہو جاتے ہیں۔ گردن میں زخم اُبھر آتے ہیں۔

چہرے پر زردی چھا جاتی ہے اور وہاں سے چلا کر بھاگنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مسلسل افسانہ

بےخبری

از:- سحر

میرے دل و جان کے مالک خورشید کا طوطی بحر و بر پر بولتا ہے۔ اس کی بہادری کے چرچوں سے عالم گونج رہا ہے اس کی دلاوری کا شور ہے۔ آہ اُسے معلوم نہیں کہ میں کس قدر اُسے چاہتی ہوں۔ اُس کے بغیر میری زندگی موت سے بدتر ہے۔ خورشید! تیری اس بےخبری کے صدقے۔ تیری ایک ایک ادا پیاری ہے۔ میں مر بھی جاؤں گی اور تجھے خبر نہ ہوگی۔ آہ اوّل تو اُس نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور دیکھا بھی ہوگا تو غلیظ خاندان کے نوکر کی حیثیت سے۔ آہ اُس نے تو اچھی اچھی شاہزادیوں کو ٹھکرا دیا ہے۔ جو حُسن و جمال میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔ ایسا میں نے سُنا ہے۔ بھلا میں کس شمار میں ہوں؟ آہ ...... کیوں گئی تھی دعوت میں؟ مگر نہیں سادہ اور مردہ زندگی سے یہ درد آمیز مگر زندہ زندگی بہتر ہے۔

x x x x x (۱۲) x x x x x

"چلو نواب صاحب۔ چاندنی رات ہے ذرا سمندر کے کنارے سیر کر آئیں"

"مہاراج اب رات زیادہ گئی۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔ اب سو جائیے"

"نہیں بھئی دیکھو تو سہی کیسا خوشنما نظارہ ہے۔ میری ہی خاطر چلو" ....

....

"مہاراج! آج آپ بہت مزے میں آرہے ہیں"

انگڑائی لیتے ہوئے مُسکرا کر چلے!

راجہ صاحب۔ اور نواب صاحب معمولی شب خوابی کے لباس میں ہی سمندر کے کنارے چل دیئے۔ اس وقت کا منظر بیحد دلکش تھا۔ دونوں ہنستے مذاق کرتے سمندر کے کنارے پہنچے۔ یکایک راجہ صاحب نے چونک کر کہا۔ دیکھو نواب صاحب وہ سامنے سیاہ سیاہ چیز کیا ہے ذرا آگے بڑھتے ہوئے۔ ... ایں یہ تو کوئی انسان معلوم ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے دونوں پاس پہنچے۔ نجمہ اس وقت اسی دُھن میں مصروف باتیں کر رہی تھی جو اوپر لکھی جاچکی ہیں۔ راجہ صاحب، نواب صاحب کو چٹکیاں لیتے جاتے تھے اور خورشید مرزا سخت حیرت زدہ تھے۔ جب نجمہ سرد آہ بھر کر خاموش ہوگئی اور پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ تب یہ لوگ بید مشک کے سامنے والے پتھر پر جاکر بیٹھ گئے۔ اب نجمہ نے ان کو دیکھ لیا تھا مگر چونکنے کی کوئی بات نہ تھی چونکہ یہ عام تفریح گاہ تھی اور لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ نجمہ کا نصف چہرہ سیاہ شال میں سے چمک رہا تھا۔ خورشید مرزا چاہتے تھے کہ وہ اچھی طرح اس کے چہرہ کو دیکھ سکیں مگر راجہ صاحب کی وجہ سے مجبور تھے۔ نجمہ بھی نہ پہچان سکی کہ یہ کون ہیں۔ چونکہ وہ اپنے دھیان میں تھی۔ تھوڑی دیر خاموشی کا عالم طاری رہا پھر ان دونوں نے دیکھا کہ لڑکی آنسو پونچھتے ہوئے سسکیاں بھرتے ہوئے اُٹھی اور گھر کی طرف چل دی۔

راجہ صاحب نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ "بھئی خورشید تم نے بھی ہزاروں کو پریشان کر رکھا ہے اُدھر نازنین آفریں" رو رہی ہے

"حضور! میں آج غیر معمولی طور پر تھک گیا ہوں۔ طبیعت نہ معلوم کیوں گری گری سی جاتی ہے۔ آج تم نے خوب کیا بڑھیا کو مرنے سے بچا لیا۔ سب تمہاری جوانمردی پر عش عش کر رہے تھے۔ کل تم بہت اچھا کھیلے۔ میرے خیال میں تمہیں لوگوں کی نظر لگ گئی۔ تم شادی بھی تو نہیں کرتے ...... آج اگر بیوی ہوتی تو نظر گذر ہی اُتارتی۔

اور یہ حسینہ تڑپ رہی ہے اور تمہیں کچھ خبر تک نہ تھی اور نہ معلوم کتنے تڑپ رہے ہوں گے بلکہ مر رہے ہوں گے۔ ایک نہیں بھی اُنھیں میں ہوں مگر تم کسی کے نہیں بنتے۔ کسی پر التفات نہیں کرتے۔ کملا کا بدلہ ایک سے نہیں ہزاروں سے لے رہے ہو۔ جب تک کملا تمھیں نہ ملی تھی۔ دوست احباب سب کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ کملا نے ہم سے بھی تمھیں چھین لیا۔ کیسے زندہ دل تھے۔ تمہارے قہقہوں کی آواز کے لئے تو اب کان ترس گئے تمہارا شگفتہ اور مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئیں۔ خورشید پیارے سچ تو یہ ہے کہ صرف تمہاری ہی زندگی افسردہ اور بے مزہ نہیں بلکہ ہماری زندگی بھی بے مزہ ہو گئی ......

سچ کہنا کہ کملا اس حسینہ سے بھی زیادہ خوبصورت تھی؟ مہاراجہ نے پوچھا ــــ مہاراجہ محبت کسی چیز پر منحصر نہیں۔ حسن صورت حسن سیرت کا یہاں سوال ہی بیکار ہے۔ کملا جب ملی تھی بچہ تھی مصیبتوں کی ماری تھی ... .. اب وہ اسی عمر کی ہو گی۔ اور ہاں میں نے جہاں تک اُسے دیکھا ہے یہ لڑکی کملا سے بہت مشابہ ہے۔ کاش ہم اسے اچھی طرح دیکھ سکتے۔ ممکن ہوتا تو فوٹو اتار لیتے۔ تاکہ کملا کی نقلی یادگار ہی دل کو تسلی دینے کے لئے تو پاس رہتی اور حضور آپ یہ کیا فرماتے ہیں ... ... میں آپ سے چھین لیا گیا؟ ......

میری زندگی کا سہارا ہے میرے سنگھ مہاراج! کملا کے بغیر میں صرف آپ کے لئے زندہ ہوں ورنہ ...... دونوں ہاتھ پھیلا کر مہاراجہ نے خورشید کو گلے سے لگا لیا۔ اور فرط محبت سے اس کی چمکتی ہوئی پیشانی کو بوسہ دے کر کہنے لگے .... میرے پیارے دوست!

میں کملا کی تلاش میں ساری طاقتیں صرف کر دوں گا۔ خورشید مرزا کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو گر پڑے ـــ ...... مہاراجہ نے بہلانے کی خاطر ہاتھ پکڑ کر کھینچا آؤ ذرا اس شبیہ کملا کے مکان کا پتہ لگائیں ـــ ..... دونوں خراماں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لڑکی شاید وہی ہے جو کل مسٹر و مسز فلپ کے ساتھ تھی۔ نواب صاحب تم نے دیکھا ہوگا۔ یہ لڑکی بہت حسین ہے۔ چوراہے پر پہنچ کر سنتری سے پوچھا ادھر سے سیاہ شال اوڑھے ایک عورت گئی ہے۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ وہ کس سمت گئی ہے۔ حضور وہ تو سامنے والی کوٹھی میں رہتی ہے۔ مسز فلپ کی پرائیویٹ سکرٹری ہے" سنتری نے کہا۔ اچھا ... کہکر دونوں واپس چلے آئے اور سو رہے۔

(۱۳)

× × × × × ×

آج مسز فلپ کے زندہ بچ جانے کی خوشی میں مسٹر فلپ نے ایک بہت بڑی ٹی پارٹی دی ہے۔ مہاراجہ اور خورشید مرزا کے علاوہ اور والیان ریاست اور شہر کے عمائدین اور رؤسا شریک ہیں آج اس خوشی میں بجز نے بھی شفقی رنگ کی ساڑھی باندھی ہے ہلکے ہلکے زیورات بھی پہنے ہیں۔ ساری مجلس کی نگاہیں اس پر تھیں۔ وہ اس وقت بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

مہاراجہ نے ایسی حسین و جمیل لڑکی آج تک نہ دیکھی تھی۔ دل میں کہتے تھے کہ خورشید کہتا ہے کملا ایسی ہی تھی، اس کی وارفتگی بجا ہے کیوں نہ اس لڑکی کو شادی کے لئے تیار کیا جائے۔ کملا کو زمین نگل گئی یا آسمان لے اڑا۔ چپہ چپہ چھان مارا۔ اُس کا پتہ نہیں ملا۔ پھر وہ خلوص والی لڑکی... خورشید تم اس لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے یہ کملا کی ہم شکل ہے۔ اصل نہ ملے تو نقل سے ہی دل کو تسلی دو۔ میرا خیال ہے کہ تم اس سے محبت ضرور کرتے ہو گے۔ یہ بھی تمھیں چاہتی ہے۔ کہو کچھ بندوبست کروں؟ موقع سنہری ہے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ بھئی ہم تو راجہ ہو کر بھی بدقسمت ہی رہے۔ ایسی بیوی ملتی تو شاہی سے فقیری بدل لیتا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر... اب تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔

خورشید مرزا۔ حضور تو یہ کہئے کیا کہہ رہے ہیں آپ" مہاراجہ نے تھا

خوبصورتی و خوب سیرتی میں یکتا ہیں ..... اور پھر اتو ذکر چھوڑ دیجئے

میں کہلا سے بے وفائی نہ کروں گا لاکھ مشکل ہو کہلا تو نہیں !!

مہاراجہ کہنے لگے شاید وہی ہو !

خورشید فرط حیرت سے ششدر رسا ہو گیا۔ سکتہ کے عالم میں

اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ امیدیں جاگ اٹھیں .. آرزوئیں کروٹ

لینے لگیں .... ارمان مچلنے لگے۔ مگر یاس کے خوف نے اُسے پہلے

ہی خوف زدہ کر دیا۔ اُس کا حال اس وقت دیکھنے کے قابل تھا چہرہ

پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جسم میں لرزش تھی۔ آنکھوں میں امید و بیم کی

کشمکش، دل میں دھڑکن .. .... اتنے میں مسز طلب نے پکار کر کہا نجمہ!

خورشید پر گویا بجلی سی گری۔ بیچ حضور را خیالی قلعے

مسمار ہو گئے۔ کہلا نہیں بلکہ نجمہ ہے

اتنی سی بات سے نا اُمید نہ ہو خورشید صبر کرو۔ مہاراجہ نے کہا

دفعتاً ایک ملکوتی نغمے کی شیریں آواز ان کے کانوں میں آئی۔ نجمہ اپنی باری

پر پلیٹ فارم پر آ کر ایک سُریلا گیت گا رہی تھی .... آواز

میں ایک خاص بات تھی۔ جو مہاراجہ اور خورشید کے دلوں میں

چٹکیاں لے رہی تھی .... حاضرین جھوم رہے

تھے۔ مکرر سہ کرر کہہ کر ۱ منٹ کی بجائے پورا ایک گھنٹہ نجمہ کو پلیٹ فارم

پر رکھا .....

آج سے مالک و مالک کے دل میں نجمہ کی قدر و منزلت

زیادہ ہو گئی۔ —— (باقی باقی)

سحر تاج آفریدی

پرنٹر پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۸ سے
چھپوا کر دفتر رسالہ ماہنامہ تنویر
تھرڈ سائکلی اسٹریٹ بمبئی ۸
سے شائع کیا

بقیہ لمعات

ناظرین تنویر کی خدمت میں پھر حاضر ہوئی ہوں اور عرض کرنا

چاہتی ہوں کہ گزشتہ تنویر میں میرے نوٹ کو پڑھ کر جن بہنوں اور

بھائیوں نے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے ان کا شکریہ

ادا کرتی ہوں اور یہ جان کر میری ہمت بڑھ گئی کہ آپ کی نیک خواہشیں اور دعائیں

میرے شریک حال ہیں۔

اس مرتبہ تنویر میں چند تبدیلیاں کی گئی ہیں ایک یہ کہ فہرست کا صفحہ اڑا دیا

گیا ہے۔ کاغذ کی گرانی ہمیں اس پر مجبور کر رہی ہے۔ یہی ایک صفحہ مضامین کے اضافہ

کا باعث ہوگا اور دوسری تبدیلی یہ کہ لمعات آخر میں رکھے جائیں وجہ یہ کہ

کئی بھائی اور بہن اس بات کی شکایت کرتے تھے کہ ہمارا مضمون آخر

میں کیوں دیا گیا۔ بس یہ مناسب سمجھا

تاکہ شکایت کا موقع نہ دیا جائے۔

ایک بات یہ کہ آئندہ سے زیادہ تر خط و کتابت بذریعہ تنویر

ہوگی۔ سلسلہ وار چار اہم خطوں کے جوابات بذریعہ تنویر دئیے جایا کریں گے

پرائیویٹ خطوں کا ذکر نہیں ہے۔ (مدیرہ)

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

آہ اسلام ..... وائے مسلمانانِ عالم... . اور تُف بر مسلمانان ہند"۔ یہ الفاظ تھے جو آنسوؤں اور ٹھنڈی سانسوں کے جلو میں میری زبان سے نکلے جبکہ میں نے ایک ہٹے کٹے فقیر کو دیکھا جو اپنی تندرست ٹانگوں اور جسم پر پٹیاں لپیٹ کر ایک کھٹیا نما گاڑی میں بیٹھا کر بھیک مانگتا پھر رہا تھا مگر میری رگِ حمیت کو پھڑکا دینے والی بات یہ تھی کہ وہ رزاقِ عالم خدائے تعالیٰ کی حمد و ثنا اور سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعتیں گا گا کر بھیک مانگ رہا تھا میں نے کئی گلیوں تک اس کا پیچھا کیا۔ پہلے وہ گا رہا تھا بلغ العلیٰ بکمالہٖ پھر وہ گانے لگا۔ وہ دیکھو رسولِ خدا آ گئے ..... پھر اس نے گایا۔ سارے نبیوں سے اچھا ہمارا نبی..... اور ایک ایک مصرعہ کے بعد کہتا بابا خدا کے نام پر ایک پیسہ رسول کے نام پر ایک پیسہ دو۔ اللہ رسول تمھاری کمائی میں برکت دے غرضیکہ اسی طرح بے تکی باتیں کہتا جا رہا تھا۔ میرا دل خون ہوا جا رہا تھا کہ آہ آج اللہ اور رسول صرف اس مصرف کے رہ گئے ہیں کہ صحت و تندرستی، طاقتور اعضاء رکھتے ہوئے بھی اس نے کام کرنے کے بجائے خدا و رسولؐ کا نام لے لے کر بھیک مانگی جائے۔ دل چاہتا تھا کہ اسے خدا اور رسول کی اس بے ادبی اور توہین کرنے پر سزا دوں اور پکڑ کے جا کر اور کہوں کے جیل بھجوا دوں تجھے پتھر توڑنے کی مزدوری دلوا دیتی ہے جیلیں۔ مگر میں خاموش رہا لیکن......

اسی اثنا میں میں نے دیکھا کہ ایک دس برس کی لڑکی آ کے پیسہ دینے آئی وہ اکنی دے رہی تھی کہ چلا اٹھی کہ فقیر نے میری انگلی مروڑ دی اسے غصہ آ گیا اس نے جھپٹا مار کر اپنی اکنی واپس چھین لی اس پر فقیر نے اسی زبان سے جس سے کہ پہلا بڑی فصاحت و بلاغت سے خدا و رسول کا نام لے رہا تھا۔ لڑکی کو مغلظات سنانا شروع کر دیں۔ لوگوں کا مجمع اکٹھا ہونا شروع ہو گیا تھا یہ دیکھ کر میرا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ میں آگے بڑھا اور غضب زدہ سے ایک طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا اور کہا "تجھے شرم نہیں آتی۔ ایک منٹ پہلے جس منہ سے خدا و رسول کا نام لے رہا تھا اسی منہ سے یہ مغلظات بک رہا ہے"۔ اب فقیر نے تیور بدلے کہنے لگا "ہم فقیر ہیں ابھی پھونک ڈالیں گے۔ ایسا ویسا فقیر نہ سمجھنا"۔ میں نے کہا پھونک ڈالو یا جلا ڈالو تم سے جو ہو سکے کرو، مگر یاد رکھو اگر خدا و رسولؐ کا نام لے کر بھیک مانگی اور یا اسی منہ سے گالیاں بکیں تو تمھاری خیر نہیں۔ مار مار کے چمڑے سے بھیجا پلپلا کر دوں گا۔ ..لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اس مجمع میں سے کچھ میرے بھی ہمنوا تھے۔ مگر زیادہ تعداد فقیر کے حامیوں کی تھی کوئی کہتا مسلمان فقیر کو اس داڑھی والے نے مارا ہے ایک نے کہا "ارے یہ بھی تو مسلمان ہیں"۔ دوسرا بولا خاک مسلمان ہیں نہ پردہ۔ نہ شرم نہ حیا۔ نہ مذہب کا پاس نہ بے چارے فقیر پر ہاتھ اٹھایا کہتی ہیں کہ خدا کا نام نہ لے۔ بھیک نہ مانگ۔ مزدوری کر۔ بھلا آج کل کہیں مزدوری ملتی ہے..... اور سے بھی تو محنت کتنی .. پیسہ بھی اتنا نہیں"۔ ایک بولا... میرا ایک واقف کار سب سے پہلے بھوکوں مرتا تھا۔ پھر ایک جگہ نوکری کی ... نوکری کی ہزار پابندیاں اور کل دس روپیہ۔ جب سے بھیک مانگنے لگا ہے سال بھر کے اندر گاؤں میں دو مکان بنوا لئے..... بیل خرید لئے .... کھیتی باڑی ہوتی ہے....." وہاں سے یہ سب کچھ سنتی سناتی اپنی ایک عرب سہیلی کے یہاں پہنچی تو وہاں ایک بڑے زبردست عالم بیٹھے تھے..... وہاں اس امر پر بحث چھڑ گئی کہ کیا اسلام زمان و مکان مخصوص زبان اور کچھ ملکوں کی حدود میں محدود ہے۔ اگر ایسا ہے تو ساری دنیا کے لئے کیونکر ہو سکتا ہے۔ پھر تعلیم اسلامی پر بحث ہونے لگی۔

وہ کہنے لگے۔ ما سوا مسلمانوں کے تمام مذاہب کے ماننے والے گمراہ ملعون اور مردود ہیں جن قوموں کے نبیوں کا نام قرآن میں نہیں آیا ہے۔ انھیں ہم اہلِ کتاب نہیں مان سکتے"۔ میں نے کہا پھر آپ اس آیۃ کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

وَمَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

کہنے لگے چپ چپ... ایسا نہ کہو ورنہ رام اور سیتا ۔ کرشن وغیرہ کو ہم لوگوں کو نبی ماننا پڑے گا ... ۔ مجھے ہنسی آگئی۔ ان عالم صاحب کی زندگی پر اشتہار کچھ نہیں لکھوں گی۔ صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ان جیسا بے دین ہی کی بدولت آج اسلام کی یہ درگت بنی ہے جس کا ذکر میں اوپر کر آئی ہوں۔

نبی کریمؐ نے سچ فرمایا تھا کہ چودھویں صدی تک قیامت آجائے گی۔ دنیا کے لئے قیامت آئے یا نہ آئے۔ مگر حقیقت یہ ہے اسلام کے لئے تو قیامت آنے میں کوئی شبہ باقی نہیں۔ اسلامی تعلیم کیا تھی اور اب کیا ہوگئی اس کا حلیہ کس قدر بدل چکا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔

ہے اسلام ایسے اصولوں کا نام تھا جنکی وسعت اور ہمہ گیری پر زمان و مکان کا کوئی اثر نہ پڑ سکتا تھا جنکی ہمہ گیری اور افادیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے منزل حیات اور ضروریات زندگی سب ہم پہلو تصور کرتے تھے اور اسلام کا بجلی کی سی سرعت سے تمام عالم میں پھیلنا اس بات کی بین دلیل ہے ۔۔۔ اسلامی تعلیم سچے معنوں میں تمام دنیا کے لئے نعمت ہو۔ قبائلی امتیازات سے بالاتر قومی۔ ملی اور مختلف قسم کے انسانی جذبے جو انسانیت کی تخلیق کرتے تھے اسلام نے ان کا استعمال کر کے انسانیت کو اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا۔ اسلام درحقیقت اتحاد بین المذاہب ہے۔ اسلام نے کسی مذہب کی تردید نہیں کی ہے۔ جو خدا کی طرف سے بندوں پر نازل ہوا ہے یعنی پورا اسلام کی تعلیم محبت اور ایثار ہے۔ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں دنیا میں فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ۔ صرف خدائے واحد کی پرستش کرو۔ اس کی صفات سے اسے پہچانو۔ یہ بات انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور خدا کے سوائے کسی دوسرے کی پرستش نہ کرنا عزت نفس اور خودداری و آزادی کا سبق دیتا ہے۔ انسانوں کے مابین مساوات قائم کرتا ہے۔ مذہب اسلام کا فرمان ہے کہ اپنے اعمال نیک کرو۔ ہر برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے اس سے بچو۔ یہ ہے مذہب اسلام کی مختصر اور جامع تعلیم کون ایسا انسان ہوگا جو ان حقائق سے اختلاف ظاہر کرے اور ان کا منکر ہو اسلامی فرائض کا مقصد بھی صرف یہی تھا کہ ان نیک مفید اصولوں سے جو انحراف کرتا ہے اسے سیدھے رستے پر لایا جائے اور خود ان کی بھلائی کے لئے طاقت کا استعمال کیا جائے ۔ جب تک مسلمان اسی اسپرٹ کے ساتھ کام کرتے رہے وہ فاتح عالم رہے لیکن جب خارجی اثرات اور متحدہ و متفقہ شیطانی طاقتوں کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقع ملا تو اسلام کی اصلی روح اسلام میں نہ رہی اور وہ جو دوسروں کو جگانے آیا تھا خود سو گیا اور سب کے شامل حال ہو گیا۔ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے اسلام کا یہ کہنا کہ لکم دینکم ولی دین و تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور ہمارے لئے ہمارا دین۔ کیا کم ہے۔ اسلام تو اس دینی روح کو جو سب مذاہب میں ایک ہی تھی اور سو چکی تھی اسے بیدار کرنے کے لئے آیا تھا۔ اور اسی لئے اللہ پاک نے بشارت دی تھی کہ

اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

اس سے بڑھ کر اور کونسی نعمت دنیا میں انسانیت کے لئے ہوسکتی تھی۔

مگر افسوس ہم پر ہے۔ غیروں کے ساتھ نبی کریمؐ کا سلوک ہمارے لئے صحیح اسلام کا نمونہ قائم کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ بہت جلد مسلمان اسلامی تعلیم سے منحرف ہوگئے۔ اور اسلام خود غرضوں کے ہاتھوں پڑ کر بدنام ہو گیا۔ اور آج اسلام کو وہ فضیلت حاصل نہیں ہونے دی جس کا وہ مستحق تھا۔ آج کل تو اسلام اور انفرادی ضرورتوں اور جذبات کی سیرابی کے لئے استعمال ہوتا ہے مثلاً میاں بیوی کی لڑائی ہوئی۔ میاں نے کہا کہ عورت پردہ نہیں کرتی۔ لہذا اسلام کو خطرہ ہے ساما دکی گردن نہ ہوتی تب نہ اسلام کو خطرہ باقی رہے گا ۔ بے چارے اسلام کو آڑ بنا کر اپنے جذبہ دشمنی کو سیراب کر لیا۔ بیوی نے کہا کہ میاں انگریزی پڑھتا ہے لہذا کافر اسلام کو خطرہ ہے۔ آزادیٔ وطن کی خاطر ہم وطنوں کے فلاں شخص سے مل گیا ہے لہذا کافر ہے اور اسلام کو خطرہ ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو وہ دن بھی عنقریب آنے والا ہے کہ دشمنان صداقت یہ کہنے لگیں کہ میرے گدھے کا پیٹ پھول گیا ہے اور چونکہ اس سے میرے مخالف کو خوشی ہوتی ہے۔ لہذا اسلام خطرہ میں ہے دشمن کے گھر کی چھت ٹپک رہی تھی۔ ایک مسلمان نے اس کافر کی مدد کی اور چھت پٹوا دی۔ لہذا اسلام کو خطرہ پیدا ہو گیا۔

آہ.. جن باتوں سے اسلام کو خطرہ ہوتا ہے ان سے چشم پوشی کر لی جاتی ہے اور اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کو ایسی باتیں خطرے کی گڑھی جاتی ہیں کہ جن سے اسلام کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مسلمانوں کا یہ حال ہے۔ رہنمایان دین کی یہ لاپروائی۔ اسی کی بدولت اسلام کے خلاف سارے عالم میں جو سازشیں صدیوں سے کی گئی ہیں وہ اپنا پورا اثر دکھا رہی ہیں۔ اور وجہ کہ آج کا اسلام نبی کریمؐ کے اسلام سے بالکل مختلف بنا دیا گیا ہے۔ اب اسلام اس چیز کا نام رکھ دیا گیا جس سے صداقت کے گلے پر چھری پھیری جائے۔ حمیت اسلامی تو باقی رہی نہیں۔ اس پر تو الٹے تھپیڑے پڑے کہ وہ بے حس ہو کر رہ گئی۔ مسلمان حمیت غیرت، صداقت، شجاعت غرضکہ ہر بات میں ایسے مفلس ہو گئے ہیں کہ دین و مذہب تک رہن کیا جا چکا ہے ایسا رہن جس کے چھٹنے کی کوئی امید نہیں۔ خدا کے نام کو بھی فروخت کیا جا چکا ہے۔ شکر ہے کہ ملک مال و منال یا قبر و مدفنہ کی طرح خدائے اسلام کسی ٹھوس چیز کا نام نہیں ہے ورنہ وہ بھی رہن دکھلایا جاتا۔ آہ! دجال تو کیا نہیں بہت سے پیدا ہو گئے ہیں مگر مہدی ایک نہ پیدا ہوا۔

ندیفا تری کیا ہو گئی حالت اے قوم
رونا آتا ہے مجھے دیکھ کے صورت اے قوم
اپنی بے دینی سے اسلام کو بٹہ نہ لگا
کام وہ کر کہ میسر ہو شفاعت اے قوم

مسلمانو! آنکھیں کھولو اور اپنے اس فرض کو پہچانو جو خدا اور رسول کی طرف سے تم پر عاید کیا گیا ہے۔

آہ..... ٹیگور

گزشتہ ماہ انسانیت کا آفتاب اور ہندوستان کا مایۂ ناز فرزند، ادب اور آرٹ کی روح رواں ملک الشعرا رابندر ناتھ ٹیگور کا انتقال ہو گیا۔ لوگ روز پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ مگر ٹیگور کی جدائی دنیا کے لئے شاق ہے۔ ٹیگور کا عقیدہ ہمیشہ [illegible] دنیا کے تمام انسان ایک کنبے کے افراد تھے۔ یہی ایک بات ہے جو تمام مذاہب کی روح، اخلاق کی جان اور امن کی کنجی ہے۔ اور ٹیگور کی عظمت اور محبت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس عقیدے کی نشر و اشاعت تمام عالم میں کی جائے۔ یہ ہر انسان کا فرض اولین ہے۔ اسی میں دنیا کا امن و چین اور انسانیت کے لئے حقیقی راحت کا پیغام مضمر ہے۔ گزشتہ دنوں جب مس راٹھبون نے اپنی گوری چمڑی کے زعم میں ہندوستان کو حقیر سمجھ کر جو طعن و تشنیع کی تھی اور ہندوستانیوں کی ایک کالی چٹھی میں توہین کی تھی تو اس انسانیت سوز حرکت کو ٹیگور جیسا انسان بھی برداشت نہ کر سکا اور بستر علالت پر سے پڑے پڑے وہ دندان شکن جواب دیا جس نے ہندوستان کی عظمت و وقار کی لاج رکھ لی۔ ہندوستان اپنے لائق سپوتوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے اور نئے سپوت سو فیصدی غلامی کی پیداوار ہیں اور غلامی کی لعنت انسان کو جانور بنانے پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ اسے ادنیٰ قسم کا جانور بنا دیتی ہے۔

دو موتیں:— اس ماہ دو موتیں اور زبردست ہوئی ہیں ملک کے مشہور مزاح نگار مرزا عظیم بیگ چغتائی اور زبان اردو کے مشہور شاعر حضرت فانی بدایونی اس دنیا سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ مرزا صاحب کا پایہ مزاح نگاروں میں بہت بلند تھا۔ آپ کی تصانیف اردو لٹریچر کی زینت ہیں۔ گزشتہ سال مجھے آپ کا ایک خط ملا تھا جس میں آپ نے سرگزشت کی بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ میں اسے بہت اشتیاق سے پڑھتا ہوں اور اسی کے لئے تنویر کا بھیجنا منتظر رہتا ہوں۔ بھوپے کے کیریکٹر کے متعلق آپ نے فرمایا کہ کاش یہ میرے قلم سے نکلتا۔

حضرت فانی بدایونی نے حیدرآباد میں زندگی کے متعلق ایک شعر سنایا تھا وہ

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اس غلام ملک کی آب و ہوا اور مسموم فضا اہل کمال کو کب راس آ سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ اہل کمال جب تک زندہ رہتے ہیں۔ زندگی سے نالاں رہتے ہیں اور موت کی آغوش ہی میں انہیں آرام مل سکتا ہے۔ ملک کو ان کے کمالات سے سروکار نہیں اور نہ انہیں ملک کی فلاح و بہبود میں اپنے کمالات سے کام لینے کا موقع ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ اُف!

تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

بقیہ بر صفحہ ۴۲

نوٹ کر لیجئے:— چونکہ ہمارے بعض مہربان وی۔ پی واپس کر دینے کے شائق ہیں۔ اس لئے آئندہ سے وی۔ پی کا قاعدہ اڑا دیا گیا ہے۔ جن حضرات کے نام چندہ بقایا ہے وہ نئے خریدار صاحبان بذریعہ منی آرڈر چندہ روانہ فرمائیں۔

منیجر

فلم نیوز FILM NEWS

نیشنل اسٹوڈیوز:۔ کا تازہ شاہکار "بہن" کامیابی سے جا رہا ہے اس کے بعد کموڈٹی "غریب" تیز دوش اور نئی روشنی تیار کی جا رہی ہے۔ مسٹر محبوب کی آئندہ فلم "روٹی" ہو گی جس میں شیخ مختار، چندر موہن اور مس یشودھرا کاٹجو ایک نئی اداکارہ کام کریں گی آپ جواہر لال کی قریبی رشتہ دار ہیں۔

رنجیت فلم کمپنی:۔ "سرال" عنقریب ریلیز کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد "مہمان" اور چارلی کی صدایت کاری میں تیار کی ہوئی مزاحیہ فلم "دستخط" پیش کی جائیگی۔ نگار خانے میں اور بھی کئی تصاویر زیر تکمیل ہیں۔

پربھات فلم کمپنی پونہ:۔ "سنت سکھو" عنقریب ریلیز ہونے والی ہے۔ مسٹر شانتارام عمر خیام سے متعلق سوچ رہے ہیں۔ رام شاستری یا کالیداس کی بھی کافذی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ "سنت سکھو" مسٹر فتح لال اور دامُلے کی زیر صدایت تیار ہوئی ہے۔

بمبئی ٹاکیز:۔ کا نیا "سنسار" کافی مقبول ہوا ہے۔ "آزاد" کے بعد "نجام" بالکل تیار ہے اور بہت جلد ہی نمائش کیلئے پیش کردی جائیگی۔ اس میں عرصہ کے بعد اشوک کمار اور دیویکا رانی پھر سے ہیرو ہیروئن بنے ہیں۔

پنچولی آرٹ پکچرز لاہور:۔ "خزانچی" نے موجودہ فلموں میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے اس کے بعد "خاندان" اور "مینا بازار" نامی تصویر پیش کی جائیگی۔ پنجابی زبان کی تصویر "چودھری" بالکل تیار ہے اور عنقریب نمائش کے لئے پیش کی جائیگی۔

واڈیا مووی ٹون:۔ "بمبئی والی" نے بمبئی میں خوب مقبولیت حاصل کی ہے اس میں نادیا اور سردار منصور و اداکارانی کام کرتے ہیں۔

منروا مووی ٹون:۔ ڈائرکٹر سہراب مودی "سکندر" کو پایہ تکمیل تک پہنچا چکے ہیں۔ اس کے بعد آپ کوئی سوشیل پکچر تیار کریں گے۔ جس کے لئے نیشنل اسٹوڈیوز سے سردار اختر کی خدمات عارضتاً لے لی گئی ہیں۔

چترا پروڈکشن:۔ کی اولین تصویر "کنگن" جس میں لیلا چٹنس نے اداکاری کے علاوہ صدایت کاری اور رقص میں بھی حصہ لیا ہے۔ ۱۹ ستمبر کو امپیریل سنیما میں پیش کردی گئی۔

فضلی برادرس لمیٹڈ کلکتہ:۔ "مسور" نہایت تیز رفتاری سے تیار کیا جا رہا ہے کے بعد اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ "چور نگی" فلم بنایا جائے گا۔ اور اس کے بعد سہراب رستم کی تیاری کی خبر ہے۔

نیو تھیٹرز لمیٹڈ کلکتہ:۔ نگار خانے میں بنگالی مزاحیہ فلم "ڈاکٹر" اردو زبان میں فلمایا جا رہا ہے۔ بنگالی زبان میں یہ فلم بہت مقبول ہوئی ہے۔

"بہن"

نیشنل اسٹوڈیوز کے مایۂ ناز ڈائرکٹر مسٹر محبوب نے "بہن" سی تصویر پیش کرکے اپنی حاصل کردہ شہرت کو برقرار رکھا ہے۔ انکی صدایت کاری نے اعلیٰ اداکاری کے ساتھ ملکر تصویر پر جادو جگا دیا۔ اور یہ طور پر کہا جا سکتا ہے کہ "بہن" عام تصویروں سے بالاتر ہے۔ مختار اور کنہیا لال کی اداکاری روز بروز ترقی پر ہے۔ نلنی جیونت، ہریش اور شریف ٹانی نے بھی مناسب کام کیا ہے۔

مینا، سوری، وجاہت مرزا اور صفدر صاحب جیسے اصحاب نے کہانی مکالموں اور گانوں میں کمال فن ظاہر کیا ہے۔ موسیقی جو مسٹر انل بسواس کی رہین منت ہے نہایت اچھی ہے۔

مجموعی طور پر فلم بہت کامیاب رہا۔

ہندوستان کی مقبول اداکارہ لیلا چٹنس کا بہترین کارنامہ
KANCHAN.
Starring
Leela Chitnees
CHITRA
کنچن
ڈائرکٹر مسٹر منی بھائی ویاس
"کنگن اور بندھن" کی مشہور ہیروئن کا اولین رقص دیکھ کر آپ مبہوت رہ جائیں گے
یقین رکھیے، ایسا دلچسپ نظارہ آپ نے کبھی بھی نہ دیکھا ہوگا
لیلا چٹنس - اروکن - پرمیلا - مبارک - بملا - ناگنیلا وغیرہ
بروز جمعرات
ستمبر سے

گودریج سوپس لمیٹڈ سیلز ڈیپارٹمنٹ ڈی لائل روڈ بمبئی

ماہنامہ
تنویر
بمبئی
TANVIR
Vol 5
No 8
AUGUST 1941
KIRAN

ماہنامہ تنویر بمبئی

جلد ۵ شمارہ ۸

مدیرہ :- سحر

نائب مدیرہ :- انوری خانم سحر

فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی نمبر ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر "تھرڈ سائکل اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸ سے شائع کیا

بہت دنوں سے دل چاہتا تھا کہ ناظرین تنویر سے کچھ باتیں کروں خطوط کے ذریعے اُن کی تو سُنتی رہتی ہوں، کچھ اپنی بھی کہوں۔

آج سے تقریباً پانچ سال پہلے میں نے تنویر کو جاری کیا تھا جن بلند مقاصد کے لئے اس کا اجراء ہوا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکی۔ اس کا مقصد انسانیت "کی نشر و اشاعت، انسانی اخوت کے جذبے کی بیداری۔ انسانوں کے کرداروں کو اعلیٰ ترین بنانا۔ سماجی برائیوں کا انسداد غلامی کی لعنت کو دور کرنا۔ بوسیدہ اور بے فائدہ چیزوں میں انقلاب کرنا عورتوں کے حقوق کی حمایت ہندو مسلم اتحاد، وطن کی خدمت جملہ مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی ہے اس خیال کی تشریح تاکہ انسان قریب تر آ سکیں اور دنیا بہشت بن جائے۔ یہ مقاصد لیکر تنویر عالم وجود میں آیا۔ اپنی پالیسی کی عظمت اور دلیری و راستی کا لوہا مخالفین سے بھی منوالیا۔ جب میں نے اسے شروع کیا تھا تو اس کے لئے کافی روپیہ بنک میں جمع کر دیا تھا اور اس مضبوط ارادے کے ساتھ اسے جاری کیا تھا کہ اگر ایک بھی خریدار نہ ملے تب بھی اسے میں دو سال تک جاری رکھ سکوں۔

میری نیت نیک تھی الحمدللہ اس اخبار نے یہاں تک ترقی کی کہ بیٹھے بیٹھے ہی تنویر اپنا بار خود سنبھالنے کے قابل ہو گیا۔ شروع شروع میں ا ـــــ میری بہن انوری خانم اور ایک میری عزیز ترین سہیلی.. ... میں جن نکہت کے نام سے یاد کروں گی۔ اسے سنبھال رہے تھے۔

تنویر ہی ایک ایسا رسالہ تھا جس کا تمام دکمال انتظام صرف عورتوں کے ہاتھ میں تھا ـــــ یعنی جو کہ مضمون نگاروں سے خط و کتابت کرنا۔ مجموعہ اخلاف لکھنا ترجمہ کرنا۔ تصحیح کرنا۔ اشتہار لانا۔ حساب و کتاب رکھنا۔ چھپوانا۔ پوسٹ کرنا سب کام ہم ہی لوگ کرتے تھے۔

سب سے زیادہ تکلیف کا کام اشتہار لانا ہوتا تھا۔ نکہت اس معاملے میں میری رہنمائی کرتی تھیں۔ چونکہ وہ خاص بمبئی کی باشندہ ہونے کے علاوہ بزنس اور تجارتی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس شعبے سے کافی واقفیت رکھتی تھیں۔ ورنہ بھلا میں ایک پٹھان قوم کی لڑکی بزنس وغیرہ کیا جانتی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جب ہم اشتہار لینے جایا کرتے تو کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ پارٹی کے ذمہ دار اشخاص دو دو تین تین دفعہ بلاتے اور بعد میں ملنے سے انکار کر دیتے۔ ایسے موقعہ پر خون کھول کھول کر رہ جاتا! مگر نکہت سمجھاتیں کہ "تنویر کی خاطر برداشت کرو"۔ کنویسروں کو بڑا حوصلہ رکھنا اور ہمت سے کام لینا چاہئے۔ اس لئے میں صبر کا تلخ گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ پارسی فرمیں اور پارسی لوگ اس معاملہ میں بہت اچھے ہیں۔ اس قوم میں اب تک عورت ذات کے لئے عزت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

تنویر کی انسانیت نواز پالیسی سے نہ معلوم کیوں، نہ تو ہندوؤں کی اکثریت خوش رہی اور نہ مسلمانوں کی۔ مسلمان ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ یہ کانگریسی پرچہ ہے۔ اس لئے آدھا ہندو ہے، ہندوؤں نے اسے اس لئے نہیں اپنایا کہ اُردو کا رسالہ ہے اور اردو گویا صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

غرضیکہ دونوں طرف سے غریب تنویر اور مجھ پر دھتکار ہی پڑتی رہی اس میں شک نہیں کہ اس پر بھی تنویر کے قدر دانوں کی کمی نہیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ آج اس رسالے کے خریدار اردو میں ہندو

مسلمان، پارسی، عیسائی، عورت، مرد، اعلیٰ طبقہ، متوسط طبقہ اور غریب یعنی
ہر قوم ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ اور جن کی دلی محبت قدر دانی اور
حوصلہ افزائی سے یہ پرچہ اب تک چل رہا ہے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوتی
ہے کہ تنویر کے مخالفین بھی اس کی سچائی اور اس کی پالیسی کے خلوص کے قائل ہیں

ریاست حیدرآباد میں میرے ایک نہایت مخلص اور سچے مسلمان
بھائی ہیں۔ جو تنویر کے خریدار بنے تھے۔ وہ مسلم لیگی تھے۔ تنویر کی آزادیٔ وطن
کی پالیسی کی وجہ سے وہ اسے کانگریسی رسالہ سمجھنے لگے۔ اور جب چندہ
ختم ہوگیا۔ تو انھوں نے مجھے ایک خط کے ذریعہ اسے بند کر دینے کیلئے
کہا اور اس کی پالیسی کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس پر میں نے
دُکھے ہوئے دل سے اُنھیں ایک خط لکھا کہ "تنویر انسانی اخوت" جو عین اسلامی
تعلیم کے مطابق ہے۔ اس کا قائل ہے اور آزادیٔ وطن کا حامی ہے۔ صرف اسی
وجہ سے آپ اسے موجودہ سیاست کی دلدل میں پھنسا ہوا خیال نہ فرمائیں۔ یہ اس سے
بہت بلند و بالا ہے۔ اگر مسلمان "تنویر" کو صرف اس لئے ناپسند کریں گے
کہ یہ متعصبانہ پالیسی کیوں نہیں رکھتا اور ہندو اس سے صرف اس لئے نفرت
کریں گے کہ اُردو میں کیوں چھپتا ہے تو اس کا خدا ہی حافظ" ہے۔ میرے خط
نے اِن مہربان بھائی کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ وہ نہ صرف خود مستقل خریدار
بن گئے بلکہ اُنھوں نے اپنے احباب کو بھی اس کی خریداری پر مجبور کیا۔ اور
بیس پچیس خریدار اسے دیئے۔

اسی طرح باوجود اختلاف کے بھی تنویر کے مہربان ترین خریداروں میں کافی
مخلص مسلم لیگی بہنوں اور بھائیوں کی اکثریت ہے۔ چونکہ وہ بھی بنیادی طور پر سچے
[illegible] اور قوم کی فلاح و بہبود اسی میں سمجھتے ہیں اس لئے اختلاف کے باوجود
وہ اس سے نہ صرف ہمدردی رکھتے ہیں بلکہ اس کے اخلاقی طور پر مددگار بھی ہیں یعنی
خریدار ہیں۔ اس معاملہ میں میرٹھ کے ایک مشہور خاندان .... کی
میں خاص طور پر شکر گزار ہوں اور اُن کی تنویر سے سچی ہمدردی کی معترف ہوں
میں تمام ناظرین تنویر کو اس بات کا یقین دلا دینا چاہتی ہوں کہ تنویر نہ کانگریسی
ہے نہ مسلم لیگی۔ اس کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ انسانیت کا مبلغ ہے
محبت اور اخوت کا پیغامبر ہے۔ انسانوں کے مابین تفرقہ پردازی سے اسے نفرت
ہے۔ اس کے نزدیک اچھے انسان قابل عزت و تعظیم اور بُرے انسان قابل رحم
و کرم ہیں۔ آزادیٔ وطن کا علمبردار ہے۔ علم و فضل، ادب اور آرٹ کا خدمتگذار ہے

گزشتہ دو سال سے تنویر کے لئے ایک آزمائشی دور درپیش
ہے۔ جنگ اور کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اسے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے
اُسے اخبار والے بخوبی جان سکتے ہیں۔ ناظرین شاید اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔
اسی دوران میں بدرجۂ اتم مجبوری اس کے صفحات میں جنگ کے زمانہ تک
کے لئے کمی کی گئی۔ اس سے اس کی دلکشی میں بھی کمی ہوگئی۔ خرچ میں کفایت کی غرض سے
مضمون نگاروں کو جو بکثرت خط لکھے جاتے تھے اُن میں تخفیف کی گئی۔ آفس کے اخراجات کم کر دیئے گئے جو پانچ
سو روپیہ جو مفت دیا جاتا تھا اس میں حتی الامکان کمی کی گئی۔ اس کے نتیجے کے طور پر اعلیٰ مضامین بھی قریب قریب کم ہوگئے
خیر مجھے اپنے آپ پر اعتماد تھا اور اب بھی اگر زیست نے توفیق دی تو کہہ سکتی ہوں کہ میرے پاس بنی نوع
انسان کی بھلائی کے لئے اتنا لکھنے کو موجود ہے کہ کم از کم بیس سال تنویر کے صفحات میرے قلم سے نہایت
دلکش انداز میں باآسانی پُر کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بقول غالب

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے + ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں + میں کہاں اور یہ وبال ؟ کہاں

جنگ کے طول کھینچنے سے تنویر کے لئے اور بھی وقت کی گھڑیاں
آن پہنچیں اور ہر ماہ خسارہ ہونے لگا۔ دلچسپی کم ہونے کی وجہ سے خریدار
بھی کم ہونے لگے ان میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ وی پی منگوا کر
واپس کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ادارہ کو سخت نقصان پہنچا ہے
میرے ہمدرد اور بے تکلف دوستوں بالخصوص میرے شوہر نے
مجھ سے کہا کہ اب اس دردِ سری سے کیا حاصل۔ جنگ کے ختم ہونے تک
اسے بند کر دو۔ جس وقت میں نے یہ بات سنی۔ گویا مجھ پر ایک بجلی سی
گر پڑی۔ تنویر کو......... اپنی معنوی اولاد سمجھتی ہوں یہ میرے
خیالات کی نشر و اشاعت کرتا ہے کوئی ماں اپنے زندہ رہتے اپنے

بچے کو موت کے سپرد نہیں کر سکتی۔ اسی لئے میں نے اپنی جان اور جسم پر تکلیف
برداشت کر کے اسے زندہ رکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اور اس کے لئے
۲۴ گھنٹوں میں سے ۸ گھنٹے صرف کرتی ہوں۔ ٹیوشنیں وغیرہ کر کے اس کا
خرچ پورا کر دیتی ہوں۔ میں چندے باز اخبار نویس تو ہوں نہیں کہ پبلک
سے اپیلیں کروں۔ خدا نے مجھے اتنا غیور بنایا ہے کہ آج تک تنویر پر
کسی کا کوئی بیجا احسان نہیں تھا یا اگر کسی سے ایک سال کا چندہ لیا ہے تو
اُسے ڈیڑھ سال رسالہ پڑھنے کو دیا ہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تنویر پر کسی
کا ایک پیسہ بھی باقی رہا ہو۔

اکثر یہ بات میرے نوٹس میں لائی جاتی ہے کہ فلاں صاحب نے دو سال
تک پرچہ جاری رکھا کہ چندہ بعد میں بھیجیں گے اور آخر میں جب انھیں
خط لکھا گیا کہ اگلے ماہ آپ کو وی۔پی کے ذریعہ رسالہ آئے گا۔ وصول کیجئے
اور اگر وصول نہ کرنا ہو تو ابھی سے ایک کارڈ کے ذریعہ اطلاع دیجئے۔ ایسے
لوگ تین پیسہ خرچ کر کے کارڈ لکھنے سے بھی احتراز کرتے ہیں اور جب وی پی
جاتا ہے تو واپس کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک اصلاحی ادارے کا نقصان
اُن کی ذرا سی غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں سے بھی مجھے
کوئی گلہ نہیں چونکہ وہ اپنی حالت کے خود ذمہ دار نہیں ہیں۔ اور اسی لئے
مجھے تنویر کے نقصان سے تو رنج نہیں ہوتا چونکہ میں اسے اپنے زورِ بازو
سے پورا کر لیتی ہوں۔ البتہ اپنی قوم کی انتہائی پستی کو دیکھ کر قلق ہوتا ہے۔
اب اس قدر طول و طویل بیان کے بعد اصل بات کہنے کی یہ ہے کہ اس نزاعی
دَور میں میرا مقصد صرف تنویر کی زندگی کو قائم رکھنا ہے۔ کوشش اس بات
کی بھی کروں گی کہ معیار اور دلچسپی بھی قائم رہے۔ مگر یہ صرف میرے بس
کی بات نہیں ہے۔ اگر میرے دیرینہ کرمفرما مضمون نگار میرے حالِ زار
پر رحم فرمائیں اور اپنی قلمی کاوشوں سے تنویر اور سحر کو اس طرح نوازیں
کہ اپنی اس نوازش کیلئے مجھ سے ظاہری رسم شکریہ کی بھی اُمید نہ رکھیں تو
تنویر کا معیار قائم رہ سکتا ہے۔ تنویر کی زندگی کے لئے مزدوری کرنے کے
بعد مجھ میں اتنی سکت باقی نہیں رہتی کہ میں فرداً فرداً ہر صاحبِ قلم سے مدد کے لئے
التجا کروں۔ اُمید ہے کہ حضرت مجنوں گورکھپوری۔ فراق گورکھپوری۔
عبدالمالک صاحب آروی۔ قیصر امراؤتی۔ رضیہ بیگم صاحبہ۔ رابعہ بیگم صاحبہ
نکہت لکھنوی صاحبہ، بہن سلمیٰ نثار صاحبہ۔ حضرت جوش ملیح آبادی
حضرت ساغر نظامی، پروفیسر بس چند صاحب۔ ڈاکٹر رادھا کرشن صاحب
محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ، بہن صفیہ شمیم ملیح آبادی، بہن چاند رانی صاحبہ
سید مصطفیٰ علی صاحب، بھائی سید صبری۔ حضرت روش صدیقی۔ جناب
قدسی امیری، حضرت احسان دانش۔ دکھی پریم نگری صاحب۔ قادر نیازی
صاحب، بہن پریم لتا ادیتی بہن صاحبہ اسرائیل احمد خاں صاحب اس پر خاص
توجہ دیں گے۔ جنگ کے بعد جب مجھے دم لینے کی فرصت ملے گی تو ایک ایک
مہربان کا ہزار ہزار بار شکریہ ادا کروں گی۔

اس کے بعد تنویر کے خریداروں سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب اس قدر
قلیل چندہ میں تنویر اسی صفحات کا نکلتا تھا اور دلکشی میں اپنی مثال آپ
تھا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ کا منظورِ نظر تھا۔
آج امتدادِ زمانہ نے اسے اُتنا معیاری اور دلکش نہیں رہنے دیا۔
صرف اس لئے آپ اس کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ جنگ کے بعد انشاء اللہ
آپ کی نوازشوں اور قدر دانی کا بدلہ عملاً ادا کر دیا جائے گا۔ اور یہی رسالہ
ہر لحاظ سے بہترین اور معیاری شکل میں آپ کی خدمت کرے گا کہ آپ
اپنے تنویر پر فخر کریں گے۔ جن خریداروں نے اس کا ساتھ ایسے آزمائشی
وقت میں چھوڑ دیا ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت تنویر
مجبوری ہے حالات ایسے نہیں ہیں کہ تنویر امتیازی طور پر آپ کی خدمت
میں حاضر ہو سکے۔ البتہ لڑائی کے بعد تنویر اُن کی خدمت میں مفت حاضر ہوگا
اگرچہ وہ اس کے لئے چار آنے مہینہ یعنی ایک روپیہ سالانہ بھی خرچ
نہیں کر سکے مگر میرا خیال ہے کہ قومی تعمیر میں ایسے ہی حضرات کے لئے تنویر

کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ایک ضروری بات کہہ کر ناظرین تو سے رخصت ہونا چاہتی ہوں وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں تحریر کے معیار سے متعلق اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا مجھے پورا احساس ہے۔ گزشتہ ماہ ایک افسانہ ایسا شائع ہو گیا جسے شائع نہ ہونا چاہئے تھا۔ اور جب وہ میری نظر سے گذرا تو میں مارے ندامت کے پانی پانی ہو گئی۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورا احساس ہے۔ اُمید کہ آپ سب بھی مجھے قابل معافی سمجھیں گے۔ آپ کی حمایت کے سہارے ہی میں یہ مصیبت کے دن ہنس کھیل کر کاٹ سکوں گی۔

اور اس کے بعد آپ دیکھئے گا کہ وہی ۱۹۳۶ء والا آپ کا تو برتن اور وہی میں ہوں ——

مستحر

بمبئی کے کارپوریٹروں کا فرض

یوں تو بمبئی آج سے ۱۰ برس پہلے سے بدنام ہے کہ یہاں پر کھانے پینے کی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ کنوؤں کے تازہ پانی سے لے کر کھانے پینے کی چیز ملاوٹی اور گراں داموں ملتی ہے۔ مگر آج کل یہ حالت اتنی بگڑ چکی ہے کہ ہم یہاں کے بستی فادرز کو مخاطب کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔ پانی کے سوال کو چھوڑ دیا جائے تو دودھ، گھی اور گوشت کا تمام انتظام کارپوریشن کے ہاتھ میں ہے خالص گھی کا بھاؤ چودہ آنہ رطل سے ایک روپیہ رطل ہے مگر ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایک دکان پر بھی خالص گھی نہیں بکتا۔ ہر جگہ بناسپتی گھی کو اصل گھی کی خوشبو دیدی جاتی ہے اور چار آنے کا ایک روپیہ بنا لیا جاتا ہے۔ ہمارے محلے کے دکاندار یہ ترکیب برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں مگر آج تک کسی کو ایک چونی تک کا بھی جرمانہ نہیں ہوا۔ کاش کارپوریشن کی اس حوصلہ افزائی کا رخ کسی اور طرف ہوتا۔ دوسری چیز جس پر کارپوریشن کو توجہ دینا چاہئے۔ وہ دودھ ہے۔ دودھ چار آنے سیر سے لے کر چھ آنے سیر تک ملتا ہے مگر ملاوٹی سائنس کی ترقی اور مہربانی سے ایک خاص قسم کا پاؤڈر ایجاد ہو چکا ہے جو پانی میں گھول دیا جاتا ہے اور ایک آنے کے چھ آنے بنا لئے جاتے ہیں۔ مگر کوئی ان لٹیروں کو پوچھنے والا نہیں۔ ہمارے شہری باپ "یورپ اور امریکہ کی دوسری تمام باتوں میں کامیاب نقل کرتے ہیں مگر اس اہم معاملے میں اُن سے ان غیر ملکی حکومتوں اور کارپوریشنوں کی نقل نہیں ہو سکتی۔ کاش یہ شہری باپ کبھی یہ سوچیں کہ اُن کی اس غفلت سے اُن کے بچے کس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ ہماری یہ پیشین گوئی ہے کہ اگر ہمارے ان سٹی فادرز نے اس بیماری کا کوئی علاج نہ کیا تو چند سالوں میں ہمارے بچوں کی صحتیں اس حد تک بگڑ جائیں گی کہ پھر شاید سدھرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ تیسری چیز گوشت ہے۔ اس کے دام پانچ آنے سے چھ آنے رطل تک ہیں۔ جس دن گوشت شہر میں بکتا ہے کہتے ہیں کہ اُس سے ایک دن پہلے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ جگہوں پر صبح چار پانچ بجے ذبح ہوتا ہے اور ایک گھنٹے بعد گوشت بازار میں بکنے کو آجاتا ہے اور بھاؤ بمبئی سے نصف ہوتا ہے۔ بمبئی کے کئی ہوٹلوں میں تو یہ کیا جاتا ہے کہ پرندوں کی ہڈیوں میں مرغیوں کا گوشت، مرغیوں کی ہڈیوں میں بکری کا گوشت اور اسی طرح بکری کی ہڈیوں میں بھینس کے گوشت کے گلے ہوئے تکے چڑھا دیئے جاتے ہیں۔ اور مزدور تنددوں سے رقم اینٹھ لی جاتی ہے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی سٹی فادر نے کہیں جا کر ان باتوں کو غور سے دیکھا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جب گھی، دودھ، گوشت والے LICENSE کی فیس ادا نہیں کرتے تو ان کو دوسرے ہی دن WARNING کا لمبا چوڑا نوٹس آجاتا ہے۔ ہماری یہ رائے ہے کہ یہ پھرتی کارپوریشن کو دوسرے اہم معاملوں میں بھی دکھانی چاہئے اور اُن کو اپنے فرائض ایمانداری کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے سٹی فادرز گھی، دودھ، اور گوشت کے بگڑے ہوئے انتظام کو جلد از جلد درست کریں گے۔

خاص برائے "تنویر"

کاروانِ خیال

از خامۂ حضرت روشن صدیقی

بدلے ہزار رنگ، رخِ روزگار نے
دی فرصتِ نظر نہ ترے انتظار نے

فردا بھی اب فسانۂ ماضی سے کم نہیں
سب کچھ بھلا دیا دلِ خوش اعتبار نے

صد کاروانِ حسن و لطافت گزر گئے
دیکھا نہ آنکھ اٹھا کے شہیدِ بہار نے

ہر احتیاطِ ضبط کو سمجھا تھا [illegible] اب راز
جب شرمِ شکست راز کیا رازدار نے

شاید یہ سچ ہو پھر [illegible] امانتِ دل
دیکھا جو تم کو دیدۂ بے اختیار نے

پھر زندگی کی نالۂ خاموش بن گئی
پھر ضبطِ غم چلا ہے کسی کو پکارنے

وہ [illegible] آشنا
ڈھونڈا جسے تری نگہِ شرمسار نے

دل ہو چلا ہے جذبِ [illegible] بدگماں
کیا کر دیا ترے کرم [illegible] نے

احساسِ عشق سے نہ جدائی ہوئی نصیب
کیا کیا، کیا حسن تغافل شعار نے

مجھ کو گناہگارِ تمنا کیا روشن
معصومئ نوازشِ بیگانہ وار نے

نشر شدہ۔ باجازت اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

خاص تنویر کیلئے

کرم یوگ

افکار عالیہ

پروفیسر لعل چند صاحب ایم۔ اے

کرم یوگ کے تین حصے ہیں۔ اوّل تپ، دوئم سوادھیائے۔ سوئم ایشور پرندھان۔ تپ کا مطلب ہے کسی بلند مقصد کے لئے خوشی سے مصیبتیں برداشت کرنا۔ سوادھیائے کہتے ہیں۔ صحیح علم دینے والی کتابوں کے مطالعہ کو ایشور پرندھان کا مطلب ہے کہ اپنے سب کاموں کو خدا کے سپرد کرنا۔

تپ سے انسان کا جسم اور روح اُس چٹان کی طرح مضبوط ہو جاتے ہیں جس پر سمندر کی زبردست لہریں ہر وقت ٹکراتی ہیں مگر اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ جب انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اُسے سب طرف سے بے شمار مخالف طاقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو زبردست انسان قوت ارادہ سے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے جسم اور روح کو قوی بنا لیتے ہیں اُنھیں تپسوی کہتے ہیں۔ تپسوی انسان ہی اس دنیا میں کھڑا ہو کر سب مشکلات کو دعوت دے سکتا ہے اور مسکراتے ہوئے اُن کا مقابلہ کر کے ان پر فتح حاصل کر سکتا ہے۔ گیتا میں تپ کو نہایت خوبصورت طریقے سے واضح کیا گیا ہے۔ اُس میں بتایا ہے کہ تپ تین طرح کا ہوتا ہے۔

۱۔ **شریرک** یعنی جسمانی

۲۔ **واچک** یعنی زبان کا

۳۔ **مانسک** یعنی من کا

ہمارا مطلب یہاں صرف شریرک یعنی جسمانی تپ (ریاضت) سے ہے گیتا میں لکھا ہے کہ جسمانی تپ میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہیں۔

(۱) کامل اُستادوں کی پوجا۔ (۲) صفائی (۳) سادگی (۴) برہمچریہ (۵) اہنسا۔ سب سے پہلی بات ہے اُستادوں اور عالموں کی پوجا۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن کی ہوتی پنڈ کر ہم اُن کے آگے ہمیشہ پیشانی رگڑتے رہیں۔ اور ہمیشہ اُن کی تعریف کے گیت گاتے رہیں۔ بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دل و جان سے اُن کی خدمت کریں اور اُن کے اشارے پر چلیں خواہ وہ ہمیں کتنا ہی مشکل حکم دیں۔ ہر انسان کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک آسان دوسرا مشکل، ایک اُترائی کا دوسرے چڑھائی کا۔ جو آسان ہے وہ شروع میں آب حیات معلوم ہوتا ہے مگر بعد میں سم قاتل بنجاتا ہے۔ جو مشکل راستہ ہے وہ شروع میں زہر لگتا ہے مگر بعد میں آب حیات ہو جاتا ہے۔ جو کامل اُستاد ہیں اُن کو دونوں راستوں کا پورا علم ہوتا ہے وہ دونوں کا انجام خوب جانتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے آنکھوں سے اُنھوں نے دنیا کا تماشا دیکھا ہے۔ اُنھوں نے جان بوجھ کر اپنے لئے مشکل راستہ چنا ہے اور اپنے دل کو مضبوط کیا ہے۔ اپنے جسم سے تپسیا کی ہے۔ بھوک، پیاس، سردی، گرمی، سکھ، دُکھ، عزت، بے عزتی، ان سب کا مقابلہ کرنے کے لئے اُنھوں نے اپنے تن اور من کو چٹان کی طرح اچل رکھنے کا ابھیاس (مشق) کیا ہے اور اس مشق سے ہی وہ مضبوط پاؤں سے دنیا کے اُس دریا میں کھڑے ہیں جس میں باقی سب لوگ بے بسی میں بُری طرح بہے چلے جاتے ہیں۔ جو ایسے کامل اُستادوں کی شرن (حضور) میں جاتا ہے۔ اُسے بھی اُس راستہ پر چلنا پڑتا ہے اور لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ اُسکو بھی مصیبتوں کے سامنے بنا گھبرائے بنا دل ہارے مسکراتے ہوئے ڈٹے رہنا سیکھنا ہوتا ہے۔ یہ ہے کامل اُستادوں کی پوجا جس رنگ میں وہ رنگے ہیں اُس رنگ میں رنگے جانا۔ جس تپ سے وہ چمکے ہیں اُس تپ سے چمک جانا۔ دوسرا جسمانی تپ ہے۔ صفائی، صفائی بھی ایک کو پیدا کرتی ہے۔ صفائی۔ سے دل ہمیشہ خوش رہتا ہے اور خیالات ہمیشہ پاکیزہ

کہ کیا بات ہے کہ تم اتنے امیر ہو گئے۔ اور تمہارا بھائی اتنا غریب ہے حالانکہ ورثہ میں تم دونوں کو برابر کی جائداد ملی۔ اس نے جواب دیا کہ میں کہا کرتا تھا کہ آؤ آؤ اور وہ کہا کرتا تھا کہ جاؤ جاؤ۔ اس آدمی نے پوچھا اس کا کیا مطلب؟ جواب ملا کہ جب کوئی کام کرنا ہوتا تھا تو میں نوکروں کو بلا کر کہتا آؤ آؤ ہم کریں اور ان کے ساتھ مل کر کام کر لیا کرتا تھا۔ میری نظر ان پر رہتی تھی اور شفقت بھی ہو جاتی تھی اور کام بھی پھلتا پھولتا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلتا تھا اور ہمیشہ نوکروں سے کہتا کہ جاؤ جاؤ جلدی کام کرو۔ اس طرح وہ سست ہو گیا اس نے اپنی نظر کام پر نہ رکھی نوکروں نے من مانی کی اور اس کی حالت ابتر ہو گئی۔ گیتا میں بیان کیا گیا۔ جسمانی تپ (ریاضت) کے متعلق ہم پیچھے عالموں کی پوجا۔ صفائی اور سادگی کے متعلق ذکر کر چکے۔ اب چوتھی بات برہمچریہ (تجرد) کے بارے میں کچھ کہیں گے۔ برہمچریہ تپ کا سب سے ضروری برہمچریہ تو تپ کی روح ہے۔ تپ سے برہمچریہ کو نکال دو تو تپ بے روح ہو جاتا ہے۔ تپ کا برہمچریہ سے بہت گہرا تعلق ہے۔ برہمچاری ہی سچا تپ [illegible] ہو سکے۔ ور سچا [illegible] ہو کر برہمچاری بن سکتا ہے برہمچریہ ایک نہایت اہم وصف ہے اس کی پوری تفصیل ہم پھر کبھی کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ برہمچریہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اپنے جوہر زندگی کی حفاظت کی جائے۔ ویریہ (جوہر زندگی) ایک آگ ہے جو اگر قابو میں ہے۔ بڑا کام بنا دیتی ہے اور اگر بے قابو ہو جائے تو انسان کو خاک تک ملا دیتی ہے انگریزی میں کہتے ہیں۔

Fire is a good
Servant but a bad master.

یعنی آگ ایک اچھا خدمت گار ہے اور خراب آقا۔ دنیا میں جتنے ہمت اور حکمت کے کام ہیں وہ سب اسی جوہر کی طاقت کی وجہ سے ہیں۔ ساری تہذیب کی بنیاد اس ویریہ کی طاقت پر ہے یہ ویریہ اس تیل کی مانند ہے جس سے تہذیب کا چراغ روشن ہے۔ بڑے بڑے سائنسداں بڑے بڑے چمتکار بڑے بڑے شاعر اسی کی بدولت دنیا میں وہ

شاندار کام کر گئے ہیں جس سے دنیا متحیر ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو تہذیب کی کہانی اس طاقت کے ٹھیک استعمال کی کہانی ہے یہ طاقت تعمیری کام کے لئے ہے لائق وتندرست اولاد پیدا کرنا بھی اسی قوت کا کام ہے سب تعمیری کام اسی کے ذریعہ ہوتے ہیں مگر بدقسمتی سے آج کل ایسے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں جن سے یہ طاقت بری طرح ضائع کی جاتی ہے، عیش و عشرت میں پھنس کر لوگ اپنی طاقت کو تباہ کر دیتے ہیں اور پھر معجونیں کھانے کے لئے حکیموں کے پاس بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کی اولاد ان سے بہتر تو کیا ان سے بدتر ہوتی ہے برہمچریہ قائم رکھنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ اچھی پاک، صاف غذا اچھی صحبت اور بلند معیار۔ اچھی غذا سے طبیعت سکون میں رہتی ہے۔ دودھ، پھل وغیرہ اچھی غذا میں شامل ہیں گوشت، شراب، کھٹے اور چٹپٹے کھانے خراب غذا میں شامل ہیں اور طبیعت میں ناجائز جوش بھر دیتے ہیں۔ جس سے برہمچاری بننے میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسری چیز ہے، اچھی صحبت اچھی صحبت نیک آدمیوں کی بھی ہو سکتی ہے اور اچھی کتابوں کی بھی، آج کل جبکہ گندے سینما اور گندے گیتوں کی وجہ سے نوجوانوں کے دل بھی گندے ہو چکے ہیں۔ بڑی سخت ضرورت ہے کہ نیک آدمیوں اور اچھی کتابوں کے ذریعے اپنے دل کو تھاما جائے اور اپنے من کو پاک کیا جائے جس کے خیالات گندے ہیں وہ کبھی برہمچاری نہیں رہ سکتا! وہ اپنی طاقت کو کسی نہ کسی ڈھنگ سے برباد ضرور کرے گا۔ خیالات کی پاکیزگی کے لئے نیک صحبت لازمی ہے سب سے اچھی صحبت تو خدا کی صحبت ہے۔ خدا سب جگہ موجود ہے بدقسمتی سے خدا سے منکر ہونا۔ اس پر لعنت کرنا۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک فیشن ہو گیا! یہ انگریز پوپ نے کیا خوب کہا ہے۔

Fools rush in
where angels fear to tread.

یعنی احمق وہاں آ گھستے ہیں جہاں فرشتے چلنے سے ڈرتے ہیں۔ تیسری بات جو برہمچریہ میں مدد دیتی ہے وہ ہے کوئی بلند مقصد جس کا کوئی بلند مقصد ہو اس کو ہمیشہ اپنی دھن سوار رہتی ہے۔ اسے ادھر اُدھر کی باتوں کے لئے فرصت کہاں [illegible]

اس کے پاس جاتا ہے جو اور کوئی کام نہ ہو۔ جو اپنے کام میں مشغول ہو شیطان
اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیسا کہ گاندھی جی اور خان عبدالغفار خان کی کامیت
پاکیزہ زندگی کا راز یہی ہے کہ ان کو خلق خدا کی خدمت سے فرصت نہیں
ان کے سامنے ایک بلند مقصد ہے جس کے لئے انہوں نے اپنا تن من
دھن سب نثار کر دیا ہے۔ اس لئے انکی زندگی اتنی بلند ہے، زندگی
کے مقصد کئی ہو سکتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق کوئی اونچا مقصد
[illegible] اپنے آپ کو بلند بنا سکتا ہے۔ سب سے اونچا مقصد [illegible]
خلق خدا کی خدمت۔ سب سے پہلے طبیعت کو مضبوط کرنا اور پھر جب
اسے پردہ نشین کا پتہ لگ جائے۔ تو اسے ہر وقت خیال
میں رکھنا، دل میں رکھنا اور ہر وقت اس کا حکم بجا لانے کے لئے تیار رہنا جو
ایسا کرتے ہیں انکی ساری زندگی ایک سرور بن جاتی ہے اور جس کے لطف کا
بیان نہیں ہو سکتا۔ برہمچریہ کے بعد جو آخری چیز گیتا نے جسمانی ریاضت
کے بعد جو چیز گنائی ہے۔ وہ ہے اہنسا یعنی دوسروں کو نہ مارنا۔ کیونکہ پیارا ایک
سب میں ہے۔ وہ پردہ نشین سب میں چھپا وہ سب کو دیکھتا ہے۔ وہ ہر وقت
ہر ایک کا امتحان لیتا ہے۔ کوئی خوش قسمت ہی اس امتحان میں پاس ہوتا ہے
جب اس کو دیکھو تو پہلے اس کو دیکھو جو سب میں یکساں سمایا ہوا ہے۔ مسلمان
بھائی، ہندو بھائی کو کیوں مارتے ہو۔ ہندو کو نہیں مارتے ہو رحیم کو
مارتے ہو۔ رحیم کو ناراض کر کے تم کہیں کے نہ رہو گے، ہندو بھائی،
مسلمان بھائی کو کیوں مارتے ہو۔ تم مسلمان کو نہیں رام کو مارتے ہو۔ رام
کو ناراض کر کے تم کہاں جاؤ گے۔ ریاضت سے انسان کی طاقت بڑھتی ہے
اس لئے آخر میں ہدایت ہے کہ انسان اپنے انسانی فرائض حاصل کر کے
غرور نہ کرے، خدمت کرے بلکہ محبت رہے خلق خدا کی۔ [illegible] کہ اس طرح ریاضت
بھاؤ اور عقیدہ سے شروع ہوتی ہے اور پریم میں ختم ہوتی ہے پوجا کا
[illegible] مدار رسیدہ فقیروں کی اور محبت بنی نوع انسان سے ہے۔ میں نے کہا تھا
کہ کرم یوگ کے تین حصے ہیں تپ، سوادھیائے اور ایشور پرنیدھان۔
تپ کا ذکر ہو چکا۔ تپ کا خاص مطلب قوت ارادی کو بڑھانا اور اس کو مضبوط کرنا اور
جسم کو مضبوط کرنا ہے۔ سوادھیائے کا مطلب ہے عقل کو روشن کرنا، جہالت
کو دور کرنا، نیکی اور بدی میں تمیز کرنا۔ جسم اور دل تو جانوروں کے بھی مضبوط ہوتے
ہیں مگر عقل کو روشن کرنا جہالت کو دور کرنا اپنے آپ کو سمجھنا خدا کو اور اسکی
کائنات کو سمجھنا انسان ہی کو ملا ہے۔ سوادھیائے کا مطلب ہے اچھی کتابوں
کا مطالعہ یعنی ویدوں کا گیتا کا قرآن شریف کا انجیل مقدس کا وغیرہ۔ ان کو پڑھ
کر اپنی زندگی کو پاکیزہ بنانا اور اپنے خدا سے جا ملنا۔ بلا لحاظ ملک و قوم سب سے
محبت کرنا اور سب کی خدمت کرنا۔ ہندوؤں کو صرف اپنی ہی مذہبی کتابیں
نہیں پڑھنی چاہئیں، مسلمانوں کی بھی پڑھنی چاہئیں، اسی طرح مسلمانوں
کو بھی صرف قرآن شریف ہی نہیں پڑھنا چاہئیں بلکہ گیتا اور رامائن کا بھی مطالعہ
کرنا چاہئے ایسا کرنے سے پتہ چلیگا کہ ہماری بہت سی باتیں ملتی ہیں۔
سب مذہبوں میں سچا مذہب ایک ہی ہے، ہر مذہب کہتا ہے کہ خدا کے
بندوں پر رحم کرو، انصاف کرو، سچ بولو، چوری مت کرو، بدمعاشی
مت کرو۔ لڑو مت، آپس میں پریم کرو۔ ضرورت اس بات کی نہیں ہے
کہ ہم اپنے مذہب کے لئے کٹ مریں، ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہر مذہب
والے اپنے مذہب کے احکام الٰہی بجا لاتے ہیں۔ جنہیں، جہاں عالم باعمل
نہیں وہاں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جہاں عمل نہیں ہے وہاں لڑائی
فساد ہے۔ بھائیو، دو دن کی زندگی ہے کیوں لڑائی جھگڑے کرتے ہو
کچھ نیک کمائی کر لو آگے جا کے جو قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے وہ اس بات سے
نہیں ہوتا کہ تو کیسے کپڑے پہنتا اور تو نے کیسے ٹھاٹ باٹ ڈالے، تو اس بات سے
ہوتا ہے کہ تیرے اعمال کیسے ہیں۔ انصاف پسند مالک تو اعمال سے فیصلہ
کرے گا۔ پڑھنے کے لئے آج کل کے علم کو پانے کے لئے بیشمار کتابیں
انگریزی میں ہیں ان میں سے صرف تین کا نام لینا چاہتا ہوں

1. The book of Knowledge.
2. The new popular Educator
3. Encyclopidia of modern knowle

یہ سب کتابیں اسٹینڈرڈ لٹریچر کمپنی کلکتہ کی تیار کی ہوئی ہیں اور گھر بیٹھے جدید علم سے بخوبی واقفیت پیدا کرا دیتی ہیں۔ کاش ایسی کتابیں اردو یا ہندی میں بھی شائع ہو جائیں تاکہ جو انگریزی نہیں جانتے وہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

تپ سے جسم و دل مضبوط کریں سوادھیائے (تعلیم) سے عقل تیز کر لی تو پھر بھی مکمل انسان نہیں بنتا۔ جب تک کہ اپنے جسم اور دل و دماغ کو انسان خدا کے سپرد نہ کر دے اور خدا کو یہ نہیں کہتا کہ یا خدا تیرے کرم سے میں نے یہ سب ترقی کی ہے، اب تو اس سے جو کام لینا چاہے لے میں ان سے خود غرضی کے کام لے کر اپنے آپ کو بڑھا سکتا ہوں، امیر بن سکتا ہوں، حکومت کر سکتا ہوں پر میں یہ سب کچھ چھوڑتا ہوں، مجھے تیرا بندہ بننا پسند ہے، تیری خدمت کرنا، تیرا حکم بجا لانا تیرے ہی اشارہ پر سب کچھ کرنا اسی میں مجھے اپنی بھلائی نظر آتی ہے۔ جیسے رام کے ہاتھ میں تیر اٹھاتا تھا اور ان کو مارتا تھا۔ ایسے ہی اے مالک میرے تم ہو یہ جسم اور میری روشن عقل کو اپنے ہاتھ میں لے، اور دنیا کی برائیوں کو ختم کر جیسے ارجن کے رتھ کو کرشن چلاتا تھا ایسے ہی اسے میرے مالک میرے جسم اور عقل کو جدھر مناسب سمجھتا ہے چلا۔ میں تو تیری مرضی کے مطابق اسی طرح چلوں گا جیسے سوکھا پتہ ہوا میں۔

ریاضت کی زندگی کا اپنا ایک خاص لطف ہے، پڑھنے لکھنے اور علم حاصل کرنے کا بھی ایک خاص مزہ ہے مگر ریاضت سے مضبوط بنائے ہوئے جسم اور عقل کو خدا کے سپرد کر کے کام کرنے میں جو لطف ہے اس سے بڑھ کر کوئی سرور نہیں ہے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنا سب کچھ تن من دھن خدا کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ایسے آدمی کرم یوگی کہلانے چاہئیں اور تپ سوادھیائے ایشور پرنیدھان مل کر کرم یوگ کہلاتے ہیں اس کرم یوگ میں مکمل زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔

ریویو کے لئے دو کاپیاں بھیجنا چاہئیں

نقد و نظر

متاع حرم

(مصنفہ :- زیب عثمانیہ صاحبہ)

ہندوستانی اردو داں طبقہ میں محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ کے تعارف کی ضرورت نہیں اور خاص کر ناظرین تحریک سے کیونکہ آپ اکثر ملک کے مختلف رسائل کو اپنے افکار سے نوازتی رہتی ہیں اور جن میں تحریک خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ ابھی حال ہی میں آپ نے اپنے افکار کو مجموعہ کی صورت میں شائع کرایا ہے اور ملک کے سامنے اسے متاع حرم کے نام سے پیش کیا ہے اور اس کا انتساب انسانیت کے نام کیا ہے۔ مجموعہ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۳۰ نظموں کے علاوہ چالیس کے قریب غزلیات بھی ہیں۔ متاع حرم کا تعارف جناب ادیب لدھیانوی کا اور پیش لفظ جناب مرتضیٰ احمد خاں [illegible] روزنامہ شہباز لاہور نے تحریر کیا ہے۔ محترمہ کی شاعری کے متعلق آپ تحریر کرتے ہیں "انداز بیان سادہ اور دلکش اور تخیل بلند اور پاکیزہ، بندش چست اور مضامین کا انتخاب خود اس امر کی دلیل ہے کہ ان میں شاعرہ کے دل کی [illegible] شاعرہ کی طبیعت کو اپنی جانب جذب و مائل کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے" ایک دوسری جگہ آپ تحریر کرتے ہیں۔

"اقبال کے انداز نے معاصرین کے بہت شاعروں کو متاثر کیا اور ہمارے اکثر سخن گو حضرات ہر انداز بیان ہی کا تتبع کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں لیکن اگر میں یہ کہوں کہ محترمہ زیب عثمانیہ کو اسی طرح یعنی اقبال کے انداز کے اتباع کرنے کے معاملے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اس دور کے بہت کم شاعروں کے حصہ میں آئی ہے تو غلط اور بیجا نہ ہوگا۔" الغرض ہم موصوف کی رائے سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ حقیقتاً متاع حرم اسم بامسمیٰ ہے۔ شائقین تحریک کو اس مجموعہ کو حاصل کر کے ایک بہترین [illegible] چیز کے مطالعہ [illegible] کتاب بہت خوبصورت مجلد ہے۔ ایک روپیہ میں [illegible] لدھیانہ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

ایک تحقیقی مقالہ

فرقہ وارانہ فسادات

از محترمہ مسز وینکٹ چندر

نازاں ہیں جہالت پہ انھیں کچھ تو حیا دے

اے دو جہان والے

دنیا دو دنیا والے جنگ کے بھنور میں پھنس چکے ہیں۔ ان کا اور ان کی تہذیب کا وجود بقا اور فنا کی کھینچا تانی میں پڑ گیا ہے۔ ہانو کرو ہوت کی قوت سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس مقابلہ میں کتنے ہی لوگ مر چکے۔ کتنے ہی تہذیب کے چراغ گل ہو گئے، ہو رہے ہیں اور ہو جائیں گے۔

انسانیت بھول گئی۔ پریم کی ناؤ ڈگمگانے لگی ہے اور چاروں طرف سے جہالت کے بھیانک طوفان اس کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس برباد زمانے میں ہندوستان بھی برباد ہو رہا ہے۔ یہاں بھی جہالت کے بادل امنڈ امنڈ کر عقل کی روشنی پر چھا رہے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کا چراغ گل ہونے کو ہے۔ وہی فرقے جو کسی زمانے میں ایک دوسرے کی اسی طرح حفاظت کرتے جیسے کہ پلک کے بال آنکھ کا کرتے ہیں۔ آج ایک دوسرے کو مارا ماری کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کا سوگت سوڈے کی بوتلوں سے ہو رہا ہے۔ پریم کی بھاونا چاقوؤں اور نشتروں سے بنائی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود

نازاں ہیں جہالت پہ انھیں کچھ تو حیا دے

اے دو جہان والے

اب سوال یہ ہے کہ آخر ان فسادات کی جڑ کیا ہے؟ کیوں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر مصر ہیں۔ ان جھگڑوں کے دو سبب ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ داخلی اسباب خود ہماری کمزوریاں ہیں جو سماجی، معاشی اور سیاسی صورت اختیار کر چکی ہیں۔

عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب جُدا ہے۔ دونوں کا مذہب الگ ہے۔ دونوں کے رہن سہن کے طریقے علیحدہ ہیں۔ اس لئے ان دونوں میں کبھی میل جول پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف رہیں گے۔ اسی بنیاد پر پاکستان کی اسکیم بھی تیار کی گئی ہے۔ مسٹر جناح نے اپنی اکثر تقریروں میں اس بات کا اعلان کھلا کر کیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک ذہنی مغالطہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تہذیب۔ مذہب اور رہن سہن کے طریقے جدا ہیں لیکن ایک عرصہ دراز سے یہ دو قومیں ایک ہی جگہ اور ایک ہی ملک میں رہتی چلی آئی ہیں۔ ان قوموں کے درمیان ایک قسم کا ذہنی لین دین ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ دونوں میں میل جول ہوا اور ایک مشترکہ تہذیب جس کو ہندوستانی تہذیب کہنا چاہئے پیدا ہوئی۔ اس تہذیب کی بنیاد محض رواداری تھی اور ایک دوسرے کی عزت؛ اسی تہذیب کی وجہ سے ایک زمانے تک ہندو اور مسلمان خوش اسلوبی اور پریم کے ساتھ رہے لیکن انیسویں صدی میں چل کر یہ خیال پیدا کیا گیا کہ مسلمان مسلمان ہے اس کی تہذیب ہندوؤں کی تہذیب سے بالکل الگ ہے۔ سمجھئے کہ اسی زمانے سے یہ تہذیبی تفریق پیدا ہو گئی جس نے اب شدید صورت اختیار کر لی ہے۔ جب ہندو اور مسلمان خلجیوں، تغلقوں اور مغلوں کے زمانے میں ایک ہی جگہ باہمی رواداری کے ساتھ رہتے تھے تو کیوں نہیں اب رہا کرتے اور رہ سکتے۔ تقسیم ہند کی تحریک کی یہ بنا کہ ہندو اور مسلمان بالکل جداگانہ قومیتیں ہیں۔ بالکل ایک ذہنی دھوکہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جزوی چیزوں میں ان کے عقاید علیحدہ ہوں لیکن جہاں تک اہم اور ضروری

باتوں کا تعلق ہے ان کے عقائد ایک ہی ہیں۔ دونوں خدا کو پوجتے ہیں۔ دونوں بُت پرستی کرتے ہیں، کوئی ذہنی بُت کی پرستش کرتا ہے تو کوئی پتھر کی مورت کی، دونوں کے مذہب میں رواداری کی تلقین کی گئی ہے۔ دونوں بھائی چارگی کے قائل ہیں۔ غرض ایسی اساسی چیزوں میں جو واقعی تہذیب کی بُنیادیں ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔

بہرحال اصل موضوع پر ہم آتے ہوئے یہ کہیں گے کہ ہندو مسلم فسادات کی جڑ یہ ہے کہ مسلمان اپنی تہذیب کو ہندوؤں کی تہذیب سے الگ سمجھتے ہیں۔ اور ایسا ہی ہندو بھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں جو کبھی ذہن ودماغ کی چار دیواری کو توڑتے ہوئے میدان جہاد میں عمل کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ ہمارا بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا وجدان کی کلچر ترقی کرنے کے لئے مضر ہے اور لیگی یہ، کہ ہندو ان کے تہذیب کو ختم کرنے کے در پے ہیں۔ یہ بدگمانی بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کی روک تھام بہت ہی مشکل ہے۔ یوں تو ظاہرہ طور پر اکثر فساد "جلوس" یا "گاؤکشی" کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ "ہندو مسلم مسئلہ" کے مصنف مسٹر ان خنداتت کا خیال ہے۔ لیکن ان کا بنیادی سبب یہی بدگمانی ہے جو آہستہ آہستہ ہمارے دلوں میں آگ لگا رہی ہے۔ اسی طرح معاشی بدحالی نے دونوں قوموں کے اطمینان وشانتی کے خواب کو پریشان کر دیا۔ معاشی میدان میں دونوں ایک دوسرے کو رقیب سمجھنے لگے۔ انسان کو معاشی میدان میسر نہ ہو تو اس کی CREATIVE IMPULSES تعمیری محرکات اپنا کام انجام دینا بند کر دیتی ہیں اور ان کے بجائے DESTRUCTIVE IMPULSES تخریبی محرکات تخریب کے کام میں منہمک ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو، ہریجن یا عیسائی بگاڑ کے کاموں میں سرگرداں اور پریشان ہے۔ فساد بازی بھی ایک تخریبی کام ہے

اگر ہندوستان میں اس وقت اچانک ہونے کے کارن دھوم مچی ہوئی ہے تو وہ انھی اسباب کی وجہ سے ہے۔ ہندوستانی تعلیم سے لیس ہو کر ان باتوں کو شعور کی روشنی کے تحت جانچے گا تو فسادوں کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائیگا کیونکہ عام لوگوں کی جہالت اور لاعلمی تخریبی محرکات کی جڑوں کو پانی دیتی ہے۔

غرض فسادوں کے داخلی اسباب یوں بیان کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ تہذیبی اور تمدنی اختلاف
۲۔ ایک دوسرے سے بدگمانی
۳۔ معاشی بدحالی
۴۔ تعمیری محرکات کی کمی
۵۔ عوام کی لاعلمی اور جہالت

اب ہم خارجی اسباب کو لیتے ہیں۔ یہ تو صاف بات ہے کہ ہندوستان برطانوی تاج کا سب سے چمکدار ہیرا ہے۔ برطانیہ کبھی اس ہیرے کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔ اس لئے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کا اصول ہندوستانی سیاسیات میں بڑی زور وشور سے کام کرنے لگا۔ کبھی کبھی یہ فسادوں کی آندھی بھی پیدا کروا تا ہے۔ اس کے برخلاف میرا تو خیال ہے کہ یہ ہماری ہی کمزوری ہے کہ ہم کسی کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر ملک کی آبرو پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ ہمارے لیڈر جو پلاٹ فارم سے دھواں دھار تقریریں کرنے کے عادی ہیں، جو عالی شان ہوٹلوں میں ڈنر ولنچ کھاتے ہیں۔ جن کا مقصد زندگی وائسرائے بہادر سے ملاقات کرنا ہے۔ وہی لوگ ہیں جو گھر کے بھیدی بن کر ہماری سونے کی لنکا کو جلاتے ہیں۔ یہی لیڈر صاحبان جو اعلیٰ درجے کے سوٹ بوٹ سے لیس رہتے ہیں۔ کبھی لوگوں کو لڑنے سے روکنے کے لئے باہر نہیں آتے اور نہ ہی اپنے فرقے کو فساد کرنے سے منع کرتے ہیں۔ چاہے کبھی تباہ ہو جائے لیکن وہ تو ادٹی یا بنگلہ میں ہمارا جان مزہ در رہیں گے۔

بھی لوگ جو کسی نہ کسی طرح ہندو یا کہ کرکٹ سے نکل جانے کو کہتے ہیں، اصل میں فسادوں کے بانی ہیں۔

غرض فرقہ وارانہ جھگڑے ہماری تہذیب یا ساری زندگی کے بدنماد ہیں۔ یہ اسی وقت مٹ سکتے ہیں۔ جبکہ ہماری تخریبی محرکات کی صحیح تعلیم کے ذریعہ اصلاح ہو اور تعمیری محرکات کو کافی گنجائش دی جائے کہ وہ ہمارے عمل کو متاثر کریں۔ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے اخبارات کو ممنوع کر دیا جائے۔ ہندوستان کی تاریخ از سر نو لکھی جائے کہ مختلف فرقوں میں پریم اور ملاپ کا جوش پیدا ہو۔ تعلیمی نصاب کی از سر نو داغ بیل ڈالی جائے۔ مذہبی اور تہذیبی حقوق کا تحفظ ہو۔

مسلمان گاؤکشی چھوڑ دیں اور ہندو جلوس نکالنا۔ ہر شخص کو اتنا کچھ ملنا چاہئے کہ وہ معاشی طور پر مرفہ الحال ہو۔ کانگریسی حکومتوں کی طرح سختی کے ساتھ فسادیوں کو پابندی میں کیا جائے۔

بہرحال ضرورت اس کی ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور آپس میں ایک دائمی سمجھوتہ کر لیں تاکہ وطن کی آبرو قائم رہے اور دھرتی ماتا کا دل وحشت اور شرم سے پھٹنے نہ پائے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
اقبال

ی اور دوا رنگ زیر علاج رہی۔
اسی وقت سے ڈاکٹر شو ہبرگ اس سے
مد ... کی افتاد طبع سے واقف تھا
ڈاکٹر کے حوال میں یہ بہت نرم دل

مسلسل نغمۂ موت

از جناب مولانا عبد الباری صاحب

مس ڈلفنی کوسیلا کے باپ دادا اصل میں اطالی تھے۔ روزی کی تلاش میں انگلستان پہنچے اور وہیں آباد ہو گئے مس کوسیلا بچپن سے ہی چلبلی اور عاشق مزاج لڑکی تھی۔ دولت، حسن، شوخی اور اس پر کسینی کا انٹیشن، جہاں یہ چیزیں یکجا جمع ہو جائیں، وہاں نیکی و اخلاق کی حدوں کا برقرار رہنا ناممکن سا ہے۔ لندن کی سوسائٹی میں ... وہ کوس رہی تھی جو چراغ تھا "بننے کی بجائے شمع انجمن بننا زیادہ پسند کرتی ہوں۔"

ایک منچلے شخص نے اس کے حسن و شوخی کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی مثال ایک مسالے دار چٹنی کی سی ہے۔ اس کے ایک سابق عاشق ایڈرین کلارکسن نے بھی اس کے متعلق ایک پتے کی بات کہی تھی کہ

"اس کے بوسہ میں اتنی گرمی ہے کہ ہونٹ جل جاتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی جلن کم ہوتی جاتی ہے۔ اور صرف ایک نہ بھولنے والی لذت باقی رہ جاتی ہے۔ واقعی اس کے بوسے بڑے لذت بخش اور سرور انگیز ہیں۔"

مس کوسیلا کی عاشق مزاجی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہر وہ چیز جس کو اخلاق اور پاکیزگی نے ممنوع قرار دیا ہو۔ اسی کی طرف لپکتی تھی۔ دنیا کی کوئی لذت ایسی نہ تھی جس کے حاصل کرنے کی اس نے کوشش نہ کی ہو۔ ایک خوشنما بھونرے کی طرح نئے نئے پھولوں کا رس چوسنا اس کا شیوہ تھا وہ اب اس منزل میں تھی، جہاں گناہ کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔ اور صرف لذت کوشی زندگی کا نصب العین سمجھا جاتا ہے۔

لذت تلاش عشق خراب شعور تھی
مستی میں مجھ سے ہوئی یہ لغزش ضرور تھی

مرض محبت کے علاج کے لئے ایک ... بار وہ ڈاکٹر شو ... اور محبت پرست لڑکی تھی۔

آج وہ نیلے رنگ کا لباس زیب تن ... پر ... سندر کی موجوں سے لطف اٹھا رہی تھی اس لباس میں اس کا ... بالا نظر آ رہا تھا۔ لباس اس قدر تنگ اور چست تھا کہ اس ... ابھر ابھر کر خوش نظارہ دے رہی تھی۔ اس کے پاس ... خاتون مسز مرانڈرتی کیپ لگائے کھڑی ہوئی تھی۔ مس کوسیلا نے اس سے پوچھا کہ

"آج صبح سے تمہارے شوہر کو ... دیکھا اور وہ کس کونے میں چھپے ہیں؟"

"تم تو جانتی ہی ہو کہ وہ کتابوں کے ... مسز ... کا خبط سا پایا ہوا ہے۔ ان کو کہیں سے ایک کتاب ... کے قدیم اصولوں کا ذکر ہے۔"

"کیا عجیب ذوق ہے۔ مجھے ... سے اتنی دلچسپی ہے کہ ایک معمولی رئیس زادے اور ... کروں تاکہ شادی کے وقت دھوکا نہ ...

"میری پیاری ... بال میں پھنسنے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے تو وہ ...

"میری اچھی لولو! تو کیا تم اپنی ... خوش نہیں ہو؟"

"اب میں کیا کہوں؟ یہ غلطی ... اب مجھے بھگتنا ہی پڑے گا بات یہ ہے کہ میں کسی نواب زادے کی بیگم بننا چاہتی تھی سو تمنا تو پوری ہو گئی مگر شوہر نہ ملا۔ مجھے شادی کی پہلی رات ابھی یاد ہے جبکہ میرے شوہر کی والہانہ نگاہیں مجھ پر پڑ رہی تھیں اور مجھ کو مخمور اور مغرور بنا رہی تھیں۔ ہم دونوں محبت کے نشہ میں چور تھے اور نیلگوں آسمان کے نیچے سبزہ زار پر بیٹھے بیٹھے ہی

ہم نے دو راتیں گذار دیں۔"

"تم تو بڑی حیرت انگیز باتیں کرتی ہو۔"

"ہاں، بس اب ان حیرت انگیزیوں کی یاد ہی تو باقی رہ گئی ہے۔"

"تو پھر تم اپنے اُسی نسوانی جادو سے کیوں کام نہیں لیتی ہو؟"

"کس پر جادو کروں؟" "نہیں تو تیری پروا ہی نہیں۔ وہ ہیں اور کتابوں کا مطالعہ"

"لولو! مرد سچ مچ بڑے فریبی ہوتے ہیں، نظر کچھ آتے ہیں، ہوتے کچھ اور ہیں۔"

میری اچھی کوسٹیلا، یہ سب ہمارا ہی قصور ہے۔ ہم لوگ، اپنے خیال میں، نہ معلوم کیا کیا خوبیاں ان مردوں میں سمجھ لیتی ہیں۔ اور وہ سب محض خیال کا دھوکا ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ مرد، فرشتوں کے لباس میں شیطان ہوتے ہیں۔ اور نہ یہ کہتی ہوں کہ وہ خباثتوں کو فریب کے پردے میں چھپائے رہتے ہیں۔ بلکہ بات تو یہ ہے کہ مرد صرف آدمی ہوتا ہے، اور ہم اس کو فرشتہ سمجھ لیتی ہیں؛ یہ سمجھ کی غلطی تو ہماری ہے ایک مرتبہ میری ماں کے ڈاکٹر دوست نے کتنی مزے کی بات کہی تھی کہ مردوں میں جتنی برائیاں ہوتی ہیں اُن کی ذمہ دار عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

مس کوسٹیلا کچھ بولنے ہی کو تھی کہ استے میں ڈاکٹر شوبرگ اس جگہ آپہنچا۔ کوسٹیلا نے بے تحاشا ڈاکٹر سے ایک سوال کر دیا۔

"میرے اچھے ڈاکٹر، عورت زیادہ بُری ہوتی ہے یا مرد؟"

ڈاکٹر نے برجستہ جواب دیا "پیاری بچی، کون زیادہ ہلاکت خیز ہے، وار یا خنجر؟ الگ الگ دونوں چیزیں بیکار ہیں۔ خنجر اسی وقت ہلاکت خیز ہوگا، جب اس سے وار کیا جائے گا۔ یعنی دونوں کا اشتراک ہلاکت انگیزی کیلئے ضروری ہے ... ... لیکن آج یہ اتنی سنجیدہ اور سنگین باتیں کیسے زیر بحث آگئیں؟ ان باتوں میں وقت ضائع کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ سمندر کی پُرشور موجوں کا نظارہ کیا جائے۔ آؤ چلو، اس سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز چیزیں تم کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ مردوں کی قسمت، مردوں کے ساتھ رہنے دو۔ میں تو تمھارے لئے ایک بڑی خوشخبری لایا ہوں۔ تم تو سن کر اُچھل پڑوگی۔ میں تم کو ایک نئے مسافر سے ملاؤں گا۔ وہ رات ہی اس جہاز پر آیا ہے۔"

دونوں لڑکیوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا "وہ کون ہے؟"

لڑکیاں حیرت اور اشتیاق بھری نظروں سے ڈاکٹر شوبرگ کو دیکھ رہی تھیں، اور ڈاکٹر اس کا لطف لے رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔

"بس سمجھ لو کہ ایک جانور اور پھنسا ہے۔ تم لوگوں کی بیچینی سے تو اب مجھے بھی سمجھنا پڑا کہ مرد آخرکار بیکار نہیں ہوتے۔ ایک نیا مرد آیا۔ اور تم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ..... یہ خوبصورت نوجوان شام کا رہنے والا ہے نفاست پسند اور خوش گفتار بھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ دولتمند والدین کا اکلوتا لڑکا ہے۔"

کوسٹیلا بچوں کی طرح ڈاکٹر شوبرگ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی۔

"میرے اچھے ڈاکٹر جلدی بتاؤ وہ کس کیبن میں ہے؟ میں ابھی اس کو جاکر لے آتی ہوں۔"

"اتنی جلدی نہ کرو مس کوسٹیلا۔ اس کا دل بکاؤ نہیں ہے، جسے تم جس وقت چاہو خرید لو۔"

"وہ یہاں کیسے آیا؟"

"قسطنطنیہ کی بغاوت میں وہ خواہ مخواہ پھنس گیا تھا۔ انگریزی سفارتخانے میں اس سے میری ملاقات ہوئی، اور میں نے اس کو بہت پریشان دیکھا چنانچہ میں نے اس کو اس جہاز پر آنے کی دعوت دی۔"

ٹھیک اسی وقت نواب مونٹرکیپ عرشے پر پہنچا۔ شاید گہرے مطالعہ کا اثر ہو، چہرہ بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے دُبلا پتلا تو تھا ہی۔ بدن میں سرخی نام کو نہ تھی۔ بیگم لولو نے اس کو بلاکر کہا

"پیارے، دیکھو ڈاکٹر شوبرگ کہتے ہیں کہ ایک نیا مہمان کل رات اس جہاز پر آیا ہے۔"

نواب مونٹرکمپ نے ڈاکٹر سے بے ساختہ پوچھا۔

"کوئی نیا جوان آیا ہے۔ کون ہے؟"

"بیروت کے ایک بہت متمول خاندان کا چشم و چراغ مسٹر جمیل الفازان، وہ پیغمبر کی اولادوں سے ہے۔"

"اچھا تو وہ مسلمان ہے اور پیغمبر کی اولادوں سے ہے ایک بات میں ان سے ضرور پوچھوں گا کہ کیا واقعی پیغمبر کی پشت پر مہر نبوت بھی تھی؟"

بیگم لولو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"پیارے تم تفریح کے وقت بھی دقیق علمی بحث اور ریسرچ کی موشگافیوں سے باز نہیں آتے۔"

بیگم لولو اپنے شوہر نواب مونٹرکمپ سے باتیں کر رہی تھی، ادھر مس کوسٹیلا، شونبرگ کے قریب آکر پوچھنے لگی:۔

تم نے اس میرے منگیتر کو خواہ مخواہ یہاں کھینچ بلایا۔ جب سے وہ یہاں آیا ہے، مجھے ایک منٹ کا بھی آرام نہیں۔ میں آزادی چاہتی ہوں اور آزادی سے اس نئے شامی نوجوان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

"میری پیاری کوسٹیلا، بات یہ ہے کہ مسٹر ہنز تمہارا منگیتر میری جائداد کی نگرانی کرتا ہے۔ مجھے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی اخلاق برتنا چاہئے اور دوسری بات یہ ہے کہ تم کو اس کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں محسوس کرنی چاہئے۔ میں خواہ مخواہ تم کو اس کے پلے نہیں باندھنا چاہتا۔ اس جہاز پر سب کو کامل سوراج حاصل ہے میرا خیال ہے کہ تم کو کسی نگرانی کی ضرورت نہیں؟"

"نہیں، بالکل نہیں؛ میں جب سترہ برس ہی کی تھی۔ اسی وقت سے میں دوسروں کی نگرانی سے آزاد ہو چکی تھی۔ میری ماں کی ایک دوست لیڈی ایبنڈیل کسی زمانہ میں میری نگرانی پر مقرر ہوئی تھیں۔ میں نے ان کا ایک چاہنے والا تلاش کر دیا۔ پھر ان کو فرصت کہاں تھی کہ وہ میری نگرانی کریں اس وقت سے آج تک میں آزاد ہوں۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم اپنے اس نئے جوان سے کب ملاؤ گے؟"

"ابھی، وہ دیکھو وہ آ رہا ہے۔"

ابراہیم بے نے شائستگی سے اس مجمع کے لوگوں سے سلام و دعا کی شونبرگ موقع شناسی سے کام لیکر نواب مونٹرکمپ کو دوسری جگہ اپنے ساتھ لے گیا ابراہیم بے عجیب مخمصے میں تھا۔ دونوں جوان عورتیں خوشبوؤں سے معطر لباس میں ملبوس اسکی طرف غور اور ہمدردی سے دیکھ رہی تھیں اسکے چہرے مہرے، خط و خال آنکھ بھوں، پیشانی کا جائزہ لیا جا رہا تھا اور وہ ایک بے بس قیدی کی طرح اپنے جانچنے والوں کی نگاہوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

مس کوسٹیلا نے پوچھا:

"آپ کل رات کس وقت اس جہاز پر آئے۔ آپ قسطنطنیہ کی بغاوت میں پھنس گئے تھے؟ خوب، بڑا مزا آیا ہوگا۔ تم نے لندن دیکھا ہے۔۔۔۔ فرسٹر کی چٹ پٹی مسالے دار چٹنی پسند کرتے ہو؟ یا کسی ماہوش کے زیر دست رہے۔ تم عربی بھی بولتے ہوگے۔ کتنی پیاری زبان ہے۔ لیکن تحریر بڑی پیچیدہ ہے۔ تمہاری آنکھیں بڑی ظالم معلوم ہوتی ہیں۔ عورتوں کا دل توڑنے میں تم کو بڑا مزا ملتا ہوگا۔ تمہاری نگاہیں جب جسم پر پڑتی ہیں تو مخمل کی طرح نرم معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی تو کچھ دنوں ہم لوگوں کے ساتھ تم رہوگے ہے نا؟"

وہ سوال پر سوال کئے جا رہی تھی اور ابراہیم بے حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا۔ صرف سوالوں کی تعداد ہی حیرت انگیز نہیں تھی بلکہ تنوع بھی حیران کن تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں اتنے سوال کر لئے تھے کہ وہ حیران تھا کس کا جواب پہلے دیا جائے۔ اور کس کا بعد، ہر سوال ایک دوسرے سے مختلف اور بے ربط۔ کبھی ذوق طبیعت کے متعلق پوچھا جاتا ہے، تو کبھی عورتوں کے متعلق اس کے رجحان اور پسند کا تجسس کیا جاتا ہے۔ کبھی اس کی سحر نگاہی کی داد طلب کی جاتی ہے۔ غرض کہ ابراہیم بے سوالوں کے ہجوم میں گھر گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے حواس کو مجتمع کیا اور ان لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"محترم خواتین، ان سوالوں کا جواب دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ

میں اپنی زندگی کے گزشتہ حالات بھی آپ لوگوں کے سامنے رکھ دوں۔ اور میں کچھ زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔ میری زندگی اتنی مختصر اور بے کیف ہے کہ تین منٹ اور دو سکنڈ اس کے لئے کافی ہیں۔ اچھا تو سنئے۔

" میں اصل میں شامی ہوں۔ بیروت میں پیدا ہوا۔ میرے نام کا پہلا حصہ جمیل ہے یعنی خوبصورت ـــــ جاننے کو تو میں انگریزی، فرنچ، عربی، ترکی سب زبانیں جانتا ہوں۔ لیکن میں ماہر کسی ایک کا بھی نہیں ہوں۔ یہ اس لئے نہیں کہ میں کُند ذہن تھا، بلکہ اس لئے کہ میں بہت شریر اور چالاک تھا۔ شُعدا مائی گوڈ ریٹ سیکھنے کے لئے سولہ برس کی عمر میں بیروت چھوڑ کر میں بننا تو چاہتا تھا ایکٹر لیکن بن گیا صرف تماشا بین۔ لیکن کچھ چیزیں میں جانتا بھی ہوں۔ میں ریس کھیلتا ہوں، شراب پیتا ہوں اور محبت کرتا ہوں۔ اور اس سے تو آپ کو بھی اتفاق ہوگا کہ ان کھیلوں کے جاننے کے بعد کسی اور کھیل میں جی نہیں لگ سکتا۔ دل کی بازی لگانے میں جو ایک ہیجان انگیز مسرت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی دلچسپی نہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان محض تفریح کے لئے دل لگاتا اور بُری طرح پھنس جاتا ہے۔ انسان اپنی آنکھ کھول کر پوری احتیاط کے ساتھ میدان محبت میں قدم رکھتا ہے۔ لیکن حریف اپنی فریب آمیز سادگی سے زیر کر ہی لیتا ہے۔ تم وفا شعاری کو ہی اپنا ایمان بنائے رکھتے ہو۔ اور حریف اپنے وفا نما فریب کو کام میں لاتا ہے۔ میرے خیال میں عقلمند وہی ہے جو گلستان محبت میں قدم رکھے اور کیاری کیاری سے پھول اپنے دامن میں جمع کرے اور پھر اپنے دامن کو کانٹوں میں اُلجھائے بغیر جلدی سے نکل آئے۔

مس کوسٹیلا نے ایک سحر انگیز تبسم کے ساتھ کہا

" تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ ایک عقلمند آدمی کو عورتوں سے پیچھا چھڑانا چاہئے۔ لیکن نرسس کا قصہ تو تم نے پڑھا ہی ہوگا۔ اُس نے اپنی محبوبہ کے لئے جان تک دیدی۔

(باقی باقی)

چھوٹے ہوئے چہرے

از جناب قادر نیازی

چند بیتاب فسردہ چہرے
جیسے کہ دورِ خزاں کے پتے
دور تک پھیلے پڑے ہوں کسی ویرانے میں
ہر طرف ایک اُداسی ہے مسلط پیہم
جیسے کہ ہو کہیں پوشیدہ گِدھوں کا مسکن
ایسے ہی وقت فسردہ چہرے
ذہن میں آتے ہیں میرے اِک اِک کرکے

خشک ہونٹوں پہ تبسم عریاں
بال بکھرے ہوئے آنکھیں ویران
نہیں معلوم کیوں
ڈبڈبا جاتی ہیں آنکھیں میری
جب اُبھر آتے ہیں نقوش

ریویو

شادی

پیش کردہ :-	رنجیت مووی ٹون بمبئی
ڈائرکٹر :-	جینت ڈیسائی
افسانہ :-	گنونت رائے آچاریہ
مکالمے و گانے :-	منشی دل لکھنوی ۔ پنڈت اندرا
اداکاران خصوصی :-	موتی لال ۔ خورشید ۔ مادہوری ۔ ایشور لال وغیرہ

مسٹری رنجیت مووی ٹون تفریحی فلمیں پیش کرنے میں پیش پیش گنی جاتی ہے لیکن اس کی فلمیں صرف تفریحی نہیں ہوتیں بلکہ تفریح کے پردہ میں اصلاح کے نقطۂ نظر کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے چنانچہ اس کا تازہ شاہکار "شادی" جو وائل آپیرا ہاؤس میں پانچویں ہفتہ میں کامیابی سے چل رہا ہے اس کا تازہ ثبوت ہے ہندوستانی عورت کس قدر پتی بھگتی کر سکتی ہے اسکو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کرنا ہو تو "شادی" دیکھنا چاہئے جسمیں ہندوستانی عورت کے اس کیرکٹر کو خوب اجاگر کیا گیا ہے۔

مکالمے سادہ اور عام فہم ہے اور بعض جگہ بہت لطف دے جاتے ہیں۔ گانے اور ان کی طرزیں بھی نئی اور دلاویز ہیں۔ اور پھر جب انھیں خورشید گاتی ہے۔ تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

قابل ڈائرکٹر نے ہدایت کاری میں بھی محنت سے کام لیا ہے۔

صدابندی و عکاسی حسب معمول ہے۔ مجموعی طور پر فلم کامیاب اور دلچسپ ہے۔

تنویر کے جن مہربان خریداروں نے اس ماہ اپنا چندہ بھیجا ہے ان کے ہم شکر گزار ہیں۔ اور جنہوں نے ابتک نہیں بھیجا ہے انکی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں۔ امید کہ وہ اس ماہ اپنا چندہ ارسال فرماکر اپنے تنویر کے لئے سہولت پیدا کریں گے

منیجر تنویر ۔ بمبئی ۸

غزلیات
زبان احسن
(از جناب حضرت احسن مارہروی مرحوم)
وصل کی صورت یونہی ہر دم رہے | یار کی تصویر دل میں جم رہے
ہاں مرے دل میں تمہارا غم رہے | اس مکاں میں ہر گھڑی ماتم رہے
قتل گہ میں بات رہ جائے مری | خنجر قاتل میں جب تک دم رہے
قامت موزوں کی دکھلا دو بہار | بول بالا آپ کا ہر دم رہے
ان کی محفل سے پھرے سب ناامید | جانے والے ایک باقی ہم رہے
چین پایا ہم نے احسن بعد مرگ
ورنہ جیتے جی ہزاروں غم رہے
(عطیہ جناب سید رفیق مارہروی
خاص برائے تنویر)

جیون بھول

نوشتہ محترمہ بہار بلگرامی

(۱)

میری پیاری رضیہ!

آہ! آج وہ ایک گزری ہوئی کہانی ہو گئی۔ زمانے کے انقلابات تقدیر کی نیرنگیوں میں حلول کر گئے۔ لیکن صحیفۂ دل کے بچے کھچے ورق پر ایک خفیف و مبہم سا عکس مرتسم ہے۔ ہاں ابھی دنیا کو سنانے کے لئے ایک بھولی ہوئی کہانی کچھ کچھ یاد ہے۔

وقت کی چکی ہر زد میں آنے والے کو پیس ڈالتی ہے اور افسوس کہ نجمہ بھی نہ بچ سکی ـــــ وہ کہیں کی نہ رہی آج یہ سطور لکھتے ہوئے بچھلی کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا ہے۔ اُس کو یاد کر کے میری روح کانپتی ہے جی پریشان ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے واقعات کی تہہ کو نہ پہچانا یا نہ سمجھا کہ آتش فشاں کو ایک خاموش پہاڑ تصور کیا۔ پیتل پر سونے کا دھوکا کھایا۔ جھوٹ کو سچ مانا اور جھوٹے وعدے پر یقین کیا۔ آخر میں اُسکی زندگی اجیرن ہو گئی۔

آج بھی نجمہ کا خیال کر کے میں محبت کے جھوٹے دعویداروں کو جذبات کے غلام نوجوانوں کو جو بھولی بھالی دوشیزاؤں کو لوٹ لیتے ہیں اور محبت کا ڈھونگ رچا کر ان کی زندگی غم و اندوہ میں غرق کر کے آپ معصوم بن کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ کف افسوس ملنے سے باز نہیں رہ سکتی اس پر طرہ یہ کہ سوسائٹی بھی مردوں کی طرفدار بن جاتی ہے اور ان دھوکا بازوں عصمت کے ڈاکوؤں سے کوئی بازپرس کرنے کے بجائے بیچاری لڑکی پر ہر طرح کے ظلم و ستم روا رکھتی ہے اور جس قدر ایذا پہنچا سکتی ہے۔ پہنچاتی ہے۔ عذر میں کہا جاتا ہے وہ لڑکی ذات ہے اور وہ مرد۔ مرد کی عزت اتنی نازک نہیں لیکن عورت کی عزت ایک نہایت نازک آئینہ ہے جو اگر عصمت پر ڈاکہ ڈالے تو اُسے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ مرد ہے لیکن عورت کے دامن پر گناہ کا ایک چھینٹا بھی گو وہ مرد ہی کی ابلہ فریبوں کا نتیجہ کیوں نہ ہو عورت کی مکمل زندگی کو غارت کر دینے کے لئے کافی ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں انجم نجمہ کا تھا اور نجمہ انجم کی تھی وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ انجم نجمہ کو پا کر اپنے کو نہایت خوش نصیب خیال کرتا تھا۔ اور بغیر مستقبل کا خیال کئے اور بغیر سوچے سمجھے وہ اس جیون نیا کو پریم ساگر میں بڑھائے چلا جاتا تھا نہ ہوا کا خوف تھا نہ کسی طوفان کا۔ وہ اپنے آپ کو نجمہ کے سپرد کر کے بے خوف ہو گیا تھا۔ مگر آہ! ابھی اس نے پریم پتھ پکڑے ہی تھے کہ سماج اور اُس کے قوانین آندھیاں بنکر اس کی نیا کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ ہر طرف سے انگشت نمائیاں ہونے لگیں۔ فقرے اور طعنے کسے جانے لگے۔ انجم یہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا اور آخر سر جھکا لیتا۔ اس کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

(۲)

نجمہ اپنی ماتا کے ماتھے کی بندی اور پتا کے جیون کا سہارا تھی اس کے بھائی بہن بھی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ قدرت بھی اس پر معمول سے زیادہ مہربان نظر آتی تھی جہاں اسے حسن کا بیش بہا خزانہ ودیعت کیا گیا تھا۔۔ وہاں دولت علم و عقل سے بھی مالا مال کر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انجم نجمہ پر پروانہ وار نثار رہتا۔ مگر اُس کے گھر

ساون آیا اور رو کر چلا گیا۔ مگر میرے دل کا مرجھایا کنول ہرا نہ ہوا یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں سے گنگا جمنا کا سیلاب رواں ہو گیا مگر پھر بھی سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ نجمہ۔۔ ۔ ۔ پیاری نجمہ میرا اس وقت دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اگر تم نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا تو میں کہیں کا نہیں ہوں گا۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہارے قدموں پر سر رکھتا ہوں ـــ نجمہ میری التجائیں کو ٹھکراؤ نہیں تو بروزِ حشر تمہارا گریبان میرے ہاتھ میں ہوگا۔ اُس وقت خدا کو کیا مُنہ دکھاؤ گی ـــ نجمہ۔ میری نجمہ ـــ بولو ـــ بولو ـــ

خودکشی، ناشادزندگی، تعجب، حیرت، اب بھی سماج کی آنکھیں نہیں کھلتیں سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ اندھا ہے۔

ہائے! تم یہ کیا کہتے ہو انجم خودکشی جس کا نام ہے تجھے کچھ نہیں اب موت سے ہمکنار ہونے جا رہا ہوں ـــ شاید اب میری لاش بھی تم نہ دیکھ سکو۔ میں یہاں سے بہت دُور اور میلوں دور چلا جاؤں گا جہاں میری قبر تلاش کرنے کے باوجود بھی تمہیں دستیاب نہ ہو گی ـــ خیر میں جانتا ہوں کہ تم رو رہی ہو مگر رو مت، میری خطاؤں کو معاف کرو میرا آخری سلام قبول ہو میں جاتا ہوں ـــ ـــ

یہ تھے ایک مطالبہ پرست دغا باز عاشق مجنوں کے الفاظ جنہوں نے نجمہ کے دل پر تیر و نشتر کا کام دیا وہ بھڑک اُٹھی۔ مگر وہ کیا اگر اُس کی جگہ کوئی سنگدل سے سنگدل بھی ہوتا وہ بھی رو پڑتا پھر نجمہ تو ایک عورت ہی تھی اُس کا دل کیوں نہ پسیجتا وہ بیچاری بیقرار ہو گئی، تڑپ گئی۔ فوراً کہہ اُٹھی،

انجم مایوس نہ ہو۔ میرا فرض ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔ تم نے میرے لئے اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں موت کے عمیق غار میں غرق ہوتا ہوا دیکھوں ـــ انجم ـــ نجمہ تمہاری ہے اطمینان رکھو۔ نجمہ کے ان لفظوں سے انجم کے جیون کی اُجڑی بگیا لہلہا اُٹھی۔ اُس کے سوتے ہوئے بخت نے کروٹ لی۔ تقدیر نے پلٹا کھایا اور انجم کو ان الفاظوں کی بدولت دنیا میں جینے کا موقع ملا۔

(۵)

ایک روز انجم نے کہا نجمہ! اب ہم لوگ ہنسی خوشی اپنی زندگی گذاریں گے ہمیں کسی کا ڈر نہیں کیونکہ اب ہماری شادی ہو جائے گی۔

مگر انجم تم جانتے ہو کہ شادی کے بعد تمہاری روش کیا ہوگی شاید وہی جو مردوں کی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ عورتوں کو نہ معلوم کس کس طرح سے کیسے عجیب و غریب دکھ درد و اذیت پہنچاتے ہیں جو بعد میں ان کی موت کا باعث ہوتی ہیں۔ انہیں دنیا میں جینا دوبھر ہو جاتا ہے اور وہ لوگ زندگی سے تنگ آ کے .

نجمہ تم یہ کیا کہہ رہی ہو ـــ شاید تمہیں شبہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ بے وفائی یا بُرا سلوک کروں مگر تم یقین رکھو یہ دل اب کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اگر میری زندگی کا آخری لمحہ بھی تمہارے کام آ سکا تو دریغ نہ کروں گا۔ تمہارے لئے تو میری جان حاضر ہے۔ تمہیں مجھ پر پورا اختیار ہے جیسا کھلاؤ گی۔ کھاؤں گا۔ جیسا پہناؤ گی۔ پہنوں گا۔ میں کسی کا نہیں ہوں صرف تمہارا ہوں۔ تمہارے ہی لئے زندہ رہوں گا۔ اور تمہارے ہی لئے مروں گا مگر انجم مردوں میں شادی کے بعد پہلے سی محبت نہیں رہتی۔ وہ خودغرض ہوتے ہیں ہر بات سے عورت کے شیشۂ محبت کو چکنا چور اور اس کی زندگی کو پامال کر دیتا ہے نجمہ میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں۔ اگر تمہیں اطمینان نہ ہو تو دیکھ لینا یا تو مروں گا یا تمہیں حاصل کر کے چھوڑوں گا نجمہ رحم کرو۔ مجھے دھوکا باز یا بے وفا تصور نہ کرو۔ تم نے جو مجھ کو اسے محروم کیا تو پچھتاؤ گی۔

نجمہ۔ سید اپنی زبان سے کبھی نہیں پھرتے میں بھی سیدزادی ہوں . .

(۶)

انجم کو نجمہ کے گھر والوں نے اور تمام دوست احباب نے روکا کہ دیکھو انجم اپنے والدین کی مرضی سے شادی کرو۔ تمہیں خود نہ کرنا چاہیے وہ لوگ جہاں منتخب ہو کر کریں۔ وہاں سرِ تسلیم خم کر دو۔ مگر ایک بیٹی لڑکی کی گردن

نہ مارو۔ اپنے ہنگامی جذبات کے لئے ایک بھولی زندگی کو تباہ و برباد نہ کرو دیکھو یہاں سے ہٹ جاؤ۔ اپنے ارادوں کو تبدیل کر دو یا پھر اپنے گھر والوں کی مرضی سے کر شادی کرو۔ مگر افسوس انجم نے ایک نہ سنی اور کہا کہ میرا اس وقت دنیا میں کوئی نہیں ہے میں اپنی مرضی سے اور اپنی شادی کرنا چاہتا ہوں اور اب بھی میرے ہونے والی خوش دامن نے منظور نہ کیا تو میں کہیں کا نہیں ہوں گا۔ اس کے بعد نجمہ کی چوکھٹ کی خاک چھان ڈالی۔ میں تنہا ہوں مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرو۔ میں یہیں ہوں گا۔ آپ لوگوں کو اپنے والدین سمجھ کر آپ کی خدمت کروں گا۔ آپ ہی لوگ میرے سب کچھ ہیں۔ میری زندگی کو بچا لو۔ مجھے مایوس نہ کرو۔ میں دنیا کا ٹھکرایا ہوا ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔

خصوصاً نجمہ کے آگے سترد فعناک رگڑی اور ہزار ہا مرتبہ قدموں پر سر رکھ دیا کہ میری التجاؤں کو نہ ٹھکراؤ۔

نجمہ — میں کہیں کا نہیں ہوں گا۔ اگر تم نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا تو پھر کون دے گا — نجمہ کیا تمہیں اب بھی اعتبار نہیں آتا۔ میں تم سے — اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں — خیر اب تمہیں اختیار ہے۔ جیسا چاہو ویسا سلوک کرو۔ میں تو اب تمہارا ہو چکا۔ تمہارے ہی رحم و کرم پر میری زندگی کا دارومدار ہے

(۷)

دنیا نے بہت منع کیا مگر انجم نے ایک نہ سنی اور گا بجا کر شادی کر لی۔ مبارک باد کے نعرے بلند ہو گئے۔ چاروں طرف خوشی کی صدائیں آنے لگیں۔ غرضیکہ ہر کوئی شاداں نظر آتا تھا۔ تقدیر بھی ہنس رہی تھی۔

(۸)

نجمہ اور انجم شادی ہونے کے بعد بہت مسرور تھے۔ مگر افسوس صد افسوس زمانے کی نیرنگیاں ہر ایک پر اپنی خاص نظر رکھتی ہیں اور ان کی مصیبتیں روز افزوں ترقی کرتی جاتی ہیں۔ وہ کب تک ان لوگوں سے لڑتا رہے گا۔ اپنی گردش کے ساتھ اور کب تک انھیں ان سے لڑنا پڑے گا۔ اس منحوس گردش نے نجمہ کو بھی کہیں کا نہیں رکھا جلا جلا کر اس کا خون اور پانی ایک کر دیا یعنی شادی ہوتا ہی تھا کہ نجمہ کی مصیبتوں کا آغاز شروع ہو گیا۔ گویا قدرت اس بات کی منتظر تھی کہ کب شادی ہو اور کب تکلیفوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ گھر میں قیامت کا سماں نظر آنے لگا یعنی ایک نئی آفت کی بالا طفل ہو گئی

گھر میں کہرام مچ گیا اور اس نئی آفت نے خاص کر نجمہ کی زندگی کو اجیرن بنا ڈالا روزانہ لڑائی جھگڑے و فسادات بپا ہونے لگے۔ یہاں تک کہ نجمہ اب نجمہ نہ رہی بلکہ اسکی ہڈیاں تک گل گئیں۔ صرف نازک سی ہڈیوں کا ڈھانچ باقی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا جس طرح سے ایک درخت کو اندر ہی اندر کیڑا کھا جاتا ہو دیکھنے میں ثابت، مگر اندر سے کھوکھلا یہی راز اب نجمہ کا بھی ہے مگر کیا کرے بیچاری اف نہیں کرتی۔ جانتی ہے کہ مقدر سے انتقام کس طرح لے ؎

باندھے کمر ہے ظلم پہ صیاد بے سبب
نالہ مرا فضول ہے فریاد بے سبب

(۹)

اب انجم نجمہ کو کتنا بھی ذلیل کرے اور روزانہ ہزار صلواتیں سنائے پھر بھی کم ہیں۔ کیونکہ جہاں اس بیچاری نے کچھ کہا۔ وہاں نجمہ اپنی کمینی حرکتوں پر اتر آیا۔ حالانکہ اب بھی وہی نجمہ ہے جس کے واسطے تڑپتے تھے مگر مثل مشہور ہے کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر بات کا زخم نہیں بھرتا۔ یہی حالت اب نجمہ کی بھی ہے۔ وہ اس واقعہ کو اپنی زندگی میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی وہ اس کو جلا کر خوش ہوتے رہیں اور رلا کر ہنستے ہیں۔ حالانکہ نجمہ ہی نے اسے دوبارہ زندگی عطا کی۔ اس کی بدولت وہ آج زندہ ہے اس نے ایسے وقت میں انجم کا ساتھ دیا۔ جبکہ دنیا میں کوئی اس کا نہ تھا اور وہ خود بھی دنیا سے مایوس ہو چکا تھا۔ صرف نجمہ کی ہی ایک ایسی ہستی تھی کہ اسنے دنیا کو ٹھکراتے ہوئے انجم کا ساتھ دیا۔ مگر گردش نصیب، نیکی برباد گناہ لازم۔ یعنی نیکی کر دریا میں ڈال۔ اب اچھے ہیں تو انجم اور ان کے گھر والے۔ اگر بری ہے تو بیچاری نجمہ اور اس کے گھر والے۔ ان کو طرح طرح کے ناموں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ پہلے انجم کے در پے مانگنے پر جتنا

انجم نے کہا ہوگا۔ اُتنا نجمہ نے لاکر دیدیا۔ مگر وہ کب تک دیتی رہتی چار دن کے آم، آندھی آئی جھڑ گئے۔ اور ختم ہو گئے۔ اب اُس کے گھر والوں کے پاس اتنا ہے کہ جب وہ جتنا مانگیں اُتنا فوراً نجمہ انہیں سے جا کر دے تب تو وہ اور اُس کے گھر والے اچھے ہیں ورنہ چور، بدمعاش دنیا بھر کے کمینے تمام عیبوں سے پُر، غرضیکہ کوئی دنیا کی بُرائی ایسی نہیں جو نجمہ یا اُس کے گھر والوں میں موجود نہ ہو گویا ساری دنیا میں شریف یہی لوگ ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ایک کمینے سا کمینہ شخص بھی اپنی بیوی یا اُس کے رشتے داروں سے ایسا سلوک یا برتاؤ نہیں کرتا ہوگا۔ اور نہ اس سے اس طرح کی بدگوئی سے پیش آتا ہوگا۔ جس نے مصیبت کے وقت اُس کا ساتھ دیا۔ مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ اب ان کی نگاہ میں اس درجہ مجرم تھی کہ تلوار اور بھالے سے کام لیا جائے۔

مجازی خدا صاحب فرماتے ہیں میں نے خدمت کے لئے کیا ہے۔ بہت خدمت کراؤں گا۔ تمہارے آرام کے واسطے نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے عیش و آرام کیلئے پانچ روپے میں کھلاؤں گا اور لونڈی بنا کر رکھوں گا۔ نہیں تو ناک کاٹ ڈالوں گا کہ دنیا والے دیکھتے ہی حیرت میں پڑ جائیں۔ ابھی جو ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اُنہیں بھی اُلٹا کر کے رکھ دوں گا۔ اور سارے گھر کی بے عزتی کرا کے بدلہ نکالوں گا۔ پکا موالی کا موالی ہوں۔ سمجھا کیا ہے۔ اگر ایک تھپڑ مار دوں گا تو مر کر ہی رہ جاؤ گی۔ مجھے اُس کی پرواہ نہیں کہ جیل ہو یا پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جاؤں مگر یاد رکھنا کہ مار کر ہی مروں گا۔ کیا مجھے عورت نہیں ملتی ابھی کر کے بتاتا ہوں کیونکہ تمہارے ساتھ میرا نباہ نہیں ہو سکتا میں تم سے تنگ آ گیا ہوں کہ تم سے دس پندرہ روپے تک گھر نہیں چلتا۔ حالانکہ میرے گھر والے تو دس اور پانچ میں گھر کے اخراجات پورے کر لیتے ہیں دیکھوں میں بات پکی کر کے آتا ہوں۔

(۱۰)

پھر خدا معلوم وہاں کیا صلاح ہو گئی کہ اچانک ایک روز انجم کے گھر والے نجمہ کے یہاں آ موجود ہوئے۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گذرے تھے کہ لگیں لمبے ہاتھ مٹکا کر شرافت کے پھول برسانے جاؤ جی جاؤ، سب معلوم ہے۔ اپنی بیٹی کو بلاؤ اُن سے پوچھو۔ دھوکا باز ہیں۔ مکاری سے کام لیا اُس کو پھنسا دیا۔ گھر میں گھسیڑ کر رکھا۔ کیا اُس کو لاوارث سمجھا ہے کیا اُس کے رشتے دار نہیں۔ میرا تو مرد بچہ ہے ایک نہیں دس عورتیں رکھ چکا ہو یا لا کر رکھے۔ تب بھی کھلاؤں گی میرا مرد بچہ تو عزت دار ہے۔ ناک کٹی تو تمہاری اور تمہاری بیٹی کی۔ اُس کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ اب اُن سے یہ پوچھا جائے کہ شادی سے قبل تو کوئی بھی نہیں تھا مگر اب یہ کہاں سے اُبل پڑے یا پیدا ہو گئے۔ پیدا ہو گئے تو بھی گھر جانی دشمن بھی۔ اماں دو ٹکڑے کرنے کے لئے تیار، بھائی بھی کسر نکالیں گے بہنیں بھی۔ دس میں کھلا کھلا کر اور ستا ستا کر ماریں گی۔ اور اُن کی نگاہ میں بھی ایسی وقعت ہے کہ جلا جلا کر اور رُلا رُلا کر جان لی جائے۔ غرض ذلیل طعن و تشنیع نے نجمہ کے کلیجہ کو چھلنی کر ڈالا۔ کہاں تک دُکھ درد سہے۔ رنج و غم برداشت کرتے کرتے، اب اُس کی قوت برداشت بھی زائل ہو چکی، اُس کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا۔ یہاں تک کہ اب جنونی حالت میں کچھ کہہ بیٹھتی ہے تو گنہگار۔ بقول شاعر

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں رسوا
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

نوبت یہاں تک پہنچی کہ جسم گھل گیا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچ رہ گیا اب بیچاری ہڈیوں کے درد کے مارے سو تک نہیں سکتی۔ نہ دن کو قرار نہ رات کو چین شب و روز تیر و نشتر چلائے جاتے ہیں۔ عجیب کشمکش میں زندگی ہے نہ مرتے چین نہ جیتے چین۔ جب طبیعت پریشان ہو جاتی ہے تو تنگ آ کر کہہ اُٹھتی ہے

قسمت کیا مقسوم کو قسّام ازل سے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ پروانے کو دیا جلنا
غم ہم کو دیا وہ جو مشکل نظر آیا

لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نجمہ کیا تھی اور کیا ہو گئی زندہ ہے مگر زندہ درگور

اپنے سے اپنے سنجیدہ لوگ بھی اُس کو دیکھ کر آنسو بہاتے ہیں۔ اور سہیلیاں اُس کا مذاق اُڑاتی ہیں۔ آخر مجبور ہو کر وہ ان لوگوں کو یہ جواب دیتی ہے کہ میری پیاری بہنو۔ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے اور تم لوگوں کو میری حالت پر ترس بھی آتا اور بعض وقت مذاق بھی اُڑاتی ہو مگر پیاری بہنو! ہنسو نہیں ؎

قسمت کی بدنصیبی کو صیاد کیا کرے
سر پر گرے پہاڑ تو فنسر یاد کیا کرے

بلکہ عبرت حاصل کرو ایک بیوقوفی سے کیا کیا ہوا۔ بیوہ بن گئی، اور بیوی والے ہو گئے وہ بھی گلے پڑ پڑ کر، مرنے کی دھمکی بتا بتا کے اور ہزار دفعہ چوکھٹ پہ ناک رگڑ رگڑ کے جب در وازے کی دھول سے ڈالی ناک گھس گئی۔ جب جا کے کہیں نصیب ہوئی، جب مل گئی۔ تو یہ بیقدری، وہ بھی پیسوں کی بدولت، جب تک دیئے جاؤں۔ جب تک، اچھی ہوں ورنہ جوتی بیزار کی نوبت یہاں تک کہ جینا

رفیقہ میں تمھیں کیا بتاؤں کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے ایک آگ ہے جو ہر وقت سینے میں سلگتی رہتی ہے۔ چاہتی ہوں کہ یہ شمع تم پر بھی روشن کر دوں۔ رفیقہ میرے واقعات سے عبرت حاصل کرو اور ان دغاباز، جھوٹے فریبی، مجنوں اور فرہادوں سے بچو یہ کمبخت پھسلا کر اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ اور جلا جلا کر مارتے ہیں۔ رفیقہ اگر آج تم کو حقیقی معنوں میں مجھ سے محبت ہوتی تو آج میرا یہ نتیجہ نہ ہوتا کہ دنیا مجھ پر آنسو بہاتی ہے۔

افسوس! میں نے واقعات کی تہہ کو نہ سمجھا۔ جھوٹ کو سچ مانا۔ میرے جیون کی ایک ہی بھول نے ستیاناس کر دیا ؎

تمھاری بدنصیب
نجمہ

سرورق پر جو کرن کا فوٹو ہے وہ مشہور فلیشا اسٹوڈیو بمبئی کے آرٹسٹ مسٹر امبالال نے کھینچا ہے

رکشا بندھن

دُکھی پریمنگری

آج رکشا بندھن کا تہوار تھا۔ مسعود اپنے مکان کی گیلری پر کھڑا ہوا۔ اس دکان کو تک رہا تھا جس کے سامنے بہت سی رنگ برنگی راکھیاں فروخت کے لئے لٹک رہی تھیں مسلمان ہونے کے باوجود اسے رکشا بندھن کے تہوار سے عقیدت تھی کیونکہ اس کے نزدیک یہ تہوار بھائی بہن کی پاک محبت کی خوشگوار یادگار تھا۔ بہن بھائی۔ دیدی۔ دادا۔ بھیّا کیسے معصوم الفاظ کیسے پُرخلوص جذبات کے حامل۔ اس کی بھی تو بہنیں تھیں۔ مگر آج رکشا بندھن کے تہوار کو وہ اس سے ہزاروں میل دور تھیں۔ آج سے پانچ برس پہلے انھوں نے اسی تہوار کو والدین سے چھپ کر اس کے ہاتھ میں راکھیاں باندھی تھیں۔ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھیں ایک دفعہ جب وہ بیمار پڑا تھا۔ تو ایک نے اس پر سے اپنے تینوں بچوں کو صدقہ اتارا تھا کہ اس کا بھیّا اچھا ہو جائے چاہے اس کے بچے..... مگر آج جب اس کے سر میں اس قدر درد تھا کوئی پوچھنے والا تھا مسعود کے جذبات اُمنڈ آئے اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسے بھی اپنی بہنوں سے محبت تھی، وہ رومال سے آنسو خشک کر رہا تھا کہ ہچکیوں کی آواز سن کر چونک پڑا آواز گلی کی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ گیلری کے اس سرے پر آ کھڑا ہوا۔ ہمسایہ مکان میں کوئی رو رہا تھا۔ وہ اندر آ گیا اور اسٹول پر کھڑا ہو کر روشن دان سے دیکھنے لگا جہاں سے وہ روزانہ ڈاکٹر مکرجی کی لڑکی پنگلا کو دیکھا کرتا تھا کیونکہ اس کی صورت اس کی بہن سے ہو بہو ملتی تھی۔ حالانکہ وہ خود جانتا تھا کہ کسی کو اس طرح چھپ چھپ کر دیکھنا پاپ ہے مگر اسے اپنی نیت پر بھروسہ تھا اور اس کا دل کہتا تھا کہ یہ پاپ نہیں ہے۔ پنگلا کو دیکھنے کے بعد اسے یہی محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنی بہن کو دیکھ لیا ہو.......

روشن دان میں سے اس نے دیکھا۔ پنگلا میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھی ہے۔ سامنے ایک سبز راکھی اور سیندور کی پڑیا رکھی ہوئی ہے اور وہ اپنے سرگباشی بھائی دیال کی تصویر کو آنسوؤں سے نہلا رہی ہے۔ یہ درد انگیز منظر دیکھ کر مسعود کے بھی آنسو نکل آئے وہ دیر تک صامت و ساکت بنا پنگلا کی حالت کا معائنہ کرتا رہا۔ آہ ظالم سماج!

اُس کا کتنا جی چاہتا تھا وہ دوڑ کر پنگلا کے پاس جا بیٹھے اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہے دیدی رنج نہ کرو، اداس مت ہو۔ میں تمہارا بھائی ابھی زندہ ہوں دیدی میری بہنیں بھی دور جیل پور میں ہیں۔ وہ بھی وہی درد فرسا کیفیت گذر رہی ہے جو تمہارے دل پر، پھر آہستہ سے اس کے آنسو صاف کرتا وہ اس کے راکھی باندھتی سیندور لگاتی اور پھر دیر تک دونوں بھائی بہن باتیں کرتے رہتے اور رکشا بندھن کا تہوار اتنا حسرت خیز نہ ہوتا۔ مگر کیا وہ ایسا کر سکتا ہے ہماری سماج میں تو مرد اور عورت کے تعلقات کو اس قدر نازک بنا دیا گیا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں گناہ کے سوا کسی دوسری چیز کا خیال سا ہی نہیں سکتا۔ انھیں یہ باور ہی نہیں ہوتا کہ ایک غیرت مند نوجوان ایک غیر مذہب کی دوشیزہ سے بہن کے تعلقات قائم کر سکتا ہے ان کے یہاں اس کلیہ کا کوئی استثناء ہے ہی نہیں۔ پھر مذہب کے ٹھیکیدار ان مہذب پنڈتوں اور ملاؤں نے محبت۔ تو محبت آج کل تو ہمدردی کو بھی پاپ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اگر آج وہ ڈاکٹر صاحب سے جاکر کہے کہ دیکھئے پنگلا دیدی دیال بھیا کی یاد میں رو رہی ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں جاکر راکھی بندھوا لوں۔ اس سے شاید ان کو تسکین ہو سکے..... ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے میں ڈاکٹر مکرجی نے داخل ہو کر کہا "پنگلا بیٹی تم تعلیم یافتہ ہو یہ پرانے رسم و رواج ہیں۔ بیکار اداس نہ ہو۔ چلو جاؤ منہ دھو ڈالو۔"

اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔ پنگلا نے ان کے جاتے ہی دیال کی تصویر کو سینے سے لگا لیا۔ اور دیال دادا کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی پھر تصویر رکھ کر راکھی اور سیندور کی پڑیا اٹھائی دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر توڑ مروڑ کر کھڑکی سے باہر گلی میں ڈال دی اور پلنگ پر آ کر لیٹ رہی۔ ہچکیوں کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ مسعود دل کو تھامے ہوئے اسٹول سے اتر آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ بیچاری پنگلا! اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ کاش میں تمہاری مدد کر سکتا۔ کاش وہ پچھلا زخم بھر سکتا

جب کہ ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شرکت کرتے تھے مگر آج تو ان خود غرض سماج کے باغیوں نے ہمارے دلوں میں وہ نفاق کے بیج بو دیئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں جب میں کسی کی زبان سے سنتا ہوں کہ ”یہ تو آخر ہندو ہی ہے تو آخر مسلمان....!“ تو میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ آہ دغاباز، ہلاکت آفرینو! ذرا سوچو شہنشاہ ہمایوں و رانی کرناوتی بھی تو تمہارے ہی آباؤ اجداد میں سے تھے ذرا تصور کرو۔ مالوے کا بادشاہ بہادر اپنے دوست مظفر کی شکست کا بدلہ لینے کو چتوڑ پر چڑھائی کرتا ہے۔ تمام راجپوت حتیٰ کہ مہارانی جواہر بائی اور راجکماری کرناوتی بھی ننھے اودے سنگھ کی جان بچانے کے لئے میدان میں پہنچ گئی ہیں تھوڑی ہی دیر کے بعد لاکھوں راجپوت اور تیرہ ہزار راجپوتنیاں خاک و خون میں مل گئیں۔ شکست یقینی ہے۔ لیکن راجکماری کرناوتی فقط بہن کی محبت کی طاقت کے بل پر اپنے ہاتھ سے ایک راکھی تیار کرتی ہے اور ایک سوار کے ہاتھ مدد کے پیام کے ساتھ شہنشاہ ہمایوں کے پاس روانہ کرتی ہے۔ ہمایوں بنگال کو نصف سے زیادہ تسخیر کر چکا ہے اور بقایا مخالف فوج بھی ہتھیار ڈالنے والی ہے کہ اتنے میں راجکماری کی راکھی اور پیام پہنچتا ہے۔ ہمایوں ہندوستان کا شہنشاہ اس وقت شہنشاہ نہیں رہتا۔ وہ صرف ایک ”بھائی“ رہ جاتا ہے۔ جو اپنی بہن کے لئے سب کچھ قربان کر سکتا ہے اور ہمایوں وزراء اور سپاہیوں کی سخت مخالفت کے باوجود سالہا سال کی کری کرائی فتوحات کو پس پشت ڈال کر اپنی منہ بولی بہن کی مدد کو دوڑتا آتا ہے۔ اپنے ہی ہم مذہب بادشاہ کو شکست دے کر راج پاٹ اپنی بہن کو سونپتا ہے اور اگر آج ایسا واقعہ ہو تو.... کیا تم لوگوں نے مذہب کا نام لے کر ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا نہیں بنا دیا۔ افسوس صد افسوس! مسعود دانت پیستا ہوا اُٹھا اور پھر کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔ یکایک پھر ہچکیوں کی آواز آنے لگی۔ ... وہ پھر اسٹول پر آکھڑا ہوا۔ پنگلا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے بڑی بڑی آنکھیں اور رونے اور آنسوؤں کے اثر سے سرخ ہو گئی تھیں اور وہ حسرت و یاس و بیکسی کا زندہ مجسمہ بنی ہوئی اپنے بھائی کی تصویر سے کہہ رہی تھی: ”دیال دادا تم ہمیں چھوڑ گئے۔ روٹھ گئے اپنی پنگلا سے آج تہوار کے دن بھی ہمارے پاس نہیں آتے۔ اتنی دور کیوں چلے گئے۔ دادا آ جاؤ دیکھو تم نہ آؤ گے تو میں کس کے راکھی باندھوں گی۔ پھر آہ بھر کر کہا: ”راکھی تو اتنے دن سے محنت کر کے بنائی تھی جیسے مجھے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ مجھے یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ رکشا بندھن کو تم نہ ہوگے۔ میرے جیون میں تو یہ پہلا ہی تہوار ہے۔ جس روز میں نے کسی کے راکھی نہ باندھی ہو۔ آہ دیال دادا تم نہیں آتے“۔ پنگلا کہتے کہتے پھر تصویر کو سینہ سے لگا کر رونے لگی مسعود سے نہ دیکھا گیا وہ چپکے سے گلی میں گیا۔ پنگلا کی پھینکی ہوئی ٹوٹی راکھی اُٹھائی۔ بکھری ہوئی سیندور کی پڑیا لی۔ اوپر آیا۔ ماتھے پر سیندور کی بندی لگائی ہاتھ میں ٹوٹی راکھی باندھی اور اسٹول پر جا کھڑا ہوا ہلکی سی سیٹی سے پنگلا کو اپنی طرف مخاطب کیا اور کہا ”پنگلا میری بہن تو مت رو تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔ یہ دیکھو تمہاری راکھی میں نے باندھی ہے“ مسعود نے اپنا ہاتھ روشندان سے باہر کیا۔ پنگلا پہلے تو متعجب ہوئی۔ پھر کچھ شرمائی پھر اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے نمسکار کیا اور جھک گئی۔ جیسے چرن چھو رہی ہو اور جب اس نے سر اُٹھایا تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوشی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ رہی تھی۔ عین اسی وقت مسعود کے متعصب چچا نے کھنکار کر کہا ”ہندو ہو جاؤ ہندو“ لیجیے وہ تم سے بھی ہاتھ کھو گئی۔“

ترانۂ مستقبل

(از محترمہ شمیم ملیح آبادی)

بغاوت کی جواں سینوں میں جب چنگاریاں ہونگیں
حکومت کے کمیں گاہوں پہ آتش باریاں ہونگیں

نہ زرداروں کے محفل میں ترنم باریاں ہونگیں
نہ یہ مدہوشیاں ہونگیں نہ یہ سرشاریاں ہونگیں

پیدا دیگی فضا کو باغیوں کی ولولہ خیزی
اجل کی گود میں پھر زیست کی چنگاریاں ہونگیں

جلالِ قیصری چومے گا اک دن پائے محکومی
دیارِ بے نوائی میں بھی خودداریاں ہونگیں

امیروں کی خدائی میں پڑیگی بھوک کی ہل چل
رخِ مزدور پر پُرسکن تبسم باریاں ہونگیں

لرز جائیگی دنیا جب بغاوت سر اُٹھائیگی
زمینداروں کے حسن خانوں پہ آتش باریاں ہونگیں

یتیموں کے خنک اشکوں میں لہرائیگی شادابی
چمن میں ہوگا ہند کے گلباریاں ہونگیں

اسی اجڑی ہوئی محفل میں جشنِ زندگی ہوگا
انہیں سوکھے ہوئے کھیتوں پہ گوہر باریاں ہونگیں

شمیم اُٹھ کارزارِ زندگی میں رکھ قدم اپنا
دیارِ ہند میں تو جانے کب بیداریاں ہونگیں

غیر مطبوعہ

سکندر نے تسخیر ہند کا خواب دیکھا
لیکن
پورس نے اس خواب کا طلسم توڑ دیا
منروا مووی ٹون
جو فلمی دنیا میں
اپنی نظیر نہیں رکھتی
سکندر
کی عظیم الشان پیش کش
MINERVA PRODUCTION
MINERVA PRODUCTION
ایک فاتح اور ایک جنگجو بادشاہ کی کہانی جسے گذشتہ
زمانہ کی تمام شوکت و عظمت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے
ڈائرکٹر :- سہراب مودی
اداکاران :- سہراب مودی ۔ پرتھوی راج ۔ ونمالا ۔ مینا ۔ شیلا
صادق علی ۔ لالہ یعقوب ۔ ظہور راجہ ۔ کے ۔ این ۔ سنگھ
عنقریب پردۂ سیمین پر پیش کیا جائے گا ۔

مسلسل

اے بی تم تو با تھ دھو کر میرے پیچھے پڑگئیں، دو دن کے لئے گھر آتا ہوں خوشی کی تلاش میں مگر معلوم ہوتا ہے کہ خوشی میری قسمت میں ہی نہیں...... اے کیوں نہیں لڑکے...... اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ... نالائق ... میں نے پشتہا پشت کے جواہرات اکٹھا کر کے کن کن مصیبتوں سے یہ زیورات اپنی بہو کے لئے تیار کرائے تھے۔ بھائیوں سے دشمنی مول لی۔ خاندان میں بُرا بنی سب کچھ تیری خاطر منظور کیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تو ایک ذرا سی تصویر بنوانے کی خاطر یہ خزانہ لٹا دے گا۔ میں نے اس خیال سے مجھے رکھنے کو دیئے تھے کہ بحفاظت رہیں گے۔ امی پیاری ...... تم آخر تو میرے ہی لئے یہ جواہرات رکھے تھے میرے ہی بہترین مصرف میں آ گئے۔ آخر میری ہی تصویر بنوائی میں تو کام آئے۔ مر جاؤں گا تو یہی تصویر دیکھ کر تمہارے دل کو تسکین ہوگی۔ اے چل ہٹ مجھے باتوں میں اڑاتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ ان جواہرات کے لئے میں نے کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں، کتنی قربانیاں کی ہیں۔ آہ! اب فخر الملک جیسے عالی شان والی تبار جاگیردار کی پری چہرہ لڑکی کے لئے ہمارے پاس کیا رہا؟ خورشید! مجھے تجھ سے ایسی اُمید نہ تھی...... اس پر بھی تو اکڑ رہا ہے کہ میں شادی نہ کروں گا میں پوچھتی ہوں آخر کیوں نہ کرے گا؟ کہیں شریفوں میں بھی نسبتیں ٹوٹا کرتی ہیں اگر تو اپنی دلہن کا پتا ہے تو جا آج سے ہمارا تیرا کوئی تعلق نہیں۔ چولہے میں جھونکیں ایسی اولاد کو جو ماں باپ کی عزت و آبرو کا خیال نہ کرے۔

اسی اثنا میں نواب شمس الملک ہاتھ میں ایک لفافہ لئے کمرے میں داخل ہوئے اور خورشید مرزا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا... خورشید نے لفافہ کھول کر پڑھا۔ باپ نے حقوق فرزندی سے عاق کر دیا...... خورشید چپکے سے اٹھ کر باہر جانے لگا۔ ماں کی مامتا نے جوش مارا وہ لڑکے کے پیچھے دوڑی تاکہ اسے منا کر سمجھا بجھا کے گھر لے آئے مگر بڈھے نواب صاحب نے انھیں روک دیا اور کہا کہ عزت سے بڑھ کر اولاد ہرگز نہیں...... ایک ہی شرط پر یہ ہمارا لڑکا رہ سکتا ہے کہ اپنی گستاخیوں کی معافی مانگے اور اسی ہفتے میں ناز آفریں سے شادی کر لے چار سال منگنی کو ہو چکے ہیں۔ سمجھتے سمجھاتے ناک میں دم آ گیا اور یہ گستاخ و ناخلف مانتا ہی نہیں۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

ٹرین ہوا سے باتیں کرتی ہوئی جنگلوں اور پہاڑوں سے گزرتی چلی جا رہی تھی اور ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں خورشید مرزا ماتھے پر ہاتھ رکھے گہری سوچ میں کنڈکی کی ٹیک سے بیٹھے ہوئے کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں...... کملا کی خاطر ہر مصیبت سہوں گا۔ وہ میرے حال تباہ سے بے خبر ہے تو ہوا کرے۔ میری ماں تو ہی ہے میرے دل میں بسی ہے۔ خورشید اُس کا ہو چکا۔ اس کے خیال ہی کی تمام عمر پرستش کرتا رہے گا۔ میں عورتوں کا کس قدر دشمن تھا مجھے اس طبقہ سے نفرت اور شدید نفرت تھی مگر آہ! مجھ پر فتح پائی بھی تو کس نے ایک عورت ہی نے...... مگر اس میں شک نہیں کہ عورت کس قدر با مروت ہوتی ہے میں کتنی مہربانی، انکساری سے اُس کے ساتھ پیش آیا۔ شاہی خاندان کی عورتیں میرے ساتھ بات کرنے کو ترستی ہیں مگر افسوس کہ اُس نے میری ایک نہ سُنی اُف! اپنا سیلا کرتا تک میرے پاس بطور نشانی نہ چھوڑا۔ نہ ہی میری یادگار قبول کی...... آہ کس قدر سادگی سے کہا تھا "آپ کے احسان کی یادگار سے بڑھ کر کوئی نشانی نہیں ہو سکتی۔ اور آپ مجھ سے کوئی نشانی طلب نہ کیجئے مجھے یہ ناپسند ہے" میں اپنی نشانی کسی کو نہیں دیتی مجھے بھول جائیے۔ آہ...... بھولنا آسان ہے مگر میری تمام حماقتیں، کوششیں، تیرے اس حکم کی تعمیل میں ناکام ثابت ہوئیں۔ توبہ توبہ کس خیال میں پڑ گیا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایک بیوہ یتیم کے متعلق اتنا سوچنا بھی ٹھیک نہیں حیرت ہے...... عورت ہو کر اتنی اچھی شہسوار۔ اس زمانے میں بھلا ایسے خاندان

کی خواہش یہ تھی کہ وہ بات ہی نہ ہو جس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ .... اُف کچھ نہیں معلوم کون تھی کہاں سے آئی تھی اور کہاں چلی گئی۔ وہ ایک چھلاوہ تھی۔ میرے دل میں ایک ناقابل برداشت پھانس کی طرح تھی جو کھٹکتی رہے گی۔ .

(۸)

نجمہ کی عمر اس وقت ۲۰ سال کی تھی۔ شباب عروج پر تھا۔ شہر بھر میں حسن صورت و حسن سیرت میں [illegible] کے مانے جانے کا کوئی نہ تھا۔ اگرچہ وہ بالکل سادہ زندگی بسر کرتی تھی مگر پھر بھی اس کی لیاقت اور حسن کے چرچے تھے۔ شہر کے ایک متمول عیسائی تاجر مسٹر فلپ اور ان کی بیوی کے ہاں ۶-۷ سال سے ملازم تھی۔ چند سال قبل جب وہ ایک [illegible] میں [illegible] پیدا ہوئی کے وقت سے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ان کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ معمولی ملازمہ کی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے آج وہ اس بوڑھی عورت کی پرائیویٹ سکریٹری کے عہدہ تک پہنچ گئی ہے۔ اخبار پڑھ کر سنانا، چٹھیوں کا جواب لکھنا، بوڑھی کے کپڑے، دکانداروں کے حساب، کتابوں کی حفاظت و نگرانی، ان سے سیر کو لے جانا وغیرہ اس کے فرائض میں داخل تھا۔ نجمہ بے چاری اسی طرح اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ مالک اور مالکہ بے حد کنجوس تھے۔ معمولی کھانا اور معمولی کپڑے کے علاوہ دس روپے ماہوار اسے ملتے تھے۔ جن میں چار پانچ روپیہ اپنے خاص شوق یعنی مطالعہ کی نذر کر دیتی تھی۔ باقی پیسہ جو بچتا تھا اچھے برے وقت کے لئے اس کے پاس محفوظ تھا۔ نجمہ کی زندگی نہایت روکھی پھیکی گذر رہی تھی۔ اس نے بچپن میں ماں باپ کی محبت اور شفقت دیکھی تھی اسی زمانے کی سنہری یاد اس کی زندگی کی رنگینی اور روح جو تھی...... مگر وہ یاد اس کے لئے سوہان روح تھی۔ اسے تڑپاتی رہتی تھی۔ اس نے اس یاد کو اس کی عقل ہمیشہ دھتکار دے کر اس کے دماغ سے نکال پھینکنے کی کوشش کرتی۔ گذشتہ شب شہر کے بہت بڑے رئیس کے ہاں دعوت تھی اور دعوت میں دو سو شہر کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی مدعو تھے..... انھیں میں ریاست [illegible] کے راجا اور ان کے دیوان خورشید مرزا بھی تھے۔ یہ بھی اپنے مالک مالکہ کے ساتھ دعوت میں گئی تھی۔ خورشید مرزا کو دیکھتے ہی گویا اسے اپنا بھولا ہوا خواب یاد آگیا۔ گذرے ہوئے واقعہ کے تمام پہلو اس کی نظروں کے سامنے پھر گئے۔ اور وہ خورشید مرزا سے کچھ اپنا لگاؤ محسوس کرنے لگی۔ اس کی زندگی حالات میں کچھ لہریں سی آنے لگیں اس نے اپنی زندگی میں کچھ لذت و مسرت دکھائی دینے لگی جب تک وہاں رہی خورشید مرزا کو غور سے دیکھتی رہی اور دیکھنے کی خواہش اور بھی زیادہ ہوتی گئی۔ دعوت ختم ہوئی اور سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے ....."

(۹)

جلدی کرو نجمہ وقت بہت کم ہے، میچ شروع ہو جائے گا تو لطف [illegible] کبھی سوچا نہیں: تمہارا ہی انتظار تھا۔ ترسی کھیل [illegible] [illegible] مگر تم اچھا نہیں سمجھتی۔ اوہو! آج تو تم نے خوب سنگھار کیا ہے آج سے پہلے تو تم نے کبھی رنگین ساڑی نہ پہنی تھی نہ ہی اس قدر خوبصورت طریقہ سے بال بنائے تھے۔ مگر نجمہ میں سے بالکل ناپسند کرتی ہوں خدا نے تمہیں ویسے ہی اچھی صورت عطا کی ہے نجمہ تم لوگوں کو بہت سیدھا سادہ لباس پہننا چاہئے ابھی پرسوں ہی... کہہ رہا تھا کہ تمہاری ملازمہ شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ مجھے اس کے تیور اچھے نہیں معلوم ہوئے۔ تم نے تم سے آج کہا ہے ویسے بھی تم کو خاص احتیاط رکھنی چاہئے لوگ تمہیں شادی کے لئے بہکائیں گے مگر میں کہتی ہوں کہ شادی ایک مصیبت ہے۔ اور کوئی سمجھدار شخص دانستہ کبھی اس میں مبتلا نہیں ہو سکتا ہزاروں کی تیور ذمہ داریاں، شوہر کی ناز برداریاں، پھر بال بچوں کی پرورش کی جھنجھٹ کوئی ایک آفت ہے؟ میں شادی کر کے بہت پچھتائی.

بوڑھی کا مطلب یہ تھا کہ ہمیشہ یہ لڑکی اسی تنخواہ پر اس کا کام کرتی رہے چونکہ اگر نجمہ اس کا کام چھوڑ دیتی تو جس قدر کام وہ کرتی تھی تیس روپیہ ماہوار دے کر بھی اس قدر خوبی سے کوئی نہ کر سکتا۔ اچھا جاؤ اور ہمیشہ کی طرح سادہ لباس پہنو اور سیدھے بال بناؤ، جلد آؤ ورنہ دیر ہو جائے گی؟

(۱۰)

شہر میں آج کل کرکٹ، ٹینس، فٹ بال، ہاکی، پولو ٹورنامنٹ ہو رہے ہیں۔ ریاست بھیرہ پور کے مہاراجہ اور ان کے سکریٹری خورشید مرزا بھی آئے ہیں، پولو کے بہترین کھلاڑی مانے جاتے ہیں ان کے نزدیک سے خیمے بھی لگے ہوئے ہیں، میدان سمندر کے کنارے تھا اور وہیں ان لوگوں نے قیام کیا تھا۔ ڈیرے خیموں کی قطاریں لگی تھیں۔ جب سے خورشید کو نجمہ نے دعوت میں دیکھا تھا اس کا دل تڑپ رہا تھا کہ دوبارہ دیکھے اسی لئے اس نے منتیں، خوشامدیں کرکے اپنی مالکہ کو کھیل دیکھنے کے لئے آمادہ کیا تھا کہ وہ بار بار خورشید کو دیکھ سکے گی گھر چھوڑنے کے بعد عمر میں پہلی بار اس نے خوشی خوشی ریشمی کپڑے ساڑی باندھی اور بال بنائے مگر بڑھیا نے ڈانٹ ڈپٹ کر کپڑے اتروا دیئے اور سیدھے بال بنوا لئے۔ مالک و مالکہ اور نجمہ جلدی جلدی تیار ہو کر آئے اور سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر میچ دیکھنے لگے۔ خورشید مرزا نے وہ ہاتھ دکھلائے کہ [illegible] پر خورشید مرزا ہی خورشید مرزا تھا۔ نجمہ کے دل میں اب خورشید مرزا کے خیال نے محبت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسرے دن علی الصباح ہی مسٹر و مسز فلپ معہ دوستوں اور نجمہ کے سمندر کے غسل کے لئے ایک پرفضا مقام پر گئے۔ خوبیٔ اتفاق سے آج خورشید مرزا اور مہاراجہ بھیرہ پور بھی اپنے ناموں خاص گھوڑوں پر سمندر کے غسل کے لئے تشریف لائے تھے۔

مسٹر و مسز فلپ پانی میں تیر رہے تھے مسٹر فلپ تو نہا دھو کر نکل آئے مگر مسز فلپ تیرتے تیرتے دور چلی گئیں اور لہروں کی تیزی کا مقابلہ نہ کر سکیں غوطے کھانے لگیں۔ وہیں پر مہاراجہ اور خورشید مرزا تیر رہے تھے۔ بڑھیا بے ہوش ہو گئی تھی لیکن کمال جانفشانی سے خورشید مرزا انھیں پانی سے باہر نکال لائے۔ مہاراجہ کے ڈاکٹر بھی تھے۔ بہت سی کوششوں سے گھنٹہ بھر بعد مسز فلپ ہوش میں آئیں اور ان کو نئی زندگی نصیب ہوئی۔ مسٹر فلپ، مسز فلپ، نجمہ اور ان کے دوستوں نے مہاراجہ اور خورشید کا شکریہ ادا کیا۔

(۱۱)

مغرب کا وقت ہے مسٹر و مسز فلپ آج اپنے دوستوں کے ساتھ دعوت اور ڈانس میں گئے ہوئے ہیں۔ ایک کمرے میں سونے پر نجمہ لیٹی ہوئی ہے اور سوچ رہی ہے یہ وہی نوجوان شخص ہے جس نے کئی سال پیشتر میری جان بچائی۔ مہربانی کے ساتھ بیگم مجھے اپنے یہاں آرام سے رکھا۔ میری عزت اپنی ماں بہن کی طرح کرتا تھا میرا ہر حکم مانتا تھا۔ مجھے شادی شدہ سن کر کسی قدر پریشان بھی ہوا تھا۔ پچھلے تمام واقعات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے پھر گئے۔ اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر دنیا میں کسی کی محبت اس کے دل میں ہے تو وہ خورشید کی ذات ہے۔ مگر افسوس! وہ میری طرف ذرا التفات نہیں کرتا۔ سچ ہے۔ میرے آقا اور مالکوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ پھر بھلا میں تو ان کے بھی نوکروں کے زمرے میں ہوں۔ آہ تب بھی تین بار موقع ملا مگر اس نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ آہ...... میں ذرہ وہ آفتاب...... ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ آہ! آج میں کئی بار اس کے پاس سے گزری مگر اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اپنی تلوار صاف کرتا رہا... اپنے گھوڑوں کو گھاس کھلاتا رہا، ان کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ انھیں چومتا رہا۔ وہ بہادر سپاہی ہے اسے تلوار سے محبت ہے اسے اپنے فرمانبردار گھوڑوں سے الفت ہے۔ آہ! مجھے اس تلوار پر رشک آتا ہے۔ مجھے ان گھوڑوں پر رشک آتا ہے۔ مجھ سے ذرہ ذرہ زیادہ خوش نصیب ہے جن پر اس کے مبارک قدم پڑتے ہیں۔ میں ہی سب سے بڑھ کر بدقسمت ہوں۔ جب دل بہت گھبرایا تو نجمہ اٹھی۔ سیاہ دوشالہ اوڑھا اور کوٹھی کے سامنے سمندر کے کنارے جو تفریح گاہ تھی اس سے ذرا آگے بڑھ کر ایک پتھر پر جا کر بیٹھ گئی۔ اپنی دھن میں اپنے خیال میں منہمک تھی۔ خود بخود کہنے لگی...... خورشید...... کتنا پیارا نام...... کتنی پاکیزہ اور پیاری صورت آہ...... کتنے پیارے اور پاکیزہ اخلاق و عادات...... کتنے بلند خیالات۔ کتنا شجاع و دلیر۔ کل پولو کے میدان میں بھی وہ تھا اور آج سمندر کی لہروں میں بھی وہ تھا۔

(باقی)

کب آؤ گے تم ـــ!

سولن ہلز کی ایک سہانی رات میں....!

از جناب ساغر جلیلی

شراب و نغمہ کی مستیوں میں بسی ہوئی ہے فضائے سولن!
ہر اک طرف بوئے عود و عنبر بکھیرتی ہے ہوائے سولن!
یہ رنگ و بو کی حسین بستی، یہ وادیٔ جانفزائے سولن!

نوید جشن طرب مجھے پھر سنا رہی ہے ـــ کب آؤ گے تم!
کب آؤ گے تم، کب آؤ گے تم ـــــــ!!

یہ دیوداروں کے لمبے لمبے درخت۔ یہ سرفشاں ہوائیں!
یہ عشرتِ جادواں میں سرمست چاند کی نقرئی ضیائیں!
یہ کوہساروں کے سبز دامن۔ یہ نرم رَو چشموں کی صدائیں!

تمہاری روح ان کے پردہ میں مسکرا رہی ہے۔ کب آؤ گے تم!
کب آؤ گے تم، کب آؤ گے تم ـــــــ!!

یہی وہ جنت ہے جس میں چھیڑا تھا نغمۂ سازِ عشق تم نے!
سُنی تھی اک خستہ دل کی گہرائیوں سے آوازِ عشق تم نے!
"خرابِ سوزِ حیات" کو کر دیا تھا مستِ سازِ عشق تم نے!

انہی عہود الفت کی یاد اب خوں رلا رہی ہے ـــ کب آؤ گے تم!
کب آؤ گے تم، کب آؤ گے تم ـــــــ!!

یہ چاند تارے تمہارے پیمانِ عشق کے ہیں گواہ ـــ ابتک!
لگی ہوئی ہے اسی گذرگاہ پر فلک کی نگاہ ـــ ابتک!
یہ دل، یہ دیوانہ دل ـــ ہے بربادۂ سجدہ شوق آہ ابتک!

ہنوز وہ کیفیت فضاؤں پہ چھا رہی ہے۔ کب آؤ گے تم!

کب آؤ گے تم، کب آؤ گے تم ———— !!

دیارِ الفت کے کیف زاروں میں بسنے والو — کب آؤ گے تم!
شباب اور شعر کی بہاروں میں بسنے والو — کب آؤ گے تم!
ضیائے مہتاب میں ستاروں میں بسنے والو — کب آؤ گے تم!
فضائے دل پر عجب اداسی سی چھا رہی ہے — کب آؤ گے تم!
کب آؤ گے تم، کب آؤ گے تم ———— !!

خرابِ صہبائے آرزو کرکے جانیوالو — کب آؤ گے تم!
حریمِ دل میں چراغِ الفت جلانے والو — کب آؤ گے تم!
بنا کے دیوانہ — صبر و ہوش آزمانیوالو — کب آؤ گے تم!
یہ رُت، یہ وادی ہمارے ہوئے غم جگا رہی ہے — کب آؤ گے تم!
کب آؤ گے تم، کب آؤ گے تم ———— !!

گذشتہ کے تمام ریکارڈ توڑنے کیلئے
SP
SP
بمبئی کی سیر
سبیتا دیوی
اور
سوبھنا سمرتھ
اداکاران خصوصی:-
سبیتا۔ سوبھنا سمرتھ۔ اردن۔ وتسلا کمٹیکر۔ ای بلیموریا
جال مرچنٹ۔ غوری۔ کانتی لال۔
خاتون وغیرہ
ایک ساتھ آرہی ہیں
سنداماں پروڈکشن کا تازہ شاہکار
امپیریل سنیما

اور اسی کے بدلے اپنا کام اپنے ذمہ لیتا ہے) اقبال اور ہٹلر کا اتحاد کتنا عجیب اتحاد ہے! ایک طرف اسلام کا پرستار، مساوات کا نام لیوا، آزادی کا علمبردار — اقبال، اور دوسری جانب جنگ کا پرستار، بربریت کا رشیا، "آزادی کو بے معنی لفظ قرار دینے والا چنگیز — ہٹلر! اصل وجہ یہ ہے کہ اقبال مغربی تہذیب سے بیزار ہے اور ہر وہ چیز جو اس تہذیب سے تعلق رکھتی ہے اس کی نگاہوں میں کھٹکتی ہے وہ اسی بات کو محسوس کرتا ہے کہ بنیادی مسئلہ کی طرف ہمیشہ نگاہ غلط انداز ڈالی گئی۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں

ظاہر ہے کہ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری ساری کوشش محض اس لئے کامیاب نہیں ہو سکیں کہ ہم نے ہمیشہ غلط نظریئے قائم کئے جس کی وجہ سے ہماری بحث بنیادی مسئلہ سے دوچار نہیں ہوئی۔ ہم نے ہمیشہ آزادی کی پردہ اور تعلیم کے الفاظ میں اس طرف توجہ کی لیکن کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ جب تک معاشی و اقتصادی آزادی نہ حاصل ہو، ہماری تمام نہاد آزادی محض خوب خیال ثابت ہوگی۔ یہ شکایت کرنے کے بعد کہ

عورت
اقبال کی نظر میں
گزشتہ سے پیوستہ

نگاہ وا نتاب مغرب روشن است — بظاہر ش زن با طن او نازن است

وہ پھر انسان ہو کر پکار اٹھتا ہے —

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

میری تو شکایت یہی ہے کہ ہماری معاشرت اور ہماری تعلیم زن کو نازن نہیں بناتی یعنی زن کا جو جنسی، صنفی اور تفریقی تخیل ہم نے قائم کیا ہے اور جو ماورائے دیگر انسانی فرائض ہے وہ بدستور برقرار رہتا ہے اور ہم زن کو صرف اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ سوسائٹی کے باغ میں خوشنما، خوش رنگ، دلفریب کا کام دے۔ اگرچہ افزائش نسل عورت کے فرائض کا ایک رخ ہے (جو یقیناً اہم ہی ہے) لیکن سوسائٹی کی بقا و بہبود کے لئے عورت کے ذمہ دیگر فرائض بھی عاید ہوتے ہیں۔ جہاں تک نسل کی حفاظت کا سوال ہے مرد اور عورت جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں کیونکہ اعضا اور عمل کی تفریق دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ لیکن دونوں کا ماحصل ایک ہے۔ آرٹ، صنعت، حرفت، زراعت، تجارت، سیاست، مذہب، تہذیب، تمدن یہ سب مختلف شعبے کے مظاہرے ہیں۔ ان کی بقا دراصل ایک عام فرض ہے جو مرد و عورت دونوں پر عاید ہوتا ہے جس کے لئے مرد و عورت دونوں یکساں حیثیت کے ذمہ دار ہیں۔ اقبال اگرچہ اپنے کو "غلامیٔ نسواں سے بیزار" فرنگ "بتاتے ہیں لیکن وہ اس عقدہ مشکل کی گرہ اس لئے نہیں کر پاتے کہ انھوں نے ان دونوں فرائض کو غلط ملط کر دیا ہے یہ کہنے کے بعد کہ —

راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود

وہ یہ بھول گئے کہ عورت کی کل کائنات اسی لذت تخلیق سے مخصوص نہیں۔ یہ کہنا کہ ہر جو عیاں ہوتا ہے بے منت غیر — شوخیٔ خیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

محض لفظی بحث ہے۔ اعضا اور عمل کی یہ تفریق دونوں کو اتنا جدا نہیں کرتی کہ عورت محض افزائش نسل کو اپنی کل حرکت، سارا عمل پورا فرض سمجھے اور تمام ذہنیتوں اور عمل کی ان تمام موجوں کو جو اس کی انسانی دنیا میں کھیلیاں کرتی رہتی ہیں فعل عبث قرار دے۔ اور اپنے سے بعید سمجھے اور پھر جب اس جائز حرکت و عمل کی دنیا حرام قرار دے دو۔

سوسائٹی میں کوئی عظیم الشان کام سر انجام نہ دے سکی تو کہا جاتا ہے
"مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی ......"
اور پھر اس کو یہ کہہ کر بہلایا جاتا ہو
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطون

از جناب مسیح الزماں صاحب جائسی

اقبال کی علمی اور فلسفی دنیا میں عورت کا کام محض فلاطون پیدا کرنا ہے جو کی دنیا میں محض سپاہی پیدا کرنا اقبال کی "زندہ حقیقت" ہے کہ عورت مرد کی دست نگر ہے — مرد اس کا محافظ ہے۔ عورت بچے پیدا کرے اور مرد خودی کے مسائل حل کیا کرے اور جو قوم اس فرض میں اگر نا پسند نہیں کرتی اس کے لئے یہ حکم صادر ہوتا ہے

اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

لیکن تاریخ محض خواہشات سے نہیں بدلتی۔ یونان و روما، ہند و بابل کا عروج
و زوال، یہ سب گی و فرسودگی اسباب کی شاہد ہے کہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔
اقبال کا آزاد عورت کے متعلق یہ کہنا کہ۔۔

این گل از بستان ما نا رستہ بہ ۔ داغش از دامان ملت شستہ بہ

ان بوڑھی عورتوں کا خیال ہوتا ہے جو تعلیم یافتہ اور آزاد عورت کو
دیکھ کر کوستی ہیں۔ اپنے مخصوص نظریہ کا اعادہ وہ اس سلسلے میں بھی کرتا ہے

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

مگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "فرنگی معاشرت" کیا چیز ہے؟
سائنسی تہذیب، صنعتی تہذیب، سامراجی نظام یا اشتراکی یا فسطائی؟ کیونکہ ہر
ایک ہی عورت کے سامنے جداگانہ مطمح نظر ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد جو صنعتی
تہذیب منصۂ شہود پر آئی۔ اپنے دن گزار چکی ہے اور دنیا کے سامنے اس کے سوا
کوئی چارہ نہیں کہ یا تو آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے۔ ایک جگہ پر قیام ناممکن معلوم
ہوتا ہے۔

جس چیز سے تہذیب کا زوال ظاہر ہوتا ہے وہ انفرادیت اور بیزاری
ہے جو بظاہر موجودہ معاشرت کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے اگرچہ یہ صرف ایک
نئے دور کی پیدائش کا پتہ دیتی ہے اس بات کا تصفیہ بخش جواب آسان نہیں
کہ آئندہ دور انسانی معراج اور معاشرتی ترقی کا دور ہوگا یا دنیا پھر کئی صدی
پیچھے لوٹے گی اور رجعت پرست فسطائی تحریک کی پرورش کرے گی۔ اقبال کا یہ سوال کہ

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟ مرد بیکار و زن تہی آغوش

بہت معنی خیز سوال ہے کہ ہم کو ایک بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔
ہمارے موجودہ نظام میں بے روزگاری ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہے اور ہماری
تہذیب کے دعوی کو جھٹلاتی ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا میں آج غربت
اور بے روزگاری کا مسئلہ اشیاء کی کمی کا مسئلہ نہیں بلکہ صرف یہ کہ سائنس کی مدد سے
ہم نے اشیاء کی پیداوار کا مسئلہ تو حل کر لیا ہے لیکن ان کی تقسیم کرنے اور استعمال کرنے
کا مسئلہ حل نہ کر سکے۔ زن کی تہی آغوشی کی شکایت بڑی معقول ہی ہے مگر چونکہ مرد

قدر کے لحاظ سے "مرد بیکار و زن تہی آغوش" ایک عمدہ طرز ادا ہے۔
لیکن اگر یہ مذکورہ الزام میں کچھ حقیقت ہے تو وہ اتنی بنیادی نہیں۔

اوپر کی بحث ہم کو ناچار اس ناخوشگوار نتیجہ کی طرف لے جاتی ہے کہ
اقبال نے اس مسئلے کے حل کرنے میں جو نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ ہمارے
معیار پر پورا نہیں اترتا۔

بہرحال یہ ضروری نہیں کہ ہر مفکر یا شاعر ہر مسئلہ کا صحیح حل پیش
کر سکے۔ اور اگر اقبال اس مسئلہ میں ناکام رہے تو یہ ہماری بدقسمتی ہے اور
اس سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔

تھکی رانی

(مترجمہ ادیب احمد قائمگنج)

کیا چندرماں رانی تھک گئی؟
اُس کا مکھ پیلا پڑ گیا ہے!
دیکھو اُس کی دُھندلی نقاب کے پیچھے
وہ کیسا نظر آ رہا ہے!
آکاش کی رانی اپنے اونچے سنگھاسن پر چڑھتی ہے!
اور پورب سے لے کر پچھم تک
اپنے راج کا دورہ لگاتی ہے!
تم سرِ شام اُسے دیکھو تو کاغذ کے ایک ورق کی طرح
وہ سفید دکھائی دیتی ہے؛
پَو پھٹنے سے پہلے اُس کا تماشا دیکھو
تو معلوم ہوگا کہ اُس کا کنول مرجھا گیا ہے؛

—— کرشنا رفیٹی (شاعرہ)

یکم اگست جمعہ سے شروع
ہوائی حملے کے خطرے کا الارم
شہریوں کو اتنا سراسیمہ نہیں کرتا جتنا فیرلیس ناڈیا کی آمد سے بدمعاشوں کی جماعت میں کھلبلی مچ جاتی ہے
واڈیا برادرس
ڈائمنڈ تھریلر
بمبئی والی
ڈائرکٹر :- ہومی واڈیا
گن بوٹ کتے کے حیرت انگیز کام قابل دید ہیں
خاص اداکار :- فیرلیس ناڈیا
سردار منصور - جان کاؤس - راجہ رانی
دلپت - نظیرہ - فہیمہ - مٹھو میاں
بتن - چھوٹو - ایم - کے حسن
اور گن بوٹ کتا
فیرلیس ناڈیا
اسٹنٹ
رومان
ظرافت
موسیقی
رقص
وغیرہ سے معمور فلم
طبقۂ نسواں میں بیداری اور ترقی کی روح پھونکنے والی فلم
جمعہ یکم اگست سے
سوپر ٹاکیز
نیو چرنی روڈ بمبئی میں

بھانجو اور بھانجیو، خوش رہو!

آج ہم تمھیں ایک فلم کی کہانی سناتے ہیں۔ سینما تو تم بہت اکثر دیکھتے ہی ہو گے اور شاید تم نے "پڑوسی" فلم دیکھا بھی ہو مگر پھر بہتوں نے نہیں بھی دیکھا ہو گا — اچھا تو اب کہانی سنو۔ . . ندی کنارے کسی گاؤں میں دو آدمی رہا کرتے رہتے تھے ایک کا نام تھا مرزا اور دوسرے کا ٹھاکر۔ مرزا جی مسلمان تھے اور ٹھاکر مہاراج ہندو دونوں کے گھر ایک دوسرے کے ہمسایہ تھے اور وہ خود ایک دوسرے کے پڑوسی۔۔۔

مرزا اور ٹھاکر آج کل کے جیسے مسلمان اور ہندو نہ تھے جو ایک دوسرے کا ذرا ذرا سی بات پر خون بہانے کو تیار رہتے ہیں بلکہ وہ دھرم اور مذہب کا اصلی مطلب سمجھتے تھے اور آپس میں بڑے میل ملاپ سے رہتے تھے۔ جب مرزا صبح اٹھ کر نماز وغیرہ پڑھتے تو ٹھاکر اس وقت اپنی عبادت بھجن اور منجیرے وغیرہ نہ بجاتا تاکہ اس کے پڑوسی مرزا کی عبادت میں خلل نہ آئے اور کبھی جب ٹھاکر اپنی پوجا اور کتھا کرتے ہوتے تو مرزا صاحب ان کے خیال سے قرآن مجید نہ پڑھتے۔ یہ تھی ان لوگوں کی رواداری جب بڑوں میں ایسا میل ہوتا ہے تو چھوٹوں میں بھی۔ اسی لئے ٹھاکر اور مرزا کے بچے اور گھر والے بھی آپس میں بڑی محبت اور پیار سے رہتے تھے مرزا کے بچے ٹھاکر کو چچا اور ٹھاکر کے بچے مرزا کو کاکا کہا کرتے تھے۔ اور جب ٹھاکر اور مرزا شطرنج کھیلتے ہوتے۔ تو وہ آکر انھیں خوب ستاتے اور ان کی نقلیں اتارتے۔ تمام گاؤں میں مرزا اور ٹھاکر کی دوستی کا چرچا تھا لوگ کہتے پڑوسی ہوں تو مرزا اور ٹھاکر کے جیسے ہوں۔ اسی میل ملاپ کی وجہ سے تمام گاؤں دونوں کی عزت کرتا تھا اور مرزا کو تو گاؤں والوں نے پنچایت کا مکھیا بنا دیا تھا جب کوئی مشکل آپڑتی یا جھگڑا چکانا ہوتا تو سب گاؤں والے دوڑے دوڑے ٹھاکر اور مرزا کے پاس آتے ——

اس سنسار کی ایک ریت یہ بھی ہے کہ لوگوں کو دو دو آدمیوں کا میل کبھی نہیں بھاتا اور تاک میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان میں دشمنی پیدا کرا دیں۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ایک بند باندھنے والی کمپنی مرزا اور ٹھاکر کے گاؤں میں آئی اور اس کے منیجر نے گاؤں والوں سے کہا کہ تمھارے گاؤں کے پاس سے جو ندی گذرتی ہے اس پر ہم بند باندھیں گے اسی لئے تم اپنی اپنی زمین ہمیں بیچ دو۔

گاؤں والے غریب تندرست تھے مگر انھیں اپنی زمین اور گاؤں سے بہت محبت تھی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے ہم ٹھاکر اور مرزا سے پوچھ لیں پھر جواب دیں گے۔

سب مرزا اور ٹھاکر سے پوچھنے آئے مرزا اور ٹھاکر بولے اگر تم اپنی زمین بیچ دو گے تو رہو گے کہاں؟ پیسے تو ضرور تم کو مل جائیں گے مگر جس زمین پر تم کھیل کود کر اتنے بڑے ہوئے ہو جس نے تم کو اپنے سینے سے اناج نکال نکال کر کھانا کھلایا! ہے کیا اسے بیچتے ہوئے تمھیں دکھ نہ ہوگا۔ بات اچھی تھی، سب کی سمجھ میں

بھگئی اور سب نے اپنی زمین بیچنے سے انکار کر دیا۔

جب بند بنانے والی کمپنی کے منیجر کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بہت جھلایا لیکن وہ انگریزی پڑھا ہوا تھا، چالاک تھا۔ اس نے سوچا کہ گاؤں والے ٹھاکر اور مرزا کی بہت بات مانتے ہیں کسی طرح ٹھاکر اور مرزا میں لڑائی کرا دینا چاہیے، تب کام بنے گا۔ اس لئے پہلے تو اس نے ٹھاکر کو نوکری سے علیحدہ کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ تمہارا دوست مرزا کہتا ہے کہ تم اچھا کام نہیں کرتے۔ ٹھاکر کو نوکری چھوٹنے کا بہت دکھ ہوا مگر اس نے مرزا سے اس بات کا ذکر نہیں کیا مرزا نے ٹھاکر سے کہا کہ پروا نہیں اگر تمہاری نوکری چھوٹ گئی ہے جس چیز کی ضرورت ہو میں مدد کے لئے تیار ہوں۔ کمپنی کے منیجر نے جب دیکھا کہ اب بھی ٹھاکر اور مرزا میں خوب لڑائی اور دشمنی نہیں ہوئی۔

تو اس نے ایک اور چال چلی وہ یہ کہ اس نے گاؤں ہی کے ایک لنگڑے بدمعاش کو جو ٹھاکر سے جلتا تھا ان کے پیچھے لگا دیا کہ کسی طرح ان دونوں میں لڑائی کرا دو — ہر جگہ اچھے آدمی بھی ہوتے ہیں اور برے بھی چنانچہ گاؤں کا وہ لنگڑا بدمعاش بھی چند روپیوں کی لالچ میں آ کر اپنے ہی گاؤں اور اپنے ہی گاؤں کے لوگوں کو نقصان پہنچانے اور ان کے بیچ میں پھوٹ ڈالنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ایسے ہی لوگوں کو غدار کہا جاتا ہے۔ آخر اسی لنگڑے کی کوششوں سے مرزا نے ایک پنچایت میں ٹھاکر کے لڑکے کو سخت سزا دی اور گاؤں کی رسم کے مطابق ٹھاکر کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ ٹھاکر کے دل میں تو پہلے ہی سے مرزا کی طرف سے بدگمانی تھی اب اس کا شک اور بھی پکا ہو گیا اور ایک دن جب مرزا اس کے پاس اپنی بیوی کے زیور اور روپیہ لیکر گیا کہ وہ انہیں جرمانہ میں دیدے۔ تو ٹھاکر نے مرزا کو بہت برا بھلا کہا کہ تم ہی نے تو.... میری نوکری چھڑوائی ہے اور میرے لڑکے کو سزا دی ہے کیا وہ کیا غصہ میں آدمی کو کچھ سوجھتا تو ہے نہیں جو جی میں آیا ٹھاکر نے مرزا کو کہہ سنایا۔ مرزا بچارہ بے قصور تھا ٹھاکر کی ان باتوں سے بہت دکھ ہوا۔ اس نے کہا کہ جب آپس میں لڑائی ہو گئی ہے تو میں یہاں رہوں گا ہی نہیں اور وہ دوسرے محلے میں رہنے لگا۔ ٹھاکر نے غصہ میں مرزا کو جاتے وقت تو نہ روکا مگر بعد میں اسے اتنا رنج ہوا کہ اس کا دماغ چل گیا۔ کبھی پتھروں سے بیٹھ کر شطرنج کھیلنے لگتا کبھی کبھی آپ ہی آپ مرزا سے باتیں کرتا

اب گاؤں والے بھی ٹھاکر اور مرزا کی پہلی سی عزت نہ کرتے تھے نہ ان کا کہنا مانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خوب اپنی زمینیں بیچیں اور بند جلدی جلدی بننے لگا۔

بیچارے ٹھاکر اور مرزا کے بچے اور عورتیں ایک دوسرے سے ملنے کیلئے تڑپتے تھے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے مگر بڑے لڑکے تو چھپ چھپا کر مل ہی لیتے تھے۔ آخر ایک روز ٹھاکر کے لڑکے نے سوچا کہ ہمارے خاندانوں کی تباہی کا سبب یہ بند ہی ہے لاؤ اسی کو اڑا دوں اور ایک روز رات کو اس نے بارود سے بند کو اڑانے کی تیاری کر لی۔ جب مرزا کے لڑکے کو یہ پتہ چلا تو وہ بھی آیا اور ٹھاکر کے لڑکے سے یہ خطرناک کام لے کر خود انجام دیا ادھر ٹھاکر اپنے لڑکے کی تلاش میں بند پر پہنچ گیا اور اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ مرزا نے جو بند پر دھماکے کی آواز سنی اور روشنی دیکھی تو وہ بھی پہنچا وہاں دیکھا کہ بند گر رہا ہے اور ٹھاکر بیچ میں بیٹھا ہے۔ وہ اپنی ساری لڑائی بھول کر فوراً ٹھاکر کو بچانے دوڑا۔ اتنے بند گر رہا تھا گاؤں والے بھی جمع ہو گئے اور چلانے لگے۔ مرزا ٹھاکر جلدی آؤ بند پھٹ رہا ہے، مر جاؤ گے۔ مرزا نے ٹھاکر کا ہاتھ خوب مضبوطی سے پکڑ لیا اور لانے لگا مگر افسوس۔ بند پھٹ پڑا اور دونوں مٹی اور دھوئیں کے غبار میں غائب ہو گئے —— دوسرے دن صبح ٹھاکر اور مرزا کی لاشیں ندی کنارے پڑی ملیں لیکن دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ مانو اب کبھی جدا نہ ہوں گے۔

اسی دن شام کو مرزا کا جنازہ اور ٹھاکر کی ارتھی اٹھی تمام گاؤں کے ہندو مسلمان ساتھ تھے اور روتے جاتے تھے۔ سب کے سب جنازے اور ارتھی پر پھول ڈال رہے تھے جنازے اور ارتھی کے پھول زمین پر آپس میں گلے مل رہے تھے۔

رنجیت کی تازہ ترین پیش کش
تیسرا شاندار ہفتہ
SHADI
شادی
اداکاران:۔
مادھوری۔ موتی لال
خورشید۔ ایشور لال
ڈکشٹ۔ غوری وغیرہ
ڈائرکٹر:۔ جینت ڈیسائی
رائل اوپیرا ہاؤس
(چوپاٹی)
جس نے ۱۲ شہروں میں کہرام مچادیا ہے
خزانچی
ملک کے گوشے گوشے میں
ہمہ گیر مقبولیت حاصل کرچکا ہے
بمبئی کے
کرشنا ٹاکیز میں
پانچ مہینے سے چل رہا ہے
پیش کردہ:۔ پنچولی آرٹ پکچرز
نمائش کنندہ۔ فیمس پکچرز لمیٹڈ
شائقین کی گنتی روزانہ
بڑھتی ہی جارہی ہے
سنیچر، اتوار اور تعطیل کے دن
ایک بجے میٹنی شو

Latest Film News فلمی خبریں

بمبئی ٹاکیز: "نیا سنسار" کی غیر معمولی مقبولیت نے اسے سونے کی کان بنا دیا ہے۔ کمپنی کی آئندہ تصویر "انجان" جس میں دیوکا رانی اور اشوک کمار کام کرتے ہیں۔ عنقریب نمائش کے لئے پیش کی جائیگی

نیشنل اسٹوڈیوز: ہرگرت کو نیشنل اسٹوڈیوز کا شاہکار "بہن" پلاتھے میں پیش کر دیا گیا ہے اور لوگوں نے اسے اُمیدوں سے زیادہ پایا ہے۔ اس فلم میں نلنی جیونت کام کرتے ہیں۔ مسٹر محبوب نے ڈائرکشن کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ دوسری تصویروں میں کسوٹی، اُجالا، نرودشش، اور روٹی قابل ذکر ہیں

رنجیت فلم کمپنی: "شادی" کو تمام حلقوں میں پسند کیا گیا ہے۔ اب لوگوں کو چارلی کی فلم کا جسے وہ خود ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ سخت انتظار ہے "سسرال" کی دہلی میں نمائش ہو رہی ہے اور وہاں سے اچھی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ اسٹوڈیو میں اور بھی کئی تصویریں پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہیں۔

واڈیا موی ٹون: مشن کے بعد اب مسٹر ہومی واڈیا نے بمبئی والی "سوپر ٹاکیز" میں پیش کر دی ہے۔ جس میں سردار منصور اور نذر نا ڈیا نے اچھا کام کیا ہے۔ اُمید ہے کہ فلم بہت مقبول ہو گی۔

نو یگ چترپٹ پونا: "امرت" کو ایک بہترین سوشیل تصویر تسلیم کر لیا گیا ہے اور کمپنی اپنی دوسری فلم "سنگم" کی تیاری میں مصروف ہے اسے مسٹر ونایک ڈائرکٹ کر رہے ہیں

پربھات فلم کمپنی: "عمر خیام" ابھی معرض التوا میں ہے۔ کمپنی کی نیم مایک دھرم وعار کی فلم "سنت سکھو" تیار ہو چکی ہے اور عنقریب نمائش کے لئے پیش کی جائیگی "سنت سکھو" کے بعد شاید رام شاستری کا نمبر ہو گا۔

اترے پروڈکشن: "برنڈی کی واپسی" نے بمبئی میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے اور بڑی کامیابی سے چل رہی ہے کمپنی کی آئندہ فلم "وسنت سینا" ہو گی۔ جس کی تیاری ہو چکی ہے

"تاج محل پکچرس" اس ادارے نے مسٹر منتیٰ نے مس نسیم کی شرکت میں ایک نئی کمپنی کی بنیاد ڈالی ہے کمپنی کی پہلی فلم "صبح شام" کی کہانی مسٹر کمال امروہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے اداکاروں میں پرتھوی راج کا انتخاب ہو چکا ہے اور اطلاع ہے کہ مسٹر ملتانی اسے ڈائرکٹ کریں گے۔

سدا ما پکچرز: "بمبئی کی سیر" ریلیز کر دی گئی اور پبلک نے اسے بیحد پسند کیا ہے عرصہ کے بعد سبیتا دیوی اور سوبھنا سمرتھ نے اس میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں خیال کیا جاتا ہے یہ ریکارڈ پکچر ثابت ہو گی۔

منروا موی ٹون: ڈائرکٹر سہراب مودی نے "سکندر فاتح" میں ہندوستان کی گذشتہ عظمت کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے اور نایاب سٹینگ تیار کروائے ہیں۔ کمپنی کے تمام لوگ نہایت تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ جب "سکندر" دن اور رات کی محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ فلمی دنیا سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کی آنکھیں اسے دیکھنے کے لئے منتظر ہیں۔

پرکاش پکچرز: سوشیل کہانی "درشن" تیار ہے اور وقت آنے پر ریلیز کی جائیگی ممکن ہے پہلے دہلی اور لاہور میں کی جائے اسٹوڈیو میں "بھرت ملاپ" کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس میں سوبھنا سمرتھ نے کام کیا ہے۔

پنچولی پروڈکشن: "چودھری" بن کر تیار ہے اور عنقریب نمائش کے لئے پیش کیا جائے گا "خاندان" کی بھی شوٹنگ شروع کر دی گئی ہے اور جس رفتار سے تیاری جا رہی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وقت قریب میں ختم ہو جائیگی

نیو تھیٹرز لمیٹڈ: کمپنی کا شاہکار "لگن" ہنوز جلد ہے اور اُمید ہے کہ ابھی کئی ہفتہ چلے گا۔ اسٹوڈیو سے جو اطلاعات دی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ فلم "ڈاکٹر" جو بنگالی زبان میں کافی مقبول ہو چکی ہے اسے ہندی زبان میں تیار کیا جائیگا

SISTER
۶ - اگست سے شروع
۶ - اگست سے شروع
نیشنل سٹوڈیوز کی معرکتہ آلارا اصلاحی و معاشرتی
پیش کش
شہرہ آفاق ڈائرکٹر مسٹر محبوب کا "عورت" فلم کے بعد اس سے
بھی بڑھا چڑھا شاہکار!
NATIONAL STUDIOS
بہن
میوزک:- مسٹر انل بسواس
افسانہ نگار
مسٹر ضیا سرحدی
اور
مسٹر بابو بھائی مہتہ
مکالے
(جادو رقم)
وجاہت حسین
گانے
ڈاکٹر صفدر آہ
سیتاپوری
کیا وہ اپنی معصوم بہن کے سوا بھی دنیا کی کسی دوسری ہستی سے
محبت کرتا تھا۔ یہ ایک عجیب درد انگیز و محبت خیز افسانہ ہے
"بہن" کا بے چینی سے انتظار کیجئے
فلمی ستارے:- مشہور فلم اسٹار شیخ مختار، حور چہرہ نلنی جیونت
مشہور مسٹر:- حسن بانو۔ کنھیا لال۔ ہریش۔ بی بی مینا
مس شاہزادی۔ سردپ رانی نگار۔ وغیرہ
پیش کنندگان:- نیشنل سٹوڈیوز لمیٹڈ تاردیو۔ بمبئی نمبر ۷
پاتھے سینما
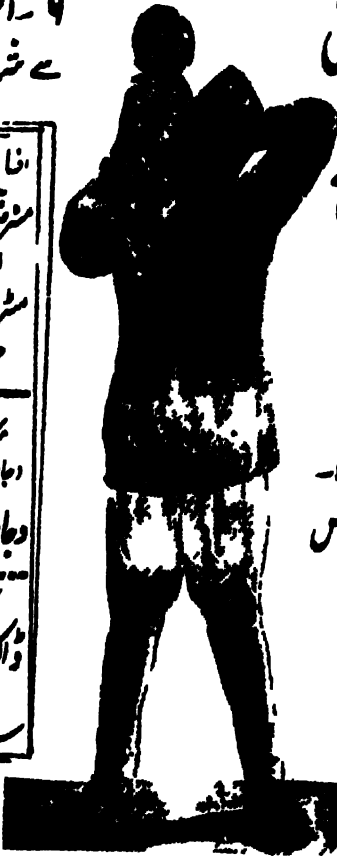
MADHURI

See her in Ranjit's "SHADI" at Royal Opera House.

Cover Printed at the Lakshmi Art Printing Works Sankli Street Byculla Bombay 8

پھول کی پنکھڑی کی طرح ملائم تر و تازہ اور شفاف
چہرے والی خاتون کی دلکشی کے لئے جواہرات
اور ریشمی لباس محض ایک مددگار ہیں۔

حُسن کے لئے پہلی لازمی شرط

واقعی خوش نصیب وہی خاتون ہے۔ جس کو قدرت نے حوروں کی طرح حُسن دیا ہے۔ لیکن بہترین خد و خال کے علاوہ بھی ایک چیز ایسی ہے جسے حُسن میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ ہے ملائم و شفاف جلد۔ حسین چہرہ کئی دلفریب چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے لیکن ان میں سے ایک بھی اتنی اہم جتنی جلد کی حفاظت۔ اور یہی حُسن کے لئے پہلی ضروری شرط ہے۔

اگر آپ جلد کو کھردرا کر دیں تو آپ کا حُسن بھی دلفریب ہو سکتا ہے جب تک پہلے آپ اس چکناہٹ اور میل کو دور کر دیں جو مسامات میں روزانہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے صابن اور پانی کافی نہیں

آپ پانڈس کولڈ کریم لگائیے یہ مسامات میں سرایت کر کے اندر اور باہر کا تمام میل صاف کر دیتا ہے۔ ہر صبح اور رات کو چہرہ اور گردن پر کولڈ کریم لگا کے کچھ دیر یونہی چھوڑ دیجئے تاکہ وہ مسامات میں سرایت کر جائے پھر اسے پونچھ ڈالئے۔

دوسری بات یہ کہ دن میں اپنی جلد کی حفاظت کے لئے آپکو پانڈس ونشنگ کریم لگانا چاہئے۔ یہ آپکے چہرے پر ایک لطیف نازک اور غیر چکناہٹ کی جھلی سی چڑھا دے گا جو آندھی، گرد و غبار سے آپکے چہرے اور گردن کی حفاظت کرتی رہیگی

فوراً پانڈس کریم کا استعمال شروع کر دیجئے۔ چند ہی ہفتوں میں آپکا چہرہ پھول کی کلی کی طرح ملائم اور چکنا ہو جائے گا

ماہنامہ
بمبئی
تنویر
The TANVIIR
MONTHLY
BOMBAY, 8
JUNE
1941
مدیرہ:
"سحر"

Mr MOINUDDIN HARIS
(Editor Daily 'AJMAL' Bombay).

A well known Muslim Satyagrahi who is under going 8 months sentence in Yeravda Jail

شرح چندہ
سالانہ ۲ روپے
مع محصول ڈاک وی۔پی خرچ ۴ر
قیمت فی پرچہ ۳ر
لوکل
ممالک غیر سے دس شلنگ

ماہنامہ تنویر بمبئی
TANVIR

مدیرہ:-
سحر
نائب مدیرہ:-
انوری خانم

جلد ۵ فہرست مضامین ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء شمارہ ۶

مستشر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۸ سے چھپوا کر دفتر رسالہ "تنویر" نمبر ۹ سائکل اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا

مقصدِ شباب

خاص "تنویر" کے لئے

از حضرت قیصر (امراؤتی)

جب اہلِ ستم کے جور و ستم ہر گام پہ آفت ڈھاتے ہیں | جب زور پہ اترا کے ظالم کمزوروں کو ٹھکراتے ہیں
حق دار ترستے رہتے ہیں حق چھیننے والے کھاتے ہیں | انساں نما شیطانوں سے سینوں میں جگر تھراتے ہیں

آلام و مصائب کی دنیا - دکھ دردوں آہوں کی دنیا
کچھ ایسا یقیں سا ہوتا ہے دنیا ہے گناہوں کی دنیا

جب ظلم و بدی کی فطرت کو ملتا ہے خطاب آزادی | عصیاں کی سیاہی بڑھ بڑھ کر لاتی ہے پیام بربادی
جب سیکھتے ہیں انسانوں سے شیطان فریب و بیدادی | انصاف کے بدلے پاتے ہیں سنگین سزائیں فریادی

انسانیتِ عظمیٰ کیلئے ہر گام پہ مشکل ہوتی ہے
انجام سے غافل انساں پر جب چشم بصیرت روتی ہے

بلبل سے گلوں کو رنج رہے پھولوں سے بلبل نالاں ہو | جب بادِ سحر کے جھونکوں سے کلیوں کا حال پریشاں ہو
پروانے شمع سے دور رہیں اور تنہا شمعِ سوزاں ہو | جب عشق سے حسن کو بیر رہے اور حسن سے عشق پشیماں ہو

اربابِ خرد یہ چیخ اٹھیں اب کوئی راہِ نجات نہیں
اس دنیا کا نقشہ بدلے فطرت کے بس کی بات نہیں

فردوسی پھولوں کی نکہت - کوثر کا سرورِ لافانی | سیماب سے برق کی بیتابی - خورشید سے شعلہ سامانی
مہتاب سے نرمی اور سنا - تاروں سے حسنِ عریانی | جب یہ سب چیزیں ملتی ہیں ڈھلتی ہے جوانی دیوانی

رضواں کی نگاہیں پڑتی ہیں حوروں کا جی للچاتا ہے

یہ نعمت جب ندم ملتی ہے انساں جواں کہلاتا ہے

کعبے میں اذانیں گونجتی ہیں ناقوس کا غل بتخانوں میں | گلشن میں پھول مہکتے ہیں ندان زل میخانوں میں
سینوں میں امنگیں اٹھتی ہیں طوفان طرب ارمانوں میں | اک ساتھ بہاریں کھیلتی ہیں گلزاروں میں ویرانوں میں

پُر کیف ہوائیں چلتی ہیں، عالم کا رنگ بدلتا ہے

پھر دل کی وحشت کا سکہ بازارِ جنوں میں چلتا ہے

کلیوں کا تبسم ہونٹوں پر، پیشانی روشن نور فشاں | متوالی آنکھوں میں جادو، چتون کی جنبش تیر و سناں
بادل کی گرج بجلی کی کڑک گھنگھور گھٹاؤں کے طوفاں | سب اسکی فطرت کے پرتو سب اسکی اداؤں پر قرباں

سینے میں سوز عشق لئے محفل گرمانے آتا ہے

یہ دار و رسن کا شیدائی افسانے بنانے آتا ہے

یہ حسن کا [illegible] اخلاص و محبت کا پیکر | یہ اہل ہوس پر برق غضب آئین وفا کا پیغمبر
[illegible] کا حاصل فطرت کے خزانے کا جوہر | آپ اپنی راہ بناتا ہے آپ اپنی منزل کا رہبر

پھر جس سے تازہ کرتا ہے یہ بھولے ہوئے پیمانوں کو

دیتا ہے جبیں سائی اس کی تقدیس حرم بتخانوں کو

[illegible] ساحل اور دریا اور عالم کو سر [illegible] دینے والا | حق دار کے حق فرعونوں سے [illegible] کے دلا دینے والا
[illegible] کی لعنت کو دنیا سے مٹا دینے والا | منزل کی دھن میں گمراہ [illegible] راہوں سے ہٹا دینے والا

ہے اس کی فطرت میں داخل بجھ جائے تو پھر بڑھتا ہی رہے
گو جنگ سے نفرت کرتا ہے شیطاں سے مگر لڑتا ہی رہے

پھر حسن کی محفل سونی ہے، پھر عشق کا وہ پندار نہیں — پھر سرد ہوا بازارِ وفا، پھر لطفِ جفائے یار نہیں
کہنے کو جواں ہیں لاکھ مگر، مخمور نہیں سرشار نہیں — دل سوزِ محبت سے خالی، گفتار بہت کردار نہیں

پھر ہم پہ فرشتے ہنستے ہیں، ہنستے نہ اگر اچھا ہوتا!
اللہ ہماری دنیا میں کوئی نوجواں پیدا ہوتا!

لمعات

بمبئی میں غنڈہ ازم

تقریباً دو ماہ سے بمبئی فتنہ و فساد کا گھر بنا ہوا ہے۔ اور شہریوں کا جان و مال اور سکون و اطمینان خطرے میں پڑا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے بمبئی جو ہندوستان کا بہترین و مہذب، خوشنما اور دلکش شہر تھا جو نفاست اور لطافت، علم و ہنر، صفائی اور سلیقہ، عمل و حرکت، حسن و معاملت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، آج قتل و غارتگری، چوری اور ڈکیتی، گندگی اور بدتمیزی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

تقریباً چودہ لاکھ انسان گورنمنٹ اور قانون کی موجودگی میں قابلِ رحم اور کس مپرسی کی حالت میں دن کاٹ رہے ہیں۔

تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس وقت تک صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس قتل و غارتگری کی وجہ کیا ہے؟ اور بناءِ فساد کون ہے؟

انگریزوں کی مہذب اور تجربہ کار کہلانے والی حکومت سے پہلے ہمارے یہاں کبھی اس قسم کے ہندو مسلم جھگڑے نہیں ہوتے تھے۔ حالانکہ بقر عید، محرم، ہولی، دیوالی، اور دسہرے کے تہوار اس وقت بھی منائے جاتے تھے، ماتم بھی ہوتا تھا اور باجہ بھی بجتا تھا۔ نہ ہندو تہذیب کو مٹنے کا ڈر تھا نہ مسلمانوں کے تمدن کو خطرہ تھا۔ نہ فارسی، عربی، سنسکرت اور ہندی کی رقیب تھیں، نہ داڑھی چوٹی میں آویزش تھی نہ پائجامہ دھوتی دست و گریباں تھے۔ ہندو اور مسلمان مل کر سکون و اطمینان سے زندگی گذارتے تھے، انگریزوں کے غلام ہونے کے بعد تک وہ آپس میں اس قدر متحد تھے کہ انہوں نے آزادیٔ وطن کے لئے بہت سے موقعوں پر مل کر اپنا خون بہایا۔ اس اتحاد کو دیکھ کر یہی نفاق اور تفریق کا بیج بو گیا جو آہستہ آہستہ پھلنے پھولنے لگا۔ خاص کر جب سے تحریکِ آزادی نے زور پکڑا اُسی زمانے سے ان تہواروں کے موقعوں پر ہندو مسلم فساد ہونے لگے، لیکن اس دفعہ بمبئی میں یہ جھگڑا جسے بعض لوگ فرقہ وارانہ کہتے ہیں بغیر کسی تہوار (از قسم ہولی، بقر عید) کے ہی شروع ہوا اور زور پکڑ گیا اور دیکھتے دیکھتے پچاس کے قریب معصوم جانیں ضائع ہو گئیں اور تقریباً تین سو کے قریب لوگ زخمی ہوئے، اور دو ہزار کے قریب گرفتار کئے گئے۔ اور بہت سے لوگوں کو بیدوں کی وحشیانہ سزا بھی دی گئی ہے۔ تب بھی فساد جاری ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ فسادی لوگ اب بھی آمادہ ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بے روزگاری اور تنگی سے مایوس لوگ "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق یہ حرکتیں کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اکثر کا خیال ہے کہ یہ ایک باقاعدہ سیاسی قسم کی سازش ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ اپنے نقصانات کے معاوضے کا گورنمنٹ سے مطالبہ نہ کریں تو کم از کم یہ مطالبہ ضرور کریں کہ اس فساد کی بنا کیا ہے اس کی آزادانہ طور پر تحقیقات ضرور کی جائے۔ اس بد امنی کو دو ماہ ہو گئے مگر اب تک گورنمنٹ اس کا پتہ نہ پا سکی یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کا جو فرض گورنمنٹ پر عائد ہے۔ اگر گورنمنٹ اپنے اس فرض کو مستعدی سے ادا نہیں کرے گی تو عوام کے دلوں میں اس خیال کا آنا لازمی ہے کہ گورنمنٹ میں اب انتظامی قابلیت نہیں رہی یا گورنمنٹ کو اپنے فرائض سے ذرا بھی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ ہماری یہ رائے ہے کہ حکومت کو اپنے وقار کی خاطر ہر ممکن طریقے سے بمبئی کے امن کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور اس میں کامیاب ہونا چاہئے۔

کیونکہ کوئی بھی حکومت بغیر وقار کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر موجودہ

گورنری یا شخصی حکومت نے تسلی بخش طریقے سے لوگوں کو مطمئن کیا تو ہر شخص مکمل با اختیار اقتدار رکھنے والے گورنر اور محدود اختیارات رکھنے والے منشی کا مقابلہ کرکے اس نتیجہ پر پہنچے گا اور سب پہ کہ کانگریس کے دوران حکومت میں بھی ایک بار شرارتی عنصر کی کوششوں سے ہندو مسلم فساد شروع ہوا تھا اور عقل کہتی ہے کہ اس فساد کو بہت دنوں تک رہنا چاہیے تھا چونکہ کانگریس کی مخالفت میں یہاں کی اور سیاسی پارٹیوں کا زور زیادہ تھا۔ کم از کم کانگریس گورنمنٹ کو بدنام اور ناکام کرنے کی خاطر اس فساد کو جاری رہنا چاہیے تھا۔

لیکن اپنی حکومت بہر حال اپنی ہی حکومت ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی بری کیوں نہ ہو۔ بمبئی والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ کانگریسی حکومت نے کس لیاقت سے اس فساد کی آگ کو پھیلنے سے بچایا۔ بمشکل تمام چار پانچ دن گذرے ہوں گے کہ فساد ختم ہو گیا۔ اور مسٹر منشی نے بڑی قابلیت سے اس پر قابو پالیا۔ نتیجہ کے طور پر شہر کے ہندو مسلمان سب ہی مامون و محفوظ ہو گئے دونوں کے کام کاج کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ دونوں طرف سے آدمی کم مارے گئے۔ کم گرفتار کئے گئے۔ شہر میں امن و امان اپنے شہریوں کو فائدہ ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اور نقصان ان سے دونوں کو نقصان ہے۔

اپنی مدد آپ کرو

فساد شدہ علاقہ میں بازاروں کا گشت لگاتے ہوئے یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ جس بازار میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں کی دکانیں بند ہیں۔ اور جہاں ہندو اقلیت میں ہیں وہاں ہندوؤں کی دکانیں بند ہیں۔ کوئی بھی غیرت مند ہندو یا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے محلے یا بازار میں اس کے ہم وطن اس پر بھروسہ نہ کریں۔ لہذا ہمارا یہ مشورہ ہے کہ اس طرح کے ہنگامے کے دنوں میں جو فرقہ وارانہ کہا جاتا ہے بجائے اپنی اپنی حفاظت کرنے کے آپس میں رواداری کا ثبوت دیں تاکہ تہذیب و ثقافت اخلاق اور مذہب کی شان بڑھانے کے لئے وہ ایک دوسرے کی حفاظت کریں یعنی یہ کہ مسلمانوں کے بازار یا محلے جہاں ہندو کی جان و مال کی حفاظت مسلمان اپنے ذمے لے لیں۔ اور اسی طرح ہندوؤں کے بازار یا محلے میں مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا ہندو اپنا دھرم سمجھیں۔ سچے ہندو دھرم اور صحیح اسلام کا بھی یہی فرمان ہے۔ جو اس سے منہ موڑتا ہے۔ وہ نہ مسلمان ہے نہ ہندو۔ ایسے ذلیل اور مفسدہ پردازوں کو فتنہ پردازی سے بطریق بہتر روکنا شرفاء کا فرض ہے۔ جب یہی چیز عدم تشدد یا محبت سے کہا جاتا ہے اگر یہ کارگر نہ ہو تو سختی اور تشدد کے ذریعہ انہیں اس مذموم فعل سے باز رکھنا ہر انسان کا انسانی۔ اخلاقی اور مذہبی فرض ہے اگر معزز شہری ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذمہ خود اٹھا لیں تو اس سے انہیں فائدہ پہنچنے کے علاوہ ہماری بے بس اور عقل کی بھولی ہوئی اور حکومت کو بھی کافی مدد ملے گی

بمبئی کی ریلیف کمیٹیاں

ان دنوں بمبئی میں سڑکوں پر ہندو ایمبولینس کاریں اور مسلم ایمبولینس کاریں اپنے اپنے ناموں کے بڑے بڑے جھنڈے اور سائن بورڈ (بمبئی کی زبان میں باؤنڈ اسپلیشے) لگائے ادھر سے ادھر دوڑتی پھرتی نظر آتی ہیں ان سائن بورڈوں پر لکھا ہوتا ہے "ہندو مہاسبھا ریلیف کمیٹی" "مسلم ریلیف کمیٹی" وغیرہ۔ یہ تو ہمیں یقین ہے کہ یہ ریلیف کمیٹیاں بلا امتیاز مذہب و قوم ہندو اور مسلم زخمیوں کو مدد پہنچاتی ہوں گی۔ مگر ان کو دیکھ کر انسان پر پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ ہندو ایمبولینس ہندوؤں کی مدد کرے گی اور مسلمانوں کی ایمبولینس صرف مسلمانوں کی مدد کرے گی۔ زخمیوں اور بیماروں کی خدمت کرنے کے لئے اپنے نام کی نمائش کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ خاص کر ایسی بگڑی ہوئی فضا میں انسانی خدمت کرنے والوں کو فرقہ وارانہ بورڈ اور جھنڈیوں کو لگا کر فضا کو اور بگاڑنا چاہیے۔

جب ہندو ریلیف کمیٹی کو مسلمان زخمیوں کی بھی مدد کرنا ہے اور مسلمان ریلیف کمیٹی کو ہندو زخمیوں کی بھی خدمت کرنا ہے تو پھر اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ یہ ظاہر کریں کہ ہم صرف اپنے فرقے کے زخمیوں کی

ہی مدد کرنے کو تیار ہیں، انسانیت اور ہمدردی کے یہ چارہ دل اور مددگار کو اس کمزوری سے باز رہنا اور اوپر اٹھنا چاہئے۔

لارڈ ہیلی فیکس

گذشتہ دنوں انگلینڈ کے امریکی سفیر لارڈ ہیلی فیکس نے کہا کہ ہم جرمنی کے "پاگل کتے" ہٹلر کے ساتھ صلح کی کوئی بات چیت نہیں کریں گے، ہم غیر مہذب کہلانے والے ہندوستانیوں کو اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ جن انگریزوں نے برسوں سے ہمارے ملک پر بغیر ہماری مرضی کے قبضہ کر رکھا ہے اور جو اپنی قوم میں فاتح اور دانشمند کہلاتے ہیں۔ ہم نے غلامی، ذلت اور قید سے بھر کر بھی کسی زندہ یا مرحوم انگریز کو ایسے الفاظ میں یاد نہیں کیا۔ مگر مہذب کہلانے والی قوم کے چوٹی کے ذمہ دار شخص کے منہ سے ایک دوسری قوم کے رہنما کے متعلق ایسے الفاظ نکلنا ان کی تہذیب اور متانت کی ایک مثال ہے۔

انگریزوں کے مصیبت میں ہوش و حواس اور اخلاق کو قائم رکھنے کی تعریف کو ہم ایک عرصہ سے سراہتے چلے آئے ہیں۔ ہمارا یقین تھا کہ دنیا میں ظاہری طور پر سب سے زیادہ مہذب قوم انگریزوں کی قوم ہے۔ یہ قوم مصیبت کے وقت میں بھی اپنے دماغ کو ٹھنڈا اور دل کو گرم رکھتی ہے مگر لارڈ ہیلی فیکس ایسے متحمل مزاج نے ہمارے اس یقین کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ انہوں نے ہٹلر کو "پاگل کتا" کہہ کر گرم مزاجی، اوچھا پن، بدتہذیبی اور بداخلاقی کا ثبوت دیا جو برطانوی کیریکٹر پر ایک دھبہ ہے۔ یہاں اس بحث نہیں کہ ہٹلر اچھا ہے یا برا مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ بلند پایہ اور ذمہ دار شخص کو غصہ کے وقت اتنا نیچے نہ اترنا چاہئے کہ عوام ان کی حرکتوں پر ہنس پڑیں۔ غصہ کے وقت ہی انسان کی بلندی اور عظمت کا امتحان ہوتا ہے۔

ایک فائدہ اس بدزبانی سے ضرور ہوا ہے، اور وہ یہ کہ برٹش قوم کے مقابلے میں ہم خود میں احساس کمتری پاتے تھے وہ جاتا رہا اور احساس برتری پیدا ہو گیا۔ وہ دن دور نہیں ہے کہ مغرب پھر سے مشرق کے سامنے انسانیت اور اخلاق سیکھنے کے لئے زانوئے ادب تہ کرے گا۔

عراق کی افسوسناک حالت

یورپ کی غیر مہذب قومیں جو دو سو برس کا فساد ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کی ٹھانے ہوئی ہیں۔ انہوں نے دو عظیم جنگوں سے ساری دنیا کو مصیبت میں پکڑ رکھا ہے۔ جنگ کی آگ دن بدن پھیلتی جاتی ہے۔ یہ شرم کی بات ہے کہ اسلامی ملکوں کو بھی اس میں نقصان اٹھانا پڑا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا اور نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ عراق میں پہلے بھی بغاوتیں ہوئیں اور نہ معلوم کیا کیا ہوا۔ آج کل کا زمانہ کچھ ایسا غیر معیاری اور غیر مستند بن گیا ہے کہ کوئی صحیح خبروں کا فقدان ہے اور جو کوئی سچی خبر ایک آدھ بھی آ بھی جاتی ہے تو یقین نہیں آتا۔

بہر حال انگریزوں نے کہا کہ رشید علی جرمنوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اس لئے عراق اور اس کے راستوں اور تیل کے چشموں کی حفاظت ہم کریں گے۔ ادھر جرمنوں کی لالچی نظریں بھی ان چیزوں پر یقیناً ہوں گی اور پھر بڑی مصیبت یہ ہے کہ انگریز جن ملکوں کے دوست بنتے ہیں جرمنی ان کا جانی دشمن بن جاتا ہے۔ اور یہ دونوں دوست و دشمن مل کر اس کمزور اور بے بس ملک کی خوب درگت بناتے ہیں۔ سارا یورپ ایسی دوستی اور دشمنی کی نذر ہو گیا۔

ہمارا دل عراق کی حالت پر بہت دکھا۔ ادھر سے انگریزوں کی فوجیں بغداد کی جانب بڑھی ہوئی، ادھر ظالم جرمنی آنکھیں دکھا رہا ہے اس حالت میں عراق بیچارا چکی کے دو پاٹوں میں پس کر نہ رہ جائے۔ اس کا اندیشہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رشید علی کو جرمنوں نے کچھ روپے دے کر خرید لیا ہے ایسے آدمی کو قابو میں کر لینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ حکومت برطانیہ نے اپنے فائدے کے لئے نہ سہی، عراق کے فائدے کے لئے اور دشمن کو دھوکا پہنچانے کے لئے یہ چال چلی ہوتی — برطانیہ کے وسائل بھی جرمنوں کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔ دھن دولت کی بھی کمی نہیں پھر ایک آدمی کو دشمن کے ہاتھ میں کیوں جانے دیا گیا

اس سے ظاہر ہے کہ برطانیہ نے اپنی سیاست والوں کا
نقصان ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسٹر [illegible] نے کہی تھی
یہ وہی باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ یا تو رشید عالی پاشا نہیں تھے صادق
اور غلطیاں صحیح جو بھی کر رہے تھے اپنی سمجھ کے مطابق اپنے ملک کی بھلائی کے لئے
کر رہے تھے مگر پھر وہ کیا جائے ڈپلومیسی بالکل جس جیسی ہو کر رہ گئی اور جرمنی
ڈپلومیسی سے مات کھا گئی۔ بہرحال دونوں صورتوں میں نقصان مسلمانوں کا
ہی ہوا۔ اور دشمن کی نسبت دوست سے اس کی شکایت زیادہ کی جا سکتی
ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ نام نہاد آزاد عراق کے لئے دشمنوں کے نیچے
میں پھنس جانے کا خطرہ ہمیشہ لاحق رہے گا۔ اور اگر وہ برٹش
گورنمنٹ کے زیر نگیں آ جائے۔ تب تو ظالم جرمن اس کا وہی حشر کر ڈالیں گے
جو اور ملکوں کا ہوا۔ اور پھر آزاد مسلمان اس بات کو کبھی پسند اور
برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ کسی بھی صلیبی قوم کے دست نگر بن کر رہیں
اس لئے بہتر ہوگا کہ عراق کو ترکی کے حوالے کر دیا جائے چونکہ
مسلمان مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا ان میں قومی تعصب
پیدا کرنا اور عالم اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ مسلمانوں اور اسلام
سے عین دشمنی ہے۔ عراقی لوگ ترکی گورنمنٹ میں شامل ہو کر اپنے
ملک کے بندوبست میں خود حصہ لیں گے۔ اور ترکی کے ساتھ مل کر طاقتور
بھی ہو جائیں گے۔ اسلامی ملکوں کو متحد ہو کر رہنا چاہئے نہ کہ چھوٹی
چھوٹی ریاستوں کی شکل میں کمزور بنے رہنا۔

ہمیں امید ہے کہ دیگر اسلامی اخبارات اور بالخصوص مسلم
حقوق تمدن و تہذیب کے علمبردار قائد اعظم مسٹر جناح بھی ہماری
اس تجویز کی تائید کریں گے اور مسلم لیگ زور و شور سے اس خالص
اسلامی معاملے کی طرف دھیان دے کر گورنمنٹ سے اسلام دوستی
کا عملی ثبوت طلب کرے گی۔

حضرت مجنوں گورکھپوری

ادب اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار ہیں جنکی کامیاب افسانہ نگاری کے
متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ انہوں نے اپنے فن کو خاص
پسندیدہ غلطیوں اور اپنے خیالات کی فصاحت کا ذریعہ نہیں بنایا اگر وہ ایسا
کرتے تو وہ کامیاب افسانہ نگار نہیں کہلائے جا سکتے تھے بلکہ انہوں نے جو
کچھ خود دیکھا اپنے قلم سے دوسروں کو بھی ہو بہو ہی دکھا دیا۔ یہی [illegible]
کے افسانہ نگارش کا کمال کہی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ حقیقت کو مد نظر
رکھا ہے کانٹوں کو کانٹے اور پھولوں کو پھول سمجھا ہے۔ انہوں نے اپنے
افسانوں میں انسانی زندگی کے ان زخموں کو کھول کر دکھایا ہے جن پر [illegible]
کی زرین پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جنکی ظاہری شکل سے اور باطن کے
تعفن اور زخموں کے ناسور بننے کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سرگذشت شباب بھی آپ کا ایک افسانہ ہے جو افسانہ "ایمان" میں
مسلسل شائع ہوتا رہا ہے اور اب سے ایمان اشاعت گھر نے کتابی
صورت میں شائع کیا ہے۔ افسانہ نہایت دلچسپ اور دردناک ہے اور
ہمارے سامنے انسان کی بے چارگی کا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔

گزشتہ دو سو سال سے ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے
اس نے یہاں کی زندگی کے ہر شعبہ پر افسوس ناک اثر ڈالا۔ عشق و محبت
بھی غلامی کی تباہکاریوں کا شکار بننے سے نہ بچ سکے۔

اس افسانے کے نقشے میں ایک ایسی ہی محبت کا عکس دکھایا گیا
ہے جو مجبوری سے شروع ہو کر مجبوری پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے
کہ ایسی محبت، بےکسی، بیکسی اور بیدم ہی ہو گی جسے بیمار کی "نگاہ" اور
مفلس کی ہچکی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

غلامی نے جس طرح ہماری دوسری طاقتوں کو کچل ڈالا ہے اور ہمارے
جذبات کو مضمحل کر دیا ہے۔ اسی طرح ہماری محبت کی شکل بھی بگاڑ کر رکھ دی ہے
جس طرح ہمارا کھانا پینا سونا جاگنا چلنا پھرنا ہنسنا رونا آزادانہ اور بے ساختہ

ہیں ۔ اس طرح ہماری محبت بھی بے جان ہے ۔ ہماری محبت بھی غلامی کی زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے ۔ یہ محبت کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتی اور آخر میں چراغ سحری کی طرح لمحہ بھر کے لئے بھڑک کر دم توڑ دیتی ہے ۔ قید و بند انسان کو بے عمل و بے حرکت کر دیتی ہے ۔ اور ایسے انسان کا کوئی جذبہ بھی صادق نہیں ہو سکتا ۔ اسی لئے غذا ہمیں خون صالح دے زندگی کے بجائے مادۂ فاسد اور بیماریاں دیتی ہے ۔ آرام ہمیں تازگی کی بجائے کاہلی دیتا ہے محنت طاقت کی بجائے تکان دیتی ہے ۔ راحت، خوشی اور کامیابی ہمیں حوصلہ کے بجائے غرور دیتی ہے درد و غم اور مصائب لطف و گداز کے بجائے ہمیں پست ہمتی اور ناامیدی سے دوچار کرتے ہیں ۔ اسی طرح محبت شگفتگی، بلند حوصلگی، لطف و سرور کے بجائے پژمردگی، تنگ دلی اور موت دیتی ہے ۔

مجنوں صاحب کے افسانہ "سوز و ساز" کو پڑھتے وقت دل میں ٹیسیں سی اٹھتی ہیں ۔ ٹھنڈی سانسیں آتی ہیں ۔ آہیں حلق میں اٹک کر رہ جاتی ہیں ۔ آنسو پلکوں میں خشک ہو جاتے ہیں ۔ اور ایک ایسی بے چینی طبیعت میں پائی جاتی ہے جس میں تکلیف کا مزا نہیں ملتا بلکہ غنودگی اور غشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے ۔

شکر ہے کہ مجنوں صاحب نے دیباچے میں یہ لکھ دیا ہے کہ "میرے افسانوں میں عشق و محبت کے بلند آہنگ دعوے آخر میں ایک ایسے جذبہ کے تقاضے ثابت ہوتے ہیں جو بھوک پیاس کی طرح معمولی اور عام ہے جو ابھرتا ہے اور آسودگی کے بعد فرو ہو جاتا ہے اور جو ایک مرکز کو چھوڑ کر اپنی خاطر خواہ آسودگی کے لئے دوسری طرف مائل ہو سکتا ہے"

اس لئے ذرا سے غور و فکر کے بعد محبت کی اس قسم کا یہ حشر ہوتے دیکھ کر کسی کو بھی یہ افسوس نہیں ہو سکتا ۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کے ابتر حالات نے جہاں انسانوں کو بلندی کی سطح سے کھینچ کر تحت الثریٰ کی پستی میں پھینک دیا ہے ۔ محبت کا بھی یہ حشر کر ڈالا ۔ آج جبکہ نفسی نفسی مچی ہوئی ہے اس حالت میں محبت بھی ایک نیچے درجہ کا جذبہ بن کر رہ گئی ورنہ یہی محبت تھی جسے "بھگتی روپ" میں اور ایثار کی شکل میں گزشتہ دور کی تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے ۔ اور اس کی سب سے بہترین مثالیں ہندوستان ہی میں پائی جاتی ہیں جس میں مقدس جذبے کے تحت انسان ذہنی ارتقاء کے اعلیٰ ترین مدارج طے کر کے انسانیت کے مرتبۂ عظیم کو حاصل کرتا ہے ۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کائنات کا بہترین تخلیق انسان ہے اور انسانیت کے لطیف ترین جذبے کا نام محبت ہے ۔

ہمارے ملک میں چونکہ قدرت کی دی ہوئی ان نعمتوں کی کمی نہیں ہے جو انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں ۔ اس لئے جب انسان ان سے بے نیازی کی حد تک سیراب ہو گیا ۔ تو اس میں ایک بلند حوصلگی کا لطیف جذبہ پیدا ہوا ۔ جس کا تقاضا یہ تھا کہ انسان خود پسندی کو بھول جائے دوسرے کے لئے ایثار کرے اور دوسرے کے آرام کے لئے خود تکلیف برداشت کرے خود آسودہ ہونے کی بجائے دوسرے کی آسودگی میں راحت محسوس کرنا ہی انسانیت کا معراج یا محبت کہا جا سکتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ اب وہ حالات نہیں ہیں جن میں انسانیت پنپ سکے اس لئے واقعی محبت مفقود ہے ۔ میں بھی نیاز صاحب کے اس خیال سے متفق ہوں کہ "مجنوں صاحب کے افسانے انسان سے عشق و محبت کا حوصلہ چھین لیتے ہیں"

لیکن اس قسم کے عشق و محبت کی "ہوس" کو ضرور چھین لینا چاہئے مجنوں صاحب ایسے افسانے لکھ کر واقعی ملک کی خدمت کر رہے ہیں ۔

ہمیں ایسی محبت کی ضرورت نہیں جو ہمیں غلط راہ پر لے جائے جو ہمیں سسکنے پر مجبور کرے ۔ جب اس قسم کی بے نتیجہ محبت سے ہمیں نفرت ہو جائیگی تو یقیناً ہم اپنی اعلیٰ قابلیتوں کے لئے کوئی اور مفید میدان تلاش

کریں گے جو بہر حال ہمیں نسائیت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچا سکے گا اور وہاں ہم
اُس محبت کا رُخ تاباں دیکھ سکیں گے جو حاصل کائنات ہے۔ وہ واقعی
ایک ایسا سر چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔ اور جس کے لئے وقت اور
زمانہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو ابتدا اور انتہا کے تعینات سے برتر و بالا ہے۔
محبت کی لذت سے وہ انسان کبھی محروم نہیں ہو سکتا جس کے ظرف پر سیرابی
"تشنگی" اثر نہ کر سکے۔

مجنوں صاحب کا انداز بیان نہایت دلکش ہے۔ پلاٹ نہایت
عمدہ اور جذبہ ..آمیز ہے۔ اس افسانہ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مختلف
الخیال انسانوں پر یکساں.. کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہم
دس بارہ آدمیوں نے پڑھا اور ہر ایک نے یہی کہا کہ اُس موقع پر ہمارا
دل دھک سے رہ گیا جہاں سائرہ نے اپنے نکاح کے ارادے
کی خبر مشتاق کو دی۔ سب کے دل میں یہی ڈر تھا کہ کہیں وہ عبدالکریم
سے تو شادی نہیں کر رہی۔

مجنوں صاحب کے افسانوں سے انسان یہ اثر لیتا ہے کہ پہلے
تو وہ رنگ برنگ کے خوشنما پھول لیکر ایک گلدستہ بناتے ہیں چونکہ
وہ صرف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ فلاسفر بھی ہیں۔ اس لئے گلدستہ بناتے
بناتے سوچنے لگتے ہیں کہ آخر میں یہ سوکھ ہی جائے گا۔ لہٰذا جھنجھلا کر
پھولوں کی پتیوں تک کو بکھیر ڈالتے ہیں۔ مجنوں صاحب کے ہر افسانے میں
آپ قدرت کی سفاکی پر ایک صدائے احتجاج پائیں گے۔

میں قارئین تنویر سے پُر زور سفارش کرتی ہوں
کہ وہ سوگوار ..ب کو ضرور پڑھیں --

قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ علاوہ محصول ڈاک
ملنے کا پتہ :- ایوان اشاعت گورکھپور

— سنجر

مس ریتھبون — ممبر پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کے نام ایک کھلا خط شائع کیا ہے جس میں
ہندوستانیوں کی سخت توہین کی ہے اور آزادی کے خواہاں ہندوستانیوں کو بہت بُرا بھلا کہا ہے کہ وہ
متحد و متفق ہو کر اس جنگ میں ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔ اپنے خیر خواہوں نے ہندوستانیوں کو بزدل
بھی کہا ہے اور بانیٔ وطن کو قانون شکن کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ اور اس بات پر بہت بُرا مانا ہے
کہ ہندوستانی انگریزوں کے ظلموں مثلاً جلیانوالہ باغ کے قتل عام پنجاب کا مارشل لا۔ اور صوبہ سرحد کے
خدائی خدمتگاروں کے قتل عام اصلی خاندانوں اور جبری کیوں وغیرہ کو بھول کیوں نہیں جاتے
اور دھمکیاں بھی دی ہیں کہ لڑائی میں فتح کے بعد تم سے سمجھ لیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کو فسطیوں اور
حملہ آوروں کا ساتھی بھی کہا گیا ہے۔ برطانوی حکومت کی ہندوستانیوں پر برکتوں نعمتوں اور توڑ پھوڑ
کے بھی راگ الاپے ہیں۔ آپکا خط بہت طویل ہے اسکا ضروری ترجمہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ایک
ایسی عورت کی بڑ جو انگلستان پر ظالم جرمنوں کی مسلسل بمباری سے پریشان و رنجیدہ ہو اسکا اس پرچے میں بھی
چھاپا جائے۔ البتہ ملک الشعراء ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کا وہ بیان اس پرچے میں شائع کیا جاتا ہے جو انہوں نے
مس ریتھبون کے خط کے جواب میں دیا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور سچے محبِ وطن اور انسانیت پرست انسان تھے
اور قومی تعصب سے بلند و بالا تھے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انہیں قوم اور اپنے ملک کی بے عزتی گوارا ہو سکے
ڈاکٹر ٹیگور کے جواب سے قارئین تنویر مس ریتھبون کی ذہنیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ بجز اس بات پر
غور کر سکتے ہیں کہ آج غلامی کی وجہ سے ابھی کچھ اور بیہودہ باتیں ہمیں سننا پڑتی ہیں اور اس قوم کے
افراد کے منہ سے جنہیں تہذیب کی ابجد سے بھی کوئی واسطہ نہیں جنہیں ابھی چھو نہیں گئی ہم اپنے
ملک کی آزادی کے لئے لڑیں تو قانون شکن قابل گردن زدنی۔ لائق زندان اسیری ہیں اور وہ اپنے
ملک کی آزادی و وقار کے لئے لڑیں تو یہ عین وطن پرستی جانثاری شجاعت ہے۔ دراصل اس تحریر کا
بہت مفصل جواب دینے کے لئے ایک بسیط مضمون کی ضرورت ہے جو انشاء اللہ جلد ہی ایک مستقل مضمون
"ہندوستانیوں کی حالت" میں دیا جائے گا۔ سر دست ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم
مس ریتھبون کی حالت کو قابل رحم سمجھتے ہیں۔ وہ اس وقت جس مصیبت سے گزر رہی ہیں
وہ یقیناً ان کی قوم کے پچھلے اعمال و نیت کا نتیجہ ہے۔ یہ ہم کہہ سکتی ہیں کہ جتنا
ملک ہندوستانیوں پر برطانوی حکومت کی برکتوں اور عنایات کا تعلق ہے اور برطانوی حکومت سے
جس قدر ہندوستانی فیض یاب ہوئے ہیں۔ اس کے بدلے میں بے شک ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ
سکتے ہیں کہ ہر ہندوستانی صدق دل سے یہ دعا کرتا ہے کہ برطانوی حکومت اور اس کا اب

مس راتھبون کو ڈاکٹر ٹیگور کا جواب

انگریزی تخیل کا فضلہ فاقہ کشی، فساد اور بزدلی برطانیہ کا ورثہ ہے

مس راتھبون چاہتی ہیں کہ ہم ان ہاتھوں کو بوسے دیں جنہوں نے ہماری غلامی کی زنجیروں کو جکڑا ہے

ناقص انگریزی تعلیم کے عوض ہمارے بچے اپنا تمدن کھو بیٹھے

ہندوستانیوں کے نام مس راتھبون کا کھلا خط پڑھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ مس راتھبون کون ہیں۔ لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اوسط درجہ کے نیک ارادہ، انگریز کی ذہنیت کی نمائندگی کرتی ہیں خط میں زیادہ تر جواہر لال سے خطاب ہے۔ بلاشبہ اگر جنگ آزادی کا وہ شریف سپاہی مس راتھبون کے ملکیوں کے ہاتھوں جیل میں بند نہ ہوتا تو اس خواہ مخواہ کے وعظ کا منہ توڑ اور چست جواب دیتا۔ اس کی مجبور خاموشی کو دیکھ کر بستر علالت سے ہی صدائے احتجاج بلند کرنا مجھ پر لازم ہو گیا۔ اس خاتون نے نادانی اور گستاخی کے ساتھ ہمارے ضمیر کو چیلنج کر کے اپنے کام کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہماری ناشکری پر وہ بھڑک اٹھی ہیں ـــــ انگریزی خیال کے کنوؤں میں ڈوب کر بھی ہمارے پاس اپنے غریب اہل وطن کی بھلائی کا کچھ خیال باقی رہنا چاہئے۔ انگریزی خیال جہاں تک مغربی روشن خیالی کی بہترین روایات کا نمائندہ ہے بلاشبہ ہم نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مگر مجھے یہ بات اور کہہ دینی چاہئے کہ برطانیہ نے ہمیں غیر تعلیم یافتہ رکھنے کی سرکاری طور پر جو کوششیں کیں ان کے باوجود ہمارے اہل وطن نے انگریزی خیال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ہم اب

کی کسی دوسری زبان کے ذریعہ مغربی علم و فضل سے روشناس ہو سکتے تھے۔

انگریزوں کی گستاخانہ دلچسپی

کیا دنیا کی دوسری قومیں اس انتظار میں ہیں کہ انگریز آکر انہیں روشن خیال بنائیں۔ یہ سمجھنا ہمارے نام نہاد انگریز دوستوں کی گستاخانہ دلچسپی کی دلیل ہے۔ اگر وہ ہمیں نہ سکھلاتے تو ہم ابتک زمانہ تاریکی میں پڑے رہتے۔ ہندوستان میں تعلیم کی برطانوی سودا بازی میں یہ کہ ہمارے بچے اسکولوں میں پہنچے۔ جو بہترین انگریزی تخیل کا فضلہ ہے۔ جہاں وہ اپنے تمدن کی بنیادیں بیچ کر اپنے خوبصورت ہاتھ کھو بیٹھے۔ فرض کیجئے کہ روشن خیالی پیدا کرنے کے لئے انگریزی زبان ہی ہمارے پاس ایک ذریعہ باقی رہ گیا ہے تو کیا دو صدیوں کے برطانوی راج کے بعد ۱۹۳۱ء میں انگریزی تخیل کے کنوئیں ڈھے ہے۔ اور اس عرصہ میں صرف ایک فیصدی ہندوستانی انگریزی تعلیم حاصل کر سکے۔ حالانکہ روس میں ۱۹۱۷ء میں صرف ۱۵ سال کے اندر ۹۸ فیصدی بچے پڑھ لکھ گئے۔ (یہ اعداد و شمار اسٹیٹسمین کی ایربک سے لئے گئے ہیں یہ انگریزی کتاب ہے۔ اور اس میں روس کے متعلق کسی غلط بیانی کا امکان نہیں ہے۔)

فاقہ کشی :- لیکن موجودہ قائم رکھنے کی ابتدائی ضرورتیں تمدن سے زیادہ

افسانہ

بے خبری

از سحر ـــــــــــــ

یہ افسانہ آج سے قریب دس سال پیشتر کا لکھا ہوا ہے۔ اور چونکہ میرا سب سے پہلا افسانہ ہے اس لئے افسانوی خامیوں کے باوجود مجھے پیارا ہے۔ یہ مجھے اپنے بچپن کی یاد دلاتا ہے۔ اُس زمانے میں، میں عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی کے ناول پڑھا کرتی تھی۔ لہٰذا اس افسانے کی طرز تحریر میں بھی شرریت کا اثر پایا جاتا ہے اور زبان بھی قدرے ملتی جلتی ہے۔

میں یہ افسانہ اپنے ان کرم فرماؤں کے تقاضوں کی وجہ سے شائع کر رہی ہوں جو میرے افسانوں کو پسند کرتے ہیں اور میں فی الحال کچھ دنوں سے افسانے لکھنے سے تائب ہوں۔ اس لئے پرانے افسانے سے ہی اپنے قلم کے قدردانوں کی تواضع کرنا چاہتی ہوں ـــــــــ :

نجمہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی۔ حسن صورت و حسن سیرت دونوں سے مالا مال تھی۔ ماں باپ نہایت روشن خیال تھے۔ اس لئے لڑکی کو چھوٹی سی عمر میں ہی اعلیٰ تعلیم دی تھی۔ اور ضروری فن بھی سکھائے۔ مثلاً تلوار چلانا۔ شہسواری۔ گھوڑے کی سواری۔ تیرنا۔ موٹر چلانا۔ سینا پرونا کھانا پکانا وغیرہ وغیرہ۔ لڑکی ایسی ذہین تھی کہ چھوٹی سی عمر میں ہی سب کچھ سیکھ کر فارغ التحصیل ہو گئی تھی۔ ماں باپ نے بھی ساری طاقتیں اپنی اکلوتی بچی کو لائق بنانے میں صرف کر دی تھیں اور اسے دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے... مگر۔

خدا دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

دنیا کی بے ثباتی رنگ لائی۔ قصبہ میں طاعون کی وبا بڑے زور و شور سے پھیلی اور نجمہ کی بدقسمتی سے ماں باپ طاعون کا شکار ہو گئے۔ چچا نے دولت اور جائداد پر قبضہ کر لیا۔ اور نجمہ کو اپنے نالائق لڑکے سے بیاہنے کا بندوبست کرنے لگا۔ نجمہ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ ایک روز۔ خوفناک اور اندھیری رات میں تن تنہا گھر سے نکل گئی۔ اس وقت اس کی عمر کا پندرھواں سال شروع تھا۔ عیش و آرام میں پلی ہوئی ناتجربہ کار بچی جنگلوں کو طے کرتی، روتی، کانپتی، بلکتی، چلی جا رہی تھی۔ ماں باپ کی بے وقت موت اور چچا چچی کے مظالم نے غریب نجمہ پر آفت ڈھا رکھی تھی۔ اس لئے اُس کا ارغوانی حسن ماند پڑ گیا تھا پھول جیسے رُخسار کملا گئے تھے۔ پنکھڑی جیسے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں پر مُردنی چھا رہی تھی۔ رات کی خوفناک تاریکی سے اُس کا دل دھڑک رہا تھا چلتے چلتے شب کے پچھلے پہر وہ قریب ہی کی ریاست ہمیر پور کی حدود میں جا پہنچی پو پھٹنے ہی والی تھی۔ نجمہ دل میں سوچنے لگی کہ عنقریب دن ہو جائے گا میں کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ گھبراہٹ کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آنسو تھمتے نہ تھے دل ٹھہرتا ہی نہ تھا۔ پیر لہولہان ہو رہے تھے۔ سامنے ہی ریاست کی سب سے بڑی "ہمیر ساگر" جھیل تھی۔ وہاں ایک پتھر پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کیا کروں اسی اثنا میں ذرا تاریکی کم ہوئی اور دن کی روشنی کا پیغام لیکر ایک ہلکی سفیدی نمودار ہوئی۔ یہ وقت بہت دلفریب تھا ہلکا ہلکا اُجالا۔ سبزہ زار۔ پہاڑوں کی چھوٹی موٹی چٹانیں۔ کہیں کہیں میدان۔ جھیل اور اس کا پانی، لہروں کا شور یا راگ، ہوا کی خنکی، پتوں کی سنسناہٹ، مگر نجمہ کے لئے اس سے بدترین وقت کوئی نہ تھا اس کے لئے تنہائی، بے سرو سامانی تھی۔ لہروں اور پتوں کی آواز اُسے اپنی حالت پر نوحہ خوانی معلوم ہو رہی تھی۔

اُسے محسوس ہوتا تھا کہ سبزے کا ہر پتہ اس کے لئے اژدہا بن کر

اُسے نگل جانا چاہتا ہے۔ ذرہ ذرہ اُسے بے پناہ دیکھ کر پہاڑ بن کر اُسے کچل دینے کو تیار ہے۔ جھیل کا ہر قطرہ مصیبت کا بحر بے پایاں بن کر اُسے غرق کرنے پر تلا ہوا ہے۔

وہ اپنی حالت پر خود ہی اشک غم بہاتے ہوئے اُٹھی۔ تھکی ہوئی تھی مگر کھڑے ہو کر انگڑائی لینے سے قوس قزح کا سماں بندھ گیا۔ دفعتاً ریاست کا مشہور بدمعاش "جمبو" اُسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا اوہو!! کیسی خوبصورت لڑکی ہے بس ہاتھ سے جانے نہ پائے کہہ کر وہ اور اس کے دو ساتھی۔ بچہ کی طرف لپکے۔ بچہ کو سوائے اسکے اور کچھ نہ سوجھا کہ ان ظالموں سے بچنے کے لئے جھیل کی خوفناک لہروں میں پناہ لے۔ اور اپنی عفت وعصمت کی خاطر اپنی جان دیدے۔ وہ تڑپی اور ایک ہی جست میں خود کو پیام اجل کا خوفناک راگ سنانے والی لہروں کے سپرد کر دیا۔

(۲)

خورشید مرزا ریاست میر پور کے نوجوان مہاراجہ کے دیوان، سکریٹری، دلی دوست جو کچھ بھی وہی تھے ریاست پر حقیقت میں اُن کا ہی قبضہ تھا اپنی خداداد لیاقت سے مہاراجہ، امراء، رعایا۔ غرضیکہ سب کے دلوں پر اُن کی حکومت تھی وہ ریاست کی جان تھے عمر کچھ زیادہ نہ تھی مگر بقول سعدی ؎ بزرگی بعقل است نہ بسال

ان کا معمول تھا کہ علی الصبح گھوڑے پر سوار ہو کر جنگلوں کی سیر کو نکل جاتے اور دن نکلتے نکلتے واپس آجاتے۔ گھوڑے کی سواری ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ آج انھوں نے وہ دردناک نظارہ دیکھا جو عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا ایک بیگناہ لڑکی "جمبو" بدمعاش سے بچنے کے لئے خودکشی کرلے؟ صرف ایک لمحہ کے لئے وہ حیران ہوئے۔ جمبو کو پکڑتے یا ایک معصوم کی جان بچاتے۔ بدقسمتی سے اُن کے پنجے سے بچ نکلنا ممکن نہ تھا۔ اُف بڑی چوک ہوئی ورنہ آج ایک ہی گولی اس بدمعاش کا قصہ پاک کر کے ریاست کو اس کے شر سے محفوظ کر دیتی۔ یہ سب خیال ایک ہی لمحہ میں ان کے دماغ میں آئے۔ جمبو پر تو ان کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ شکل دیکھتے ہی ہوا ہو گیا۔ اور یہ فی الفور گھوڑے سے اُتر جھیل میں کود پڑے اور غوطے کھاتی ہوئی لڑکی کو باہر نکال لائے۔ اور اُسے بچانے کی تدبیر کرنے لگے لڑکی نے

پانی بہت کم ڈبکیاں کھائی تھیں انھوں نے اُسے ایک پتھر کی ہموار چٹان پر لٹا دیا اور تھوڑی سی گھاس اِدھر اُدھر سے اکٹھا کی جو شبنم سے بھیگی ہوئی تھی آگ جلا کر لڑکی کو گرمی پہنچائی۔ اپنا اوور کوٹ اُسکے اوپر ڈال دیا اور رومال گرم کر کر کے اس کے ہاتھ پاؤں سینکنے لگے۔ اسی اثنا میں انھوں نے دیکھا کہ یہ ایک کمسن لڑکی ہے اور دولت حسن سے مالا مال۔ مگر بدنصیبی نے اس کے حسن میں خاص کمی کر دی ہے گرمی پا کر لڑکی ہوش میں آئی اور اوور کوٹ دور پھینک دیا اُٹھ بیٹھی اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی جونہی اُس کی نظر خورشید مرزا پر پڑی۔ رنگ اور بھی فق ہو گیا اور چیخ مار کر پھر جھیل کی طرف دوڑی۔ مگر خورشید مرزا نے لپک کر اسے تھام لیا۔ اُسکے ہاتھ سے خون بہنے لگا اور دلاسہ دینے لگے لڑکی انھیں جمبو ہی سمجھے ہوئے تھی۔ روتی جاتی تھی اور خدا رسول کے واسطے دے دے کر کہتی تھی ظالم! مجھ پر رحم کر میں خود ہی قسمت کی ستائی۔ خلق کی ٹھکرائی ہوں۔ للہ مجھے موت کے آغوش میں آرام لینے دے اور تجھے اس کا اجر دے گا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ خورشید مرزا اس کے دونوں بازو پکڑے ہوئے تھے اور [illegible] دلاسہ تشفی دے رہے تھے۔ لڑکی ہوش میں آ تو میں جمبو نہیں ہوں بلکہ تمھارا مددگار ہوں گھبراؤ مت۔ وہ تو جمبو کو دیکھتے ہی بھاگ گیا مجھے ذرا بتلاؤ کہ تم کون ہو۔ چلو ذرا آگ کے پاس بیٹھو۔ کہیں تمھیں غش نہ آجائے۔

میری طرف دیکھو میں جمبو ہرگز نہیں ہوں تمھارا مددگار ہوں۔ یہ اپنی کہہ رہے تھے وہ اپنی کہہ رہی تھی [illegible] وہ انھیں جمبو ہی سمجھ رہی تھی اور بھاگ کر جھیل میں دوبارہ کودنا چاہتی تھی۔ اسی کوشش میں اس نے خورشید مرزا کی کلائی کو دانتوں سے زور سے کاٹ لیا خون کے فوارے چھٹنے لگے مگر خورشید مرزا نے ہمت نہ ہاری۔ اور مجبور ہو کر اُسے زبردستی اُٹھا کر آگ کے پاس لے گئے۔ بچہ بے حال ہو چکی تھی ہلکی سی چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ خورشید مرزا نے اُسے پھر چٹان پر لٹا دیا۔ اور اپنے ہاتھ کے زخم کو جھیل کے پانی سے خوب دھویا اور رومال باندھ لیا پھر لڑکی کو بے ہوش ہی اوور کوٹ میں لپیٹ کر گھوڑے پر ڈال کر اپنے محل میں لے آئے۔　　(باقی آئندہ)

؟

از جناب تاباں قائم گنجوی

جب سکوت شام میں ایک نغمگی سی پاؤ گی
بے کہاں پیدا کرے گی جب فضا میں ارتعاش
جھوم کر چھا جائیگی ساون کی جب کالی گھٹا
بے سبب پژمردہ، افسردہ رہو گی رات دن
ایک لذت سی ملے گی داستانِ ہجر میں
ہوک سی دل میں اٹھے گی سن کے کوئل کی صدا
دیکھ کر رنگ چمن دل کی کلی مرجھائے گی
جب کبھی بھولے سے دل میں یاد آئیگی مری
جب کسی اخبار میں دیکھو گی تاباں کی غزل

تم بھی اپنی زندگی میں کچھ کمی سی پاؤ گی
زندگی کے ساز میں اک برہمی سی پاؤ گی
ان حسیں آنکھوں میں بے وجہ نمی سی پاؤ گی
بے وجہ دلچسپیوں میں تم کمی سی پاؤ گی
غم کے افسانوں میں طرفہ دلکشی سی پاؤ گی
میٹھے نغموں میں بھی غم کی چاشنی سی پاؤ گی
تم بہاروں میں بھی اک افسردگی سی پاؤ گی
گرم پیشانی پہ تم کچھ کچھ نمی سی پاؤ گی
آنکھ میں آنسو مگر دل میں خوشی سی پاؤ گی

نغمۂ بہار

از حضرت جلال ملیح آبادی

نذرِ مینا

رنگین شفق کی دنیا سے میں گیت سناتی آتی ہوں...
جب چاندکی کرنیں گردوں سے سونے کے ورق برساتی ہیں
افشاں سی چھڑکتی آتی ہوں کلیوں کے سبک رخساروں پر
گھبرا کے جنوں کے قدموں پر خورشید خرد جھک جاتی ہے
مخمور ہوائیں ہوتی ہیں سرشار فضائیں ہوتی ہیں
رنگین فضا سے نغموں کے چشمے سے ابلنے لگتے ہیں
گلشن میں مچلتے ہیں دلبر، سبزے پہ کھنکتے ہیں ساغر
غنچے بھی چٹکنے لگتے ہیں، کانٹے بھی جھکنے لگتے ہیں
ہر آں دریچے جنت کے آغوش میں کھلتے رہتے ہیں
ہر عارضِ گل پر ذرہ میں مہتاب دمکنے لگتے ہیں
ناہید کے خیرہ نغموں سے میں کسب طرب فرماتی ہوں
رومانِ فرا برساتوں میں ہر لمحہ کھنکنے لگتا ہے
بے دھرم برہمن ہوتا ہے اور شیخ بھی مذہب کھوتا ہے

کلیوں کو کھلاتی آتی ہوں پھولوں کو ہنساتی آتی ہوں
یوں چرخ پہ رنگیں تاروں کا اک جال بچھاتی آتی ہوں
بے رنگ افق کے ماتھے پر قشقہ سا لگاتی آتی ہوں
مستانہ جوانی کا پرچم گردوں سے اڑاتی آتی ہوں
یوں گیت سناتی آتی ہوں یوں مست بناتی آتی ہوں
یوں چھاؤں میں رنگیں تاروں کی میں ساز بجاتی آتی ہوں
فکروں کی ستائی دنیا پر یوں رنگ جماتی آتی ہوں
دامانِ چمن میں پھولوں کے انبار لگاتی آتی ہوں
ہر دل میں محبت کی گویا شمعیں سی جلاتی آتی ہوں
یوں زہرہ جبینوں کے رخ پر کلیاں سی کھلاتی آتی ہوں
بادل کی گرج میں بوندوں کی چھاگل سی بجاتی آتی ہوں
ساون کی اندھیری راتوں میں بربط سا بجاتی آتی ہوں
مندر میں اذانیں مسجد میں ناقوس بجاتی آتی ہوں

ہے خاک مگر اتراتا ہے اپنی کو خدا کہلاتا ہے
یوں خاک کو میں اک شاعر کی اکسیر بناتی آتی ہوں

شہرت کا عام دربار

از جناب سراج احمد صاحب علوی

کل رات بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ بیسیوں پہلو بدلے، جتنی خواب آور دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں، مگر نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ آخر جب تھک گیا اور کوئی تدبیر سونے کی کارگر نہ ہوئی تو کتاب دیکھنے کی ٹھانی، کچھ تو اس خیال سے کہ بیکار پڑے رہنے سے کیا فائدہ، اور کچھ اس خیال سے کہ حکیموں نے مطالعۂ کتب کو خواب آور کہا ہے۔ سرہانے کی الماری سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب نکالی، اور پاس ہی رکھے ہوئے برقی لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ کتاب پر نظر پڑی تو آزاد کی نیرنگ خیال اور صفحہ جو کھولا تو وہ جہاں آزاد اپنے استاد ذوق کے لئے بقائے دوام کے دربار میں کرسی ڈھونڈ رہے تھے۔ میں بھی تماشا دیکھنے لگا۔ بقائے دوام کے دربار میں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، اور آزاد انھیں قرینے سے بٹھا رہے تھے آخر وہ وقت آیا کہ خیمہ مستحقین سے بھر گیا اور پچھلی صف میں دو ایک کرسیاں خالی رہ گئیں، کچھ لوگوں نے آزاد کی محنت کے صلہ میں انھیں بھی ایک کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن فوراً اعتراضات شروع ہو گئے کسی نے کہا کہ اس نے "ایک عالم سے لڑائی مول لے رکھی ہے" کسی نے کہا کہ "ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے" وغیرہ وغیرہ، غرض اس ہڑبونگ میں آزاد کھسک گئے، کچھ دیر کے بعد ذرا جب سکون ہوا اور میں نے بقائے دوام کے دربار کی طرف نگاہ اٹھائی تو نہ وہ خیمہ تھا، نہ وہ شہنائی کی آواز تھی، اس کی جگہ ایک بڑا وسیع پنڈال برقی قمقموں اور کاغذی جھنڈیوں سے آراستہ نظر آیا۔ پنڈال کے قریب ہی ایک جھیل تھی جس میں کچھ کشتیاں پڑی ہوئی تھیں، اور ان پر سے بینڈ کی آواز آ رہی تھی، پنڈال کے دروازے پر برقی قمقموں سے "خوش آمدید" بنا ہوا لگا تھا اور کچھ حضرات مغربی لباس پہنے آنے والوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے کھڑے تھے، لیکن یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ ہر آنے والے سے اندر جانے کے لئے دعوت نامہ طلب کیا جاتا ہے اور جس شخص کے پاس کارڈ موجود نہیں ہوتا اس کی جیب کی تلاشی لی جاتی ہے اگر کچھ مال قابل قدر مل گیا تو انھیں بھی ٹکٹ دے دیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص پنڈال میں داخل ہوتا ہے تو اس کا نام بذریعہ لاؤڈ اسپیکر مع اس کے چند کارناموں کے سنا دیا جاتا ہے اور وہ شخص اپنا ٹکٹ لئے لال قالین سے ڈھکے ہوئے راستہ سے شہ نشین تک جاتا ہے اور صدر کو انگریزی طریقے سے سلام کرتا ہوا شہ نشین کے دائیں یا بائیں جانب سے نکلتا ہوا مقررہ جگہ پر جو اس کے ٹکٹ میں لکھ دی جاتی ہے آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

مجھے یہ حیرت ہوئی کہ آخر یہ کہاں کا دربار ہے جو اس قسم کی نوکھی پابندیاں عاید ہیں، پنڈال کے دروازے کو پھر غور سے دیکھا تو سائن بورڈ میں وہی بقائے دوام "شہرت عام کا دربار" جگمگا رہا تھا۔ دروازے پر جانے کی تو ہمت نہ پڑی کیونکہ نہ تو دعوت نامہ پاس تھا اور نہ جیب میں پیسے، البتہ ایک جگہ پنڈال کی قنات ذرا سی کھلی تھی اور روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں ادھر چلا گیا اور اندر جھانکنے لگا، دیکھتا کیا ہوں کہ شہ نشین پر بڑا لانبا چوڑا ایرانی قالین بچھا ہوا ہے اس پر نہایت اعلیٰ درجہ کی مسند بچھی ہوئی ہے۔ جس پر کمخواب کا مسند پوش پڑا ہوا ہے اور اس کے تین کونوں پر "بقائے دوام، شہرت عام اور محنت کا انجام" کڑھا ہوا تھا۔ چوتھا کونہ چونکہ نظر سے غائب تھا اس لئے پڑھا نہ جا سکا۔ مسند پر ایک

چھوڑ ۔ ۔۔۔ رکھا ہوا تھا۔ میز کے قریب ایک گنگا جمنی کٹ دار کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کرسی پر جو شخص متمکن ہے وہ آزاد کی تخیل کردہ شہر ۔ ۔ ۔ [illegible] ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ دیواروں پر نہایت خوبصورت شیشے کی الماریاں تھیں جن میں سرخ چمڑے کی بنی ہوئی جلدیں تھیں جن پر سنہرے حروف میں کتابوں کے نام نقش تھے۔ ۔ ۔ سے چھپی ہوئی تھیں۔ مگر حاضرین جلسہ کی طرف جو نگاہ اٹھائی تو جتنے لوگ دو رویہ کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ سب قریب قریب وہی تھے جنھیں میں کچھ منٹ پہلے آزاد کے دربار میں دیکھ چکا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ یہ تمام لوگ نیم مغربی لباس میں تھے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کے سامنے ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر تواضع کے لئے سگریٹ، سگار، دیاسلائی اور خاکستر دان رکھے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں یہ معاملہ کچھ نہ آیا پنڈال کے اندر بیٹھنے والوں میں وہی آبرو فیضی اور وہی ذوق و غالب سب موجود تھے لیکن دربار کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے میں ذرا دیر کے لئے وہاں سے ہٹ آیا لیکن ۔ ۔ ۔ [illegible] اور شخص جسے میری طرح دربار میں جانے کی صورت نظر آتی ہو یہاں قبضہ کر لے قنات درست کر دی تاکہ روشنی چھن کر باہر نہ آئے اور خود پنڈال کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ ممکن ہے کوئی ایسا ہی آدمی مل جائے جس سے یہاں کے حالات معلوم ہو سکیں۔ بڑی دیر تک گھومتا رہا لیکن کوئی ایسا نہ ملا جس سے کچھ حال معلوم ہوتا۔ ہر شخص بیحد مصروف نظر آتا تھا۔ قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ پنڈال کے اندر جانے کے منتظر ہیں کچھ ایسے ہیں جن کے پاس ٹکٹ موجود ہیں مگر ان کا نمبر ابھی نہیں آیا ہے اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کے پاس ٹکٹ نہیں ہے وہ اس کے حاصل کرنے کے انتظام میں ہیں اور اندر بیٹھنے والوں سے ملنے کا طریقہ سوچ رہے ہیں۔ غرض عجب نفسی نفسی کا عالم ہے۔ میں نے کئی آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کرنا چاہا مگر کسی نے نہ سنی۔ آخر ہار کر میں دروازے کی طرف چلا۔ ایک صاحب نے جو اتفاق سے میری طرف منہ کئے سگار سے دھواں نکال رہے تھے، مجھے غور سے دیکھا۔ مجھے شاید خیال گزرا کہ میری پریشان حالی جاذب توجہ ہوئی۔ میں نے مغربی طریقہ سے سلام کیا اور فوراً ان سے قریب ہو گیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیکر کہا۔ ابھی انٹرول (وقفہ) ہے ذرا ٹھہر کر اندر جائیے گا۔ مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں اندر جانے والوں میں نہیں ہوں بلکہ ایک نووارد ہوں اور صرف اس جلسے کا سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے بتایا کہ یہ دربار عموماً سالہا سال کے بعد منعقد ہوتا ہے۔ لیکن اب کی یہ اس وجہ سے وقت سے پہلے منعقد ہو رہا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنھیں شہرت دوام کی سند حاصل ہونا چاہئے تھی مہتمم دربار (رجسٹرار) کی غفلت اور ذاتی اغراض کی بناپر نہ مل سکی۔ اور بیچارے کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ میرے استفسار پر اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لوگ جو دروازے پر کھڑے ہیں موجودہ دور کے نقاد ہیں اور مغربی اصول تنقید سے واقف ہیں اور بقائے دوام کے دربار میں جانے کی اسی کو اجازت دیتے ہیں جو ان کے معیار پر صحیح اترتا ہے۔ اس نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ جتنے لوگ تم کو نظر آ رہے ہیں وہ ہیں جنکو اس سے قبل کے دربار میں سند مل چکی تھی۔ مگر ان نقادوں نے زبردستی ان کی جانچ پرتال کر کے ان سندوں کی تصدیق مزید کر کے دعوت ناموں کے ساتھ انھیں شریک مجلس کیا ہے۔ جو نئے آنے والے ہیں ان کی البتہ خوب جانچ کی جاتی ہے تب کہیں ان کو اجازت دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے درجے بھی مقرر کر دئیے جاتے ہیں۔ لیکن اندر پہنچنے پر اصحاب کے ذریعہ درجے بدل بھی جاتے ہیں۔

میں نے "فرشتہ امداد" کا شکریہ ادا کیا اور پھر گھومتا ہوا قنات کے پاس آ گیا اور آہستہ سے قنات کھسکا دی۔ چونکہ جلسے کی پوری کارروائی دیکھنے کا ارادہ تھا اس لئے جیب سے رومال نکال کر گھاس پر بچھا دیا۔ اور بیٹھ کر

بیٹھ گیا۔ چند ہی سکنڈ کے بعد لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی "ویلیٹ مرثیہ کا تاجدار انیس" ساتھ ہی میر انیس مراثی کی تین ضخیم جلدیں نظامی پریس کی چھپی ہوئی بغل میں دبائے نہایت متانت کے ساتھ صدر کی جانب بڑھے اور بادب سلام کر کے کتابیں پیش گزرانیں۔ صدر نے مسکراتے ہوئے انیس کا خیر مقدم کیا۔ فضا تالیوں سے گونجی اور انیس، غالب، ذوق اور مومن کے بالمقابل جاکر بیٹھ گئے۔ تالیوں کی گونج کم ہوئی تو داغ دہلوی کی آمد کا اعلان ہوا۔ ان کا نام سنتے ہی ذوق کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر غالب۔ مومن اور میر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، مگر بولا کوئی نہیں۔ صرف ایک آواز ایک کونے سے سنائی دی "یہ تو ارباب نشاط کے شاعر ہیں۔ یہاں کیوں؟" دوسری آواز آئی "ہاں ہاں! اجیر دولہ شہریار دکن کے اُستاد ہیں آنے دو۔" جس پر ذوق اور ظفر نے ان کی سفارش کی کہ جرأت کے انداز کے واحد نمائندے ہیں انھیں ضرور جگہ ملنا چاہئے۔ صدر نے تسلیم کیا۔ داغ حیدرآبادی لباس میں آگے بڑھے چند چھوٹے بڑے مجلے پیش کر کے جلدی سے ذوق کے پیچھے بیٹھ گئے۔ اب امیر مینائی کی باری آئی۔ کسی نے کہا کہ داغ کی صحبت نے ان کو بھی خراب کیا مگر جب انھوں نے اپنے ناتمام لغت کے اجزا دکھائے تو انھیں بھی داغ کے پہلو بہ پہلو جگہ مل گئی۔ امیر مینائی نے بیٹھتے ہی صدر سے یہ درخواست کی کہ باہر مشہور مداح پیمبر محسن کاکوروی موجود ہیں۔ جنھیں دربان داخل نہیں ہونے دیتے ہیں۔ انھیں بھی اندر آنے کی اجازت دی جائے، نعت میں ان کی مثال ناپید ہے۔ صدر نے حاضرین سے رائے لی سب نے امیر کی تصدیق کی۔ اور محسن مدحیہ مثنویوں اور چیستانوں کا مجموعہ لئے داخل ہوئے اور صدر کو کتاب نذر کر کے امیر مینائی کے پاس بیٹھ گئے۔

دفعتاً باہر ایک شور ہوا، معلوم ہوا کہ نثر اردو کے بابا آدم (بقول حالی) سر سید احمد خاں تشریف لائے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کے دوست چراغ علی، محسن الملک، وقار الملک، [illegible] انھیں پہچان نہ سکے

مگر سر سید تنہا آنا چاہتے ہیں۔ اور انھیں سے ملنا چاہتے تھے۔ بڑی رد و کد کے بعد صدر نے انھیں بھی اجازت دی۔ سر سید داخل ہوئے۔ کتابوں کے بوجھ سے دبے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ چل کر صدر کی میز پر پلندا پیش کیا جس میں آثار الصنادید، تفسیر قرآن، اسباب بغاوت ہند اور تہذیب الاخلاق کے پرچے اور خطبات احمدیہ وغیرہ شامل تھیں، ڈھیر کر دیا۔ فضا پھر تالیوں سے گونجی اور سر سید غالب کے بائیں بازو پر آکر بیٹھ گئے اور بقیہ لوگ سر سید کی پیچھے والی صف میں جاکر بیٹھ گئے۔ ان کی طرف سے جو نظر پھری تو ڈاکٹر نذیر احمد سر پر قرآن شریف مترجم رکھے اور اسی بغل میں مذہبی ناول دبائے جلدی جلدی قدم اٹھاتے مسند نشین کے قریب آئے۔ آپ کا تعارف یہ کرایا گیا کہ آپ تعلیم نسواں کے حامیوں میں ہیں اور مشرقی اور مغربی معاشرتوں کے نقاد ہیں۔ امہات الامۃ کے متعلق کچھ کانا پھوسی بعض لوگوں میں ہوئی لیکن صدر تک بات نہیں پہنچی، چنانچہ آپ کو سر سید کی پشت پر جگہ مل گئی۔

پھر پنڈال میں ایک زور کا دھکا لگا۔ ساتھ ہی زنجیروں کے بجنے کی آواز آئی۔ اور لاؤڈ اسپیکر یہ کہتا ہوا سنائی دیا "ایک دیوانہ پیروں میں زنجیریں پہنے بہت سی کتابوں کے مسودے جن میں کچھ مکمل اور کچھ نامکمل ہیں۔ ہاتھوں میں لئے زبردستی داخل ہونا چاہتا ہے منجملہ اور دعوؤں کے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ پچھلی مرتبہ بقائے دوام کا مہتمم وہی تھا۔ اور اپنا نام آزاد بتاتا ہے" آزاد کا نام سنتے ہی اس سے قبل کہ صدر کچھ کہے اکبر بادشاہ نے اٹھ کر شاہانہ انداز میں سفارش کی کہ اس نے میرے ان کارناموں کو زندہ کیا جو تین صدیوں کی مدت نے دلوں سے محو کر دیا تھا۔ اس کو ضرور جگہ ملنی چاہئے۔ دیکھا دیکھی ابو الفضل نے بھی زبان کھولی کہ اگرچہ اس نے میری آئین اکبری تو ذرا مردہ کر کے دربار اکبری میں پیش کی ہے۔ لیکن چونکہ میرے ولی نعمت کا نام پھر زندہ کیا ہے لہٰذا میں بھی سفارش کرتا ہوں۔ اب ذوق کی باری آئی جنھوں نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ لیکن ظفر نے اٹھ کر

کہا کہ وہ اس قابل نہیں کہ اس دربار میں جگہ پائے۔ اس نے مجھ پر تہمت تراشی۔ اس نے میری عمر بھر کی کمائی اُستاد ذوق کے حوالے کر دی۔ غالب اور مومن نے بھی اس کی تائید کی۔ لیکن آزاد نے جتنے شعر کو "آبِ حیات" پلا کر زندہ کیا تھا ان سب نے سفارش کی۔ آخر صدر نے یہ اجازت دی کہ وہ پابجولاں بلایا جائے اور کرسی پر اس طرح بٹھایا جائے کہ بھاگ کر ہنگامہ بپا کر سکے۔ آزاد کئی آدمیوں کی معیت میں داخل ہوئے۔ بہت اُچھلے کودے اور اپنی کل کائنات دو بغلی میز پر پٹخ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک زنجیر ان کی ذوق کے ہاتھ میں دے دی گئی اور ایک دوسری خالی کرسی میں باندھ دی گئی۔

اس سے فرصت ہوئی، تو حالی پانی پتی کی آمد کی خبر مشتہر ہوئی۔ ان کا نام سنتے ہی غالب اور سرسید مارے خوشی کے اپنی کرسیوں سے اُچھل پڑے اور ذوق و آزاد نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ حالی نہایت خاموشی سے داخل ہوئے۔ چہرے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہری فکر میں ہیں۔ وہ نیچی نظریں کئے ہوئے سیدھے صدر کی طرف گئے۔ مسدس حالی، یادگار غالب، حیات جاوید، مقدمہ شعر و شاعری نذر کئے۔ واپس ہوئے اور غالب اور سرسید کو نہایت ادب سے سلام کیا۔ سرسید نے جھپٹ کر چمٹا لیا اور اپنی کرسی کے برابر والی کرسی پر بٹھا دیا۔

اب علامہ شبلی نعمانی کی آمد کا شور ہوا۔ شبلی کا نام سنتے ہی جتنے ایرانی اور ہندوستانی درباری بیٹھے تھے سب شگفتہ ہو گئے۔ البتہ ذوق اور آزاد کے چہرے اُتر گئے۔ سب نے شبلی زندہ باد کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کیا۔ شبلی بیباکی کی حد سے آگے بڑھے۔ سینہ پر جبہ و تمغہ لگائے، کتابوں کا تھیلا پشت پر۔ ابھی صدر کی نشست تک نہ پہنچ پائے تھے کہ حضرت اورنگ زیب نے بڑھ کر لپٹا لیا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور کچھ دعائیں پڑھ کر دم کیں۔ صدر نے بھی ہاتھ کی حرکت سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور ان کی کتابوں کا پارسل نہایت احترام سے دونوں ہاتھوں سے لے کر اپنی میز کی داہنی جانب رکھ لیا۔ ہر شخص شبلی سے مصافحہ کرنے کے لئے بیقرار تھا۔ شبلی فرداً فرداً ہر شخص سے مصافحہ کرنے کے بعد بہت دیر کے بعد سرسید کے قریب حالی کے مخالف سمت بیٹھ گئے۔ بہت دیر کے بعد جا کر کہیں سکون ہوا۔

ان کے بعد شرر کی باری آئی۔ ان کے آنے پر بھلا کس کو اعتراض ہوتا۔ وہ آئے اور اس شان سے کہ ناولوں کا پلندہ ایک کندھے پر، دلگداز کے پرچے دوسرے ہاتھ میں۔ کتب تاریخی بغل میں لئے۔ ایک ہاتھ میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھامے، مغربی لباس زیب تن اور اس پر ایک بھری سفید ڈاڑھی۔ نہایت مہذب صورت بنائے آہستہ آہستہ آ رہے تھے کہ کسی نے ٹوکا آپ اہل بیت پر اتہام لگاتے۔ ایک آواز آئی آپ پردہ شکن بھی ہیں۔ مگر کسی نے اٹھنے لیا۔ ابتداءً شرر کو پٹ کا پلوٹ دے کر کسی بہتر جگہ کی تلاش تھی۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ حالی نے اشارے سے بلایا اور وہیں جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی قہقہوں کی آواز آئی اور منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کا نام پکارا گیا۔ حالی اور شرر دونوں کے چہرے سجاد حسین کا نام سنتے ہی اُتر گئے اور کرسیوں پر جنبش کرنے لگے۔ آزاد بھی کسمسائے، کچھ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ کچھ مارے تہذیب کے ہونٹ چبا کر ہنسی روک رہے تھے، ادھر سجاد حسین ایک ہاتھ میں حاجی بغلول کا کارنامہ لئے اور بغل میں اودھ پنچ کے پرچے دبائے داخل ہوئے کہ پورا پنڈال قہقہستان بن گیا۔ حتی کہ صدر کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسم کھیلنے لگا۔ سجاد حسین نے آگے بڑھ کر حاجی بغلول کا صدر سے تعارف کرایا۔ پھر اودھ پنچ کے ناموں سے میز پاٹ دی۔ واپس لوٹے تو کوئی جگہ پسند نہ آئی اور کرسی گھسیٹ سب سے الگ صدر کے چبوترے کے قریب نیچے بیٹھ گئے۔ سجاد حسین کے بیٹھتے ہی سرشار قہقہوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ سیر کہسار، فسانۂ آزاد کی بڑی بڑی دفتی جلدیں بغل میں، کہہ کے سجاد حسین سے ہاتھ ملا پیچھے دبکے

بیٹھ گئے۔

سرشار کے بیٹھتے ہی ایک بیک لڑکوں کا شور و غل سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ مدرسوں کے بچے بچیاں زبردستی اسمٰعیل میرٹھی کو پکڑ لائے ہیں وہ لاکھ دامن چھڑا کر بھاگتے ہیں لیکن لڑکے انھیں جانے نہیں دیتے اور صدر سے درخواست ہے کہ انھیں بھی ان کا نمائندہ سمجھ کر داخل کر لیا جائے۔ صدر نے فوراً طلب کی۔ شیخ سعدی نے فوراً بچوں کی تائید کی۔ اسمٰعیل آئے اور اپنا کلیات نذر کر کے سعدی سے بپاسِ ادب ذرا پیچھے ہٹ کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔

اسمٰعیل کے بیٹھتے ہی پھر زور کا قہقہہ پڑا۔ معلوم ہوا کہ حضرت اکبر الہ آبادی کے داخلے کا پیش خیمہ ہے۔ کلیات کی تین جلدیں بغل میں لیے ایک ہاتھ میں تسبیح لئے داخل ہوئے اور شہ نشین تک پہنچتے پہنچتے شبلی، سرسید، حالی اور نذیر سب ہی سے ٹھٹھے لیتے ہوئے آئے۔ البتہ سجاد حسین کو دُور سے تپاک سے سلام کیا اور انھیں کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے اچھوت اور دیہاتی جیکارے لگاتے چلے آ رہے ہیں۔ دروازے کے قریب یہ شور رکا اور اعلان کیا گیا کہ منشی پریم چند دیہاتی اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے نمائندے بن کر آئے ہیں اور داخلِ دربار ہونا چاہتے ہیں۔ سب کو شوق ہوا کہ ان کی زیارت کریں۔ چنانچہ صدر کے ایما سے وہ بلائے گئے۔ منشی جی سوٹ میں ملبوس فلٹ ہیٹ پر دھرے مختصر افسانے اور "میدان عمل" کے خوبصورت کتابچے لئے ڈائس تک پہنچے۔ دیوی کو نمسکار کر کے اپنی محنت کی بھینٹ چڑھائی۔ شہرت کا خلعت ملا۔ واپس ہوئے اور نذیر سے ذرا پیچھے کرسی سرکا کر بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے آغا حشر کاشمیری اپنے ڈرامے لے کر داخل ہوئے۔ کالی داس نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ شرر، پریم چند اور سجاد حسین نے بھی مبارکباد دی۔ صدر کو نذرانے نذر کر کے کالیداس کے پاس برابر بیٹھ گئے۔

اتنے میں ایک نحیف و نزار زرد رنگ پست قد سیاہ فام چار موٹی موٹی بڑی ضخامت کی جلدیں، رعشہ دار ہاتھوں میں سنبھالے ڈگمگاتے ہوئے آتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ مولوی نورالحسن نیر مؤلف نوراللغات ہیں۔ میر حسن نے سہارا دے کر ڈائس تک پہنچایا۔ محسن نے اٹھ کر پیشانی کو بوسہ دیا۔ ان کی محنت نظر احسان سے دیکھی گئی اور انھیں میر حسن کے پاس ہی جگہ مل گئی۔

ایک بار پھر شور ہوا کہ بیگ ... نظیر داخلِ مجلس ہونا چاہتے ہیں اور وہ شخص محمود اکبرآبادی اور نیاز فتحپوری کی سفارش سے ... کرتے ہیں اور کچھ سفینۂ ... مغربی لوگ بھی ان کے ہم زبان ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ گزشتہ دربار میں حشم نے قصداً ان سے چشم پوشی کی۔ صدر نے آزاد کی طرف دیکھا۔ آزاد نے شرم سے گردن جھکائی۔ طلبی ہوئی۔ اس شان سے داخل ہوئے ... میں مرگ چھالا اور ہاتھ میں عصائے فقیری لئے کھڑاؤں پہنے۔ مسکراتے ہوئے صدر کے قریب پہنچے۔ ترقی عمر کی ... دیگر مرگ چھالے سے کلیات نظیر اکبرآبادی نکال اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور میر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ نظیر کو بھی دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوئے۔ لیکن کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

لوگ ابھی ان کے دیکھنے ہی میں مصروف تھے کہ شاعر مشرق کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ پوری مجلس ... پردہ اٹھا اور "شاعر مشرق" علامہ اقبال، پیام مشرق، بانگِ درا، زبور عجم، ضرب کلیم اور جاوید نامہ کے دیدہ زیب ایڈیشن لئے چہرے سے عمل، آزادی اور زیست کے آثار ہویدا، نہایت تمکنت سے بڑھے۔ پورے ... نے کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا۔ چھت سے پھولوں اور پنکھڑیوں کی بارش ہونے لگی۔ سعدی، حافظ، خاقانی، فیضی، عرفی، ... اور غالب نے ہاتھوں ہاتھ صدر تک پہنچا دیا۔ ادب کی دیوی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ... زندۂ جاوید شاعر کے الہامات لے کر سامنے رکھ لئے۔ اقبال پیچھے ہٹے۔ حافظ، سعدی اور فیضی نے اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنی صف کے آگے ایک کرسی بچھا کر اس پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ایک پیر مرد ایک ہاتھ میں ... کا ... دوسرے میں بڑی چھوٹی چند کتابیں لئے سوگوار صورت

بناوٹ آتے دکھائی دیئے غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک شکستہ کمری والا بوڑھا
عورت ہے۔ دنیا کے بڑے ہمدردوں میں پیدا ہوا صدر کو بھی ان سے دلچسپی ہوئی
نذر پیش کر کے شریک ہو کر بیٹھ گیا۔

ابھی کوئی اور نہ آنے پایا تھا کہ صدر نے اپنی نرم آواز میں کہا
کہ ایک ادب کا پیاسا اگرچہ ابھی اس کی اہمیت نہیں رکھتا کہ باقاعدہ
مجلس میں شامل ہو لیکن گذشتہ قربانیوں کے پاس بیٹھا جلسہ کی کارروائی
دیکھ رہا ہے اور اپنی ادب دوستی کا ثبوت دے رہا ہے۔ لہذا ہم
اسے بحیثیت مہمان کے شرکت مجلس کی دعوت دیتے ہیں۔ جو لوگ صدر
دروازے پر کھڑے ہیں اُسے جا کر لے آئیں۔ میں نے جو اپنی طلبی کی بھنک
پائی، جلدی سے کھڑا ہو گیا اتنے میں پیروں کی چاپ سنائی دی۔ تیزی سے
جو گھوما تو آنکھ کھل گئی۔ لیمپ جل رہا تھا۔ کتاب نیچے پڑی تھی۔

(رنگا۔)

نتیجۂ فکر جناب حکیم مجروح سلطانپوری

بچھڑے کچھ اس طرح سے وہ مجھ ناتواں سے رات | میں باز آ گیا غمِ عمرِ رواں سے رات

کرتے تھے ذکر میرا خود اپنی زباں سے رات | کچھ اُنس ہو گیا تھا مری داستاں سے رات

چاہوں تو ماہ و مہر بنا دوں جہان کو | جلوے سمیٹ لایا ہوں اک آستاں سے رات

تیرے خیال کی وہ سکوں آزما خلش | بیدار کر دیا مجھے خوابِ گراں سے رات

بدمستیوں میں سب کو بتاتے مقامِ ہوش | آوارہ واں بتائیں ہم آئے کہاں سے رات

تیری وہ گرم گرم نگاہیں کہ الاماں ....! | اک آہِ سرد اُٹھی لبِ کون و مکاں سے رات

اے کاش تجھ کو بھی ہو خبر بے نیازِ ہوش | کیونکر اُٹھا ہے کوئی ترے آستاں سے رات

مجروح اب جو بیت گئی ہے نہ پوچھیے | کتنا لپٹ کے رویا ہوں اک بدگماں سے رات

خاص

کیا انسان موت پر قابض نہیں ہو سکتا؟

از حضرت امام اکبرآبادی

انسان فی نفسہ شخصیت پرست توہم پرست ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ ہر وہ بات جو عقل و فہم سے باہر ہو، دیوانگی میں شمار کی جاتی ہے۔ حالانکہ ذہن و دماغ سے کوئی بات باہر نہیں، ایک بات جو ایک گنوار کے منہ سے نکلتی ہے۔ بڑے لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، پھر وہی بات جب ایک فلاسفر کی زبان سے ادا ہوتی ہے تو ذی علم و ذی مرتبت لوگ گردنیں جھکا لیتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ دنیا بات کہنے والے کو دیکھتی ہے، بات کو نہیں دیکھتی۔

اکثر مذہبی دیوانے کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ ہندو بھی اپنے بعض اوتاروں کے متعلق یہی کہتے ہیں اور مسلمانوں میں بھی بعض لوگ اس عقیدے کے پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ مُردوں کے وہ زندہ کرنیوالے کہاں گئے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ وہ تو زندہ ہیں بلکہ زندوں سے زیادہ زندہ۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال احترام و تقدس اور عقیدت کی بنا پر ہے ایسی عقیدت جس کے زعم باطل کے اندر یقین بھی گم ہو جاتا ہے کہ خدا کا قانون بدل نہیں سکتا لیکن جب یہی بات کوئی معمولی آدمی کہتا ہے کہ انسان کو موت نہیں آ سکتی یعنی موت کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے تو مذہبی گروہ اس کو چیر پھاڑ دینا چاہتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ خیال کفر میں داخل ہے۔

انسان جب بیمار ہوتا ہے تو اس کا علاج صرف دو وجوہ کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کو تکلیف سے بچایا جائے اور دوسرے یہ کہ موت نہ آنے پائے۔ سل دق، ہیضہ، نمونیہ، طاعون، ٹائیفائیڈ فیور، اور ٹیٹنس یعنی کزاز، نیز اسی قبیل کی دوسری خطرناک و مہلک بیماریوں کا علاج تو صرف اسی لئے کیا جاتا ہے کہ مریض کو موت نہ آنے پائے۔ حالانکہ موت سے بچانے کا خیال قانونِ قدرت کو توڑنے کے خیال سے کم نہیں ہے۔ لیکن یہاں پہنچکر انسان سب کچھ بھول جاتا ہے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ فطرت کا قانون بدل نہیں سکتا۔ اور ہمارا فکر و دماغ یہ یقین کرتا ہے کہ موت کا قانون بڑا سخت ہے ایسا سخت و شدید جس میں تبدیلی ممکن نہیں ہے اور یہ کہ محدود زمانے سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اس لئے موت کا یقین، وہ بھی پختہ [illegible] ہے اور یہی وجہ ہے کہ [illegible] آگے قدم نہیں بڑھاتا اور یہ [illegible] اپنے تئیں مجبور سمجھتا ہے۔ حالانکہ فطرت کے دوسرے قوانین میں روزانہ دخل انداز ہوتا رہتا ہے، پر موت کے بارے میں اس کو تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا۔

قانون یہ ہے کہ ہر چیز انتقال کرتی ہے اور یہ انتقال ہر لمحہ ہوتا رہتا ہے، جسے ہم محسوس نہیں کر سکتے۔ اور نہ روک سکتے ہیں۔ لیکن انتقال کی صورت بدلی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے مضمون میں کہا جا چکا ہے کہ انتقال کا موجودہ طریقہ نہایت درجہ بھدا اور ظالمانہ ہے اور اس کو بدل کر کسی حسین ترین صورت میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ انسان کے ظاہری و باطنی حواس و جذبات حقیقی مسرت سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ایسا کرنے سے خدا کبھی ناراض و برہم نہیں ہو سکتا۔ اور کبھی شک و حسد نہیں کر سکتا وہ ایسے ملکوتی جذبات سے منزہ و پاک ہے۔ وہ ہمیں تعلیم دیتا ہے، غور و فکر، ارتقا اور ہمارے دماغ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ ارتقا زندگی کرتا ہے چنانچہ انسان زمین کے علاوہ ساری کائنات کا مطالعہ کرنے لگا ہے اور بہت سے راز و نیاز معلوم

کر چکا ہے ایسے راز جو اس سے قبل انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

پس موت بھی ایک راز ہے۔ ایک بھید ہے اور ایک معمہ ہے۔ اس کا حل تلاش کرنا نہ تو حماقت ہے، نہ آسمان کا ہے، نہ گناہ ہے اور نہ خدا کے کاموں میں دخل اندازی کے مرادف ہے۔ بلکہ اس عقدۂ لاینحل کے حل سے تو انسان خدا سے نزدیک تر ہو جائے گا۔

نپولین اعظم نے لفظ "ناممکن" کے متعلق کتنے وسیع و بلند خیال کا اظہار کیا تھا۔ ابن رشد نے کتنی عمیق اور گہری بات کہی کہ "زندگی سے کوئی ذرہ اور کوئی قطرہ خالی نہیں"۔

دنیا کے جن لوگوں نے ان باتوں پر غور کر کے عمل درآمد کیا وہ کامیاب ہوئے اور توہم پرست ناکامیاب۔ آج یورپ و امریکہ کی ترقی درحقیقت ابن رشد کے فلسفہ کی مرہون منت ہے۔ اور امریکہ کی تلاش بھی، لیکن ناممکن کہنے والے ان سے زیادہ آج بھی موجود ہیں۔

دنیا میں ہر زبان کے لٹریچر میں یہ قول پایا جاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ زمین کا خلیفہ ہے۔ اس کا درجہ فرشتوں سے بڑھا ہوا ہے۔ یہاں تک عرفی نے کہہ دیا کہ خدا کا مظہر ہے۔ خدا اس کی شہ رگ کے قریب ہے۔ اس کا دل خدا کا گھر ہے بلکہ یہ خود خدا ہے۔ خدا ہو جائے گا کہ

صورت انسان خدا را دیدہ

پس یہ یقینی ہے۔ قابل موت کے بعد یہ روح کی امر ہو گیا نہ رکھے اور تقش پیدا کرے کہ جس سے پیدا کئے جائیں ہر دنیئے رہ ذو [illegible] ذی شان لوگ جتنے پیر و بے شمار ہوئے ہیں، جن کے اشاروں پر دنیا رقص کرتی ہے۔ اور جو مکمل انسان تھے۔ جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی صورت میں خدا تھے۔ اور اس سے ان کے رعب جلال، شان و شوکت اور عزو جاہ سے مرعوب ہو کر ان کے عزیز اور معتبروں کو اپنے عالی شان القاب سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے زندہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کے۔ وقت وہ لیکن کیا ایسی شان والے موت کے اس بھیانک [illegible] طریقہ

سے زیادہ کے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ عقیدتاً تم کچھ بھی کہو اور کچھ بھی سمجھو، لیکن حقیقت وہی ہے جو اس سے پہلے مضمون میں اور اس میں بتائی گئی ہے۔ غالب نے خوب کہا ہے کہ :-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اپنی شوخیٔ تحریر سے کیا عمدہ نقش بنا دیا، کتنی حسین تصویر کھینچی، جو لافانی ہونا چاہیئے تھی۔ لیکن جسمانی لباس کاغذ کا تھا کہ جب چاہا آسانی سے پھاڑ ڈالا۔

پھر نوع ایک وقت آئے گا۔ جب دنیا میں امن قائم ہو گا اور ہر انسان اطمینان کا سانس لے گا۔ پھر حکمائے مسیح الزمان جمع ہو کر موت کے موجودہ مکروہ ترین طریقہ کو بدل کر کسی بہترین اور حسین و جمیل ترین صورت میں منتقل کرنے کی سعی بلیغ کریں گے۔

بھی آ جاؤں گی۔ اس نے چلتے ہوئے کہا۔ دو بجے پورے دو بجے پیچھے والے دروازہ
پر سے گذرنا ۔۔۔ اب جاؤ ۔۔۔ دعا کرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ عزیزہ وہ
دن میری زندگی میں سب سے زیادہ خوشی کا دن تھا۔ میں دوستوں سے خوب لپٹ لپٹ کے بے اختیار
ملا سب کو خوب کھلائے پلائے۔ خوب گلاس لنڈھائے۔ میں پاگل سا ہو گیا تھا
میرے ہر ایک دوست "مبارک ہو" اپنا تکیہ کلام بنائے ہوئے تھے آج کے
دن۔ فقیر نے مجھ سے سوال کیا اس کو خوش کر دیا۔ میرے دوست نے کہا۔
سب پیسے ختم کئے دیتے ہو کل ملو گے تو کیا خالی۔ اس کے لئے کچھ تحفہ بھی لیا۔
اب مجھ کو ہوش آیا۔ میرے پیسے سب ختم ہو چکے تھے۔ میں نے دوست سے
دس روپے قرض لئے۔ اس کے آویزے خریدنا چاہتے لیکن ان کی قیمت بہت
تھی، سیونگ بینک بند ہو چکا تھا۔ اس لئے مجھکو اپنی گھڑی بیچنا پڑی اُس
رات مجھ کو نیند نہ آئی۔ میں نے جس قدر خیال اس رات دوڑائے۔ ان کے کچھ
نہیں۔ کتنی بڑی رات تھی۔ اُف۔ اُف! اُس دن جتنی دیر میں گھڑی نے
دو بجائے کبھی نہیں بجائے۔ ہاں تو میں بھٹک رہا ہوں۔ ہاں تو عزیزہ!
دوسرے دن میں پورے دو بجے شیلا کے دروازے کے سامنے سے
گزرا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک سہیلی بھی تھی جس نے
اشارے سے کھڑے ہونے کو کہا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ شیلا نے سہیلی کے ہاتھ ایک
لفافہ بھیجا۔ میں نے وہ لفافہ لے لیا۔ اور آویزے اس کو دیدیئے کہ شیلا کو دیدے
اور قریب کے ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ بڑی بے تابی سے لفافہ کھولا۔ دیکھا تو اس
میں تھوڑا سا سیندور، چاول اور پیلا دھاگا تھا۔ میں نے بہت سوچا لیکن کچھ
سمجھ میں نہیں آیا۔ ۔۔ پھر اس طرف گیا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اور اب بغیر اسکول
کھلے اُس سے ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی۔ خدا خدا کر کے اسکول کھلا ۔ میں نے
شیلا کو ایک خط لکھ کر دیا جس میں لکھا تھا کہ میں تمہارے اس لفافہ والے قصہ
کو نہ سمجھ سکا۔ مجھ کو ایک ضروری بات پوچھنا ہے۔ اس لئے کوئی آدھ گھنٹہ ملنے
کی صورت نکالو ورنہ میں بہت جلد اپنے کو ختم کر دوں گا اس دنیا سے بہت
دور چلا جاؤں گا۔ اس کے جواب میں شیلا نے لکھا۔ بھیا ایسا نہ کہو۔
ایشور کے لئے ایسا نہ کرنا۔ ملنے کی ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ اسکول اور ہمارے
گھر کے راستے میں راستہ سے کچھ ہٹ کر کوئی گھر ہو تو مل سکتے تھے۔ اور اگر لفافہ
کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ تو آویزے کیوں دیئے؟ میں یہ لفافہ والی بات تو اب بھی
نہ سمجھا لیکن اس گھر اور ملنے والی ترکیب پر ضرور اُچھل پڑا۔ بڑی اچھی ترکیب تھی
میں نے اسی دن اسی سڑک کے پاس ایک گھر لے لیا۔ اب شیلا اور اس کی سہیلیاں
برابر آیا کرتیں ۔ رتنا بھیا کے سوا بات نہ کرتی۔ اور شانتی دوست بنانا
چاہتی تھی۔ سروپ اور کملا بھاگ چلنے پر راضی تھیں۔ دمینتی مجھ سے ملنے ہی
کے خلاف تھی اور صرف اس لئے کہ میرا اس کا دھرم ایک نہ تھا۔ میری عقل کام نہ
کرتی کہ میں کیا کروں۔ اسی طرح کوئی تین ہفتے گذرے ہوں گے کہ ایک دن شیلا
اکیلی ہی آ گئی۔ کچھ اُداس سی تھی۔ میں نے اُداسی کا سبب پوچھا تو اس نے کہا بھیا
دمینتی تمہارے بہت خلاف ہے، کملا اور سروپ طرفدار بنی ہوئی اس سے
ڈرتی ہیں، شانتی آج اسکول ہی نہیں آئی تھی ورنہ وہ بات بڑھنے نہ دیتی۔ دمینتی
منہ پھلائے اکیلی آئی ہے۔ اور وہ دونوں پہلے ہی چھٹی لے کر چلی گئیں۔ بھگوان
جانے کیا ہوگا۔ میں صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ ان کے سامنے مجھ سے بات نہ کرنا
میں اکیلی ہی ملا کروں گی۔ رام جانے کیا ہوگا مجھ کو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے اس
کا غم اور فکر غلط کرنے کو دلاسا دیتے ہوئے پوچھا ۔ شیلا اس دن جو لفافہ تم
نے دیا تھا اس میں سیندور، چاول اور دھاگا وغیرہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ اس کو
میں سمجھ نہ سکا۔ اور اگر وہ کوئی جادو ٹونا تھا تو اس کی کیا ضرورت تھی میں تو
ویسے ہی تمہارا پجاری ہوں آج بتلا دو شیلا۔ وہ مسکرائی مگر اس کی آنکھوں
میں غم کے دو شاہکار لرزنے لگے۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا کہ تم نے بھی تو اس کے
جواب میں آویزے دیئے تھے۔ اور وہ رونے لگی اس کے لب کانپ رہے تھے
اس کی آنکھوں میں میں نے پہلی مرتبہ آنسو دیکھے ہیں۔ میں بیتاب سا ہو گیا وہ
بڑبڑانے لگی۔ اس دن بھیا دوج تھی اور تم میرے بھائی ہو۔ تم میرے
بھائی کی جگہ ہو۔ اور خیر یہ تو بالکل دوسری بات ہے لیکن بھگوان نے ایک
سال ہوا میرا بھائی چھین لیا۔ اور دوسرے بھی ہو گیا۔ وہ نہ اس سال میں ٹیکا کر کے

نکلی۔ میں اس کی دلی چیخیں اس کی دبی ہوئی آواز میں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے
میرا دامن بھی بھیگ رہا تھا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور کہا بھیا تم کیوں روتے ہو، تمہاری بہن تو تمہارے
چرنوں میں ہے، اور میرے پاؤں میں گر پڑی۔ میں نے اس کو فوراً اٹھا لیا
اس کے ماتھے پر بوسہ دیا، اور اس گھڑی سے اس کو سچے دل سے بہن سمجھنے لگا
وہ مجھ سے ملتی رہتی۔ دیوالی میں میرے لئے مٹھائی لاتی، اور عید میں میرے
ساتھ ہی سوئیاں کھاتی۔ وہ میری بہن تھی۔ اور اس طرح کم و بیش دو سال
گذر گئے، لیکن آہ! میرے دوست اس کو میری بہن اب بھی نہ سمجھتے تھے
اور یہی وجہ تھی کہ میرا پیارا لیکن بدگمان دوست مجھ سے لڑ لیا۔ اور عمر بھر
کے لئے چھوٹ گیا۔ کیونکہ شیلا بہن کے متعلق میں کچھ نہیں سن سکتا تھا۔ اس کے
اور میرے متعلق بدگمانی کو میں گالی سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ میری بہن تھی۔ عزیزہ
جب دوستوں ہی کا یہ حال تھا تو تم جانتی ہو کہ میں کس قدر بدنام ہوں گا۔
دشمنی کافی زہر اُگل چکی تھی ـــــ وہ شیلا ہی کو نہیں۔ بلکہ سروپ اور کملا کو بھی
بدنام کر رہی تھی۔ جن سے اب میرا اور کوئی بھی واسطہ نہ تھا۔ اور یہی باتیں
تھیں کہ شیلا سکول سے روک لی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ مجھ
سے کہتی کہ بھیا تم کہیں بھی ہو، مجھ کو اپنی شادی میں بلانا! میں کہتا پگلی تم کو نہیں بلاؤں گا
تو کس کو ـــــ ہاں تو عزیزہ۔ وہ سکول سے روک لی گئی اور کوئی بیس دن تک
میں نے اس کی صورت نہ دیکھی ـــــ میں اس گلی میں بھی نہ جا سکتا تھا۔ میں مجرم
تھا اور صرف اس لئے کہ ایک لڑکی کو بہن اور حقیقی بہن سمجھتا تھا۔ کئی دن سے
اُسے نہ دیکھا تھا۔ ایک روز میں بے اختیار چل پڑا۔ میں نے دور سے دیکھا
اس کے دروازے پر سواگتم (خوش آمدید) لکھا ہوا تھا۔ رنگ برنگ
کی جھنڈیاں باندھ رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ دوسرے دن شیلا
کا بیاہ تھا۔ اُف میرے دل پر کیا گذری۔ میں اپنی چھوٹی بہن کی اس خوشی میں
نہ شامل ہو سکا ـــــ اُف میں جھنڈیاں نہ بندھوا سکا۔ اُف میری بہن کی شادی
ہو گی اور میں شامل نہ ہو سکوں گا۔ اُف پھر بھی زمین آسمان قائم ہے۔

عزیزہ ـــــ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح شیلا بہن سے ملوں۔ لیکن کوئی
صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر دل نے یہ فیصلہ کیا کہ چوروں کی طرح جاؤں مجبور ہوں۔ ہمارا
ملوں کیونکہ سماج مجھ کو مجرم ہی قرار دیتا ہے۔ یہ تھی دل کی آواز۔ لہٰذا میں نے
بہن کو شادی کا تحفہ دینے کے لئے ایک بہت خوبصورت ہار خریدا
اور اسی طرح رات کو ایک بجے چوروں کی طرح اس کے گھر میں گیا
اس کو جگانا کام تھا! وہ ڈر سی گئی۔ وہ مجھ کو ایک دوسرے کمرے میں لے گئی
اور روتے ہوئے کہنے لگی بھیا تم کیوں نہیں آئے۔ بھیا میں نہ بلا سکی بھیا
کیا تم بھی اپنے بیاہ میں مجھ کو نہیں بلاؤ گے۔ بھیا یہ تم کو نہ لانا مجھ کو شاکر۔ ۔
بھیا اپنی چھوٹی بہن سے خفا نہ ہو جانا"۔ وہ رو رہی تھی اور میرے دل کے
ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے کو سنبھالا اور تسلی دی۔ کہا
شیلا تم اس کا بالکل خیال نہ کرو۔ دیکھو میں تم سے بہت خوش ہوں۔
لے ہی تو یہ ہار لایا ہوں۔ لو یہ اپنے بھائی کی طرف سے شادی کا تحفہ سمجھ کر اسکو
پہن لو۔ میں نے اسے ہار پہنا دیا۔ اس نے مجھے نمستے کہا۔ اور پھر روتے
ہوئے کہنے لگی۔ بھیا میں رات کو جب چاند دیکھتی ہوں تو اسکو دیکھتی ہی رہتی
ہوں کہ شاید تم بھی دیکھ رہے ہو گے ـــــ بھیا! یہ ہار تم ہی رکھو۔ مجھ
کبھی دے دو گے۔ کوئی دیکھے گا تو غضب کی آفت آ جائے گی ... دیکھ
کیا کیا کہتے ہیں۔ بھگوان ان کو سمجھے۔ ایکا ایک کسی نے ... دروازہ
کو چٹخا دیا۔ وہ گھبرا گئی ـــــ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا ... ہو گا
میں نے سنبھلتے ہوئے کہا میں جاتا ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ہاں ہاں جلدی
جاؤ، دعا کرو۔ اور اب کبھی ایسے مت آنا۔ اس نے کہا۔ پیچھے کوئی
بابوجی بابوجی باہر کے دروازے پر پکار رہا تھا۔ میں نے شیلا سے چلتے
ہوئے کہا شیلا تم سب لکھ کر رکھنا۔ کہ شادی کیسے ہوئی۔ گونا کب ہو گا
اور کہاں جاؤ گی وغیرہ۔ اور رات جب میں تمہاری دیوار کے نیچے سے
گذروں تو پھینک دینا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا اچھا۔ ... جلدی
کرو۔ کوئی جاگ جائے گا ـــــ میں فوراً وہاں سے فرار ہو گیا۔ چاند ... تھی

پچوں کا صفحہ

ڈھیلا اور پتا

از

ڈکھی پریم نگری

ونبھنی جمال، سرلا اور ونود تم لوگ ہمیشہ شکایت کرتے تھے کہ ماموں جان کبھی کہانی نہیں سناتے تو آج تمھیں ایک کہانی سنائیں اور پھر اس کہانی کو تمھارے پیارے رسالہ "تنویر" بمبئی میں کیوں نہ چھاپ دیں کہ تمھاری طرح اور بھی کہانی کے شوقین بچے اور بچیاں پڑھیں۔ کہو، آپ بیتی سنوگے یا جگ بیتی۔ ہم تو کہیں جگ بیتی ہی سنو، آپ بیتی سنوگے تو ناحق تمھیں بھی دکھ ہوگا۔ یوں تو تم نے آدمیوں اور جانوروں کی بہت سی کہانیاں سنی ہوں گی آج ہم تمھیں ایک مٹی کے ڈھیلے اور پیپل کے پتے کی کہانی سناتے ہیں۔ سنی سنائی کہانی ہے نہ سنی ہو تو سن لو اور سنی ہو تو غور کرو اور سمجھنے کی کوشش کرو، کیونکہ کہانی تو معمولی سی ہے مگر کہنے والے نے کہانی کی روپ میں کہی بڑے پتے کی بات ہے ہاں تو اب کہانی شروع ہوتی ہے۔ ایک تھا پیپل کا پتہ ہرا بھرا درخت کی ٹہنگی پر ہوا میں لہراتا ہوا۔ ہر طرح کا آرام تھا۔ سب سے اوپر ہونے کی وجہ سے نہ اسے جانوروں کا ڈر تھا اور نہ تم جیسے شریر بچوں کا جو اسے کھا جاتے یا خوبصورت دیکھ کر توڑ لیتے۔ اور دوپہر کو جب سورج کی سنہری کرنیں اس پر پڑتیں تو وہ بھی چمک اٹھتا اور اس سے . .. نور ہوتا کہ جیسے وہ سونے کا ہو۔ مگر یہاں سنسار کا قاعدہ ہے کہ سب دن ایک سے نہیں رہتے، اسی طرح بچارے پتے پر بھی ایک روز بپت آپڑی ہوا یہ کہ اتر کی اور سے ایک بڑی زبردست آندھی اٹھی اور بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا یہ پیپل کا درخت بھی نہ بچ سکا۔ ہوا اتنے زور کی تھی کہ ایک ہی ٹہنی کے پتے آپس میں ٹکرانے لگے مانو لڑ رہے ہوں۔ آخر اس آپس کی لڑائی میں یہ بیچارا پتا بھی ٹہنی سے ٹوٹ گیا۔ ہوا اسے دور دور اڑاتی پھری۔ پتے نے ہزاروں تکلیفیں اٹھائیں اور ہوا کے زور سے بچنے کے لئے دھرتی سے چپٹ گیا مگر مصیبت نے پیچھا نہ چھوڑا ایک سفید سا مٹی کا ڈھیلا لڑھکتا لڑھکتا پتے پر آ رہا۔ بچارا پتا پہلے تو انجان پن میں بہت خوش ہوا کہ چلو اب ڈھیلے کے وزن سے آندھی میں ادھر ادھر ٹکریں کھانے سے مکتی ہوئی پرنتو جب آندھی رک گئی اور پھر بھی ڈھیلا اس کے اوپر سے نہ ہٹا تو اس نے ڈھیلے سے کہا کہ بھائی تم نے مجھے ٹکروں سے بچایا ہے تمھارا بڑا اپکار مانتا ہوں مگر اب تو آندھی نکل گئی، اب ہٹ جاؤ، میری کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ مگر ڈھیلے نے اس کی ایک نہ سنی اور ڈھٹائی سے کہا واہ میں نے تمھیں آندھی سے بچایا اب مجھے ذرا اپنے اوپر پڑا رہنے دو۔ مجھے آنند ملتا ہے مانو میں سونے کے تخت پر بیٹھا ہوں۔ پتا بچارا

بہت کلبلایا بہت زور مارا مگر اُس کی ایک نہ چلی کیونکہ وہ کمزور تھا۔ مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری اور رہائی کی کوشش میں لگا رہا۔ اب اسے افسوس ہوا کہ نہ آپس میں ٹکراتے نہ یہ نوبت آتی۔ مگر اب کیا ۔ ۔ ۔ ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ۔ یونہی بہت دن بیت گئے۔ آخر پتے کی انتھک کوششیں رنگ لائیں۔ اُس نے سچے من سے پراتھنا کی کہ اے ایشور مجھے آزادی دلا اس سے تو اچھا ہے کہ ایک مرتبہ پھر آندھی آئے اور یہ ڈھیلا مجھ پر سے سرکے اور میں پھر کھلی ہوا میں آزادی کی سانس لوں ۔ سچے من کی پراتھنا تھی قبول ہوگئی۔ آندھی تو نہ چلی، پر مینہ برسنے لگا ۔ بوندیوں نے گر گر کر ڈھیلے کو گھلانا شروع کیا۔ اب تو ڈھیلا بہت گھبرایا اور پتے کی منت سماجت کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ تم بڑے بہادر ہو، میرے دوست ہو، میں نے تمھاری بُرے وقت میں مدد کی تھی۔ آج میں مصیبت میں گھرا ہوا ہوں، تم میری مدد کرو۔ پتا بولا یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو، میں تمھارا احسان نہیں بھولا ہوں مگر پہلے مجھے آزاد تو کر دو، تاکہ میں تمھارے اوپر ہو جاؤں۔ اور تمھیں گھلنے سے بچا لوں۔ ڈھیلے کو تو اب پتے پر چھے رہنے کی لالچ پڑ گئی تھی۔ اس لئے مکاری سے کہنے لگا کہ نہیں میں تمہیں آزاد کر دوں گا تو آندھی پھر تمھیں اڑا لے جائیگی اس لئے ایسا کرو کہ میں تمھارے اوپر سے آدھا سرکا جاتا ہوں تم اپنا آدھا حصہ میرے اوپر ڈال دو ۔ پتا بھی اب ڈھیلے کی مکاری کو خوب پہچان گیا تھا۔ کہنے لگا معاف کرو۔ تم ہمیشہ مجھ سے جھوٹے وعدے اور مکاری کی باتیں کرتے آئے ہو، اب میں تمھاری چالوں میں نہ آؤں گا ۔ اور پھر کیا ہوا؟ پانی برستا رہا اور ڈھیلا گھلتا رہا۔ آخر سارا ڈھیلا گیا گھل اور پتا گریا اُڑ"

نجیب کا خط

پیاری بہن مینا۔ تم نے لکھا ہے کہ تنویر میں بچوں کے صفحے کے لئے کچھ لکھوں۔ بھائی ادیب تو ادیب ہی ٹھہرے۔ ہم اُن کی برابری کیسے کر سکتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ یہاں گرمی بہت ہے۔ تم جب سمندر کے کنارے جاؤ تو بادلوں اور ہوا کو ڈانٹنا اور کہنا کہ ذرا قائم گنج کی طرف بھی جاؤ۔ جب تمھارے بھیجے ہوئے بادل یہاں پانی برسائینگے اور ٹھنڈی ہوا ہمارا منہ چومے گی۔ تب ایک نظم یا مضمون "برسات" پر لکھ کر بھیجوں گا۔

اس سال ہمارے آموں کے باغ میں آم بہت آئے ہیں۔ خربوزے، تربوز اور آم کھانا ہو تو خالہ بیلن جمشید بھائی، ماموں جان، پیاری تبسم اور خالو جان کو بہکا کر لے آؤ۔ اور سب کے سب پسینہ بہاتے چلے آؤ ۔ آج کل ہمارا قلمی ..... اخبار "شمع" بڑے زوروں سے چل رہا ہے۔ چونکہ جنگ کی وجہ سے ہم نے اِسے روزنامہ کر دیا ہے؛ مگر حلقۂ خریداران ابھی محلہ کلاخیلوں سے آگے نہیں بڑھا

فقط تمھارا بھائی نجیب
عمر ۹ سال
قائم گنج

مسلسل افسانہ

نغمۂ موت

از جناب مولانا عبدالباری صاحب

پانچواں باب

مسٹر گروز کی عمر پینتالیس (۴۵) کے لگ بھگ ہوگی ڈاڑھی کے بال بھورے ہو چکے تھے چہرے میں ایک خاص قسم کی دلکشی تھی۔ بات اس طرح کرتے تھے کہ سننے والا مسحور ہو جائے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے۔ جو اپنے سیاسی عقیدے کو ہانگ پکار پیش کرتے ہوں۔ یا اس کے اظہار کے وقت آواز میں غیر معمولی کرختگی و جوش پیدا ہو جائے۔ اُن سے ملنے کے بعد کوئی شخص یہ شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا سنجیدہ، ملنسار اور متحمل انسان حکومت وقت، یا موجودہ نظام کے خلاف جارحانہ قدم اُٹھائے گا۔

جب ہماری گفتگو، مجوزہ انقلاب کے عملی پروگرام پر پہنچی تو مسٹر گروز ہمسو ایک ایسے ماہر جنرل کی طرح سمجھانے لگے جو کئی جنگی معرکوں میں میدان جیت چکا ہو، انھوں نے کہا کہ:-

"ترکی انقلاب کے شعلے، سارے مشرق میں پھیل جائیں گے۔ قبل اس کے کہ بالشویزم کی مخالف یوروپین طاقتیں، ان مشرقی ملکوں کی مدد کو پہنچیں، ہم ان پر اپنا تسلط جما چکے ہوں گے آبنائے باسفورس پر قبضہ کرنا زیادہ سے زیادہ، چار پانچ دن کا کام ہے اور پھر اس کے بعد انقرہ کو لے لینا۔ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہمارے ایجنٹ، شام، فلسطین اور حجاز میں ایک سال سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ اشارہ پاتے ہی، ان ملکوں میں "خدائی حکومت" کا نام لیکر آگ بھڑکا دیں گے۔ ترکی کے ملاحدوں کے ذریعہ بھی اشتراکیت کا اچھا خاصہ پروپیگنڈہ کیا جا چکا ہے قسطنطنیہ کو لینے کے لئے ایک ہزار آدمی بھی بہت ہیں۔

اُن کی حیرت انگیز گفتگو سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب آئندہ جنگ میں دو مخالف قومیں، صرف اس لئے کہ ان کے وطن، نسل اور مذہب میں اختلاف ہو ایک دوسرے کے خلاف صف بستہ نہ ہوں گی۔ فوج میں ایسے کرایہ کے سپاہی نہ ہوں گے جو صرف دوسرے لوگوں کی اغراض کا آلۂ کار بنیں دنیا کی آئندہ جنگ، قوموں کے درمیان نہیں بلکہ طبقوں (کلاسز) کے درمیان ہوگی۔ ایک طرف، دولتمند اور زردار ہوں گے، دوسری طرف اُسی ملک کے، اُسی قوم کے، اُسی مذہب کے، اور اُسی نسل کے غریب اور نادار لوگ ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ غریب عوام، دولتمندوں کے مفاد کے لئے اپنی جانیں تلف کریں۔ قومیت، مذہب اور نسل کی بنیاد پر لڑائیاں نہ ہو سکیں گی۔ مذہب، نسل اور وطن کا امتیاز اُٹھ جائے گا۔ ایک طرف وہ لوگ ہوں گے۔ جن کو دنیا کی کل راحتیں میسر ہیں رہنے کے لئے عالی شان مکان، سواری کے لئے موٹر، خرچ کرنے کے لئے بے حساب دولت، اور ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہوں گے جن کے رہنے سہنے کا نہ کوئی ٹھکانا، نہ کھانے پینے کا کوئی سامان۔

گذشتہ عالمگیر جنگ میں جرمن اور فرانسیسیوں کی شدید باہمی منافرت سے ہم ناواقف نہیں۔ متضاد قوموں میں نفرت کی شدت اور دشمنی کی انتہا سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن آئندہ طبقاتی جنگ میں جو

نفرت اور دشمنی کارفرما ہوگی، اُس کا تصور بھی اتنا ہولناک ہے کہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔

اب تک جو لڑائیاں لڑی گئیں، اُن سے عوام کے مفاد کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ سرمایہ دار، اور صاحبِ اقتدار جماعت اپنی دولت اور اقتدار کی حفاظت کے لئے طرح طرح سے عوام میں جوش و اشتعال پیدا کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے تھے۔ کبھی وطن کا نام لے کر، کبھی مذہب کا واسطہ دیکر اور کچھ نہیں تو نسلی عصبیت کو اُبھار کر، عوام کو لڑایا جاتا تھا۔ لیکن، اب، دنیا پر، وطن، نسل اور مذہب کا جادو نہیں چلے گا۔ غریب اور نادار، دولتمندوں کے لئے نہیں، بلکہ دولتمندوں کے خلاف بر سرِ پیکار رہیں گے۔ غرضکہ دنیا بھر کے نادار، غریب اور بیکار لوگ ایک صف میں نظر آئیں گے اور ان کے مقابلے میں دنیا بھر کے دولتمند، اور صاحب اقتدار لوگ ہونگے

کہا جاتا ہے کہ ایشیاء میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور یورپی اقتدار کے خلاف، ایک عالمگیر جذبہ پیدا ہو رہا ہے لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے ایشیاء میں یورپی اقتدار کے خلاف نہیں بلکہ یورپی سرمایہ کے خلاف ایک عام لہر پیدا ہو گئی ہے۔ یورپ کے سرمایہ دار، ایشیاء کو مفلس بنا رہے ہیں۔ پیٹ کی آگ بہت بُری ہوتی ہے۔ مفلس اور نادار ایشیاء، افلاس و تنگدستی سے عاجز آ گیا ہے۔ حقیقت میں یہ ایشیاء اور یورپ کے قوموں کا تصادم نہیں ہے بلکہ یورپ کے سرمایہ داروں کا، ایشیاء کے مفلسوں سے جنگ ہے ......"

یہ کہتے کہتے ابراہیم بے رُک گیا، اور معذرت خواہ انداز میں مسٹر کارنکی سے کہا کہ

"کہو تو میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں"...............

قیدخانے کے گندے پانی کے بعد آج اتنا شفاف اور گرم پانی میسر ہوا تھا ہاتھ منہ دھونے کے بعد، ابراہیم بے کا چہرہ نکھر آیا۔ کسل و ماندگی کے آثار تو اب بھی تھے لیکن آنکھوں کی چمک سے چہرہ گلنار بنا ہوا تھا۔

ابراہیم بے نے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا کہ

"میں اصل موضوع سے بہت بہک گیا تھا۔ آئندہ جنگ کے اسباب پر بحث و مباحثہ کرنا، میرا کام نہیں! .... ہاں تو مختصر یہ ہے کہ مسٹر گرز، یعنی میری محبوبہ کے والد نے ہم لوگوں کو مختلف فرائض سونپ دیئے تھے۔ تجویز یہ تھی کہ جیوں ہی غازی کردستان جائیں، ہماری کمیٹی یعنی "انجمن اتحاد و طاقت" مزارستان کے توپخانے اور اسلحہ خانے کے اور گھر پر حملے کر دے اور اس کے مسلح ہو کر، شہر کے مخصوص اور اہم مقامات کی ناکہ بندی کر دی جائے۔ اس تجویز کا جو حشر ہوا، اُس سے میں اور تم دونوں واقف ہیں۔

میری محبوبہ کو بلغاریہ کی سرحد پر، خبر رسانی کے دفتر کا کام سپرد ہوا تھا۔ میں عربی اور ترکی زبان سے واقف تھا۔ اس لئے انور بے کی سابقہ انجمن اتحاد و ترقی کے افراد، اور کمالی اقتدار کے مخالفین کی نگرانی اور سرداری، مجھے تفویض کی گئی۔

میری محبوبہ سے یہ طے ہو چکا تھا کہ "انقلاب" کی کامیابی کے بعد ہم لوگ بخارسٹ میں رہیں گے۔ ہم میں سے کسی کو بھی، اس انقلاب سے فائدہ اُٹھانے کا خیال نہ تھا۔

یہ اچھی طرح سُن لو کہ ہم لوگ اس انقلاب میں کسی ذاتی غرض کی بنا پر شریک نہیں ہوئے تھے۔ وہ بیچاری تو، اپنے باپ کی محبت کی وجہ سے شریک ہوئی اور میں، اپنی محبوبہ کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہوا۔

۱۴ مئی کی رات کو میں نہیں بھول سکتا۔ اُسی رات کو دولما باغچہ محل پر حملہ کرنے کا کام، میرے دستے کے سپرد کیا گیا۔ مجھے کئی دستی بم دے گئے تھے، اور میں چپ چاپ کنارے کھڑا تھا۔ ڈر کے مارے چھینک بھی نہ سکتا تھا کہ کہیں ہچکولوں سے بم نہ پھٹ جائے جمیل علی بے کے دفتر پر ہم نے کامیاب چھاپہ مارا۔ ہمارے تین آدمی

اس ملک میں کام آئے جمیل بے نے تو مجھ کو اپنی دریا اور کا نشانہ ہی بنانا چاہا تھا لیکن میں نے پھرتی سے تپائی پھینک کر اُسکو گرا دیا۔ اس وقت میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ میں نے جمیل علی بے کی جان نہیں لی۔ بلکہ میرے ساتھ جو پانچ پاگل اور بیوقوف لوگ تھے۔ اُنھوں نے میرے ہاتھ سے بم چھین کر جمیل بے پر پھینکا جمیل بے تو خیر، خاک کا ڈھیر ہو گیا لیکن یہ لوگ بھی اچھی طرح زخمی ہوئے۔

بد قسمتی یہ ہوئی کہ عین اسی وقت کمالی فوج مدد کو آ پہنچی۔ ہم لوگوں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اور پھر ہم لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ اس لڑائی میں صرف دو آدمی زندہ بچ گئے تھے۔ ایک میں اور ایک ہمارا سردار۔ چنانچہ ہم دونوں پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تم جانتے ہی ہو مضحکہ خیز تحقیقات اور اس سے زیادہ مضحکہ خیز، عدالتی کارروائی! اساد بھی جیلوں کی بارش کی طرح پھانسی کی سزائیں ملزموں پر نازل ہو رہی تھیں۔

اچھی خاصی زندگی بسر کر رہا تھا نہ معلوم مجھے کیا سوجھی کہ اس خونریز انقلاب میں شریک ہو گیا تب سے کھلونے اسی طرح آگ میں کود جاتے ہیں۔ ۔۔۔

مسٹر کارنگی نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ :-

" اب میری سمجھ میں آیا کہ تم جیسا سمجھدار انسان اس میں کیسے اُلجھ گیا۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ مسٹر گرونڈز کا کیا ہوا۔ اس لڑکی کا حال تو مجھے معلوم ہے کہ بلغاریہ کی سرحد میں چلی گئی۔"

ابراہیم بے۔ مجھے تو یہ امید تھی کہ شاید تم اس سے واقف ہو گے کہ وہ

کہاں گیا ہے معلوم نہیں۔ میری محبوبہ کا کیا حال ہے وہ کہیں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی۔

مسٹر کارنکی:۔ وہ ترکی مملکت سے بھاگ چکی اور اس لئے وہ یقیناً محفوظ ہوگی۔

ابراہیم بے:۔ ہاں ہونا تو یہی چاہئے لیکن اگر اُس کا باپ گرفتار ہو گیا ہے تو پھر بڑی مشکل ہے۔ بہر حال میں نے اُس کو ایک خط لکھا ہے جب تم قید خانے میں مجھ سے ملنے کو آئے، تھے اُس سے کچھ دیر پہلے میں نے جیلر کے ذریعہ برلن بینک کے پتہ پر اُس کو ایک خط لکھا ہے۔ لیکن اُس خط سے تو اُس بیچاری کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ مجھے پھانسی دیدی گئی۔

مسٹر کارنکی:۔ لیکن اب تو اُس نے اخباروں میں تمہارے فرار ہونے کی خبر پڑھ لی ہوگی۔

ابراہیم بے:۔ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اور پھر مسٹر کارنکی کے قریب آکر اُس نے ذرا تحکم کے ساتھ پوچھا کہ:۔

"آخر تم اُس شخص کا نام کیوں نہیں بتاتے جنہوں نے میری زندگی کو ایک سال تک بڑھا دیا۔

مسٹر کارنکی:۔ وہ شخص خود تم سے، مل کر بتانا چاہتا ہے اور آج ہی دوپہر کے کھانے کے پہلے، وہ تم سے تنہائی میں ملے گا۔

ابراہیم بے:۔ لیکن کیا، اس ایک برس کی مدت، مجھے قیدیوں کی طرح، اسی بہانے سے گذرانی ہوگی؟

مسٹر کارنکی:۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ تمہارے مستقبل کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔

ابراہیم بے ابھی کچھ اور باتیں کرنی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک شخص سفید فلالین کا پتلون اور نیلا کوٹ پہنے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اور شائستگی سے جھک کر ابراہیم بے سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا کہ:۔

"میرا نام ڈاکٹر ہیگو شومبرگ ہے"

مسٹر کارنکی کھڑے ہو گئے اور ڈاکٹر شومبرگ سے مخاطب ہو کر بولے کہ:۔

"شاید آپ کو تنہائی میں باتیں کرنی ہیں اس لئے مجھے رخصت ہونے کی اجازت دیجئے"

ڈاکٹر شومبرگ:۔ شکریہ، مسٹر کارنکی۔

مسٹر کارنکی:۔ باہر چلے گئے۔

باقی

میری ڈائری کا ایک ورق

از محترمہ قریشہ خاتون صاحبہ بھوپال

اس وقت دس بج چکے ہیں۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک بتا رہی ہے کہ ابھی ابھی ساڑھے دس بجے ہیں ایک وقتی موت کا پیغام دے گا۔ روشنی گل کرنے کا آرڈر بھی کتنا کیف آور ہوتا ہے جب ہم تمام تفکرات، کتابوں کے انبار میں دفن کرکے اور اپنے لائق، نالائق استادوں کو خیرباد کہہ کر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔

مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے جب میری تمام کائنات سمٹ کر ایک پلنگ تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ دن بھر کی کوفت۔ خوشی اور غم۔ نیند کے بُھنور میں گُھس جاتے ہیں اس وقت میں اپنی زندگی کی اُن گھڑیوں کو یاد کرتی ہوں جنہوں نے میری دنیا ہی بدل دی ہے اس سے قبل مجھے اپنی زندگی ایک معمہ نظر آتی تھی اس کی پیچیدگیوں میں مجھے الجھن سی محسوس ہوتی تھی میرے نزدیک حسن اور نزاکت کوئی ٹھوس چیز تھی جس کو مس کرنے سے مجھے اپنی انگلیاں جھلتی ہوئی اور جلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ــــ مگر آج زندگی ایک رنگین اور کھلی ہوئی فضا نظر آتی ہے۔ جس کے رنگا رنگ مہکتے پھول میری ہر دلچسپی کا مخزن اور برگ و شجر درسِ عبرت لئے ہوئے ہیں۔

صبح کے سات بجے میں کالج جانے کے لئے تیار ہوئی۔ آج مجھے اپنا داخلہ کروانا تھا۔ میں حیران تھی کہ آج گھر کی محدود دنیا سے باہر میرے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ ایک ننھی سی اُمید کی جھلک میرے دل کو تسلی دیتی تھی کہ میری ایک سہیلی اس کالج کی طالب علم ہے۔ شاید انہیں کے ذریعہ میری تمام مشکلیں حل ہو جائیں گی میں عمارت کے احاطے کے اندر داخل ہوئی تو ایک بڈھا چوکیدار مجھ کو اس وسیع اور پُرفضا عمارت کی دوسری منزل پر لے گیا پھر رُک کر دریافت کرنے لگا "جی آپ کو اپنی سہیلی کے کمرہ کا نمبر یاد ہے؟"

میں نے متین صورت بنا کر کہا کہ "ہاں! کمرہ نمبر ۶۳"

اُس نے ایک کمرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہے کمرہ نمبر ۶۳۔ اب آپ تشریف لیجائیے۔" یہ کہہ کر وہ بڈھا واپس ہوگیا۔ میں نے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو کوئی موجود نہ تھا۔ میں برآمدے کے آگے آکر باہر وسیع باغیچہ کی طرف جھانکنے لگی۔ اُف وہ! کتنے پھول تھے، یہ باغیچہ تو دنیائے حسن کا ایک مکمل نمونہ معلوم ہوتا تھا یکایک مجھ کو خیال آیا کہ کہیں جنت یہی تو نہیں ہے۔ کاش کہ میں اس جنت کی حور ہوتی اور دوسری حوریں مجھ کو اپنی شیریں اور سُریلی آواز سے پکارا کرتیں!

میں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ ایک میٹھی اور چہکتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔ میرے کان اور میری آنکھیں بیک وقت ہوئی مڑیں اُف کس قدر حسین منظر تھا۔ ایک نازک اندام خوبصورت لڑکی سفید لباس میں ملبوس۔ ہاتھوں میں سفید پھول لئے ساکت و صامت کھڑی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بڑھ کر اس کو تھام لوں کہ وہ مجسمۂ حسن متحرک ہوتا ہوا میرے نزدیک آگیا۔ اور نہایت سُریلی آواز میں کہنے لگا "آپ کی دوست چائے پی رہی ہیں ابھی آتی ہی ہوں گی آپ ایک طرف بیٹھ جائیے۔"

قبل اس کے کہ میں کچھ پس و پیش کروں میرے قدم بڑھتے ہوئے کمرہ کے ایک گوشہ میں رُک گئے جہاں میں بالکل خاموش کھڑی ہوگئی۔ میری دوست

آپہنچیں۔ اُس دوری جگہ سے پھر ویسی ہی کھلکھلی آواز پیدا ہوئی۔ خاید وہ میری دوست کا جملہ ہی تھی کہ "دیکھئے آپ کی بہن صاحبہ تشریف لائی ہیں اور وہ ایک گوشہ میں کھڑی ہوئی ہنس رہی ہیں"

"ہائے ہائے ایک کیسی عجیب لڑکی ہے کہ بات بات پر ہنستی ہے" یہ کہتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئی۔ پیچھے سے ایک نقرئی قہقہہ کی آواز سنائی دی بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نازک سی چاندی کی گھنٹیاں کسی البیلا چھوکری کے ہاتھوں سے پھسل پڑی ہوں، میں بھی ہنسی کو ضبط نہ کر سکی۔ اور میری دوست بھی بجائے خفا ہو جانے کے ہنس پڑیں۔ اس کے بعد ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ مجھے کالج کے قوانین کا پتہ نہ تھا اس لئے ڈر رہی تھی کہ خدا جانے مجھ پر کیا کیا پابندیاں عاید کی جائیں گی اسی اثنا میں وہ حسن و موسیقی کا مجسمہ غائب ہو گیا۔ میں نے اپنی دوست سے دریافت کیا "کون بہن یہ لڑکی کون ہے؟ کیا یہ گانا بھی جانتی ہے؟ اور دیکھو کہیں اس کالج میں گانے کی ممانعت تو نہیں ہے؟"

میری دوست نے جواب دیا کہ "پیاری بہن سچ پوچھو تو تم جیسی لڑکی کیلئے جو زندگی کی اس قدر عادی ہو۔ یہاں پریشان ہو جاؤ گی۔ یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں"

یہ سنتے ہی میرا تو جی اُداس ہو گیا۔ خیال آیا کہ فوراً یہاں سے واپس چلی جاؤں۔ لیکن اب یہ کیونکر ممکن تھا۔ یہاں یہی سوچ رہی تھی کہ میری دوست نے کہا کہ میں نے آپ کا داخلہ کرا دیا ہے چلئے پرنسپل سے آپ مل لیجئے" یہ کہکر اپنے دوست کے ساتھ ہولی۔ مگر دل میرا طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے کہ خدا جانے کیا حشر ہوگا۔ ہم دونوں پرنسپل صاحبہ کے کمرہ میں داخل ہوئیں۔ سامنے کی بڑی میز کے نزدیک ایک خاتون نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس ملاقات کے بعد میں نے اس کالج کا روزمرہ کا پروگرام! یہ زندگی ——— ایک وسیع اور نہ ختم ہونے والا مطالعہ۔ علم کی بے پناہ گہرائیاں، زندگی کے عجیب و غریب مسائل اور دلچسپ بحث و مباحثے!

اس پر میری دوست کی محبت و رفاقت سونے پر سہاگہ تھی۔

شام کی رنگین فضا میں جب ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر تھکی ہوئی ماندی فاختاؤں کی طرح ہم سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں تو دور سے سہانے کانوں کی دلکش آواز مجھ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر اس میٹھی آواز کا تعاقب کرتی ہوں۔

ہاں یہ آواز میری اُسی سہیلی کی ہوتی ہے۔ جسکو میں بید چاہتی ہوں اور یہی وہ حسین مغنیہ ہے۔ جسکے شیریں اور سُریلے نغمے مجھکو کسی دوسری دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ سب اس کو "ناہید" کے نام سے مخاطب کرتے ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتی کہ اُسکو کس نام سے یاد کروں۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں اُس کی فطرت کو نہیں پڑھ سکتی۔ میرے نزدیک سچا دوست وہی ہے جس کو ہم نہ سمجھ سکیں اور نہ چھوڑ سکیں! یہ ہے میری زندگی کی کتاب کا ایک سنہرا ورق!

خواجہ الطاف حسین حالی

گذشتہ سے پیوستہ

از جناب سید اصغر علی صاحب (سکندرآبادی بلندشہر یوپی)

لیکن باہمی تمام طعن و تشنیع کے باوجود اس نظم کو جو قبول عام کی سند حاصل ہوئی وہ دنیا کی بعض کتابوں ہی کو نصیب ہوئی ہے اور ادب اردو میں تو اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی تمام تر وجہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تھا جو غدر کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کو جو نقصانات اور تکالیف پہنچیں وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھیں اور ہر ایک آدمی اس نقصان سے قطعی واقف تھا۔ ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ مغلیہ سلطنت جو کئی صدیوں سے ہند پر مسلط تھی آج ختم ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ بعض ان تمام نقصانات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور بعض ان کا اندازہ بھی نہ لگا سکتے تھے لیکن یہ خیال سب کو پریشان کر رہا تھا کہ اس کا تدارک کیا ہونا چاہئیے۔

جب مسدس شائع ہوا تو لوگوں نے اس میں اپنے نقصان کی تفصیل پائی۔ اور اس کو قدر کی آنکھوں سے دیکھا حتیٰ کہ معطلین نے بھی اس کو اس لئے پسند کیا کہ اس میں ان کو مسلمانوں کے ہر طبقہ کی خامیاں اور کمزوریاں بھی طرح معلوم ہو گئیں اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے کہ ان کا اچھا ہو تو ہطا اور یہ مسدس ایک بجلی کی مانند تھا جو آنکھوں کے سامنے کڑک کے ساتھ چمک کر غائب ہو گئی ہو لیکن دلوں کو دہلا گئی ہو۔ وہ دماغ جو کبھی اپنے مستقبل کے سوچنے کے عادی نہ تھے روشن ہو گئے۔ پہلو میں درد پیدا ہوا اور وہ بھی قوم کا لوٹ تمام نگاہیں منزل مقصود کی تلاش میں دوڑنے لگیں۔

مسدس کے اس حصہ کو بیحد پسند کیا گیا۔ جس میں مولانا نے مسلمانوں کی گذشتہ عظمت اور عروج کا راگ گا یا ہے اور دکھلایا تھا کہ مسلمان دور گذشتہ میں کس قدر ترقی یافتہ اور مہذب تھے۔ اس کے پسند کئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ جب موجودہ دور میں ظلمت اور تیرگی کے بادل چھائے ہوتے ہیں۔ اور پستی و زوال ہر طرف مسلط ہوتے ہیں تو ماضی کی داستان عروج و کمال عموماً باعث تسکین ہوا کرتی ہے اور اشک شوئی کا باعث ہوتی ہے۔

مسدس کی مقبولیت کے مختلف اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک سوز و گداز ہے اور پوری نظم کی نظم دل سے ہی نکلی ہے اور یہ دونوں صورتیں دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتیں جب یہ قاعدہ کلیہ ہی ہے تو پھر مسدس ہی اس سے کیوں مستثنیٰ تھا۔

مسدس کی ایک خاص صنعت یہ بھی ہے کہ حالانکہ اس میں مسلمانوں کے تیرہ سو سال کے واقعات ہیں لیکن نظم کہیں سے پھیکی نہیں پڑنے پائی۔ اس میں تسلسل اور ربط اس قدر ہے کہ اگر درمیان سے ایک بند بھی نکال دیا جائے تو مطلب تو صاف رہتا ہے لیکن وہ خوبی نہیں رہتی اور اتنا اچھا اور بہتر تسلسل اتنی لمبی چوڑی نظم میں ایک زبردست کمال ہے۔ مسدس کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا مطالعہ بچوں، جوانوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں سب کے لئے یکساں مفید ہے۔

مسدس کا بیان سادہ۔ زبان صاف و شگفتہ اور سلیس ہے حتیٰ کہ اور روانی اس قدر ہے کہ کہیں پڑھنے والے کو رک کے یا اٹکنے کی ضرورت نہیں

برابر پڑھتے چلے جائیے اور مطلب خود بخود صاف ہوتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر یہ معنف انگریزی ہے۔ یہیں جہاد ب اردو سے بہت شغف رکھتے ہیں۔ مسدس کو پچھلی صدی کی بہترین تصنیف کہتے ہیں۔ مسدس میں ایک خامی یہ ہے کہ مولانا اکثر انگریزی کے الفاظ جن کے ہم معنی اردو الفاظ با آسانی مل سکتے ہیں استعمال کرتے ہیں اور بعض جگہ کلام میں وزن کی خامی بھی رہ جاتی ہے۔ یہ خامیاں مولانا کے تمام کلام میں موجود ہیں۔

اگر کسی شخص سے صرف یہی کہا جائے کہ تو نا کارہ ہے اور اسے کوئی تدبیر اصلاح کی نہ بتائی جائے تو وہ یقیناً ہمت ہار بیٹھے گا۔ اور نا کارہ ہی رہیگا۔ مسدس حالی کا خاتمہ بھی نہایت ہی حسرت آمیز اور دل شکن الفاظ پر ہوا تھا لیکن حالی کو اس بات کا خیال تھا کہ قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے امید کا سہارا بھی ضروری ہے۔ دوسرے ان کے احباب نے بھی رائے دی کہ اس میں مرض کے ساتھ ساتھ علاج بھی ضرور ہونا چاہئے۔ اسی خیال اور احساس کے ماتحت مولانا نے چھ سات سال بعد مسدس میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جو بجائے خود ایک دوسرا مسدس ہے۔ مولانا اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا۔ اسی قدر مایوس کرنیوالا بھی تھا مصنف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں۔ شاید اس خرابی کا تدارک کچھ نہ ہو سکتا۔ مگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا کرتی اور قوم کو ایک نئے خطاب کا مستحق ٹھہراتی کہ قوم نہیں بدلی مگر ہم کے تیور بدلتے جاتے ہیں۔ بس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفریں میں ضرور کمی ہونی چاہئے۔ بعض احباب کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے لاحق کیا گیا۔

لیکن اس ضمیمہ کی حیثیت وہی ہے جو ملٹن کی پیراڈائز لوسٹ و پیراڈائز ریگینڈ اور اقبال Paradise Regained

کے جواب شکوہ کی۔ وجہ اس کی تمام تر یہ ہے کہ مصنف جو کچھ پہلا لکھتا ہے وہ اندر ہوتی ہے لیکن جب اس کا جواب وغیرہ دیتا ہے تو اس پر آورد ہوتی ہے اور بحقیقت سب پر واضح ہے کہ آمد اور آورد میں کیا فرق ہوتا ہے۔

جس طرح مولانا نے مسدس میں مسلمانوں کے ہر گروہ اور ہر طبقہ کو مورد طعن و ملامت بنایا ہے اسی طرح سے ضمیمہ میں انھوں نے لوگوں کو پند و نصائح کئے ہیں اور ان کو ان تمام چیزوں کی وقعت بتائی ہے جو کسی قوم کی ترقی کے لئے ناگزیر ہیں اور جن کا مفقود ہو جانا اس قوم کے خاتمہ کے مترادف ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے عز بیدار کو محنت پسندی کی تلقین دی ہے اور انھیں بتلایا ہے کہ ان کو کسی کام کے کرنے میں عار نہیں ہونا چاہئے۔ امیروں کو کاہلی سے بیزاری کی تعلیم دی ہے اور بتلایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کیا نقصانات لاتی ہے۔ ان کو غیرت قومی اور شرافت وغیرہ کی تعلیم دی ہے اور سب سے زیادہ انھوں نے تعلیم پر زور دیا ہے۔

مولانا حالی کو سرسید نے اپنا ہم خیال و ہمنوا بنا لیا تھا۔ سرسید نے تحریک علیگڈھ شروع کی تھی۔ لیکن اس کی زبان حالی تھے۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مسدس میں سب سے زیادہ زور تعلیم پر دیا۔ سرسید مسلمانوں میں انگریزی تعلیم اور علوم جدیدہ کو مقبول کرنا چاہتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے علیگڈھ کالج کی بنیاد ڈالی۔ لیکن لوگ اس تعلیم سے بیزار تھے اور ہر معاملہ میں اپنی قدامت پسندی کا ثبوت دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی ہمسایہ قوموں سے پیچھے رہے جاتے تھے۔ مسدس میں حالی نے لوگوں کو ان کی خامیاں اور کمزوریاں جتا کر ضمیمہ میں ان کا تدارک بتایا۔ ان کے تدارک کا ایک علاج علوم مغربی کو قبول کرنا بھی تھا۔ دیکھئے وہ اپنے ضمیمہ میں لوگوں کو اس کے عمدہ نتائج بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:-

جنھوں نے بنایا ہے اپنا یاور ہر اک راہ میں اس کو ٹھہرا یا رہبر
یہ قول آج کل صادق آتا ہے ان پر کہ اک نوع ہے نوع انساں سے بہتر
الگ سب سے کام ان کے اور طور ہیں کچھ
اگر سب ہیں انساں تو وہ اور ہیں کچھ

بہت ان کو معجز نما جانتے ہیں ! بہت دیوتا ان کو گردانتے ہیں
جو ٹھیک ٹھیک ان کو پہچانتے ہیں ! وہ اتنا مگر انھیں جانتے ہیں
کہ دنیا نے جو کی تھی، اب تک کمائی
وہ سب جزو وکل ان کے حصہ میں آئی

کہ تھا علم و ہنر ان کو ہر فن میں یکتا ! نہ ہمسر رہا کوئی ان کا نہ ہمتا
ہر اک چیز ان کی ہر اک کام ان کا ! سمجھ بوجھ سے ہے زمانہ کی بالا
صنائع کو سب ان کے تکتے ہیں ایسے
عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

دیئے علم نے کھول ان پر خزانے ! چھپے اور ظاہر نئے اور پرانے
بتلائے انھیں غیب کے مال خانے ! دکھائے فتوحات کے سب ٹھکانے
ہوا جیسے چھائی ہے سب بحر و بر پر
وہ یوں چھا گئے خاور اور باختر پر

اور آخر میں یہ تمام باتیں بتا کر ان کو علوم جدیدہ کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔

نہیں اب علم وفن کے وہ پھیلاؤ ساماں ! کہ نسلیں تمھاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہ ترقی ہو آساں ! امیروں میں ہو نور تعلیم تاباں
کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتی دین وملت کو تھامے

نہ قوم کھانے کمانے کے قابل ! زمانے میں ہو منہ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل ! خطاب آدمیت کا پانے کے قابل
سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ
لگیں کرنے آپ اپنی مدد وہ

مسدس سے مسلمانوں کو جہاں اور فائدے پہنچے وہاں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تحریک علی گڑھ کو بڑی تقویت ہوئی اور عوام نے مغربی علوم کو قبول کر لیا۔ اور تحصیل علم کی طرف راغب ہو گئے۔

سب سے آخر میں مولانا کے نام سرسید احمد خاں مرحوم کا وہ خط نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے مولانا کو مسدس کی کاپیاں موصول ہونے پر لکھا اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے اس کو کس قدر کی نظر سے دیکھا اور اپنی جگہ خود ایک جامع اور مکمل تبصرہ ہے جو مسدس پر نہایت مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"عنایت نامہ مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو نازش شعر وشاعری ہے بالکل مبرا ہے کیوں کر ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ نئی آہنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے .... نثر میں سب سے اس کا شکریہ کرتا ہوں اور اس کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں کہ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی تو صرف انھی الفاظ میں ہے جو میری طرف اشارہ ہے بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا کر کے لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔

مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں رقم فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں۔ اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان امور سے مطلع فرمائیے یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں۔"

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ الحکیم کو دیا جائے رجسٹری کرادیئے جائیں ان سے تشکر یہ کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جائے۔ جسقدر چھپے اور جسقدر مشہور ہو اور لڑکے .... اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں۔ قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں اسی قدر مجھکو زیادہ خوشی ہوگی۔ میرا دل خود چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں اور رنڈیاں بلوائیں۔ مگر وہ رنڈیاں ہی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔ میرے ان استدعا کا جواب .... بہت جلد مرحمت ہو۔"

تمام شد

آنسو

از جناب فہمی الہ آبادی

یاد میں ان کی جو نکلے ہیں ہمارے آنسو
پارۂ دل ہیں یہ آنکھوں کے ستارے آنسو

گرچہ موتی ہیں مگر بخت کے مارے آنسو
ساری دنیا کی نگاہوں سے اتارے آنسو

رات گذری تو بنے صبح کے تارے آنسو
پتلیوں سے مری پل پل کے سدھارے آنسو

کیوں نہ ہر لحظہ منور کریں سارا عالم
فلکِ دل سے یہ ٹوٹے ہیں ہمارے آنسو

بجلیاں بن کے چمک اٹھے سیہ خانوں میں
سن کے افسانہ مرا آج تمہارے آنسو

جذبہ الفت کا بڑھا اور نگاہیں جو ملیں
میری آنکھوں سے نکل آئے تمہارے آنسو

غم کے ہوتے ہیں جو آنسو انھیں پی جاتے ہیں
پر نہیں تھمتے مسرت میں ہمارے آنسو

مت کہو فہمی کہانی انھیں دیکھو تو ذرا
چھلک آئے ہیں ہونٹوں کے کنارے آنسو

سوگوارِ شباب کے مطالعہ کے بعد

مصنفہ حضرت مجنوں گورکھپوری

از دکھی پریم نگری

"ایوان" کا مطالعہ کرنے والوں کو یاد ہوگا کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں مجنوں صاحب کا ایک افسانہ "سوگوارِ شباب" مسلسل شایع ہوتا رہا۔ انتخاب ایوان اشاعت داور، نے اس کو کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔

حضرت مجنوں کی افسانہ نویسی کے متعلق بہت سے حضرات کو غلط فہمیاں ہیں کوئی کہتا ہے کہ آپ نے ہارڈی کا تتبع کیا ہے اور کسی کا خیال ہے کہ آپ کے افسانوں پر ہر ہر ... اسپنسر کا اثر ہے۔ سوگوارِ شباب میں خود حضرت مجنوں نے اپنی افسانہ نویسی کے متعلق "سی ادراک" کے عنوان کے تحت برسبیل تمہید کچھ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مجنوں صاحب کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی کہ اردو ادب کے ہر شعبہ میں ایسی چیزیں پیش کی جائیں جن سے ہمارا ادب اگر انگریزی کے ہم پلہ نہ بن سکے تو اس کے دوش بدوش ضرور کھڑا ہو سکے اور جب اردو ادب کی چیزیں انگریزی ادب کے معیار پر پرکھی جائیں تو طرز خیال اور اسلوب بیان میں کم درجہ پر نہ رہیں۔ چنانچہ اسی خیال کے زیر اثر آپ نے ترجمہ کے بجائے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور مختلف بدیسی مضمون جن میں ہارڈی اور اسپنسر بھی شامل ہیں، کے شاہکار زیر مطالعہ رکھے۔ ان مشاہیر ادب کے بعض ناولوں کو پڑھ کر آپ کے اندر یہ تحریک پیدا ہوئی کہ ان کو سامنے رکھ کر لیکن ماحول کا جامہ پہنا کر انھیں اردو میں داخل کر لیا جائے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور آپ نے اردو میں ایسے افسانے پیش کئے جنھیں ہم اردو ادب کی طرف سے انگریزی کہانیوں کے مد مقابل بغیر کسی جھجک اور تامل کے پیش کر سکتے ہیں۔

ہارڈی ہی کے ایک ناول "Two on the Tower" کو پڑھنے کے بعد آپ میں مذکورہ بالا افسانہ لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔

آپ کے افسانوں کے متعلق ایک بات اور جاننا ضروری ہے۔ ہر شخص کی ہر چیز کے متعلق ذاتی رائے اور اپنا نظریہ ہوتا ہے اور اسی لئے بہت سے لوگوں کو مجنوں صاحب کے افسانوں میں عنصر کچھ غیر فطری سا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر انہیں یہ پتہ چل جائے کہ مجنوں صاحب کا عشق و محبت کے متعلق کیا نظریہ ہے تو پھر یہ بات پیدا نہ ہوتی۔ اور آپ کے نظریہ کو سمجھنے کے بعد اگر آپ کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بوجھ اور غیر فطری پن جو آپ کے افسانے پڑھتے وقت طبیعت کو محسوس ہوتا ہے، رفع ہو جاتا ہے۔

حضرت مجنوں عشق و محبت کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ یہ بھی ایک عام جذبہ ہے۔ جسے سیدھی سادی زبان میں .....
"جذبہ جنسی" کہنا چاہئے۔ جس طرح انسان کو بھوک پیاس اور سردی گرمی لگتی ہے، اسی طرح محبت کا جذبہ بھی عام اور معمولی ہے۔ جو ....
ابھرتا ہے، اور آسودگی کے بعد فرو ہو جاتا ہے۔ اور جو ایک مرکز کو چھوڑ کر اپنی خاطر خواہ آسودگی کے لئے دوسرے کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ انسانوں نے اس جذبہ کا ایک اہم اور مقدس بت بنا لیا ہے اور عشق و وفا کا غلط مگر راسخ تصور قائم کر چکے ہیں ــــ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کا یہ فلسفہ محبت کہاں تک غلط یا صحیح ہے کیونکہ اس کے رد اور تائید دونوں میں زیادہ سے زیادہ واقعات و مشاہدات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم سوگوارِ شباب میں ہم نہیں مان سکتے کہ مشتاق (ہیرو) اور سائرہ (ہیروئن) کا جذبہ عشق ایک معمولی جذبہ تھا اور وہ دونوں اس جذبہ کی "خاطر خواہ آسودگی" کی خاطر دوسروں کی طرف مائل ہو گئے۔ ہمارے خیال میں تو یہ خاک ماحول اور سرد مہریاں تھیں۔ جن کی وجہ سے انہیں جبراً دوسروں کی طرف مائل ہونا پڑا گو ہم اسے "مائل ہونا" بھی بمشکل کہہ سکتے ہیں۔

سوگوارِ شباب ایک غمزدہ تشنۂ محبت کی کہانی ہے جو بلا سوچے

سے بھی سفاک ماحول کے بے رحم ہاتھوں کی کٹ پتلی بن کر ایک طرف دوڑ پڑی مگر جب ہوش آیا تو سنگدل قدرت زندگی کے دوراہے پر کھڑی قہقہہ پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ ایک طرف محبوب کی تباہی تھی اور ایک طرف اپنی —— اور اپنی محبت کی! اس نے خود تباہ ہونا منظور کر لیا!

"سوگوار شباب" مجنوں صاحب کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ اگر آپ شتاق (ہیرو) کا کردار ذرا اور مضبوط کر دیتے تو اور بہتر ہوتا کیونکہ ایک نوجوان شخص کا آغاز محبت کی سرشاری میں جب انسان کو اپنا برا بھلا کچھ نہیں سوجھتا ہے۔ اپنی محبوبہ کو صرف ایم۔ اے کرنے کی خاطر چھوڑ کر چلا جانا اور پھر اپنی طبیعت سے ایسے جبکہ وہ ایسے مظاہرے بھی دیکھ چکا تھا جس سے اُسے اپنی محبوبہ کی تکلیف کا بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا۔ کچھ زیادہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا دیگر یہ کہ مطالعہ کرنے والوں کو سانحہ کے بعض جملوں سے یہ شروع ہی میں پتہ چل جاتا ہے کہ اب ان دونوں میں ابدی جدائی ہونے والی ہے۔ اس سے بھی افسانہ کی دلچسپی میں کمی پیدا ہو گئی ہے

مجنوں صاحب نے ایک جگہ تو کمال ہی کر دیا ہے جہاں ناظر پڑھتے پڑھتے اندازہ لگاتا ہے کہ ہیروئن رقیب سے شادی کرے گی، لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کے نوکرے کرتی ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کسی کو اتھاہ گہرائی میں دھکا دیدے۔ لیکن جھٹکے کے بعد پتہ چلے کہ پیچھے سے دامن پکڑا ہوا تھا۔

مجنوں صاحب کی طرز نگارش اور اسلوب بیان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجموعی طور پر سوگوار شباب ایک نہایت دلچسپ اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ ناظرین "تنویر" کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ مجلد کتاب ایوان اشاعت گورکھپور سے دو روپیہ آٹھ آنے میں اور غیر مجلد دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ ناشرین کو چاہئے تھا کہ وہ اسکی موجودہ ہیئت سے کہیں بہتر صورت میں شائع کرتے۔

———— : ————

بے زبان عورتوں کو نیک مشورہ

ہندوستان کے بعض مقامات میں طبی بورڈ قائم ہو گئے ہیں مگر چونکہ ان کا انتظام و انصرام مردوں کے ہاتھوں میں ہے اس لئے مستورات اپنی فطری شرم و حیا کے سبب ان سے پورے طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں مدت سے خیال تھا کہ یہاں ایک ایسا طبی بورڈ ہو جہاں صرف زنانہ علاج ہوتا ہو اور قابل اطمینان دوائیں مل سکتی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ زنانہ طبی بورڈ لکھنؤ کے اجراء نے یہ کمی پوری کر دی

"زنانہ طبی بورڈ" لکھنؤ ہندوستان کے مشہور مایۂ ناز حکیم جناب محمد کبیر الدین صاحب شیخ الجامعہ طبیہ دہلی کی سرپرستی میں قائم ہوا ہے۔ آپ نے از راہ ہمدردی و نفع رسانی خلق اپنے وہ تمام خاص خاص مجربات اس بورڈ کے لئے وقف کر دیئے ہیں جو آپ کو مجدد طب مسیح الملک حکیم اجمل خاں اعظم اعلی اللہ مقامہ سے بطور خاص حاصل ہوئے تھے اور جن پر مرحوم کو بڑا اعتماد تھا اور جو ابتک کسی کو نہیں دیئے گئے تھے۔

بورڈ کی درخواست پر لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد اور دوسرے مقامات کے بڑے بڑے اطباء نے اس کو اپنے مجربات خصوصی جو عورتوں اور بچوں کے امراض سے متعلق ہیں عطا فرما دیئے ہیں۔ بورڈ نے اہتمام کیا ہے کہ وہ صرف وہی مرکبات اپنے دواخانے میں تیار کرے جو ننانوے فیصدی بے خطا اور کارگر ثابت ہوں۔ "زنانہ طبی بورڈ لکھنؤ" کی مہتمم جناب امان النساء بیگم صاحبہ ثریا مصنفہ کتاب مستورات ایوروید ایڈ یونانی طبی کالج دہلی ہیں جنہوں نے اپنی ذہانت خداداد کی بدولت کالج سے طلائی تمغہ بھی حاصل کیا ہے دیگر طبیبات بھی سب دہلی اور لکھنؤ کے طبی اداروں کی سند یافتہ ہیں [illegible] امراض میں کافی مہارت و تجربہ رکھتی ہیں۔ شعبہ تشخیص کی انچارج جناب نور جہاں بیگم صاحبہ نکہت لکھنوی ہیں۔ جن کے ہاتھ سے کئی ہزار عورتیں اور بچے سالانہ شفایاب ہوتے ہیں۔

جو بہنیں اپنے یا اپنے بچوں کے علاج کے متعلق متفکر ہوں ان کو چاہئے کہ وہ بورڈ کی طرف رجوع کر کے پورا فائدہ اٹھائیں۔ بورڈ کے جملہ داخلی و خارجی انتظامات خواتین کی نگرانی میں ہیں۔ خط و کتابت ذیل کے پتے پر کریں۔

زنانہ طبی بورڈ ۔ محمود نگر ۔ لکھنؤ

فلمی خبریں

رنجیت مووی ٹون:۔ "اُمید" کامیابی سے چل رہا ہے فسادات کی وجہ سے رنجیت کے دو فلمیں شادی اور سسرال ریلیز ہونے والی تھیں جو فسادات کے ختم ہوتے ہی نمائش کے لئے پیش کی جائینگی دونوں فلموں میں مادھوری موتی لال نے کامیاب اداکاری پیش کی ہے۔ شادی کے ڈائرکٹر مسٹر جینت ڈیسائی ہیں اور سسرال چتر بھج دوشی کی زیر ہدایت تیار ہوئی ہے۔ مسٹر چاولہ اپنی مذاحیہ فلم کی تیاری میں مصروف ہیں جو یقیناً ایک پُر قہقہہ ثابت ہوگی۔

نیشنل سٹوڈیوز:۔ لوگ آسرے کا "آسرا" لگائے بیٹھے ہیں۔ جسکی نمائش کرفیو آرڈر کی وجہ سے فی الحال ملتوی کر دی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ شہر کی فضا ٹھیک ہوتے ہی پاتھے سینما میں "آسرا" کی نمائش کر دی جائیگی۔ پچھلے دنوں ڈائرکٹر محبوب نے اپنی فلم "سرونتی" کی مہورت کر دی ہے۔ اس میں مسٹر مختار کے ساتھ چندر پربھا کو بھی ایک اہم کردار دیا گیا ہے۔

نیو تھیٹرز لمیٹڈ:۔ "لگن" مقبول ترین فلم ثابت ہوئی ہے۔ ڈائرکٹر مدھو بوس عنقریب اردو اور بنگالی دونوں زبانوں میں اپنی تصویر کا مہورت کرنے والے ہیں۔ اس فلم میں سہگل اور سادھنا بوس کام کریں گے۔

بمبئی ٹاکیز:۔ دیویکا رانی کی فلم کا نام "انجان" رکھا گیا ہے اور یہ بہت حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ کاسٹ میں دیویکا رانی اور اشوک کمار ہیں ڈائرکشن کے فرائض مسٹر امیہ چکرورتی کے سپرد کئے گئے ہیں کمپنی کا تازہ شاہکار "نیا سنسار" کو لوگوں نے زیادہ پسند کیا ہے۔

پرکاش پکچرز:۔ "درشن" عنقریب نمائش کے لئے پیش کی جانے والی ہے۔ مسٹر وجے بھٹ "بھرت ملاپ" کو کامیاب ترین فلم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں مسٹر لوہار نے بھی آئندہ فلم کے لئے

ریویو

لگن :-

پیش کردہ :- . . . . . . نیو تھیٹرز لمیٹڈ کلکتہ

ڈائرکٹر :- . . . . . . نتن بوس

خاص اداکاران :- . . . . نواب - سہگل - جگدیش - نیمو - کانن دیوی وغیرہ

ڈائرکٹر نتن بوس نے لگن فلما کر ایک دفعہ پھر نیو تھیٹرز کی تصویروں کی گزشتہ شاندار روایات کو از سرِ نو سر بلند کر دیا ہے - کہانی کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہندوستان کے شاعرِ اعظم ڈاکٹر ٹیگور اسے پسند فرما چکے ہیں - مکالمے نہایت شستہ اور دلچسپ ہیں اور جا بجا ایسے نکتے رکھے گئے ہیں کہ بے اختیار واہ نکل جاتی ہے -

اداکاری میں نواب کاشمیری صاحب سب پر بازی لے گئے ہیں اور لگن میں آپ کی اداکاری دیکھ کر آپ کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا اعتراف کئے بنا نہیں رہا جا تا سہگل - جگدیش - نیمو اور کانن دیوی نے اپنی اپنی جگہ اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں -

لگن کے گانے نہایت دلآویز ہیں اور پھر جبکہ انھیں سہگل اور کانن دیوی جیسے موسیقاروں نے گایا ہو - تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کیا غضب ڈھایا ہوگا ڈائرکشن کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں - کیونکہ مسٹر نتن بوس نے پریذیڈنٹ بنا کر ثابت کر دیا تھا کہ ان کی ڈائرکشن میں بنی ہوئی تصویر کبھی فیل نہیں ہوتی -

مجموعی لحاظ سے لگن ایک گلدستۂ تفریح ہے جس میں حسن و عشق، ساز و نغمہ دل میں اتر جانے والے مکالمے - مدھر گیت - جذباتی و فطری اداکاری اعلیٰ ہدایت کاری کو پھولوں کے روپ میں سجا دیا گیا ہے - فلم نہایت کامیابی سے منروا ٹاکیز میں چل رہی ہے -

واڈیا مووی ٹون :- ختمن کی نمائش بھی فسادات کی وجہ سے ملتوی کر دی گئی ہے حالات سدھرتے ہی اسے نمائش کے لئے پیش کیا جائے گا

ریویوز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ - لاہور

غریبوں کا بہشت:- ہندوستانی ادیب اکثر اپنی مادری زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب سے ناواقف ہوتے ہیں مگر غریبوں کا بہشت کا مطالعہ کرنے کے بعد جو ہندی، تیلنگو، تامل، بنگالی، کناڑی، مرہٹی اور گجراتی کے بہترین افسانوں کے ترجموں کا مجموعہ ہے۔ پڑھنے کے بعد انہیں پتہ چلے گا کہ دیگر زبانوں کے ادب میں بھی کیسی کیسی مایۂ ناز چیزیں موجود ہیں۔ ان افسانوں کا ترجمہ جناب آتش گوجرانوالیہ نے کیا ہے اور دیباچہ مشہور شاعر و ادیب جناب ماہر ہندی کالجی صاحب نے لکھا ہے کاغذ نفیس، لکھائی چھپائی دیدہ زیب، مضبوط جلد قیمت عہ مذکورہ بالا پتہ سے طلب کریں

بیٹے:- امریکہ کی مایہ ناز ادیبہ اور نوبل پرائز یافتہ پرل ایس بک کے مشہور ناول SONS کا ترجمہ ہے جسے اس کے مشہور ناول Good Earth دھرتی ماتا کا دوسرا حصہ سمجھنا چاہئے اس مشہور ناول میں قابل مصنفہ نے چین کے ایک کسان خاندان کا نقشہ پیش کیا ہے اور بڑی خوبی سے دلچسپی کو اخیر تک قائم رکھا ہے۔ احسان علی شاہ نے اس ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ آپ خود بھی افسانہ نگار رہے اس لئے ترجمہ خوب کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ اور مذکورہ بالا پتہ سے (دو) روپیہ میں مل سکتی ہے۔ لکھائی چھپائی بہترین ہے۔

ستارۂ صبح:- شاعر رومان و ادیب محبت جناب چراغ حسن مہندی ۴م اخان صاحب نے مختلف ممالک کے بہترین افسانے منتخب کرکے ان کا ترجمہ کیا ہے اور ان کے مجموعہ کو "ستارہ صبح" کے نام سے شائع کیا ہے جب ایک افسانہ نگار افسانوں کا انتخاب کرتا ہے تو دیکھے ہوتے ہیں اس حال کا واہ ستارہ صبح کا مطالعہ کیجئے گا۔ جسکا ہر افسانہ بابو مہندی خان کے ذوق انتخاب پر دال ہے۔ ایک بار کتاب اٹھا کر پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ نرائن دت صاحب اینڈ سنز کے یہاں کی شائع شدہ کتابیں حسب نفیس کاغذ بہترین لکھائی چھپائی کی حامل ہوتی ہیں۔ ستارہ صبح مجلد ہونے کے باوجود مندرجہ بالا پتہ سے صرف ۸ ؍ میں مل سکتا ہے

کہکشاں:- ہندوستان کے مشہور ادیب شاعر حضرت فیضی اجمیری المعروف بہ اخلی اجمیری مرحوم کی نگارشات کو جناب فیضی رامپوری نے یکجا فرما کر کہکشاں کے نام سے شائع کیا ہے کہکشاں میں اخلی مرحوم کے تین بہترین افسانوں کے علاوہ ۱۴ علمی مضامین بھی شامل ہیں۔ حضرت اعلمی کی فسانہ نگاری کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ان کی اپنی طرز نگارش ہے اور وہ ہندوستان کے ممتاز ادیبوں میں سے تھے اگر جوانمرگی فرصت دیتی تو وہ ادب میں معراج کمال کو پہنچ جاتے۔ کتاب کا سائز چھوٹا ہے اور ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف کی تصویر بھی دی گئی ہے لکھائی چھپائی بہترین۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ دفتر تنویر سے طلب کریں

شمیم کے سو شعر

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے (غالبؔ)

جمیل صاحب نے جناب مظفر حسین صاحب شمیم کی غزلیات سے سو شعروں کا انتخاب کیا ہے اس انتخاب کو پڑھکر شمیم صاحب کی شاعری کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ انتخاب جمیل صاحب کے ذوق کا ضرور آئینہ دار ہے۔ افسوس کہ ہمارے ذوق آپکے ذوق سے بیگانہ سا رہا۔ تاہم بہت سے اچھے شعر بھی اس انتخاب میں شامل ہیں ان شعروں کے علاوہ ایک شعر وہ بھی ہے جو کسی نامعلوم شاعر نے اس کتابچہ کے سرورق پر بنا دیا ہے لیکن اس شعر کو پڑھنا مشکل ضرور ہے کیونکہ یہ شعر حروف تہجی میں نہیں بلکہ چند لکیروں میں لکھا گیا ہے اور یہ شعر واقعی نہایت لطیف ہے جو نامعلوم مصور نے چند ترچھے بانکے اور سیدھے خطوط سے لکھ دیا ہے۔

کتابچہ کی لکھائی چھپائی اچھی ہے اور چار آنہ میں عثمانیہ بکڈپو دکان نمبر ۱۵ محمد علی بلڈنگ بمبئی نمبر ۳ سے مل سکتی ہے۔

د - پ

Cover Printed at the Lakshmi Art Printing Works Sankli Street Byculla Bombay 8

TANVIR, Bombay

Regd No. B 4013

The TANVIR
MONTHLY
BOMBAY, No 8
VOL 5
NO 3
MARCH
1941
مدیرہ :-
"سحر"
قیمت
مقامی

DUKHI PREMNAGRI

Our most popular tragic story writer recently arrived in Bombay, whose stories are read with keen interest throughout India

مدیر مسئول — ستمر
نائب مدیرہ — انوری خانم

شرح چندہ
سالانہ ..... ۲ روپے
مع محصول ڈاک وی۔پی خرچ
قیمت فی پرچہ ...... ۴ ر
نوکل .... ۳ ر
ممالک غیر سے ..... دو شلنگ

جلد ۵ فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء شمارہ ۳

مشہر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۳ سے چھپا کر دفتر رسالہ "تنویر" نمبر ۳ ... اسٹریٹ بمبئی ۳ سے شائع کیا

کرن

از جناب ادیب مالیگانوی

عطیہ زندگی کا بن کے مینا کی بہن آئی
امیدوں کے افق سے یعنی اک تازہ کرن آئی

گلستانِ سحر پہلے ہی سے شاداب تھا لیکن
بڑھانے اور یہ آرائشِ بزمِ چمن آئی

علم لہرائے گا انسانیت کا اسکے ہاتھوں سے
مٹانے کیلئے تفریقِ شیخ و برہمن آئی

وہ ماں جسکی زباں پر انقلابی داستانیں ہیں
اسی کی ہمخیال آئی، اسی کی ہم سخن آئی

* مینا کی بہن [illegible] ہندوستانی علم

"گورنمنٹ برطانیہ" نے تبلیغ کومات دینے کیلئے ضروریات زندگی پر بے انتہا ٹیکسوں کا اضافہ کر دیا ہے، گورنمنٹ ہند کی جگہ ہم نے "گورنمنٹ برطانیہ" اس لئے کہا کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کی نمایندہ اسمبلی کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کے نمایندے جنہوں نے حکومت کی کچھ ذمہ داریاں اپنے سر لی تھیں اور جنہیں عوام کا اعتماد حاصل تھا ان میں سے زیادہ تعداد جیلوں میں ہے بس یہ ظاہر ہے کہ اسوقت ہندوستانیوں کی نمایندہ حکومت کوئی نہیں ہے جسے ہندوستانیوں کے مفاد کا خیال ہو، برطانی گورنمنٹ اپنی بھلائی کیلئے جو چاہے کر سکتی ہے ہم بدقسمتی سے اس کے غلام ہیں، اسلئے نہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ کر سکتے ہیں، یہ کسے معلوم نہیں کہ ہندوستان جیسا زرخیز ملک آج دنیا بھر میں سب سے زیادہ غریب ملک ہے۔ جسکے باشندوں کو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی — پہننے کیلئے کافی کپڑے میسر نہیں، ان کے رہنے سہنے کے مکان جنگلی جانوروں کے بھٹوں سے بدتر ہیں۔ اس مفلسی اور بدحالی کیوجہ سے تعلیم جیسی نعمت اور ضروری چیز سے بھی ہندوستانی محروم ہیں۔ جو زمانہ پڑھنے لکھنے اور بیفکری سے کھانے کھیلنے کا ہوتا ہے۔ اس مصیبت کے زمانے میں یعنی ۶-۷ سال کی عمر میں یہاں کے بچے کے سامنے روٹی کا سوال آ کر اُسے متفکر بنا دیتا ہے، چنانچہ آپ اسی سونے کی چڑیا کہلانیوالے ملک میں ۶-۷ سالہ بچوں کو خوانچہ اٹھاتے محنت مزدوری کرتے دیکھینگے۔ ایسے ملک میں جو پہلے ہی مفلسی و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا ہے، مزید ٹیکسوں کی بارش حکومت کے نظام اور انصاف پر ایک دھبہ ہے۔

مثل مشہور ہے کہ جب "باڑھ ہی کھیتوں کو کھانے لگے تو رکھوالی کون کرے" ہم اپنے اہل وطن سے یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ وہ اس ابتر حالت میں پروٹسٹ کے طور پر ان ٹیکسوں کیخلاف کوئی قدم اٹھائیں کیونکہ ایسا کرنا "اخلاف قانون ہے، البتہ یہ مشورہ دیئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ غریب ہندوستانیوں کو مزید فاقوں سے بچنے کیلئے اپنے پرانے بزرگوں کی بتائی ہوئی آزمودہ باتوں پر عمل پیرا ہونا چاہئے اپنی قدیم تہذیب کو پھر سے زندہ کرنا چاہئے اور اس یورپ کی لائی ہوئی نئی تہذیب کی لعنت اور نئی روشنی کو ٹھوکر مار دینا چاہئے۔ مثال کے طور پر جب کہ دیاسلائی کا بکس بجائے دھیلے کے تین پیسے میں ملنے لگے تو اُسکے استعمال کرنا ترک کر دینا چاہئے اور اسکے بجائے یا تو قدیم زمانے کی طرح چقماق کے دو پتھر آگ جلانے کو استعمال کریں یا پھر ہر محلے میں باری باری ایک ایک گھر آگ بنائے رکھے، جہاں سے سارا محلہ آگ لے سکے۔ ریشم کے بجائے کھدر پہننا چاہئے۔ بجلی کے بجائے "دیا" جلانا بہتر ہے، غرضکہ ہر وہ چیز جسکی قیمت حد سے زیادہ ہو اسکا استعمال ہم اگر بالکل ترک نہ کر سکیں تو اسمیں اس حد تک کمی ضرور کر دینا چاہیے کہ اسکا اثر بڑی صورت میں ظاہر ہو۔ عمل سے جو آواز گورنمنٹ کے کانوں میں پہنچیگی وہ زیادہ اثر رکھیگی اور عوام کی بھلائی پر حکومت کو مجبور کر دیگی۔

نئی تہذیب اور ترقی نے انسانوں کو فائدے کے بجائے سراسر نقصان پہنچایا ہے اور اس دور میں جتنی تباہی انسانوں پر آئی ہے کبھی نہیں آئی۔ ہمیں ایسی ترقی اور تہذیب کو شیطان سمجھ کر دور بھاگنا چاہیے جو ہم سے انسانیت چھین لے۔ جسوقت ہم غیر مہذب کہلاتے تھے اسوقت ہماری

عمر میں سو سال سے زیادہ ہوتی تھیں۔ ہمارے دل و دماغ انسانیت کی روشنی سے منور تھے یہ ایسے قوی طاقتور تھے۔ کوئی بھوکا نہ رہتا تھا بیماریاں نہ تھیں، اتنی خونریزیاں نہ ہوتی تھیں۔ ایک کشت و خون تھا اور دوسرا کنگال تھا۔ غرضکہ اتنا اندھیر نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔
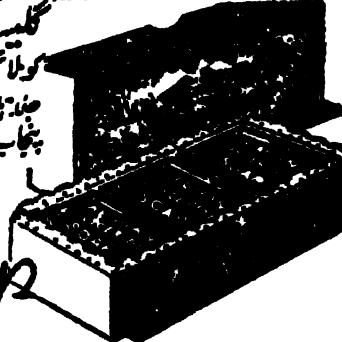
بحالات موجودہ

اس کساد بازاری مصیبت اور فاقوں سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو ہمارے دیہی پرانے رسم و رواج اور روایات جو اپنی طرف ہمیں بلا رہی ہیں۔

ناظرین تنویر سے

"تنویر" نے مضامین کے تنوع وقت کی پابندی اور دلچسپیوں کا جسقدر لحاظ رکھا ہے اس سے ناظرین "تنویر" بخوبی واقف ہیں یہ ضرور ہے کہ اس ہولناک جنگ میں جبکہ بہت سے رسائل وجرائد اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں "تنویر" کی ضخامت میں کچھ کمی ہوئی تاہم اسکے معیار اور دلچسپیوں میں کوئی فرق نہ آنے کا اہتمام رکھا گیا ہے۔ اب ہم بمسرت اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ پرچے سے "تنویر" کی رعنائیوں دلچسپیوں اور دلاویزیوں میں مزید اضافہ ہو رہا ہے خاصکر افسانے گیت اور دیگر ادبی کے تراجم قابل مطالعہ ہونگے۔ مضمون نگار حضرات کو چاہیئے کہ وہ پرچہ کی ضخامت کا خیال رکھیں۔ مسلسل مضامین کی فی الحال گنجائش نہیں کیونکہ "پھانسی کا تختہ" مولفہ عبدالباری صاحب کا ترجمہ کردہ ایک نہایت دلچسپ و دلکش ناول مسلسل چل رہا ہے۔ دوسرا مضمون اصغر گونڈوی کا "خواجہ الطاف حسین حالی" ہے۔ اسکے ختم ہونے کے بعد سرگزشت کا سلسلہ

لے مسلسل افسانہ سرگزشت جو ناتمام رہ گیا ہے وہ پورا کیا جائیگا کیونکہ ناظرین "تنویر" اس سلسلے کو پورا کرنے کا سخت تقاضہ کر رہے ہیں۔ سرگزشت ماہ مئی یا جون سے شروع ہو جائیگی ناظرین سرگزشت سے جہاں استدعا ہے انتظار کیا ہے ماہ اور انتظار کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

از:- حساس ادیب دکھی پریمنگری

"بابوجی ایک پیسہ! بھگوان بھلا کرے—"

ایک بھکارن نے مجھے سجدہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دل میں کہا:- اپنے بھگوان ہونے کی تو شرم رکھ اپنے بندوں کو اتنا مجبور نہ کر کہ وہ اپنے بھگوان ہی کو سجدہ کرنے لگے" میں آنکھیں بند کئے اس بھکارن کے پاس سے گذر جانا چاہتا تھا لیکن ایک چیخ کی آواز سنکر میری آنکھیں خود بخود کھل گئیں — ایک چھوٹی سی لڑکی سڑک سے گوبر اٹھا رہی تھی کہ موٹر کی زد میں آگئی — موٹر کے اردگرد تمام آدمیوں کا ہجوم تھا۔ میں نے لڑکی کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میرے محلہ کی غریب غریب بھکارن سبھدرا کی لڑکی سوہا تھی — آہ اسکے سر پر سے موٹر کا پہیہ چلا گیا۔

پانچ برس ہوئے سبھدرا کا پتی اسے اس سنسار میں تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے سدھار گیا اور سبھدرا اکیلی رہ گئی — غریب سبھدرا کا حسن اس کیلئے مصیبت بن گیا۔ قدم قدم پر پاپی شکاری تاک لگائے بیٹھے تھے تیسرے روز کرایہ وصول کرنے والے نے اپنی نگاہوں سے بتلا دیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مگر وہ سبھدرا اپنا کرایہ لیکر مالک مکان کے پاس گئی تو جب وہاں سے وہ اپنا سب کچھ لٹا کر واپس لوٹی۔ غریبوں کی عزت وعصمت کی وقعت ہی کیا! ذلت کے احساس سے وہ دو دن تک اپنی کوٹھری سے باہر نہ نکلی — اپنی عزت گنوا کر اگر وہ چاہتی تو اس کوٹھری میں کیا مالک مکان کے بنگلہ پر عمر بھر رہ سکتی تھی — لیکن اس نے اپنی عزت و عصمت گنوائی نہ تھی۔ یہ بہترین سرمایہ ایک سرمایہ دار نے زبردستی چھین لیا تھا۔ اسی لئے اس نے اپنا اسباب اٹھاکر دوسری جگہ رہائش کا انتظام کیا اور نوکری کی تلاش میں نکلی۔ مگر ہر جگہ وہ لوگوں کی نظریں پہچان کر ہی واپس آگئی۔ اس نے اپنے بال کاٹ ڈالے، صاف کپڑے پہننا ترک کردیئے خود کو جس قدر بدصورت بنا سکتی تھی بنالیا تب کہیں جاکر اسے حریص نگاہوں سے نجات ملی — مگر آہ اسکا پہلا جبری گناہ" اسکے سینہ میں مجسم ہوچکا تھا — یہ لڑکی سوہا اسی گناہ کا نتیجہ تھی۔ سماج نے مالک مکان کے بجائے غریب سبھدرا ہی کو بدکار بتلایا اور اسے محلہ چھوڑنے پر مجبور کیا تب سے یہیں سبھدرا ہمارے ہی محلہ میں رہتی تھی۔ دن بھر دونوں ماں بیٹیاں بھیک مانگتیں یا گوبر جمع کرتیں اور اپلے تھاپ تھاپ کر فروخت کرتیں جس کے بدلے میں انہیں دو چار پیسے مل جاتے — اسی طرح یہ دونوں جانیں پل رہی تھیں — میں کھڑا ہوا یہی سوچ رہا تھا کہ سبھدرا بھیڑ کو چیرتی ہوئی اندر گھسی

اور لاش سے لپٹ کر چیخیں مارنے لگی ۔ کچھ بھی تھا آخر اسکی ہی لڑکی تھی ۔ — پولیس کانسٹبل موٹر ڈرائور سے سوال وجواب میں مشغول تھا کبھی کبھی آس پاس کھڑے ہوئے آدمیوں سے کچھ دریافت کر لیتا تھا۔ موٹر کے اندر نواب صاحب بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے ، لوگ شاید نواب صاحب کی شخصیت سے مرعوب ہو کر لڑکی ہی کی غلطی بتلا رہے تھے ۔ آخر نواب صاحب موٹر سے اترے اور مسکراتے ہوئے سمجھدار کے پاس جا کر اپنا چرمی بٹوہ سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر دینے لگے — سمجھدار کو کہاں کسی بات کا ہوش تھا ۔ لوگ آپس میں چہ می گوئیاں کر رہے تھے ۔ — " نواب ہے بڑا چالاک ۔ حادثہ خود اسکے ہاتھ سے ہوا اور ڈال اپنے ڈرائور پر رہا ہے " کسی نے کہا :- ارے ڈرائور تو پیچھے بیٹھا تھا چلا تو خود نواب صاحب رہے تھے " سمجھدار نے نوٹ لینے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے روک دیا اور نواب صاحب سے کہا :- " غریبوں کی جان بزار سستی سہی مگر اتنی بھی نہیں پانچ روپے میں خریدی جا سکے " نواب صاحب نے میری طرف گھور کر دیکھا ۔ اسوقت میری حالت بالکل بمبئی کے موالیوں کی سی تھی — خاکی پتلون — سفید بنیان اور سر پر بند کیوں کا نیلا رومال ، کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میرے بھینچے ہوئے ہونٹ اور بندھی ہوئی مٹھیوں کو دیکھ کر خاموشی ہو کانسٹبل کی طرف دیکھنے لگے — وہ میری طرف بڑھا اور بڑے رعب سے کہنے لگا — " تو کون ہے بے — " میں نے کہا بتلاؤں کون ہوں ! — میں وہ ہوں جسے تمہارے تحصیلدار اور سپرنٹنڈنٹ صاحب ہاتھ جوڑ کر تھانہ داری دیتے تھے مگر اس نے نہ لی — اچھا تمہارا نمبر کیا ہے ؟ " میں نے پنسل نکالی اور اس کا نمبر نوٹ کیا پھر نواب صاحب سے کہا ۔

نواب صاحب ذرا ہوش کی دوا کیجئے ، آپ اس کانسٹبل کا منہ پانچ روپے دیکر بند کر سکتے ہیں لیکن دسنت کا نہیں ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حادثہ آپ کے ہاتھوں ہوا ہے لوگوں کے آنے سے پہلے آپ پچھلی نشست پر پہنچ چکے تھے — میں آپ کو ابھی کوتوالی لے جاؤں گا — ورنہ — ! نواب صاحب بھی شاید کسی قومی جلسہ کی صدارت کرنے جا رہے تھے ، اسلئے انہوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کاغذی سکوں سے لوگوں کے منہ بند کر دیئے جائیں — نتیجہ میں پانچ روپے کا نوٹ کانسٹبل کو پچاس روپے سمجھدار کو مل گئے — بھیڑ چھٹ گئی ۔ میں سمجھدار کو اسکے گھر چھوڑ آیا اور کریا کرم کا سامان کر دیا — یونہی بلا مقصد گھومتا آ رہا تھا کہ میں نے دیکھا — نہایت بھیانک منظر — سڑک کے کنارے ایک نیم مردہ شخص تعفن و غلاظت میں لپٹا پڑا تھا ۔ ضعیفی اور نقاہت کے سبب وہ کراہ بھی نہ سکتا تھا ، البتہ اسکی پھیلی ہوئی پتلیوں میں حسرت و یاس کا ایک بے پناہ سمندر موجیں مار رہا تھا — پتلیوں کی گردش انقلاب زمانہ کی آئینہ دار تھی — کون جانے یہ بڑھا پا کس ناز و نعم میں پالے ہوئے بچپن اور شاہانہ جوانی کا انجام ہو — میں دل تھامے ہوئے اس حسین دنیا کی خونچکاں بہار کا نظارہ کرتا چلا جا رہا تھا — میرے داہنی طرف ایک عالیشان ہوٹل تھا — مالک ہوٹل ایک غریب نوکر کی جوتیوں سے خبر لے رہا تھا ، شاید اس بیچارے کے سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں سے کوئی گلاس گر کر ٹوٹ گیا تھا — ہوٹل کے سامنے چند بھکاری للچائی ہوئی آنکھوں سے اندر ناشتہ کرنے والوں کو تک رہے تھے ، ان کے پاس ہی کچھ مہتر بیٹھے ہوئے ٹوٹے کپ دھو رہے تھے سامنے ایک کاغذ میں کچھ سپوال رکھے ہوئے تھے ۔ بھکاریوں کی چیخ پکار کے جواب میں مالک ہوٹل کیفر دستے تو

صرف جھڑکیاں ہی ملیں لیکن اُن مہتروں نے بچے ہوئے سیودال
شے دیئے بجائے اندر بیٹھے ہوئے اصحاب سے خوش ذائقہ
غذائیں کیسے نگلی جارہی تھیں ۔ ہوٹل کی گھڑی نے آٹھ
بجائے ۔ اوہ! مجھے خیال آیا کہ جلدی اسٹیشن پہنچنا ہے
کیونکہ گاڑی ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے آتی تھی اور اسٹیشن گھر سے
کافی دور تھا۔ اکثر ایسے ہی نظارے میرے پاؤں میں زنجیر
ڈالتے اور گاڑی نکل جاتی اور میرے دو تین آنے مفت مارے
جاتے ۔ آہ ایک گریجویٹ تھی ۔ اور کما ہی کیا سکتا تھا؟
میں قدم بڑھائے ہوئے ابھی پبلک اسپتال ہی تک پہنچا تھا کہ
پھر ٹھٹک جانا پڑا۔ اسنار گمبا کی ایک اور سندر کیاری سامنے
آگئی تھی ۔ اسپتال کے پھاٹک پر ایک بڑھیا چیتھڑوں میں
لپٹی پڑی تھی ۔ لوگ جمع تھے، معلوم ہوا کہ رات کو اس کے
رشتہ دار اسے اسپتال میں داخل کرانے لائے تھے، مگر خیراتی
اسپتال ہونے کے باوجود اسے داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا
ناتوان کے اسپتال میں غریبوں کے لئے زہر تک نہ تھا۔ رشتہ داروں
نے بھی اسے وہیں پھاٹک پر ڈالدیا ۔ اُف! رات کی سردی
نے تو بڑھیا کو آب حیات پلا دیا ۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہاں
تھے وہ لوگ جو لاوارث میت یتیم خانوں اور غریبوں کے نام
پر چندہ مانگا کرتے ہیں، کہاں ہے "ریڈ کراس سوسائٹی"؟
میرے کالج میں بھی ریڈ کراس سوسائٹی کے بہت سے رنگین پوسٹر
لگے ہوئے تھے جس میں بیماریوں اور ان کی احتیاط کے طریقے
بتلائے گئے تھے کاش یہ سوسائٹی یہ پوسٹر لگانے کے بجائے
اسی پیسے سے زہر خرید کر ملک کے نوجوان روگیوں کو دیدیا جاتا، اگر
ان کے دواخانوں میں ان کے لئے دوا نہیں ملتی؟ پاپی ڈے میں
ہزاروں روپے دیکر جھوٹی شہرت خریدنے والے کہاں ہیں آئیں

اور اس منظر کو بھی دیکھیں ۔ پاپی کہیں کے!
مکارو! دغابازو! بڑھیا تو تمہیں دعائیں دیتی مرگئی
اور اپنی موت سے کم از کم دو چار کا پیٹ بھر گئی کیونکہ دو چار
فقیر ملکر غریب کی میت اٹھانے کو کچھ پیسے مانگ ہی لینگے جیسے ہو
ان کا بھی گذارہ ہوجائیگا!

میرے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا اور میں گم سم
کھڑا ہوا دل ہی دل میں ظالموں کو صلواتیں سنا رہا تھا کہ اتنے
میں سول سرجن صاحب کی قیمتی موٹر کار فراٹے بھرتی اسپتال
میں داخل ہوئی، ان کی موٹر جانے کے بعد ایک نوجوان اپنی بہن
کی لاش کو کاندھے پر رکھے اسپتال سے نکلا ۔ کیوں؟۔
اسپتال کی موٹر غریبوں کی لاشوں کو نہیں لیجایا کرتی۔ آخر اس کے
ڈرائیور اور پٹرول کا خرچہ بھی تو چاہئے ۔ خوب! یہ ہیں
غریبوں کے ہمدرد اور رحمدل لوگوں کی چالاکی! لوگوں سے
غریبوں کے نام پر مانگتے ہوئے روپیہ کا مصرف ۔
ایک طرف سول سرجن صاحب یورپین ۔ پھر اسٹاف ۔
بڑی بڑی تنخواہیں ۔ موٹریں۔ بنگلے عیش و آرام، اور
دوسری طرف بیمار ۔ روگی۔ آہیں کراہیں، زخم غلاظت
و تعفن ۔ ایک ہی اسپتال میں امیر مریضوں کے لئے نرم
بستر ۔ نرسیں ۔ قیمتی دوائیاں ۔ انجکشن اور غریبوں
کے لئے زہر بھی نہیں ۔؟ مگر دست اسی کا نام تو دنیا ہے"
میں اپنے آپ بڑبڑایا ۔ پھر سوچا کہ آج مجھ سے کوئی کام
نہ ہوسکے گا ۔ ابھی دو ہی فرلانگ چلا ہوں تو ایسے ایسے
روح فرسا ناظر دیکھنے میں آگئے ۔ آگے نہ جانے کیا کیا
ہو ۔؟ مجھ سے اپنے دیا لو بھگوان کی لیلا کی ہوئی سندر
گمبا کی شوبھا بڑھانے والے یہ منوہر پھول نہ دیکھے گئے ۔

جگر میں طوفان اور دماغ میں جہاں سوز جنوں لئے ہوئے میں واپس ہو گیا۔ راستہ میں ایک پھل فروش کی دوکان پر ایک صاحب تازہ سنتروں کی فرمائش کر رہے تھے ــــ پاس ہی چند غریب بچے ایک سڑے ہوئے سیب جسے دکاندار نے نالی میں پھینکدیا تھا لڑ رہے تھے۔ کچھ پاس پڑے ہوئے کیلے کے چھلکوں سے بچا کھچا گودا نوچ کر کھا رہے تھے۔ میری آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، میں نے رنگین آکاش کی طرف دیکھکر کہا ــــ

مرحبا اے میرے رزاق مرحبا ــــ

خوب وعدہ نبھا رہا ہے اپنا ــــ ارے کوئی کتا بھی پالتا ہو تو اسکے کھانے پینے کی خبر رکھتا ہے ــــ " مجھ سے اب نہ ٹھہرا گیا اور میں دل میں بڑبڑاتا ہوا گھر کی طرف چلدیا۔ ــــ

تف ہے تجھ پر اے ننگے بھوکے بد اخلاق ہندوستان

تف ہے تجھ پر اے غلام ہندوستان

تف ہے تجھ پر اے سرمایہ دار

تف ہے تجھ پر اے بزدل مزدور

تف ہے تجھ پر۔ اے عمل سے خالی جھوٹے ادیب!

تف ہے تجھ پر اے انسان۔

تف ہے تجھ پر اے ــــ ؟

از جناب محمد مصطفیٰ خاں صاحب
مداحؔ پھپھوندوی
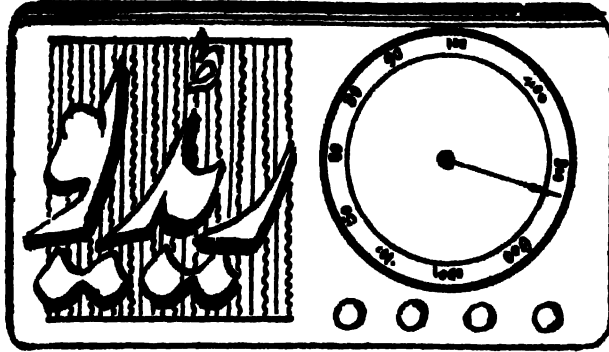
ریڈیو اس عہد کی ایک بہترین ایجاد ہے
کر دیا دنیا کو بیدار اس کے پیغامات نے

قلب افسردہ کو اسکے نطق نے گرما دیا
اسکی گویائی میں پنہاں ہیں ہزار آثار زیست

واقعی نعمت ہی یہ اہل نظر کے واسطے
دہر کو دیتا ہی عزم و استقامت کا سبق

بہرہ ور ہوتی ہی دنیا اس کی معلومات سے
اک نیا درس عمل ہی اس کی ہر آواز میں

لیکن اسکی خوبیاں اسکی یہ سب اچھائیاں
ہیں نبات و قند جو شئے اک جہاں کے واسطے

ساری دنیا کو جو بیداری کا دیتا ہے پیام
مستعد ہی جو زمانے کو جگانے کے لئے

عقل انسانی کا جسکی عمدگی پر صاد ہے
پھونکدی اک روح تازہ اسکے الہامات نے

زندگی کا خون مردہ جسم میں دوڑا دیا
ہے زبانِ نازک اسکی محرم اسرار زیست

رحمت حق ہے بنی نوعِ بشر کے واسطے
کھولدیتا ہے کتاب علم کے، روشن ورق

باخبر رکھتا ہی اک عالم کو ہر ہر بات سے
سحر ہی، جادو ہی، افسوں ہے لب اعجاز میں

ہند میں ہیں ذلت و تحقیر و نفرت کا نشاں
زہر سے بدتر ہی وہ ہندوستاں کے واسطے

کر رہا ہے خواب شیریں کا ہمارے اہتمام
مضطرب ہے ہمکو تھپکی سے سُلانے کے لئے

نطق جس کا ایک نعمت ہے پئے اہلِ جہاں — گنگ ہے گویا ہمارے واسطے اُسکی زباں

جو کیا کرتا ہے دنیا کے دماغوں پر چِلا — ہے ہمارے ذہن کو اک اختلالی سلسلہ

اک زمانے کو ذخیرہ ہے جو معلومات کا — ہے ہمارے واسطے البم وہ ہذیانات کا

ذکرِ مجنوں ہے کبھی افسانۂ لیلیٰ کبھی — نغمۂ شادی کبھی ہے شور واویلا کبھی

حُسن کے پُرکیف وسحر آگیں فسانے ہیں کبھی — عشق کے پُرسوز و پُرحسرت ترانے ہیں کبھی

بیلیئِ شوق داریاں کی حکایت ہے کبھی — ہجر کے رنج ومصائب کی شکایت ہے کبھی

بھیرویں، کھماج، ٹھمری، دادرا طبلہ ستار — ہیں یہی اپنے لئے سیکھا ہائے روزگار

اک طرف اسٹیلن و ہٹلر کے پیغامات ہیں — ایک جانب اختری بیگم کے ارشادات ہیں

ایک جانب تبصرہ امریکہ وجاپان پر — اک طرف تنقید ببّوا و گوہر جان پر

اکطرف ہیں حکمت و سائنس کے زریں نکات — اک طرف سرگم کی مشقِ فاعلاتن فاعلات

اکطرف ہے ہمت وپامردی وجُرأت کا درس — اک طرف ہے کاہلی و سستی و غفلت کا درس

ایک جانب انقلابی ساز کا ہے زیر وبم — اک طرف ہیں صرف تفریحی ڈرامے اور ہم

ایک چیز اور اسکے اک حالت میں دو برعکس کام — عقل افرنگی کی شائستہ ذہانت کو سلام

آہ اے ہندوستاں اے تیرہ بخت و بدنصیب — اب تباہی ہوتی جاتی ہے بہت تجھ سے قریب

بس انہیں نغموں میں تو اک دن یونہی کھو جائیگا — رفتہ رفتہ نیند آجائے گی اور سو جائیگا

تیری بیداری ہے اک خطرہ تمدن کیلئے
تو نکالا جا رہا ہے پاپ سے پُن کیلئے

شاعروں اور شاعری سے فلاطون کو مخاصمت بہت زیادہ مشہور ہے، جو حکیم خود شاعر تھا کیوں شاعری کی مخالفت پر مجبور ہو گیا؟ وہ کیوں نہ دیکھ سکا کہ انسانی زندگی کے بعض ایسے ناقابل تشریح مظاہرے بھی ہیں، جنہیں سوائے شاعری کے اور کسی طرح سے بیان نہیں کیا جا سکتا؟ اس نے کیوں ہومر اور سوفوکلیز جیسے غیرفانی شعراء کو اپنے غیر منصفانہ افادی معیار اور کسوٹی پر پرکھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب اس مختصر سے مضمون میں نہیں دیا جا سکتا، لیکن ہمیں دیکھنا ہے کہ اس کے نظریے اسکے زمانے اور ماحول کی قدرتی بازگشت تھے۔ اس لئے ہم ان میں سچی باتیں اور غلطیاں کہاں تک دیکھ سکتے ہیں؟

شاعروں کی مذمت میں اسکا جوش و خروش اسے غلط فہمی پر لے جاتا ہے، لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ فلاطون آمر اور ظالم شہنشاہوں کی ناجائز قصیدہ خوانی کرنے والے شاعروں کا دشمن ہے اور جماعتی حیثیت سے انہیں سوسائٹی کی خودی اور وقار کے خلاف سمجھتا ہے۔

اس کی اپنی زندگی میں شاعری انتہائی ابتذال کو پہنچ چکی تھی، وہ خود کہتا ہے کہ:- "قانون پر بالغ نظر شاہی اور بااختیار قوتوں کی بجائے تماش بینوں کا قبضہ ہے جو اچھے ان اوصاف کے تذکرے شاعروں سے سنکر مغرور ہوتی ہیں جو درحقیقت انھیں نہیں ہیں۔"

یونان میں اُوریپڈیس نے المیہ ڈرامہ کا آخری دور پیش کیا، مگر اس میں فلاطون کو اوریپڈیس "المیہ فلسفہ کا ایک غلط بین منطقی" نظر آیا، فلاطون انسان کے اجتماعی قوی میں مسرت اور انبساط دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یونان میں قدیم طربیہ ڈرامہ ختم ہو چکا تھا اور نیا ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ یونانی ادب کی دوسری شاخوں کی طرح اور ہندوستان میں حالی کے دور تک اُردو ادب کی طرح "صحیح آرٹ" کا حُسن اور رنگ زبان اور بیان کے دباؤ سے نیچے کچلا جا رہا تھا اور جس طرح اب بھی ہم ہندوستانی ادب میں دیکھ رہے ہیں، ہزاروں ادیب و ڈرامہ نویس یونانی ادب کی اسٹیج پر ایک دفعہ نمودار ہوئے اور پھر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔

فلاطون نے ایک حکیم کی طرح ــــ جس کی نظریں اسکائی لاس دیوتا کی طرح دور رس اور سفاکلین کی طرح بلند اور سنجیدہ تھیں، ان "چھوٹے" اور "عارضی" شاعروں اور ادیبوں کو نہیں دیکھنا چاہتی تھیں بلکہ اُن کے خاتمہ کے حق میں تھیں ــــ اپنے زمانہ کا تجزیہ کیا، لیکن اس غم و غصہ کی شدت میں فلاطون نے اپنی تنقید اور مذمت میں شاعری اور شاعروں کو یکسر ہی قابل گردن زدنی قرار دے دیا، چنانچہ اگرچہ "چھوٹے چھوٹے" شاعروں اور ادیبوں کی مذمت میں اسے حق بجانب بھی قرار دے دیا جائے تب بھی ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ وہ انسانیت کے اس حسین فن پر غیر مشروط ضرب لگاتا ہے اور اسے خشک آئینیات اور غیر منصفانہ

ڈیلویسی کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے دور میں جو کچھ لکھا یا کہا وہ اسکی زندگی کے آخری دور سے بہت مختلف تھا پہلے وہ خود شاعر تھا، شاعروں کا مداح تھا لیکن آخری دور میں اُس نے نہایت شدت سے نہ صرف اپنے پہلے خیالات کی مخالفت کی اور انسانوں کے انفرادی کریکٹر کی تعمیر اور تکمیل پر زور دیا اور اس جوش و خروش میں اُس نے سقراط کی علانیہ مخالفت کی بلکہ ارسٹوفینز اور خیالی دولت مشترکہ (Ideal Commonwealth) قائم کرنے والوں کی "بیہودگیوں" کی سخت مذمت کی اور تمام انسانیت کو ٹھکرایا۔

ایکٹروں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "ایک اداکار اپنے انفرادی کریکٹر کو ختم کر دیتا ہے اور ایک "انسان" بننے کی بجائے کئی انسانوں کی نقالی کرتا ہے اور آخرکار دنیا سے الگ تھلگ ایک عجیب "جانور" بن کر رہ جاتا ہے" لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ ایک کامیاب اداکار اپنے نام نہاد انفرادی کریکٹر کی قربانی دے کر لاکھوں انسانوں کے دلوں میں مسرت، امید اور انکی پریشان کن گتھیوں کے حل پیش کر دیتا ہے کبھی نیکی کا "فرشتہ" اور شرافت کا مجسمہ بن کر ہزاروں انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے اور کبھی اپنے تاریک غم میں دوسروں کو دعوت شرکت دے کر اُن کی انسانیت اور رحم کے جذبات کو بیدار کرتا ہے اور کبھی ذلیل اور گنہگار انسانوں کے روپ میں بدی سے نفرت اور اسکے خوفناک انجام سے عبرت دلاتا ہے۔ ہم چارلس بائر، پال مینی؛ اور جارج آرلس کے انفرادی کریکٹروں کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتے بلکہ ان کی اس انفرادیت کی قربانی سے خوش ہوتے ہیں، جب ہم انہیں جذبات کی وارفتگی میں ایک نپولین، فرسودہ چھپنیزرے میں فرانس کے ایک عظیم الشان اہل قلم اور درد مندانہ اظہار میں ایک والٹیر کے روپ میں دیکھتے ہیں نہ صرف ہم بلکہ تمام انسانیت ماضی کی عظمت کو زندہ رکھنے کیلئے انکی شکرگذار ہوتی ہے۔

بہرحال اسی طرح آرٹ کا مذاق اڑانے کی کوشش میں فلاطون نے اپنی دسویں کتاب میں سنئے اعتراضات کی فہرست مرتب کی ہے، جنمیں وہ لکھتا ہے "ایک شاعر یا مصور محض نقال ہے اور حقیقت سے تیسرے درجے پر دور ہے۔ اور اسکی تخلیق کا کوئی خاص وزن یا معیار مقرر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسے محض خواب سمجھا جا سکتا ہے"

اول تو ہم فلاطون کے تمام فلسفے میں بہت کم سمجھ سکتے ہیں کہ "حقیقت" سے اس کا مطلب کیا ہے؟ اگر اسکی حقیقت کا مطلب ہماری عملی زندگی میں خیالات اور تصورات کا ظہور ہے اور شاعر اور مصور کے خیالات اس عملی زندگی سے چونکہ دور ہیں اس لئے وہ مبنی بر حقیقت نہیں ہیں تو یہ انتہائی غلط ہوگا۔ حقیقت قطعی طور پر ہمارے عمل تک محدود نہیں ہے (اگرچہ عمل اس سے باہر نہیں ہے)؛ اس لئے ہمارے تصورات اور خیالات اور ان کی تخلیق حقیقت سے باہر نہیں کہی جا سکتی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ عمل کی نسبت ہمارے تصورات و خیالات اور اعتقادات "حقیقت" کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں۔ اور انسان کے فطرتی تجسس کو زندہ رکھتے ہیں۔

غلط آرٹ اور شاعری واقعی حقیقت سے دور ہوتی ہے، اور شاید فلاطون کا غم و غصہ بھی اس جھوٹی شاعری اور آرٹ کے خلاف ہو؟ جو زمانہ وسطیٰ تک یورپ اور تا حال ہندوستان کے اردو ادب میں موجود ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں آرٹ نقالی نہیں ہے بلکہ یہ کافی حد تک "خالق" ہے اور اپنے کئی واضح مظاہر رکھتا ہے۔

عظیم اور کائناتی آرٹ میں حدود اور قوانین کی باتیں کرنا محض تمسخر ہے کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ اسکی نثر کی طرح سچائی شاعروں اور مصوروں کی رنگ آمیزی میں بھی جلوہ گر ہو سکتی ہے اور حقیقت کے ایسے بھی عناصر ہیں جو صرف ذہن اور تصور سے بنتے ہیں۔ فلاطون شاعر

اور آرٹسٹ کی بہت بڑی تصویر کھینچتا ہے اور پھر اسکو اپنے درشت اور قاطع نظریوں سے ڈھانپتا ہے۔ حالانکہ موجودہ زمانے کے شاعر اور آرٹسٹ ایک لوہار اور بڑھئی کے خراب اور خستہ جھونپڑے میں "ایک نئی دلچسپی" پیدا کرسکتا ہے۔ ایک شاعر کی آنکھ جو دیکھتی ہے اور مصور کا دل جو "محسوس" کرتا ہے۔ ایک چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی لڑکی اور ٹوٹے ہوئے در و دیوار میں حسن اور رنگ کی ایسی رنگینی پیدا کرسکتا ہے جسے "عمل" اور افلاطون کی "حقیقت" میں انسان دیکھنا بھی گوارا نہ کرسکیں

اگر فلاطون سے پوچھا جاتا کہ "کیا زیوس، تھیسیوس اور فیدرس کی تصاویر ایک نقالی ہیں؟ ہومر اور شکسپیر کی تخلیق فضول اور بیکار مذاق ہے؟ تو اسے ماننا پڑتا کہ اسکی محدود "حقیقت" سے کہیں بڑھکر اور ایک فانی انسان کے جسم و جان سے کہیں زیادہ ان میں حسن اور رنگینی ہے اور جیومیٹری اور الجبرا کے سخت قواعد اور حدود کی نسبت ان کا تناسب اور وسعت کہیں زیادہ موزوں ہے۔

آرٹ پر فلاطون کے اکثر اعتراضات فلسفیانہ نہیں بلکہ جذباتی ہیں، جیسا کہ وہ ایک جگہ ارسطو کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

" المیہ نگاری اور سنجیدہ نقالی خوف یا رحم کے ذریعے انسانی جذبات کا مظاہرہ ہے اور اسمیں شاعر اور مصور کا انفرادی کریکٹر نظر نہیں آتا"

انفرادی کریکٹر جیسا میں کہہ چکا ہوں اگر اجتماعی طور پر انسانیت یا ایک قوم کے فائدے کیلئے قربان کیا جائے تو اس قربانی کو روکنا انسانیت دشمنی اور قوم فروشی ہوگا۔ رہی دوسری دلیل تو یہ غلط ہے کہ خوف المیہ نگاری کا موجب ہوتا ہے کیونکہ خوف ہی ایک ایسا عنصر ہے جو انسانی فطرت میں بیکاری اور تخریبی صورت رکھتا ہے اور کسی قسم کی مفید تخلیق سے خالی رہتا ہے لیکن پھر بھی فلاطون کا یہ کہنا درست نہیں کہ آرٹسٹ کی تخلیق محض سنجیدہ نقالی ہے اور کسی جذبے کے عظیم اظہار سے پیدا نہیں ہوتی، ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ شاعر اور مصور کے جذبات میں جب پاکیزہ ابھار اٹھتا

اسی وقت ہی وہ اپنی تخلیق پر آمادہ ہوتا ہے اور بغیر اس جذباتی ابھار کے وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا" اور اسکی بھی ایک دنیا، ایک تنظیم اور ایک قانون ہے جو خوف اور رحم سے بہت دور ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم اپنے غیر مستقل اور پریشان جذبات کو صرف ظاہر کرنے ہی سے درست، صحیح اور منظم کرسکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے جذبات پر بالکل بندش عائد کردیں تو ہماری زندگی سوائے ذہنی انتشار، کشمکش اور پریشانی کے اور کچھ بھی نہ رہ جائے۔ رہا احساسات کا سوال تو انہیں گم ہونے سے ہماری "انفرادیت" تباہ ہوتی ہے اور نہ تو اس میں کوئی برائی ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور پست سے پست احساسات بھی انسان سے مسرت نہیں چھین سکتے اور شاعر اور مصور صرف انہی احساسات سے کام لیتا ہے جو بہت مسرور یا بہت غمگین ہوتے ہیں اور جنہیں عام انسان ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

فلاطون اپنی جمہوریت کے اولین حصہ میں خود آرٹ کی ضرورت کا معترف ہے اور انسانی جذبات کی ہم آہنگی اور تازگی کیلئے اسے ناقابل انکار اہمیت دیتا ہے۔ لیکن اپنی دسویں کتاب میں اسے صوفیانہ اور خشک قانون دان کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے اور اس مصلحانہ خوشی سے جو آرٹ نے انسانیت کو دی ہے غیر مطمئن ہوکر شاعر کو گردن زدنی کا پرچار کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے " یہ میں نے روح کے تجزیے سے معلوم کیا ہے کہ بلند صلاحیتیں کائناتی مسائل کیلئے ہوتی ہیں اور پست صلاحیتیں صرف ذہن اور فکر کی پابند ہوتی ہیں"۔

مقام حیرت ہے کہ وہ شاعر اور مصور کو عام انسانوں کے برابر درجہ دیتا ہے، حالانکہ شاعر اور مصور کو عام انسانوں سے بلند ہی اس لئے کہا اور مانا جاتا ہے کہ انکا پیغام کائناتی ہوتا ہے، جبکہ عام انسانوں کا ذہن ان کی فکر کی حدود کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ شاعر اور مصور پیغمبروں کی طرح اپنے زمانوں کے زبانیں ہوتے ہیں۔

ہومر اور ہسیوڈ کو کوئی جائز یا ناجائز کوشش ہماری قوم یا اُن کے ملک کی حدود یا زمانوں کی حدود تک پابند نہیں رکھ سکتی اور نہ ہی شکسپیر اور شیلے صرف برطانیہ یا انگریزوں کیلئے "محفوظ" ہو سکتے ہیں۔ ان کا پیغام اور الہام کائناتی ہے چنانچہ فلاطون کا ان پر طنز اور استہزا اسکی اس کمزوری کا ثبوت ہے اور اس کمزوری میں وہ فلسفہ اور شاعری کی قدیم کشمکش کو زندہ کرتا ہے اور جو آج بھی اپنی عجیب و غریب صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ فلاطون کی طرح آج بھی کئی لوگ ہیں جو نہیں سمجھ سکتے کہ شاعری اور فلسفے میں بہت سی باتیں مشترک ہیں — شاعری وجدان سے متعلق ہے اور فلسفہ خیال اور خارجی عوامل سے، لیکن دونوں کا کسی صورت میں کبھی رشتہ نہیں ٹوٹتا ہے۔

فلاطون شاعروں پر جو سب سے بڑا اعتراض کرتا ہے یہ ہے کہ "شاعر جھوٹ کے ناقدے ہیں اور فیدارس کے مجہول صوفیوں اور جارجیاس کے چرب زبان ادیبوں کی طرح زندگی اور علم کی تمام صداقتوں میں ناکام ہیں، وہ جھوٹے راہب ہیں، جھوٹے پیغمبر ہیں، ان کی روحیں مسخ ہیں اور صرف جادوگروں کی طرح دنیا کے بھولے انسانوں پر ہنیا جال پھینکنا جانتے ہیں۔

فلاطون کا یہ غم و غصہ شاید اسکائی لاس اور ڈیناسیوس کے درباری شاعروں پر ہے لیکن پھر بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آرٹ ہماری زندگی میں ایک اہم اور ناقابل تردید عنصر ہے، ہم شاعروں کی غلط بیانی کی مذمت کر سکتے ہیں، ان کی مصنوعی خوشامدوں اور مجروح ضمیر پر افسوس ظاہر کر سکتے ہیں، لیکن ان کی عزت کا جائز حق نہیں چھین سکتے۔

کوئی حکومت بھی بالکل وحشیانہ طاقت پر قائم نہیں کی جاسکتی اور مذہب اور اخلاقی اصولوں کی متانت کے باوجود بھی عوام کی سادہ لوحی سے کوئی اپیل کامیاب نہیں ہو سکتی جبتک ان کے سامنے خواہ تھوڑی دیر کے لئے کیوں نہ ہوں، کوئی رنگین بہانہ "کسی علم اور انصاف کی عمل سے پہلے ان کے سامنے پیش نہ کیا جائے، اور اس سے آرٹ کی اہمیت اور ضرورت ثابت ہوتی ہے، اس کا غیر ضروری ہونا ثابت نہیں ہوتا، یونانی آمر۔ ایران کے شاہوں اور ہندوستان کے سلطانوں کی طرح نہ ہی آرٹ کی محبت سے خالی تھے اور نہ ہی اپنی طاقت، وقار اور اقتدار کی برقراری میں اس "رنگین بہانے" کی اہمیت اور ضرورت کے احساس سے قاصر تھے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ آرٹ بھی دوسری چیزوں کی طرح مادی صورت میں آنے کے بعد بھلائی اور برائی دونوں کیلئے استعمال میں لایا جا سکتا ہے، یہ بھی سچ ہے کہ آرٹ کی وہ روح جسمیں زمانہ قدیم کے دیوتا اور ہیرو جنم لیتے تھے، زمانہ وسطیٰ میں بادشاہوں اور آمروں کے وحشیانہ اغراض کی تکمیل میں معاون ثابت ہونے لگی، لیکن اسکی ذمہ داری شاعروں سے زیادہ خود انسانی مزاج اور زمانہ پر ہے، شاعر کو بہرحال ایک ماحول میں رہنا پڑتا ہے اور خواہ وہ کسقدر آزاد ہو، اس کا پیغام کسقدر وسیع ہو وہ اس ماحول کی مجبوریوں سے جدا نہیں ہو سکتا۔

بہرحال آرٹ کی ایک لے ہوتی ہے، جو ہمیں اشتراک اور ہم آہنگی سے روشناس کرتی ہے — خیالات اور انکی پیشکش — کچھ خیالات پیشکش کی خاطر، الفاظ کی ترتیب اور زبان کی آرائش کی خاطر اور کچھ الفاظ اور زبان کے قوانین، خیال کی اہمیت اور تکمیل کی خاطر قربان ہونے چاہئیں، اگر یہ دونوں ہم آہنگ ہو جائیں تو ایک سچائی کو پابند کر کے ابدی درجہ دیدیتے ہیں، اور اسی طرح آرٹ کائناتی بن جاتا ہے، اور زمانے کی گود میں سوئے ہوئے حقائق اور نیم بیدار روحوں کو جگا کر اپنی پہنائی میں لے لیتا ہے۔ اس سلسلے زندگی اور انسانیت کی المیہ رفتار میں نظر انداز کرنا خودکشی کے مترادف ہے ●

تعلیم یافتہ آزاد خیال اور روشن دماغ ہمکو کے لیے در کار ہیں —!

منروا مووی ٹون کی تازہ ترین مزاحیہ تصویر
MINERVA PRODUCTION
عورتوں کی فتح اور مردوں کی شکست کا
طنزیہ شاہکار
ایک دلکش اور سبق آموز کہانی
سو فیصدی تفریح کیساتھ
اداکار۔ پرمیلا۔ صادق علی۔ بنرجی۔ گلاب
ایرچ تاراپور۔ برج رانی۔ سعادت علی۔ رمیش وغیرہ
الٹی گنگا
عنقریب آپ کے شہر میں نمائش کیلئے پیش کی جائیگی۔
آج تمام ڈائرکٹر پوچھ رہے ہیں
کہ
"ورجینا"
میں
مسٹر کے ایم۔ ملتانی
ہندوستان کے مایہ ناز ڈائرکٹر نے کیا کمال
کر دیا ہے کہ عوام نہایت شوق سے اسکا انتظار
کر رہے ہیں؟۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں
پردہ سیمیں پر قدیم روما کی ایسی حسین اور عجیب داستان
آئی نہیں ۔ دیوتاؤں اور انسانوں کی جنگ۔
محو حیرت کر دینے والے مناظر۔ یہ ہے ورجینا کی کامیابی کا ثبوت
بیرتاب فلمی دنیا کے درخشاں ستارے منجولا۔ ڈبلیو۔ ایم خان وغیرہ
ورجینا
منروا سنیماٹون میں
آرہا ہے

(گذشتہ سے پیوستہ)

از مولانا عبدالباری صاحب

دوسرا باب

مصر کے بالائی حصہ میں ابراہیم پاشا کا کاروبار نہایت فراخ تھا۔ روئی کی تجارت میں اس قدر ترقی کی تھی کہ لوگ انہیں روئی کا بادشاہ کہتے تھے۔ آدمی بڑے مخلص اور ان کو دولت کی بھی کمی نہیں تھی۔ زیادہ تر پیرس میں رہتے تھے۔ وہاں کی فضا ان کو خوب راس آئی۔ جلد سوسائٹی میں ہر دلعزیز ہوگیا۔ دن عید اور رات شب برات تھی۔ اسی عیش پرستی کے سلسلہ میں ایک نہایت حسینہ مس روز این مارشل سے آنکھیں لڑ گئیں۔ مس روز این بلا کی حسین تھی۔ حسن و زیبائی کے اکثر مقابلوں میں اس نے طرۂ امتیاز حاصل کیا تھا۔

یہی محبت شادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ابراہیم پاشا مس روز این پر اسقدر فریفتہ تھے کہ انہوں نے شادی سے پہلے یہی وعدہ کر لیا کہ اگر اس شادی سے لڑکا ہوگا تو اسکی تعلیم و تربیت مصری انداز پر ہوگی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۰ء میں ان دونوں کی شادی ہوگئی شادی کے بعد مس روز این نے بھی اپنی خدمت اور وفاداری کا پورا ثبوت دیا۔

شادی کے ایک سال بعد ۶ اپریل سنہ ۱۸۹۱ء کو رمضان کے مہینہ میں میڈم ابراہیم پادشا کو ایک چاند سا لڑکا پیدا ہوا۔ ابراہیم پاشا کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پاشا نے نومولود کی دیکھ بھال کا سامان بڑی کشادہ دلی سے کیا۔ لندن کے شاہی ڈاکٹر پروفیسر وارنہی اور ڈاکٹر ہملٹن مشہور ماہر امراض مخصوصہ کو زچہ اور بچہ کی نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا۔ انگلستان کی اسپتال سے تین نرسیں بلائی گئیں۔ مصر سے اس "دایہ" کو طلب کیا گیا جس نے خود ابراہیم پاشا کی پرورش و نگرانی کی تھی۔ اسکے علاوہ پانچ تندرست اور نوجوان عورتوں کو بھی دودھ پلانے کیلئے مقرر کیا گیا۔

پرورش کی اس صحت پرور فضا میں لڑکا اسی طرح بڑھتا رہا جسطرح دریا کنارے کی شاداب زمین پر پودے بڑھتے پھلتے اور پھولتے ہیں۔

ابھی ابراہیم بے کی عمر بارہ سال کی ہی تھی کہ وہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے زیادہ طاقتور معلوم ہونے لگا۔ حبشی نوکروں کے چھوکرے جو اسکے ہاں نوکر تھے، اکثر اسکی طاقت کا نشانہ بنتے۔ ایکبار اُس نے ایک ہم عمر چھوکرے کو اس بُری طرح پچھاڑا کہ غریب نے اسپتال میں جا کر دم لیا۔ پاشا اپنے لڑکے کی شہزوری اور جواں مردی پر بہت خوش ہوتے۔ ایک دن وہ خوشی میں اپنی بیوی سے بولے کہ

"دیکھو خالص مصری خون اسکی رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ ایک مرتبہ ٹامس نے اسی طرح سات برس کی عمر میں اپنی دودھ ماں کی چھاتی پر گرم پانی انڈیل دیا تھا"

بیوی کو خاموش اور اداس دیکھکر، انہوں نے اور بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا کہ

"لیکن یہ مشرقی جوہر مجھے اس وجہ سے باز نہیں رکھ سکتا جو میں نے تم سے کیا ہے۔ اسکی تعلیم و تربیت جامعہ ازہر کی بجائے

لیکن اور تیزی میں ہی ہو گی ، اسکی صورت مشرقی ہو تو ہو لیکن
اسکی سیرت مغربی سانچے میں ہی ڈھلیگی ۔

~~~

نوجوان ابراہیم نے ایٹن ، اور کیمبرج میں پانچ سال
تعلیم حاصل کی ۔ یہاں اسکو بتایا گیا کہ صرف برطانیہ عظمیٰ ہی دنیا میں
تہذیب و شائستگی کا گہوارہ ہے اور انسانی شرافت و بلندی
صرف برطانوی قوم میں پائی جاتی ہے ۔ اور فرانس دنیا میں صرف
نمائش اور تصنع کیلئے مشہور ہے اور اس ظاہری چمک دمک
کی تہہ میں کوئی ٹھوس جوہر نہیں ہے ۔ استادوں نے تو کمسن
ابراہیم کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ "خدا بھی انگریز قوم کا تھا"
جس نے چھ دن کے بعد اتوار کا دن صرف تفریح و مذاق کیلئے
بنایا ۔ اسی لئے انگریز ، جب اتوار کے دن فٹ بال یا کسی
دوسرے کھیل میں مشغول ہوتے ہیں تو آندھی آئے ، طوفان آئے
دھاوا ، بارش ، سلطنت تباہ ہو یا دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے ،
یہ ٹس سے مس نہیں ہوتے ۔

جیسے چکنے گھڑے پر پانی کی بوند نہیں ٹھہرتی ابراہیم بے
پر بھی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ کیونکہ اسکی پرورش فرانسیسی
ماں کی گود میں ہوئی تھی ، جہاں اُس نے ، گفتگو کے تجزیہ کا ذوق
باتوں میں تسلسل و ربط کا انداز اور صاف اور سلجھی ہوئی ترکیب
ورثہ میں پائی تھی ۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ برطانوی نظریہ یا استدلال
کو یا تو بالکلیہ تسلیم کرنا پڑتا ہے یا سرے سے رد کرنا ہوتا ہے ۔
یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اسکے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ، بعض حصوں کو
قبول کر لیں اور بعض حصوں سے انکار کر دیں ۔ برطانوی نظریات
تو مسلم ہی حلق سے فرو کرنا ہوگا ، اگر آپ اسکو چبائیں گے تو پھر
تھوکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ، کیوں کہ زبان اسکا اصلی ذائقہ
پہچان گئی ۔ ابراہیم بے کی تو حالت یہ تھی کہ ہر روز اسکو کچھ نہ
کچھ تھوکنا ہی پڑتا تھا ۔ کبھی مل یا اسپنسر کے نظریے کو کبھی میکالے
اور کارلائل کے خیالات کو ۔۔۔

انگریزوں سے ابراہیم بے کی نفرت کا سبب بعض
جذباتی باتیں بھی تھیں ۔۔ مثلاً اسکی ماں کو بھی انگریزوں سے نفرت
تھی باپ کو بھی ، اسنے تو ترکی جنگ میں انگریزوں کی شکست پر
خوشی ہوتے دیکھا تھا ۔

~~~

جب وہ سترہ سال کا ہو گیا تو وہ اپنے سکریٹری کے ساتھ
پیرس واپس آیا ، اور انگلستان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا
ابراہیم بے نے پولو کے گھوڑے اور دوسرے کھیل کے سامان
سب پیرس منگا لئے گئے ۔ وہ فرنچ اور فرانسیسی وعربی تو گویا اسکی
مادری زبان تھیں ، چنانچہ پیرس میں بھی کچھ دنوں کالج میں حاضری دی
ایک دن وہ انسانی دماغ کی نفسیاتی بے ربطی پر لکچر سن
رہا تھا ، سنتے سنتے کتابیں فرش پر پھینک کر وہ کالج سے باہر نکل
آیا ۔ وہ سوچنے لگا کہ باپ تو "ملک التجار" ہے پھر میں اس مہمل
موضوع پر اپنا سر کیوں کھپاؤں ۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اسکے سکریٹری کو معلوم ہوا تو وہ
اُسکی تلاش میں نکلا ، ابراہیم بے قریب ہی ایک گلی میں مل گیا ۔
اس وقت وہ ایک خوبصورت چھوکری سے باتیں کر رہا تھا ۔
بات کرتے ہوئے یہ دونوں پاس کے ایک شراب خانے میں پہونچے ،
سکریٹری بھی اسی میز کے پاس بیٹھ گیا ، ابراہیم بے کو سکریٹری کی یہ
دخل اندازی پسند تو نہ تھی ، مگر اسکو اسکی کوئی پروا بھی نہ تھی ۔۔
دونوں انگریزی میں باتیں کرنے لگے تاکہ وہ چھوکری نہ سمجھ سکے ،
سکریٹری نے کہا کہ ۔۔۔ "پیرس میں آتے ہی تم نے ہاتھ پاؤں نکالے"

بات یہ ہے کہ انگلستان میں مجھے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ وہاں کے کمروں میں کافی ورزش ہو جاتی تھی۔ چول چول ڈھیلے ہو جاتے تھے۔ چار گھنٹے کرکٹ، یعنی پانچ گھنٹے ٹینس کھیلنے کے بعد کرکٹ زدہ بازو اور ٹینس زدہ پاؤں کو آرام دینے کے [illegible] کمبخت کو کچھ اور سوجھتا تھا ایسے تو ہو سکتا ہے خیال تو ہو [illegible] بھی نہیں آسکتا، لیکن یہاں کی حالت کچھ اور ہے ۔۔۔ جانتے ہو کہ یہاں کیا خرچ کر رہا ہوں؟

کوئی پانچ ہزار فرانک ماہانہ۔

نہیں میرا مطلب فرانک سے نہیں بلکہ [illegible] سے ہے محنت و مشقت سے۔ یہاں کوئی [illegible] نہیں آرام [illegible] چین سے وقت گزرتا ہے۔ دماغ [illegible] خیالات [illegible] اور دل طرح طرح کی تمناؤں کی جولانگاہ بنتا [illegible] پھر یہاں کی گلی گلی کوچہ کوچہ ایک ایک کیوپڈ [illegible]

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

انگلستان میں شریفوں [illegible] ناچ میں گلابی گالوں والی لڑکیوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا، لیکن ۔۔۔ بہت ہوا تو کسی کا ہاتھ دبا دیا۔ کسی کے دو چار پیار لے لئے، کسی کو ذرا گھور کر دیکھ لیا یا کسی کو چپکے چپکے بانہوں میں دبا لیا ۔۔۔ اور بس۔ ۔۔۔ لیکن یہاں تو شام ہوتے ہی مستی انگیز جلوے اس طرح پیچھا کرتے ہیں جیسے بھوکی شیرنی ابھی پنجرہ سے نکلی ہو ۔۔۔ میرے فادر، تو میرے دادا کے پاس سات "حرم" تھیں اور سرکیشیا کی پچاس چھوکریوں سے عشق کا قصہ تو الگ ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ آپ ایسی ذلیل اور آوارہ چھوکریوں کو منہ لگائیں۔

تو کیا تم اس سے بہتر چیز مہیا کر سکتے ہو؟

لیکن پہلے تو مجھے قاہرہ، بڑے حضور کے پاس تار دینا ہوگا۔

~~~~~~~~

دوسرے دن سکریٹری نے ابراہیم پاشا کو یہ تار بھیجا۔

"ابراہیم بیے اب جوانی کی رنگ رلیوں میں پھنسنا چاہتا ہے، نہایت ادب سے، آپکی ہدایت اور بجٹ کا انتظار کر رہا ہوں"

اس تار کا جواب بھی آگیا کہ:۔

"میڈم کولمین، خدیو کی دلالہ سے ملو، جو ریو اہیبرگ میں رہتی ہے، وہ جس کو پسند کرے، اسکا طبی معاینہ پروفیسر [illegible] سے کرالو۔ خرچ کا کچھ خیال نہ کرو۔ تفصیلی رپورٹ بعد میں بھیجنا"

سکریٹری بیچارہ بہت ایماندار اور شریف آدمی تھا لیکن حکم کا بندہ کیا کرتا، ہدایت کے مطابق وہ میڈم کولمین سے ملا۔ یہ میڈم بڑی ذات بزرگ تھیں، خدیو کے افسروں کیلئے چھوکریوں کا مہیا کرنا انہیں کے سپرد تھا۔ بڑی بی اس کام کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھیں کہ ہر شخص ان کی پسند اور انتظام کا مداح تھا ۔ اور کیوں نہ ہو، سالہا سال کا تجربہ بھی تو تھا۔

میڈم کولمین کو جب ابراہیم پاشا کی ہدایت کی ملی تو وہ حیرت اور خوشی سے پھول گئی۔ سکریٹری سے کہا کہ:۔

"اس راہ میں باپ کی رہنمائی بھی میں نے کی تھی اور اب بیٹے کی "تربیت" بھی میرے سپرد ہوئی ہے۔ پاشا کیلئے میں نے ایک سے ایک حسین لڑکی مہیا کی، مگر پاشا کا جی نہ بھرتا تھا ۔ ان کیلئے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا لیکن ان کی نظر میں کوئی کاہے کو جچتی ۔۔۔ آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا ۔۔۔ پاشا نے جوانی میں جو اودھم مچایا تھا وہ ابتک یاد ہے۔ بیٹا بھی آخر
~~~~~~~~

باپ بھی پر جائے گا ۔۔۔ اسکی عمر ۱۷ سال کی ہے ۔۔۔ ہے نا ؟ ۔۔۔ تم کہتے ہو کہ ابتک حسین لڑکیوں سے زیادہ اسپورٹ اور کھیل کود کا شوق رہا ہے ، ہوگا ۔۔۔ یہ اسپورٹ ، میرے پیشہ میں اکثر روڑے اٹکاتا ہے ، جسکو اسپورٹ کی چاٹ لگ گئی وہ وہ اس گھاٹی میں بہت کم اترتا ہے ۔۔۔ خیر دیکھا جائیگا ..

۱۷ سال ؟ ۔۔۔ اس عمر کے بے پناہ جذبات کے سامنے عقل و احتیاط کی سنگین دیواریں بھی ، خیر مقدم کیلئے جھک جاتی ہیں ، یہی وہ زمانہ ہے کہ جب جنسی ترغیبات سے زیادہ موثر کوئی چیز نہیں ہوتی ۔ انسان سوچتا کچھ اور ہے کرتا کچھ اور ہے ۔ پاؤں رکھتا کہیں ہے اور پڑتا کہیں ہے ۔ آہن و کہربا میں اتنی کشش نہیں ہوتی ، جتنی ایک جوان مرد اور جوان عورت میں ۔۔۔ عورت ، تو بہت دور ہے اُسکے بلاؤز ، پیٹی کوٹ ، گون کے ایک ٹکڑے کی قیمت بھی اسکی نگاہ میں ....

سکریٹری نے بات کاٹ کر کہا کہ :۔

"تو آخر ہونا کیا چاہئے"

میڈم کولین نے اپنے رجسٹر کو دیکھکر کہا کہ :۔

"آئرن لیلی ۔۔۔ نہیں ، وہ تو بہت لاپرواہ ہے ، جب اسکو کوئی بل چکانا ہوتا ہے تو باہر نکلتی ہے ۔۔۔

نادن ونجی ؟ ۔۔۔ ہے تو حسین اور بہت حسین ۔۔۔ لیکن وہ نوجوانوں کو پسند ہی نہیں کرتی ، میں تو اسکو عیاشی کا کالج کہتی ہوں ، جہاں بہت سے ابتدائی مدارج طے کرنیکے بعد انسان پہونچتا ہے ۔۔۔ تو سی لی میر ؟ ۔۔۔ حسین شوخ اور بڑی رسیلی ہے ۔۔۔ لیکن بیگم تالا بار کیا کم ہے ؟ اٹھتی جوانی ، گدرا بدن ، بڑی بڑی آنکھیں ۔۔۔ بس یہی ٹھیک ہے"

میڈم کولین کی پسند کی ہوئی عورت ، بیگم تالا بار سے ملکر سکریٹری نے کل معاملات طے کرلئے ، طبی معائنہ بھی ہوگیا ، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ابراہیم بے کو بھی وہ پسند تھی ۔

اس معاملہ کی خبر ابراہیم پاشا کو دے دیگئی ۔ وہاں سے پانچ سو پونڈ کی منظوری بھی آگئی اور یہ ہدایت کی گئی کہ بیگم تالا بار سے معاہدہ پر دستخط کرالو کہ ان کی توجہ و التفات صرف ابراہیم بے پر ہوگی ۔

غرضکہ ابراہیم بے کی رومانی زندگی کا عجیب طرح آغاز ہوا ۔۔۔ نہ تو پہلی نگاہ محبت ، خرمن دل پر بجلی گری ، اور نہ ہمدردی و رفاقت نے محبت کی شکل اختیار کی ۔۔۔ اصل میں تو یہ حسن ۔ محبت کا کرشمہ تھا ہی نہیں ۔۔۔ نہ حسن کی جلوہ پاشیاں نہ عشق کی جانبازیاں ۔۔۔ نہ ادھر انکار و تمکنت ، نہ اُدھر اصرار و عاجزی ۔ ۔۔۔ سودا تھا ، قیمت دی گئی اور خرید لیا گیا ۔

بیگم تالا بار کے ساتھ آٹھ مہینے تک دن عید اور رات شب برات رہی ۔۔۔ ابراہیم بے اب وہ کیمبرج کا متین طالب العلم نہ تھا بلکہ عیش پرستی کا پیکر ، اور آوارگی و بدی میں غرق ۔۔۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اس رنگ میں اپنے باپ سے بھی بازی لے گیا ۔

بیس سال کی عمر میں پاشا نے اسکو فرینچ کاٹن ایکسچینج میں اپنا نمائندہ بنادیا تھا مگر ؎

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے
وہ کمبخت چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

چنانچہ "سود و زیان" کے نازک مسئلہ کو ایک یہودی کے سپرد کرکے اپنا پیچھا چھڑا لیا ۔

اب ابراہیم بے اپنی ماں کی خواہش کے مطابق

سوال یہ ہے کہ ہند ابتک ہوا نہ آزاد کیا سبب ہے
جواب یہ ہے کہ اسکی قوموں میں اتحاد و عمل ہی کب ہے

سوال یہ ہے کہ دشمن ہے کس واسطے ہمارے لئے پپنیا
جواب یہ ہے کہ چار جانب ہے اپنی ڈفلی تو راگ اپنا

سوال یہ ہے کہ لوگ مل بیٹھنے پہ تیار کیوں نہیں ہیں
جواب یہ ہے کہ اٹھ گیا ہے دلوں سے ایثار یوں نہیں ہیں

سوال یہ ہے وطن کی خدمت میں مذہبی مار دھاڑ کیسی
جواب یہ ہے شکار کے واسطے ہے ٹٹی کی آڑ کیسی

سوال یہ ہے کہ ہوتے رہتے ہیں آئے دن یہ فساد کیسے
جواب یہ ہے، مٹے تباہی سے کم نصیبوں کو داد کیسی

سوال یہ ہے کہ اب وہ اخوت وہ بھائی چارہ نہیں ہے باقی
جواب یہ ہے کہ امتیاز جنوں کا پانا نہیں ہے باقی

سوال یہ ہے کہ عام کیوں ہی یہاں تعصب کی رو میں بہنا
جواب یہ ہے کہ گھٹیوں میں پڑا ہوا ہے "غلام رہنا"

سوال یہ ہے کہ لٹھ لئے پھر رہے ہیں کیوں پاسبان قومی
جواب یہ ہے کہ یہ بھی ہے ایک حیلہ "رازدان قومی"

سوال یہ ہے کہ روز افزوں عبث یہ دین و دھرم کے جھگڑے
جواب یہ ہے چکے نہیں ہیں کبھی خدا اور صنم کے جھگڑے

سوال یہ ہے یہ ناشناسی یہ بغض یہ اختلاف کب تک
جواب یہ ہے۔ خطا ہماری خدا نہ کرے معاف تا بہ تا کہ

سوال یہ ہے کہ ایک ہندوستان لیڈر ہزار یہ کیا؟
جواب یہ ہے کہ ایک مختار ملک پر اعتبار! یہ کیا؟

سوال یہ ہے کہ نکتہ چینی و عیب بینی ہے او بھارت
جواب یہ ہے کہ روپیہ پیسے ہی دھارتی ہے غلط تجارت

سوال یہ ہے کہ فتحیابی کا خون کرنا ثواب ہی کیا
جواب یہ ہے کہ بات معقول ہو تو اسکا جواب ہی کیا؟

عورتوں کے کام کی باتیں

(از شریمتی رامیشوری نہرو صاحبہ)

شریمتی رامیشوری نہرو صاحبہ نے آل انڈیا ویمنز کانفرنس بنگلور کے پندرھویں اجلاس میں جو صدارتی تقریر کی تھی وہ نہایت اہم اور ضروری تھی اسکا ترجمہ مختصر طور پر ہدیۂ ناظرین ہے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس عالم " اور انسانیت کی ترقی کیلئے سب کی امیدیں نگاہیں صرف عورت کی ہی طرف اٹھتی ہیں، جو کام نبی اور پیغمبر پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے اسے عورت پورا کر سکتی ہے، تو پھر عورت اپنے عظیم الشان فرض سے غافل کیوں ہے، کس نے اسکے فرض ادا کرنے میں رکاوٹ ڈالی اور عورت کی بے پناہ قوت تخلیق و تعمیر نے اس رکاوٹ کے پرخچے کیوں نہ اڑا دیئے، کیوں نیکی پر بدی کو فتح پانے دیا؟

عورتوں کو چاہیئے کہ اب وہ خود اٹھیں اور اس جنگی نظام کو درہم برہم کر کے رکھدیں جو ایسے ناتربیت یافتہ مرد بچوں نے دنیا اور انسانیت کی تباہی کیلئے قائم کر رکھا ہے۔ مرد اسکے لئے بالکل ناموزوں ثابت ہوئے ہیں اس لئے اب عورت کو خود کام کرنا چاہیئے اور نظام دنیا کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے قدموں کے نیچے اس دنیا کو سب کے لئے جنت بنانا چاہیئے۔

امید ہے کہ ہماری بہنیں اس مضمون کا نظر عمیق سے مطالعہ فرمائینگی اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرینگی ——— (مدیرہ)

بہنو، ماؤں اور دوستو!

میں چاہتی تھی کہ آپ لوگوں سے ہندوستانی میں مخاطب ہوں، مگر افسوس کہ ابھی ہندوستان میں اشد ترین ضرورت کے باوجود ہم کوئی ایسی زبان پیش نہ کر سکے جو تمام ہندوستان میں یکساں بولی اور سمجھی جا سکے اسلئے مجھے مجبوراً انگریزی سے مدد لینا پڑیگی امید ہے کہ آپ میری غلطیاں معاف فرمائینگی لیکن وہ وقت زیادہ دور نہیں جبکہ ہندوستانی ہندوستان کی عام زبان ہوگی اور جنوبی ہندوستان میں بھی یہ اچھی طرح بولی اور سمجھی جائیگی

آج ہم نہایت نازک موقع پر مل رہے ہیں، بے حد خونریزیاں ہیں، انسانیت کے دماغ پر بہیمیت کا قبضہ ہے اور ہم ان حالات سے متاثر ہو کر اپنے دل و دماغ پر ایک قسم کی اداسی اور رکاوٹ سی محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن اس تخریبی دور میں بھی دنیا اپنے کام میں مشغول ہے اور ہمیں بھی ان تمام پریشانیوں کے باوجود اپنا فرض ادا کرنا ہے چنانچہ اسی فرض کی تکمیل میں آج ہم یہاں موجود ہوں، اس کانفرنس کے ساتھ میرا بہت دراز اور نہایت قریبی تعلق رہا ہے، مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ میں اس طویل عرصہ میں کانفرنس کی وہ خدمت نہ کر سکی جو مجھے کرنا چاہیئے تھی۔ آپ نے اصل میں مجھے اس کانفرنس کا صدر بنا کر جو عزت بخشی ہے اسکا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں، کسی آل انڈیا کانفرنس کا صدر بننا بڑی ذمہ داری کا معاملہ ہے اور یہی ذمہ داری مجھے اپنے فرائض کے بار کو اٹھانے میں مدد دے رہی ہے مجھے افسوس ہے کہ آج میں اپنے بعض

مخلص اور صلاح فکر کارسے الگ ہوئی جن سے قیمتی اور مفید مشورے مجھے بڑی مدد دیسکتے تھے آج وہ جتنا میرے ساتھ نہیں کیونکہ وہ اپنے دیس کی اور جگہ "خدمت کر رہے ہیں لیکن انکی عزت ہمارے دلوں پر محکم ہے۔ وہ امن کے سپاہی ہیں اور ہمیں انپر فخر ہے۔

مجھے اُن بہنوں کا بھی خیال ہے جو مشرق بعید یا مغرب بعید میں ہیں آج انسانوں پر یہ بہیمیت طاری نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ آج ان میں سے کچھ نہ کچھ یہاں ہوتیں۔ آج انکی جدائی مجھے بری طرح محسوس ہو رہی ہے۔ وہ بہنیں جو اپنے بچوں اور بزرگوں کے ساتھ آتشین بموں کی بارش میں زندگی گذار رہی ہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں اُن کی تکالیف کا احساس نہیں ہے اور ضرور ہے ہم جب ان بےکسوں کی تصاویر دیکھتے ہیں تو ہمارے دل تڑپ اٹھتے ہیں، میں انفرادی طور پر اور اس کانفرنس کے ذریعہ انہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہماری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ اور ہم ہمیشہ ان کے غم میں شریک ہیں۔

یہاں کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں ہم پر ان کا کافی اثر ہے۔ ہم سیاست میں کسی جماعت یا پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن بحیثیت ہندوستانی اور عورت ہونے کے ہم ان مسائل سے قطعی بے بہرہ نہیں رہ سکتے، جو ملک کیلئے اشد ضروری ہیں۔ سوال نا اتفاقی کے ہم قائل ہوں یا نہیوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقریر و تحریر کی آزادی ایک اہم مسئلہ ہے جس کے لئے آج ملک کے سپوت اور بہادر خواتین آہنی سلاخوں کے اس پار اپنی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ ان محبان وطن کی گرفتاری پر ہمارے دل خون کے آنسو روتے ہیں جواہرلال اور دیگر لوگوں کی طویل سزاؤں کو سنکر عورتیں جو ملک کی آزادی کے لئے لڑ رہی ہیں خاموش نہیں رہ سکتی اور اپنی آواز اس غلط نظام کے خلاف اٹھا رہی ہیں میری دلی آرزو ہے کہ یہ غلط دور جلد ختم ہو اور حکومت کی باگ ڈور

کو دماغ سنبھالیں۔

وہ چھوٹے چھوٹے ممالک جو اپنی آزادی کی جدوجہد میں اپنے جان و مال کی قربانی دے چکے ہیں ان کی عزت ہمارے دلوں میں موجود ہے ان میں سے بعض نے اپنی زندگی کا خون خود کو آزاد رکھنے کیلئے بہا دیا لیکن افسوس کم طاقت بڑی طاقت کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور پھر تشدد ہی فاتح ہوا۔ اس لئے ہمیں اسکے سوا کوئی اور چیز تلاش کرنا ہوگی جسے کسی اور موقع پر واضح کروں گی۔

لنکا سے آئی ہوئی بہنوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے میرا دل مسرت اور فخر سے بھرا جا رہا ہے۔ ہندوستان اور لنکا کوئی غیر نہیں، آج سے نہیں بلکہ عہد تاریخ سے بھی قدیم زمانہ میں بھی ان دونوں ملکوں میں ربط و ضبط قائم تھا۔ اور مجھے پوری امید ہے کہ ان بہنوں کی اس کانفرنس میں شمولیت سے ہمارا اتحاد و اتفاق اور بھی مستحکم ہو جائے گا۔

آج اگر بین الاقوامی حالات ناسازگار نہ ہوتے تو آج اپنے درمیان مادام چیانگ کائی شیک کو دیکھ کر ہماری خوشیوں کی انتہا نہیں ہوتی، پچھلی دفعہ جب ہم نے انکی خدمت میں دعوت نامہ پیش کیا تھا تو انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ پہلی فرصت میں وہ ہم سے ملیں گی۔ گذشتہ اجلاس الہ آباد میں ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان سے ایک وفد چین جائے اور اسکے استقبال کا انتظام مادام نے نہایت اعلیٰ طور سے کیا تھا۔ اکتوبر میں ہم لوگ وہاں جانے والے تھے تاکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اس ملک اور وہاں کی ——— بہادر عورتوں اور مردوں کے ساتھ اپنا جذبہ خلوص و ستائش پیش کریں اور یہ بتلائیں کہ وہاں کے مرد اور عورتوں نے اپنے ملک کیلئے جس بہادری سے تکالیف و کلفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جاپان کا مقابلہ کیا ہے اسکی ہمارے دلوں میں قدر و منزلت ہے مگر افسوس حالات

نا سازگار ہونے کے سبب سے ہمیں یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

آج اس کانفرنس کے وجود کو چودہ برس ہوگئے ہیں۔ لوگوں کیلئے یہ کوئی طویل زمانہ نہیں تاہم جب اس زمانہ سے قبل کیطرف نظر ڈالتی ہوں تو آج بہت فرق پاتی ہوں۔ اس قلیل سے عرصہ میں عورتوں نے بہت ترقی کرلی ہے۔ شروع شروع میں نسوانی تحریکیں مردوں ہی کی قیادت میں انجام پاتی تھیں لیکن اب عورتوں نے تمام کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ آج عورتیں زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہیں اور بعض شعبوں میں تو حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یوں تو شروع ہی سے بہت سے ادارے عورتوں کیلئے کام کر رہے تھے لیکن اسوقت آل انڈیا کانفرنس کا خیال بھی ایک عجیب چیز تھا کیونکہ ان اداروں میں باہمی اتحاد مفقود تھا۔

آج عورتیں کافی ترقی کرچکی ہیں اور ہمیں اسپر فخر ہے۔ اب عورتوں میں تعلیم عام ہوچکی ہے پردہ رفتہ رفتہ اٹھتا جارہا ہے اور عورتیں سیاست، تجارت، ملازمت غرضکہ سب ملکی اداروں میں موجود ہیں، شادی کی عمر کے لئے بھی قانون بن چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں مارواڑی عورتوں کی اینٹی پردہ کانفرنس اور ان کا گھوڑوں پر سوار ہوکر جلوس نکالنا ایک معجزہ سے کم نہیں اور صاف پتہ چلتا ہے کہ عورتیں اب بیدار ہوچکی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ یہ تمام ترقی محض ہماری کانفرنس کی مرہون منت ہے کیونکہ اور بھی کئی چیزیں اس ترقی میں حصہ دار تھیں۔ ہماری کانفرنس کا تو یہی کام ہے کہ اس نے عورتوں کی اس تحریک کو ایک خاص اجتماعی شکل دے دی اور لوگوں کو نسوانی مسائل کیطرف متوجہ کردیا آج اس کانفرنس کو فخر حاصل ہے کہ کانفرنس کے پرچم تلے جسقدر تعداد عورتوں کی ہے اتنی کسی اور آل انڈیا کانفرنس میں نہیں ہے۔ اس کانفرنس کے سالانہ اجتماع میں دور دور سے امیر غریب ہر قسم کی عورتیں شرکت کرتی ہیں اور خود میں توانائی محسوس کرتی ہیں۔ کانفرنس کی چھوٹی شاخیں بھی سالانہ اجلاس کرتی ہیں اور یہ اجلاس خوابیدہ عورتوں میں احساس بیداری پیدا کردیتے ہیں اور آپس میں یگانگت اور اتحاد کو اور طاقتور بنا دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ مسرت خیز امر یہ ہے کہ ہم میں مزدور عورتوں کی تعداد بھی کافی ہے اور وہ بھی بڑے شوق سے اس میں حصہ لیتی ہیں اور ہم بھی ان کے حقوق کے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

کانفرنس نے اپنا دائرہ نظر اور وسیع کرلیا ہے۔ اور اب وہ نسوانی مسائل کے علاوہ عالمگیر انسانیت کے مسائل پر بھی غور کرتی ہے اور اس چیز نے اسمیں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ کوئی بھی قومی ادارہ خواہ وہ عورتوں ہی کا کیوں نہ ہو یہ نہیں کرسکتا کہ اپنے کو صرف نسوانی مسائل ہی تک محدود رکھے۔ ایک زندہ ادارہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ بڑھے، وسیع ہو، اور ترقی کرے۔ لہٰذا قدرتی طور پر بھی ہماری کانفرنس نے عالمگیر مسائل پر غور و فکر کرنا شروع کیا۔ دہلی کے موقع پر جو فیصلہ کیا گیا اور دیگر شاخوں نے جو اس عرصہ میں ششماہی اور سالانہ جلسوں میں قرار دادیں پاس کیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ نے کس طرح ہمارے دلوں کے عمق پر اثر کیا ہے اور ہم اس انسانیت کشی پر کتنے متاسف ہیں۔ ہم ہمیشہ سے تشدد کے مخالف رہے ہیں اور بار بار چیخ کر عدم تشدد کی حمایت کی ہے۔ کاش ہماری کمزور دنیا سن سکتی سمجھ سکتی ——!

امسال کیا کیا کیا گیا اسکی مفصل رپورٹ آپ لوگ ابھی سیکریٹری کی زبانی سنیں گے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا خاص میدان سوشیل اور تعلیمی مسائل ہیں اور انہی تجاویز میں ہم نے اسپر

کافی زور دیا ہے۔ ان مسائل کو ہم نے کہاں تک سلجھایا ہے نہیں کہہ سکتے۔ یہ مسائل بیشمار اور نہایت پیچیدہ ہیں اور ہم تو کیا کوئی حکومت بھی پوری طور پر کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ ان مسائل کے علاوہ اور بہت سے باعث ہیں جن کا یہاں ذکر کروں گی۔

تعلیمی میدان میں ہم نے بہت زیادہ محنت کی اور اکثر جگہ ابتدائی تعلیم کو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے جبری بنوایا۔ اسکولوں میں تجربہ کار ماسٹر رکھنے پر زور دیا اور حفظان صحت کے اصولوں کے تحت اسکول بنانے کا مطالبہ کیا اور اسمیں ہم بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ فنون لطیفہ اور ڈومیسٹک سائنس صوبجاتی زبانوں کو یونیورسٹی کے کورس میں اختیاری مضمون کا درجہ دیا۔ لڑکیوں کے لئے دارالاقامہ وغیرہ غرضکہ ایسی ہی اور بہت سی چیزیں ہمارے ہی ریزولیشنوں کی مرہون منت ہیں۔ بہت سی جگہ موسیقی، سینا پرونا ہندوستانی اور انگریزی جماعتیں جاری ہیں۔ نئی دہلی میں لیڈی ارون کالج ایک مثال ہے کہ گھریلو تعلیم، تعلیم نسواں میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔

سوشیل طور پر بھی ہم نے بہت محنت کی ہے اور بہت سی فرسودہ و تکلیف دہ رسم و رواج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے وہ ہے دوہرا ووٹ۔ جہیز۔ پردہ۔ کمسنی کی شادی وغیرہ وغیرہ اور اخلاقی مساوات پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسمیں ہم بعض جگہ قانون سے مدد دینا پڑی ہے گو میں قانون سے بجائے پروپیگنڈے کو بہتر خیال کرتی ہوں۔ وراثت اور طلاق کے قوانین کے متعلق ہم ہمیشہ اسمبلی میں بل پیش کرتے رہے ہیں اور ان میں ترمیم کرائی گئیں۔ اسکے علاوہ یہ بھی ٹھیک ہے جیسا کہ میرے دوسرے ممبروں کا خیال ہے کہ ایک نیا قانون بالکل موجودہ قانون کی طرح بنایا جائے جس میں مرد اور عورت کے حقوق میں بالکل مساوات ہوں اور یہ قوانین انفرادی طور پر قبول کئے جائیں تاکہ آگے چلکر رائج ہو سکیں۔ بچوں کے لئے آمدورفت کے قوانین میں ترمیم، دیوداسی رواج کی تردید اور دیگر کئی چیزیں ہمارے دھیان میں ہیں مثلاً مزدور عورتوں کی تولید کے سلسلہ میں خاص رعایتیں اور آسانیاں بہم پہنچانا وغیرہ۔

اب ان چیزوں سے جنکا میں نے نہایت اجمالی طور پر ذکر کیا ہے صاف ظاہر ہے کہ ہمارا کام کسقدر بڑھا ہوا ہے۔ اور جب کام کی فراوانی ہو تو عملی کام اکثر کم ہوا کرتا ہے چنانچہ ہمارا کام بھی زیادہ تر بحث و نظریہ پر مشتمل ہے۔ اس سال کے لئے ہمارا موضوع گھریلو مصنوعات کا فروغ، فرقہ وارانہ ذہنیت کا اختتام اور چھوت چھات کا خاتمہ ہے۔

چھوت چھات خاص میرا موضوع ہے اور میں اچھوتوں کی خدمت کو بھگوان کی پوجا کا درجہ دیتی ہوں اور یہ خدمت کرنے کے بعد اپنی روح کو ایک جانگسل بار سے ہلکا محسوس کرتی ہوں۔ ہمارے اچھوت بھائی اور بہنیں عرصہ سے ہمارے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، اب ہمیں ان کے ساتھ خلوص اور مساوات برتنا چاہیئے۔ قومی و ملکی آزادی کے لئے بھی چھوت چھات کا فقدان نہایت اہم ہے۔ بہت سی جگہ یہ کام ہو رہا ہے اور میں خاص طور پر اپنی دیگر بہنوں سے التجا کرتی ہوں کہ وہ بھی اسکو ضروری خیال کریں اور میرے بیان کی تصدیق کریں۔

چھوت چھات کی طرح فرقہ وارانہ سوال بھی نہایت اہم ہے اور آزادی کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سوال جتنا اہم ہے اسیقدر پیچیدہ بھی، کیونکہ اسمیں مذہب سیاست اور اقتصادی دُوریاں بھی شامل ہیں تاہم کوشش کرنے پر کوئی چیز ناممکن نہیں رہتی چنانچہ میں نہایت فخر کیساتھ اعلان کرتی ہوں کہ اس کانفرنس میں ہر فرقہ کی عورتیں موجود ہیں، لیکن ہم میں سے کسی کی بھی فرقہ وارانہ ذہنیت نہیں ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم اپنی ذہنیت کو زیادہ وسیع نہ کر سکے اور اسے عالمگیر نہ بنا سکے دوسرے یہ کہ میں نمائندگان میں

مسلم خواتین کی بہت اقلیت دیکھ رہی ہوں اور یہ چاہتی ہوں کہ مسلم خواتین زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور آئندہ سال کثیر تعداد میں ممبر بن چکی ہوں اور اسطرح ایک ہی ملک میں رہنے والی دو بہنیں اور زیادہ قریب آجائیں ۔

اقتصادی ترقی کیلئے میں نے گھریلو صنعتوں کو لیا ہے میں فی الحال گھریلو صنعتوں کی خوبیوں اور امکانات پر بحث نکرونگی لیکن اس صنعت کا سب سے بڑا نمونہ "کھدر" ہے۔ شدید رنج ہے میں دیکھتی ہوں کہ اکثر بہنیں کھدر استعمال نہیں کرتی ہیں میں انکی توجہ اسطرف دلاتی ہوں ۔ یہ کانفرنس اگر تمام کھدر میں ملبوس ہوتی تو بجائے خود ایک "دعوت نظارہ" ہوتی ۔ کھادی سے ہماری اس محبت اور مخلصانہ جذبہ کا پتہ چلتا ہے جو ہمیں اپنے ملک اور وہاں کے غریب لوگوں سے ہے ، میں یہ بھی کہوں گی کہ سوت کاتنا بھی ایک طرح کی روحانی تعلیم ہے اور ہمیں روزانہ ضرور تھوڑا بہت کاتنا چاہیئے ۔

گھروں کا معاملہ بھی نہایت اہم ہے ہندوستان کی کثیر التعداد آبادی اسوقت ایسی ہے جو بہت سے ایسے ۔۔۔ کوئی جگہ نہیں ہے یا وہ صرف تاریک اور مختصر سے ہیں جنہیں گھروں کے نام سے پکارا جاتا ہے یا سڑکوں کی فٹ پاتھ ۔ اس کانفرنس کا مقصد یہی ہے کہ وہ اس معاملہ کو گورنمنٹ کے سامنے رکھے اور زمیندار یا مالگذار جو ہے مزدوروں سے چار روپے سے آٹھ روپے تک گھروں کا کرایہ لیتے ہیں اسے معاف کرایا جائے اور انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے مزدوروں کے لئے رہائش کا تسلی بخش و صحت افزا انتظام اپنی طرف سے کریں ۔

اب میں چند لفظ عدم تشدد کے متعلق کہونگی ۔ عدم تشدد کوئی نئی چیز نہیں بلکہ ہندوستانی عورت تو بغیر سمجھے ہوئے بھی تمام عمر عدم تشدد ہی پر عمل پیرا رہکر گذار دیتی ۔ ہے وہ تکالیف اور مصیبتوں کو اپنے پر سہتی ہے اور تشدد سے کام نہیں لیتی ، چنانچہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ "اہنسا" کے بارے میں انہیں مردوں سے زیادہ عورتوں سے توقع ہے اسلئے ہمیں چاہیئے کہ ہم عدم تشدد کو اپنا نظریہ رکھیں ، اور پہلے اپنے گھر سے مشق شروع کریں تاکہ آخر ایک روز ساری دنیا کی گود میں عالمگیر انسانیت عدم تشدد کا سبق سیکھ لے ۔ زبانی لفاظیاں تو بہت ہوتی ہیں اور ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا لہٰذا میں اپنی بہنوں سے درخواست کروں گی کہ گاندھی جی جو عدم تشدد کے علمبردار ہیں ان کی زندگی اور لٹریچر کا بغور مطالعہ کریں اور فخر کریں کہ وہ گاندھی جی کے زمانہ میں پیدا ہوئی ہیں ۔

آج آپ لوگوں کے ساتھ میں یہاں نہایت خوش و خرم ہوں چند سال ہوئے میسور میں بھی خواتین نے نہایت فراخدلی سے کانفرنس کو خوش آمدید کہا تھا اور وہاں کے چند مخلص اور پرانی سہیلیوں سے ملاقات نے میری مسرت کو دوچند کر دیا ہے ، افسوس ہے کہ آج مرحوم مہاراجہ صاحب ہمارے درمیان نہیں لیکن ہمارے قلب آج بھی انکی یاد سے معمور ہیں ۔

ایک آخری لفظ مجھے اور کہنا ہے وہ یہ کہ ہمارے وہ بھائی جو اس کانفرنس کے مقاصد یعنی "مساوی جنسی حقوق اور آزادی نسواں" سے مطمئن نہیں ہیں ہمیں تمام خوف و خطر کو اپنے دل سے نکال دینا چاہیئے ۔ جب جنسی مساوات کا سوال آتا ہے تو آپ میں سے بعض حضرات جھنجلا اٹھتے ہیں اور بھیانک خطرات کو سوچنے لگتے ہیں لیکن میں یقین دلاتی ہوں کوئی ڈر کی بات نہیں ، ماں بیٹے ، بھائی بہن اور میاں بیوی میں کبھی ایسی لڑائی اور اختلاف نہیں ہو سکتا جس کا تصور آپ لوگوں کے دماغ پر چھایا جاتا ہے ، اور جب یہ لوگ نہیں لڑ سکتے تو مرد و عورت بھی بغیر جنگ کئے رہ سکتے ہیں ہماری اس تحریک میں مردوں پر کوئی طعن نہیں کوئی حملہ نہیں نہ کسی ایسی بات کے پیش آنے کا مستقبل پر خطرہ ہے ۔ وہ سب جو ہم

چاہتے ہیں صرف اتنا ہی ہے کہ مرد اور عورت میں مساوات اور اعتماد کی لہر دوڑ جائے اور مرد عورت اور مرد مرد کے تعلقات خوشگوار ہوں اور یہی چیز ایک متمدن سوسائٹی کی سنگ بنیاد کہلائی جا سکتی ہے۔

اپنی بہنوں سہیلیوں اور نمائندوں اور ساتھیوں سے میں صرف اسقدر کہنا چاہتی ہوں کہ بس کام کئے جاؤ جہاں کہیں بھی ہو، کام بڑھ رہا ہے اور کارکنوں کی زیادہ تعداد کی ضرورت ہے۔ اپنی تمام قوتوں کو ظلم و استبداد اور قدیم فرسودہ رسم و رواج کے مٹانے اور جدید اور خوشگوار آئین وضع کرنے میں صرف کر دو تاکہ دنیا سے خباثت اور بہیمیت نیست و نابود ہو جائے اور امن و شانتی کا دور دورہ ہو جائے۔ ع

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

ہر قدم پر ایک نیا منظر ہے میرے سامنے
کہہ نہیں سکتا کہاں مجھ کو لئے جاتا ہے دل
بھائی — بہن — زن و شوہر
چار بچھڑے ہوئے دلوں کی روح انگیز داستان جو آپ کے
دل پر تیر و نشتر کا کام کریگی، زلزلہ کا رقت انگیز سین — !
"مسافر" کے چترنجن ڈودشی — کی اور پیشکش
ڈائرکٹر — چترنجن ڈودشی
۲
دوسرا ہفتہ
اداکاران
خورشید
موتی لال
سینہ پربھا
درگیش کماری
کیسری
اہی بلموریا
وغیرہ
اوقات:—
۴½ - ۷¼ اور ۱۰ بجے شب کو
سنیچر اتوار اور پیر کو ۲ بجے
زائد کھیل
لیمنگٹن ٹاکیز
لیمنگٹن روڈ بمبئے

(گذشتہ سے پیوستہ)

خواجہ الطاف حسین حالی

از جناب سید اصغر علی صاحب سکندر آبادی ایم اے بی ٹی

قطعات

حالی کے قطعات اکثر اخلاقی ہیں۔ انہوں نے اپنے تمام کلام سے اصلاحی کام لیا۔ اسی طرح سے قطعات میں بھی اصلاحی رنگ موجود ہے۔ وہ ان میں اکثر واقعات کا ذکر کر کے بعد میں کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور اس طرح بچوں کو سمجھانے کے انداز میں ذہن نشین کرتے ہیں۔ وہ ان نصیحت کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سامع کو اس کی تمیز ہی نہیں ہوتی کہ خطاب اسی کی طرف ہے یا کسی دوسرے کی طرف۔ دوسری خوبی ان قطعات کی یہ ہے کہ جن مضامین پر طبع آزمائی کی گئی ہے وہ زمانہ جدید کی ضروریات کے مطابق ہیں۔ وہ جو بات کہتے ہیں نپی تلی اور اپنے زمانے کے رنگ میں ہیں۔ زبان کے قطعے سے مطلب صاف ہوجائے گا۔

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے کہ اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور
جب کرتے تھے، کرتے تھے بخیلوں کی ملامت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لئے ہے یہ بیاں موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر یہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

انہوں نے ان قطعات میں ظرافت سے بھی کام لیا ہے۔ بعض جگہ یہ ظرافت کچھ بھونڈی ہے جیسے کہ "کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" میں وہ لکھتے ہیں کہ

دی سند گورے کو کہ، تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا "سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا جس گورے کے مکے سے مر
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار"
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیوں کہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

لیکن بعض جگہ بڑی اعلیٰ درجہ کی ظرافت ہوتی ہے۔ وہ خاموش ظرافت کرتے ہیں لیکن ہوتی ہے وہ بہت موثر جسے سن کر اگر ہنسی نہ آئے تو رہ رہ کر گدگدی تو ضرور پیدا ہو۔ "قحط اہل اللہ" کے قطعے میں وہ لکھتے ہیں کہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشم پرنم اپنا تھا یا پرایا
دنیا سے اٹھ گئے سب جو تھے مرید صادق

یہ کہہ کے شیخ کا دل بیساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اسکو بھی رلایا

اسی طرح سے " نوکروں پر سخت گیری کا انجام " اور ایک خود پسند امیرزادہ کی تضحیک " میں بھی حالی نے ایک متین ظرافت سے کام لیا ہے۔ حالیہ کا قطعہ " شعر کی طرف خطاب " مشہور ہے۔ اس میں وہ شعر کو مخاطب کرکے شعر کی خصوصیات بتاتے ہیں کہ شعر کیسا ہونا چاہئے۔ وہ خود بھی اسی معیار شعری پر قائم رہے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز
جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو
چپ چاپ اپنے پیچھے گئے جاد وں میں مگر
اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو
تو نے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کرکے رہیگا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو

رباعیات

حالی قطعات و رباعیات لکھنے میں ماہر ہیں۔ آپ کی رباعیات بھی دیگر اصناف سخن کی طرح مفید خیالات کی جامع ہیں۔ وہ رباعی میں بھی بہت دلکشا تکلم کرتے ہیں اور ان کے ذریعے اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ صرف چار مصرعوں کی محدود وسعت میں اپنے مافی الضمیر کو اس طرح ادا کردیتے ہیں کہ کوئی تشنگی نہیں رہ جاتی۔ ان میں کہیں وحدت کا ترانہ ہے کہیں صلح کل کی لے اور کہیں انقلاب عالم پر فلسفیانہ جذبات کا اظہار۔ مندرجہ ذیل دو رباعیاں جن میں وجود وحدت باری تعالیٰ کی پر اثر اور سچی دلائل سے کام لیا گیا ہے بہت مشہور ہیں۔

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

~~~~~~

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

دنیا کے فانی ہونے سے کسی کو انکار نہیں لیکن یہی خیال اکثر بڑے کاموں کی تکمیل میں حارج ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کو مولانا اس طرح حل کرتے ہیں۔

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

مسئلہ عشق کی نزاکت و دقائق سے مولانا حالی بے خبر نہ تھے لیکن ہمارے شعرائے کرام کی بدولت عشق بھی بچوں کا کھیل بن گیا اور رفتہ رفتہ عوام الناس اس پاک جذبہ کو بھی شاہد بازی کا
~~~~~~

مرادف سمجھنے لگے ۔ حالی کو یہ معلوم تھا کہ اس حالت میں جب کہ اس کے حقیقی معانی سے بے خبری کا یہ عالم ہو ۔ عشق و محبت کی تعلیم قوم کیلئے غیر مفید ہوگی اور یہی سبب ہے کہ انہوں نے اکثر اس کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کیا ۔ وہ کہتے ہیں کہ

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو ملوث اور جوانوں کو تباہ
دیکھا سدا سلامتی میں تیری
قوموں کو ذلیل خاندانوں کو تباہ

علم کی خوبی اور اُسکے فوائد سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن جب کہ مسلمانوں میں اسکی طرف سے عام لاپرواہی برتی جا رہی تھی اسوقت حالی سمجھاتے ہیں کہ

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

حالی پہلے غزل گو شاعر تھے لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کے انحطاط اور پستی کو دیکھا تو غزل کو خیرباد کہا اور اپنے کلام سے اصلاح کی ٹھانی ۔ اسی وقت سے آپکے کلام میں حزن وملال کا عنصر زیادہ نمایاں ہے ۔ اسکو اس طرح کہتے ہیں کہ

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

اب تک تو مولنا کی جدید طرز کی رباعیات دیکھی ہیں لیکن آپ کی قدیم رباعیات بھی کسی کم رتبہ کی نہیں ۔ مثال کے لئے ذیل میں دو رباعیاں پیش کی جاتی ہیں ۔ حالی کا رنگ ان میں بھی نمایاں ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ

ہر عیب کی خو پاکہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اس گلی میں جانا
عادت ہے اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

~~~~~~~~~

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئینگے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئینگے
الفت پہ وفا پہ جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روتے تھے تو اب روئینگے (باقی)
~~~~~~~~~

منگنی

(مشاطہ دولہن کے گھر)

مرزا آچھو بیگ کی بیوی زینت بی مشاطہ نواب فرخ مرزا کی لڑکی جہاں آرا کی نسبت نواب لڈن صاحب کے لڑکے نواب عسکری مرزا کے ساتھ مقرر کرانے کو آئی ہیں۔ چونکہ طرفین کو منظور تھا نسبت پسند آکر طے پاگئی۔ آج منگنی کی بات چیت کرنے زینت بی آئی ہیں۔ سواری سے اتری ہیں

پہلا شگون

فرخ مرزا کی بیوی شوکت آرا بیگم کی انا جلدی سے آگے بڑھیں اور انتظار سے زینت بی کو کہا ایسی بات :- ع ذکر نا (جھٹ سے نبات لاکر زینت بی کے منھ میں بہت سی چیز رکھ دی) اور کہا اب بولو۔ مطلب یہ تھا کہ منگنی کی بات پہلے میٹھے منھ سے شروع ہو۔

دوسرا شگون

بی مغلانی سروری خانم چاندی کی کشتی میں پانچ ورق لگی گلوریاں۔ پانچ چھوہارا الائچیاں ــــ جوڑا قند کا قندہ (کوزہ)۔ پانچ روپے اور گلنار لگا ہوا دوپٹہ لیکر آئیں اور زینت بی کے سامنے رکھ کر چلی گئیں۔ زینت بی نے سب سمیٹ لیا اور خوشی خوشی رخصت ہوئیں!

عسکری مرزا کی لیاقت نیک مزاجی اور جہاں آرا کی سیرت اور یہ کہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ ہیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب شکل ہے۔ یہی ذکر دیر تک رہا۔ نسبت تو دلوں میں منظور تھی پکی ہی ہو گئی ــ البتہ لڑکی کی چھوچھو بولی سنا ہے۔ یاروں بٹھا سے شادی رخصتی اور چوتھی کی تاریخیں مولوی عبد السلام کے صاحبزادے مولوی ابو الحسن سے مقرر کرائی جائیں ــ کوئی اور مولوی ملا جس کے کانپ نہ ٹھٹھا دغیرہ سے کہا نہ جائے اسلئے کہ ان کے نام میں اک خاص نسبت شادی کے امور سے ہے۔ زینت بی بولیں ہوا ایسا ہی ہوگا۔ مبارک سلامت کہتی ہوئی زینت بی رخصت ہو گئیں)

~~~

ادھر زینت بی مشاطہ رخصت ہو گئیں ادھر بی سروری خانم چاند بی لڑکی کی چھچھ چھوچھو ڈھولک لیکر بیٹھ گئیں، بے تکی تانیں اڑانی شروع کر دیں

گھنگھن مورا بانکا کاندھیا　　کہ گھنگھن مورا بانکا کاندھیا
سب سکھین مل منگل گا دیں　کہ سب سکھیں مل ناچیں تاتھیا
پھتن مورا .... (عسکری مرزا عرف پھتن نواب تھا)

~~~

مشاطہ دولہا کے گھر

زینت بی نواب لڈن صاحب کے یہاں خوش خوش ناچتی تالیاں بجاتی پہنچیں۔ مبارک ہو مبارک، نسبت منظور ہو گئی،

فردوسیہ بیگم کو بہو رانی مبارک ہو۔۔!

پہلا شگون

فردوسیہ بیگم عسکری مرزا کی ماں نے حکم دیتے ہی بی مغلانی کمیتو بیگم کیوڑے گلاب کا شربت بنا کر لائیں اور مشاطہ کو پلایا۔ پھولوں کا ہار گلے میں ڈالا گیا

دوسرا شگون

ایک کشتی میں پچرنگی مٹھائی۔ پانچ ورق لگی گلوریاں، پانچ طلائی ورق لگی چوگھڑا الائچیاں۔۔۔ جوڑا مصری کا کوزہ اور پانچ روپے زینت بی کو یہاں سے بھی ملے۔

مولوی نثار الحسن سے تاریخیں معین کرانے کی تجویز پسند آئی۔۔۔ کمیتو بیگم لڑکی کی دائی انا چھچھو خواصیں سب مل کر ڈھولک پر گانے لگیں۔۔

منگنی کے دن

(دولہا کے گھر سے دولہن کیلئے انگوٹھی نشان کی روانگی)

مصلحہ دار، علم بردار آگے آگے۔ سات سینیوں میں پچرنگی مٹھائی۔ پانچ سینیوں میں پھل پھلیری۔ ایک کشتی میں دولہن کے لئے پھولوں کا گہنا۔ ایک سونے کی کشتی میں الماس کی انگوٹھی۔ ایک روپہلی تھیلی میں اکیاون روپے اور امام ضامن جس پر روپہلی سنہری جھل جھل کرتے تورہ پوش پڑے، روغن چوبی کی کشتی، سب کے پیچھے بیگمات کی سواریاں عسکری مرزا کی ماں فردوسیہ بیگم ان کی بہن جنت النساء بیگم لاڈلی بیگم نواب لڈن صاحب کی بہن چوپہلوں پر سوار ایک میانہ میں زینت بی مشاطہ۔ خواصیں اور پیش خدمتیں چوپہلے کے پردے پکڑے آپس میں چہلیں کرتی، یہ سارا منگنی کا جلوس دولہن کے روانہ ہوا۔

خواصوں پیش خدمتوں کی آپس میں چہلیں

سوسن۔ اس موئی نرگس دیدہ دلیل کو دیکھو جھٹ پھولوں کے گہنے کی کشتی سر پر اٹھالی اور ہم لوگوں کے لئے بھاری بھاری سینیاں اٹھانے کو چھوڑ دیں۔ موئی گھورتی ہے کس طرح، اللہ کرے یہ تیرے موٹے موٹے دیدے پٹم ہو جائیں۔

نرگس۔ نسترن کو نہیں کہتی کہ سونے کی کشتی، انگوٹھی امام ضامن والی چونچلے بگھارتی اٹھلاتی، پھول سے قدم اٹھاتی کس ٹھسے سے چل رہی ہے۔

سیوتی۔ سچ تو! اور ہمارے سروں پر مٹھائی لدی پڑی ہے۔

نسترن۔ خدا کی شان! موئی پیش خدمتیں خواصوں کا عہدہ چھیننا چاہتی ہیں۔

نرگس۔ دیکھو نا، وہ موئی سیوتی توپ کا گولہ، کالو تو ہماری ایسی چار نکلے۔ گویا بیچاری پھل پھلیری کی سینی سے دبی جاتی ہے۔

نسترن۔ ارے سنتی بھی ہو، پیش خدمتوں کی شامت آئی ہے۔ بیگم صاحب کہہ رہی ہیں ان کو کہو یہ سارا یاں سینیاں لئے ہمارے چوپہلوں آگے قطار سے چلیں۔۔۔ جاتیاں ہو یا نہیں او مردار و بائیں بیگم صاحب سے کہوں!

سب پیش خدمتیں حکم پاتے ہی قطار سے سینیاں لیکر قطار سے چلنے لگتی ہیں۔

کہاروں کی آسری

ہوں ہوں آگے پیچھے! ہوں ہوں دہنے موڑ۔۔۔! ہوں ہوں بائیں پر۔۔۔! ہوں ہوں روڑا راڑی۔۔۔!

ہوں ہوں چل اگاڑ۔۔۔! ہوں ہوں چڑھائی ہے! ہوں ہوں گڑھا ہے! ہوں ہوں نیچے۔۔۔!

غرض دولہن کے گھر منگنی کی بارات جاگئی ـــ ڈھیوڑھی دارنی نے محل کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہانک لگائی :ـــ

" منگنی کی بارات آگئی ہے ئے ئے ئے ـــ "

محل میں اک شور مچگیا ۔ بی مغلانی سردری بیگم چلائیں :ـــ

" ارے کہاں گئیں او مردارو "! دُہی اللہ یہ پیش خدمتیں خواصیں سب کدھر چلی گئیں "۔

سب دوڑتی گرتی پڑتی آوازیں لگاتی :ـــ " آئی ۔ بی بی آئی ـــ

اُدھر سے محلدار نے پھر آواز لگائی :ـــ " سواریاں اتروالیجائیں "۔

ادھر ڈیوڑھی دار سے کہا :ـــ " ایک ایک کرکے چپ چلے دھیوڑھی پر لاؤ!

شوکت آرا بیگم ان کی بہنیں عصمت آرا بیگم ، عفت آرا بیگم لڑکیاں حُسن آرا ، جمال آرا ـــ نندیں گوہر بیگم ، لاڈلی بیگم ، سمدھنوں کے استقبال کیلئے ڈھیوڑھی تک آگئیں ! سمدھنوں کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور بی مغلانی سردری بیگم نے مشاطہ زینت بی کی خوب آؤ بھگت کی ـــ

سمدھنوں کی آپس میں چہلیں

فردوسیہ بیگم ـ کیوں بہن شوکت آرا اپنی شان و شوکت ہی میں مگن رہوگی یا میری بھی دو دو باتیں سنوگی ؟

شوکت آرا ـ تم آپ فردوس کی حور ہو ـــ اصل میں تو تمہاری ساری آن بان شان ہے !

عصمت آرا ـ کیوں ری گوہر شب چراغ ، اپنی چمک دمک ہی دکھاتی رہیگی یا ادھر بھی رخ کریگی ؟

گوہر بیگم ـــ اپنی لو سنبھال ورنہ تیری عصمت کی خیر نہیں !

عفت آرا ۔ اور وہ تو دنیا جہان کی لاڈلی ٹھہریں ۔ بی لاڈلی بیگم نام ہے ٹھہرا ، وہ اپنے لاڈ میں ہیں ، منہ سے کیوں بات کریگی !

لاڈلی بیگم ـــ چل اپنی عفت کا چرخہ نہ کات ۔ تیرے اس گز سے بدن میں تکلا بھونک دونگی ـــ بڑی عفت والی بنی ہے !

چہلیں کرتی سب مل کر محل میں پہنچیں اور وہاں پہنچتے ہی سیدھی دولہن کے کمرے میں گھس پڑیں ۔ دولہن کی بہنیں حُسن آرا ، جمال آرا پاس بیٹھی تھیں ، بے غل و غش جو یہ ساری بیگماتیں سسرال والیاں دولہن کے کمرے داخل ہوگئیں تو دولہن ایک طرف سمٹ سمٹا کر مسند کے گاؤ تکیہ میں مُنہ چھپانے لگی ۔ تھر تھر کانپ رہی ہے اور بس چلے تو زمین میں گڑ جائے ۔ فردوسیہ بیگم پاس جا کر چیڑ چیڑ بلائیں لیکر کہنے لگیں " اجو تم میری بیٹی ہونا ۔ مجھ سے بھلا کیا پردہ ۔ میں صدقے گئی منہ اٹھاؤ ۔ سر دولہن کا اپنے سینہ سے لگا لیا ، ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی ، داہنے بازو پر امام ضامن باندھ دیا ۔ حُسن آرا جمال آرا کو مخاطب ہو کر فردوسیہ بیگم نے کہا آؤ میری مدد کرو تمہاری بہن کو پھولوں کے زیور پہناؤں "۔

غرض دولہن کو نشانی چڑھا کر سب کمرے سے باہر آگئیں ۔ سب کی تواضع کیوڑے کے شربت پان تمباکو سے ہوئی ـــ بی گنّو جان میراثن نے گانا شروع کیا :ـــ

" راج دلاری ! ہاتھ میں تیرے انگوٹھی سوہے ۔

اماں پیاری بازو پہ تیرے امام ضامن سوہے "

ایسی پرانے زمانے کی گیتیں میراثن گاتی رہی ۔ فردوسیہ بیگم نے دس روپیہ اور سبھوں نے دو دو روپیہ چھوڑ دی ۔ بی زینت مشاطہ نے چوتھی اور بی مغلانی نے ایک اٹھنی دی ۔ سمدھنیں ہنسی خوشی بجا لائی رسم منگنی گھر کو واپس آئیں ـــ

شام کو دولہا کے گھر دولہن کے گھر سے اسی تفصیل کیساتھ منگنی کا نشان ، الماس کی انگوٹھی ، امام ضامن ، مٹھائیاں ، پھول چنبیلی وغیرہ گئی ۔ فرق اتنا تھا کہ وہ فقط سمدھنوں کا جلوس تھا یہ مدھیوں کا جلوس جو لڑکے کو نشان پہنا نے آئے ۔ امام ضامن باندھنے گئے فقط عورتیں میں شوکت آرا بیگم اور جنت آرا بیگم گئی ہوئی تھیں ـــ غرض منگنی کی رسم

دونوں طرف سے آج ہی ادا ہوگئی ۔

دلہن کا مایوں بیٹھنا

آج وہ دن ہے کہ دولہن کو مایوں بٹھائیں گے، پہلے دولہا کے گھر سے مانجھے کی برات جائیگی پھر دولہن کے گھر سے دولہا کا مانجھا آئے گا۔

سات کشتیاں تیار کی گئی تھیں ۔ ایک کشتی میں دولہن کا بسنتی جوڑا ۔ بسنتی رومال پانچ عدد ۔ ہاتھ کا کنگنا ۔ سونے کا چھلا ۔ دوسری کشتی میں دو شیشیوں میں سہاگ کا عطر ۔ اور پانچ کشتیاں ابٹن کی دولہن کو جو ابٹن لگایا جاتا ہے اسمیں ساتوں مصالحہ بڑھی بڑھا چھیل چھبیلا ناگرموتھ سوبا صندل وغیرہ سب ڈالا جاتا ہے ۔ دولہا کے واسطے جو بٹنا جاتا ہے اسمیں اور ضروری مصالحوں کے علاوہ فقط ناریل کا چھلکا ڈالا جاتا ہے ۔ غرض ان سات سینیوں کے اکیس چاندی کی کٹوریوں میں سوا سو پنڈیاں لیکر فردوسیہ بیگم مع بہنوں کے چوپہلوں پر بیٹھ باجہ آگے آگے بجتا ۔ آخری قطار پنڈیوں کی ٹھلیوں کی جن کے آگے نفیری پھنکتی ، ڈھن چوکی بجتی ۔ خواصیں ۔ پیش خدمتیں ۔ قلماقنیاں ۔ ترکنیں ۔ حبشنیں ، مانجھے کی گیت گاتیاں روانہ ہوگئیں!

وہاں لڑکی کو سات سہاگنیں نہلا رہی تھیں کہ مانجھا سسرال سے دروازہ پر پہنچا ۔ سمدھنیں استقبال لیکر کے اتاری گئیں ۔ لڑکی کو مایوں بٹھانے کے کمرے میں لا بٹھایا ۔ فردوسیہ بیگم نے پہلے بہو کو مانجھے کا جوڑا پہنوایا ، پھر بٹنا عطر سہاگ میں ملا کر لگایا ، بعد اس کے ہاتھ میں کنگنا پہنایا ۔ میراثنوں نے مانجھے کی گیتیں گانا شروع کرکے چھوٹے سے کر سلام کرنا شروع کیا ۔

فردوسیہ بیگم شوکت آرا سے کہا دیکھو بہن، بس گیارہ دن لڑکی کو مایوں بٹھانا ، زیادہ کم زدکر نیکی ضرورت نہیں اسلئے کہ دولہن خود دواں پان ہورہی ہے ۔ سمدھنوں نے ایک دوسرے کے گالوں پر بٹنا لگا کر یہی رسم ادا کی اور خوشی خوشی گھر کو واپس آئیں ۔

شام کو دولہن کے گھر سے اسی تزک احتشام سے دولہا کے لئے مانجھا گیا ۔ جو لوگ ساتھ گئے ہوئے تھے دولہا کو مانجھا پہنا کر خوش خوش واپس آئے ۔

حنابندی یعنے مہندی کی رات

دولہا کے گھر سے آج دولہن کے گھر مہندی جارہی ہے ۔ پانچ کشتیوں میں ملتانی رنگیلی خشک مہندی ، ایک کشتی میں ہری پسی ہوئی مہندی سینی میں جمائی ہوئی اسپر سونے چاندی کے ورق جمائے گئے تھے اور کچھ پھول بوٹے بنائے گئے تھے ۔ ایک کشتی میں مصالحہ کا خوشبودار تیل اور عطر سہاگ کی ایک شیشی مہندی کا رنگ شوخ کرنے کیلئے ۔ پانچ کشتیوں میں ہفت رنگی مٹھائی ۔ پانچ کشتیوں میں پھل پھلیری ۔ ایک کشتی میں دولہن کے لئے سرا (کنگنا) ، جوڑا پانچ رومال مہندی لگا کے ہاتھ پیر باندھنے کیلئے ، ایک کشتی میں بارہ موم کی کافوری شمعیں روشن کی ہوئی ۔ گیارہ کشتیوں میں مٹیدہ ۔ ساری کشتیوں پر جھل جھل کرتے سنہری روپہلی گوٹہ لگا ہوئی تورہ پوش پڑے ۔ آگے آگے روشن چوکی بجتی ہوئی ۔ پیچھے پیچھے فردوسیہ بیگم ، جنت النساء بیگم گوہر بیگم ، لاڈلی بیگم وغیرہ بیگمات چوپہلوں پر سوار پیش خدمتیں پردے پکڑے ہوئے ایک میانہ میں زینت بی بی مشاطہ اور کنیز بیگم مغلانی ۔ آج مہندی کی تیاری میں بسبب شب ہونے کے دو طرفہ بالو پچکاریوں کی اور آگے دو ماہ پلٹنی کے بینڈ باجے بجا رہی ہیں ۔ جلوس مہندی کا دولہن کے گھر جا لگا ۔

شوکت آرا ، عصمت آرا ۔ عفت آرا ، حسن آرا ، جمال آرا بیگمات کے استقبال کے ڈھیوڑی پر آکر کھڑی ہوگئیں ۔ سواریاں اتریں ۔ فردوسیہ بیگم شوکت آرا کے گلے ملیں ، حسن آرا نے جمال آرا کو پیار کیا ۔ فردوسیہ بیگم دولہن کے کمرے میں گئیں ، بہو کی چٹر چٹر بلائیں لیں ، گلے سے لگایا اور مہندی لگانے کی رسم ادا کی میراثنوں نے گانا شروع کیا ۔

"سورج تم دھیرے سے اگیو
میری مہندی کا رنگ جل جائے ۔"

تکلنوں کے اندر مہندی گوندھی گئی اور سمدھنوں نے ایک دوسرے کو مہندی لگائی ، سروری بیگم نے کھیتو بیگم کے منہ میں تھوپ دی ۔ شادی کے گھر میں خوب خوب مہندی اچھلی ، دیواروں پر مہندی کے چھاپے لگائے گئے ۔ غرض سارا گھر مہندی مہندی ہوگیا ۔ دولہا والیاں دولہن کو مہندی لگا کر خوش خوش واپس آئیں ۔

ساچق

ساچق فقط دولہا کے گھر سے دولہن کے گھر جاتی ہے جسطرح اور رسم دونوں طرف سے ادا کی جاتی ہے اس طرح یہ رسم ساچق نہیں ۔

آج دولہا کے والد نواب لڈن صاحب خود ساچق لیکر دولہن کے گھر چلے ہیں ۔ ان کے دوست احباب اکثر تو ہیں بھی ساتھ ہیں ۔ محمد تقی بھی دولہا کی ماں فردوسیہ بیگم کے ہمراہ شہر کی اکثر بیگمات بھی ہیں ۔

چاندی کی کشتیاں ابرک کی نقش و نگار والیاں ۔ ستر کشتیاں چاندی کی جلا ایک ایک کشتیاں جنمیں گوبد کا خشک میوہ بادام پستہ چلغوزہ ، اخروٹ ، کاجو ، کشمش ، چھوہارے وغیرہ وغیرہ ۔ اکاون

کشتیوں میں تر میوے سیب انار انگور ناشپاتی گلابی ۔ زرد آلو ۔ شریفے امرود کیرتی فالسہ وغیرہ ۔ اکتیس چاندی کی کشتیوں میں دولہن کے بھاری توڑے اور جوڑے اور تین جوڑے دیگر کشتیوں میں زردوزی کامدانی وغیرہ کے ، ایک چاندی کی کشتی میں جڑاؤ بیچ جڑت کے گیارہ زیور اور سونے کے بیس زیور ۔ ایک سہاگ پڑا جس کا پھیلاؤ قطر ایک گز کا اور ساتھ ایک فٹ کا اونچان میں پورا سوا گز سکندری کا تھیں جلد ریت اور سنگار کی چیزیں مسی سرمہ ٹھنڈا کاجل تر کاجل افشاں چاند تارے ، آئینہ نقرئی ، کنگھی طلائی نقرئی ایک جوڑا ۔ مٹھائی زری کے تاؤ یوسفی گوند کی چاندی کی کٹوریاں جن میں گوند مشک زردق میں لپٹی ہوئی وغیرہ وغیرہ ، سات سینیں ہر ہفت رنگی مٹھائی سات کشتیوں میں پھل پھلیری اس ساچق کے سامان کے آگے ایک انگریزی بینڈ فوجی دوسرا ہندوستانی بینڈ باجہ آخر میں ملنگوں کی دفڈھول تاشے جھم جھم کرتے ہوئے سہاگ پڑے کے آگے روشن چوکی بجتی ہوئی جسکے پیچھے بیگمات کی سواریاں سب کے آگے دو سانڈنیاں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ۔ غرض دولہن کے گھر جاگی مردوں کے استقبال کیلئے خود نواب فرخ مرزا صاحب چند رؤسا شہر اور بیگمات کے استقبال کیلئے شوکت آرا بیگم معہ شہر کی چند جہاں بیگمات محل کے دروازے اور ڈھیوڑھی پر موجود تھے ۔ سبھوں کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا ۔ نوابین محفل میں آکر بیٹھے اور بیگمات محل میں داخل ہوئیں ۔

مردانہ محفل میں بلوریں گلاسوں میں کشتیوں میں گلاسوں میں لگا کر شربت آیا ۔ پہلے دولہا کے والد کی خدمت میں پیش کیا گیا جنہوں نے گیارہ اشرفیاں شربت پلائی دی باقی رؤسا نے بجائے گیارہ روپیہ فی کس شربت پلائی کی رسم ادا ہونے کے بعد نواب لڈن صاحب کے داروغہ آگے بڑھکر دست بستہ نواب فرخ مرزا صاحب سے عرض کرنے لگے " سرکار حکم دیا جائے کہ جو شے اور نذر جدا سے فہرست سے ملائے جائیں ۔ چنانچہ فہرست سے مع داروغہ صاحب

اور حیدر مرزا صاحب مصاحب نواب فرخ مرزا صاحب نے سب چیزیں تحویل میں لیکر دستخط دیدیا۔ اندر بھی بیگماتوں کے لئے شربت آیا شربت پلائی ہوئی اور جوڑے زیورات جو باہر سے محل میں آئے ان کو سبھوں نے دیکھ کر تعریف و تحسین کی۔ ایکطرف دولہن کے پاس جو بیگماتیں بیٹھی تھیں ان کی زبانوں پر یہی جاری تھا کہ ماشاءاللہ ماشاءاللہ دولہن پر خوب روپ آیا ہے۔ فردوس بیگم نے یہ سنکر دولہن کے سر سے نیل ماش اور پانچ روپے کے کالے پیسے اتروائے دولہن کی بلائیں لیں، گلے لگایا پیار کیا۔ میراثنوں نے خوب خوب لوسے سہاگ گائے، سب نے چھوٹ دی۔ اندر سے بیگمات اور نوابیں، ایک دو گھنٹہ محل میں بیٹھ کر رخصت ہوئے اور خوش خوش گھر واپس آئے۔

بارات

رسم ہے کہ دولہا کا گھر آج کے روز دولہن کیطرح سجایا جائے اسلئے کہ دولہن کے قدم گھر میں آنا یوں سمجھا جاتا ہے کہ گھر میں برکتوں کا نزول ہوا۔ چنانچہ نواب لڈن صاحب کے گھر پائین باغ گلشن جنت کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ تمام درختوں کی شاخوں میں ہزاروں گلاس اور لال سبز سرخ قمقمے لٹکے ہوئے ہیں۔ پھاٹک پر دہلیز سے محرابتک سقدر گلاس لگائے گئے ہیں کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ رسم و رواج کے موافق ایک بہت بڑا منڈوا ناچ گھر تیار کیا گیا ہے جسکے چاروں طرف شہ نشین بنائی گئی ہے صدر میں ایک چار چوب کار چوبی شامیانہ لگایا گیا ہے۔ شامیانہ کے نیچے مناری تکے کی مسند گاؤ تکیہ بغلی تکیے رکھے گئے ہیں سامنے جوڑی مردنگ کی رکھی گئیں ہے۔ منڈوے کی چھت میں متعدد چوبیس چوبیس بارہ بارہ بتی کے جھاڑ دو شاخے سہ شاخے استروی جھاب لٹک رہے ہیں۔ منڈوے کے صدود کی قناتوں پر قدم آدم آئینے لگے ہیں، جابجا بیل بوٹوں سے دستکاری کے

پنجرے غلاف پڑے لٹکے ہیں۔

دولہا غسلخانہ سے برآمد ہوا، شاہانہ لباس کشتی میں لاکر رکھا گیا۔ مخصوص وہ احباب جن کی شادیاں ہوگئی ہیں دولہا کو رسم کے موافق لباس پہنا رہے ہیں۔ مخملہ دولہا کو نواب لڈن صاحب نے بسم اللہ کہکر پہنایا اور کان میں طرۃ لگا دیا۔ بھاری سہرا پہلے مقیش کا بھاری تولواں قد آدم سر پر سورۂ اَن یَکاد پڑھکر باندھا گیا مقیش کے سہرے پر پھولوں کا سہرا پہنایا۔ ہاتھ میں قرولی جس پر زربفت کا غلاف اور جس کا قبضہ سونے کا تھا دیدی گئی۔ ہر طرف سے مبارک باشد مبارک باشد آوازیں آئیں۔

~~~~~~~~~~~~

بارات کی شان بھی سجائی کھڑی تھی۔ آگے آگے ساٹھ ساٹھ بتیوں کے جھاڑ مزدوروں کے کندھوں پر اسکے پیچھے سب سے پہلے شہر کا بینڈ باجہ جسکے بعد اکیس ہاتھیوں کی قطاروں پر رنگا جھنی جھولیں پڑی ہوئی اور عماریاں بندھی ہوئی دو طرفہ ہاتھی کی قطار کے چھ چھ بتیوں کے جھاڑوں کی دوڑ ہاتھیوں کے پیچھے ساز براق سے سجے سجائے چاندی سونے کی ہیکلیں گلوں میں پڑی سانڈنی گھوڑوں کی قطار جسکے دو طرفہ سہ شاخوں کی دوڑ بعد اسکے پھر ایک بینڈ باجہ بجتا جسکے پیچھے آتش کے ایک سو ایک تختے جسکے دو طرفہ پنج شاخوں کی دوڑ اسکے پیچھے تمام روسائے شہر جسکے پیچھے براتی تھے۔ روشن چوکی بجتی دولہا ایک عربی گھوڑے پر سوار، دولہا کے خاص خاص احباب گھوڑے کو گھیرے گھوڑے کی لگام دونوں طرف سے دولہا کے دونوں بھائی پکڑے ہوئے گلیوں میں مہتابیاں چھوٹتی ہوئی سامنے سے مرزا شہر کے نامی آتش باز گذرے ہوائیوں کی ہاتھ میں لئے ہر دس قدم پر ایک ہوائی داغتے جسکی زن چہ چہ چہ چہ آواز فلک کو توڑ کر اس پار نکل جاتی تھی۔ پیچھے سب کے شہدوں کی ٹولی، کوئی ہپکاتا، سنیہ پھینک
~~~~~~~~~~~~

یہی وہ سب ہے کہ خواجہ کا کوئی نوکر کہتا نواب چونیتوں تھا ہو۔ کوئی کہتا دولہا کا صدقہ نواب کا بول بالا بیبیک چنانچہ کبھی کبھی دس دس منٹ کے وقفہ سے نواب صاحب کے دار وغہ پیسوں اور دونی چونی ملے پیسوں کے سنے دولہا کے سر پر سے پھینکتے شہدے لوٹتے غرض اسطرح آہستہ آہستہ دولہن کے گھر کی طرف بارات جا رہی تھی۔

جب بارات دولہن کے گھر کے قریب پہنچی، آتشبازی جو دولہن کے گھر کے سامنے والے میدان میں گاڑی گئی تھی۔ آتشباز ولی نے داغدی، بیکد فعہ گھنگرو چرخیاں ہوائیاں وہ ار سینکڑوں کی تعداد میں ہزاروں انار کرنجوے نسرینیں چوہیاں چھوٹنے لگیں، ایک طرف آرائشش کے تختے شہر کے اوباش اور شہدے لوٹنے لگے۔ غرض ایک گھنٹہ بارات رکی رہی بہزار دقت نوشاہ کا گھوڑا آگے بڑھایا گیا اور دولہن کے گھر کے دروازے پر جا لگا ــ نواب فرخ مرزا صاحب اور نواب لڈن صاحب نے نوشاہ کو گھوڑے سے اتروایا اور لاکر محفل میں بٹھایا۔

نوشاہ کے محفل میں آکر بیٹھتے ہی طبلہ پر تھاپ پڑی اور بی مشتری جان طوائف نے ناچنا شروع کیا اور لہرا بجنے لگا۔ ناچ ختم ہونے پر بالگیسری کی ایک چیز بی مشتری جان ابھی گنگنا ہی رہی تھیں کہ نواب فرخ مرزا صاحب کے داروغہ دوڑتے آئے کہتے ہوئے ناچ گانا بند کرو مولوی صاحب قبلہ کی پالکی آگئی اتنے میں سامنے سامنے سے مولوی رشاد الحسن صاحب نمودار ہوئے۔ آکر دولہا کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے محفل میں سناٹا پڑگیا۔ مولوی صاحب قبلہ نے بیٹھتے ہی ارشاد فرمایا دولہن سے ایجاب قبول کرنے کوئی صاحب جائیں نواب فرخ مرزا صاحب نے عرض کیا آپ ہی تکلیف گوارا فرمائیں۔ چنانچہ مولوی صاحب بسم اللہ کہکر کھڑے ہوگئے۔ محلدار نی نے محل میں ہانک لگائی بیبیاں بیگماتیں پردہ کرلیں مولوی صاحب قبلہ تشریف لا رہے ہیں۔ محل میں اک شور مچگیا، مولوی صاحب آرہے ہیں، پردہ کرو پردہ کرو۔

مولوی صاحب دولہن کے کمرے میں داخل ہوئے پردے کے قریب بیٹھکر فرمایا۔ جہاں آرا بیگم تم مجھے اپنا وکیل کرتی ہو کہ تمہارا نکاح نواب عسکری مرزا ولد نواب لڈن صاحب کے ساتھ سات لاکھ روپیہ سکہ، رائج الوقت اور ایک اشرفی پر پڑھ دوں۔ اور پردے سے کان لگادیا۔

اندر بیگماتیں "ہوں" کرنے پر دولہن سے اصرار کر رہی ہیں، کوئی کہتی ہے "بیٹی آہستہ سے ہوں کہدو، کوئی کہتی ہے، مولوی صاحب قبلہ کو تکلیف ہو رہی ہے جہاں آرا شاباش جلدی ہوں کہدو۔

غرض آدھ گھنٹہ کے بعد ایک مہین آواز میں "ہوں" سنائی دی۔ مولوی صاحب قبلہ نے فرمایا۔ بس بس میں نے سن لیا۔

مولوی صاحب قبلہ محل سے باہر آئے دولہا سے فرمایا مجھے وکیل کرتے ہو کہ تمہارا نکاح جہاں آرا بیگم دختر نواب فرخ مرزا کے ساتھ سات لاکھ روپے رائج الوقت اور ایک سو ایک اشرفی مہر پڑھ دوں۔ دولہا نے آہستہ سے کہا:۔ "وکیل کیا"

نکاح پڑھا گیا۔ نقل بٹایا گیا۔ مولوی صاحب کے ہمراہ نقل، مصری کے کوزے ایک کشتی میں اور سوا سو روپے ایک ایک اشرفی نوکر لیکر پالکی تک گیا نواب صاحبان بھی گئے، ور مولوی صاحب کو رخصت کر آئے۔

دولہا محل میں

رسم آرسی مصحف اور نبات چنائی

خدا خدا کرکے بارہ بجے دولہا محل میں بلایا گیا۔ نواب فرخ مرزا اور نواب لڈن صاحب دولہا کا دونوں طرف سے ہاتھ

پکڑے محل کے دروازے تک آئے اور نواب شوکت آرا بیگم اور فردوس بیگم نے محل کے دروازے سے مسند تک دولہا کو پہنچایا۔ دولہا مسند پر دولہن کی بغل میں بٹھایا گیا۔

نواب شوکت آرا۔ (بیٹیوں سے) حُسن آرا، جمال آرا تم دونوں آرسی مصحف کراؤ اور نبات چنواؤ اور لو یہ آئینہ قرآن۔ وہ آیت محبت والی کس پارہ میں ہے یاد ہے نا؟

حُسن آرا۔ ہاں ہاں اماجان جانتی ہوں، وہی وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ۔

شوکت آرا۔ ہاں ہاں وہی اور دیکھو جب دولہن آنکھ کھولے تو دولہا کا منھ دیکھ کر فوراً قرآن دیکھے۔ خبردار خبردار کسی اور عضو پر نظر نہ پڑے " اور سُنا اسکے بعد دولہن کا جھوٹا شربت چاہے ایک گھونٹ ہی سہی دولہا کو ضرور پلانا۔ سمجھیں کون شربت؟

جمال آرا۔ اماں چپ بھی رہو گی کہ نہیں، وہی انگوٹھے والا۔

قرآن اور آئینہ دولہا دولہن کے آگے رکھکر —

جمال آرا بولی۔ " کہئیے بھائی جان — بیوی میں تمہارا غلام ہوں آنکھیں کھولو" عسکری مرزا نے آہستہ سے کہا۔ — بیوی میں تمہارا غلام ہوں آنکھیں کھولو۔

حُسن آرا۔ کہئیے بھائیجان آنکھیں کھولیں؟

عسکری مرزا۔ انہوں نے تو آنکھیں اور زور سے بھینچ لیں۔

جمال آرا۔ تین مرتبہ کہئیے گا تو وہ آنکھ کھولیں گی۔

عسکری مرزا سے آخر سالیوں نے تین بار بیوی میں تمہارا غلام ہوں کہلوا ہی لیا جب اسپر بھی آنکھ نہ کھولی تو حُسن آرا بولی — سچ تو یہ ہے کہ جبتک دولہن کے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی پہنا دیجئیگا اور اشرفیاں ہاتھ میں نہ دیجئیگا دولہن آنکھ نہیں کھولے گی — رسم کے موافق فردوس بیگم نے دولہا کو گیارہ اشرفیاں اور ہیرے کی انگوٹھی جو سرکھی تھی جو عسکری مرزا کی جیب میں تھی وہ انہوں نے دولہن کے ہاتھ میں پہنا کر اشرفیاں ہاتھ پر رکھدیں۔

ادھر شوکت آرا بیگم بیٹی سے کہنے لگیں بیٹی جہاں آرا آنکھیں کھول دے اب زیادہ اپنے دولہا کو نہ ستا۔ بہنوں نے بھی کہا تو دولہن نے نیم باز آنکھیں کھولیں قرآن دکھایا گیا اور اب نبات کی باری آئی۔ سالیوں نے نبات سات اعضاء عروس پر چنوائی اور خوب ڈھکیا جب ایک ایک اشرفی اور سو سو روپے سالیوں کو عسکری مرزا نے ٹیک دیا تو جان چھوٹی۔

آرسی مصحف اور نبات چنائی کی رسم کے بعد دولہا باہر محفل میں لایا گیا۔ طوائفوں کا ناچ گانا شروع ہوا۔

تاروں کی چھاؤں میں دلہن کی رخصتی

رخصتی کی بارات کی تفصیل

جہیز:۔ اکتیس صندل آبنوس شیشم کے صندوقوں میں جن چاندی کے نقش و نگار کئے پتر جڑے ہوئے تھے دولہن کے کپڑے۔ اکیس جالیدار محافوں میں ۱۴ من تانبے کے برتن۔ پانچ محافوں میں چاندی کے برتن۔ چینی کے لاتعداد برتن کشتیوں میں سجے ہوئے۔ متعدد جوڑ قوچ کرسیوں کے۔ پانچ چاندی کی صندوقچیوں میں دولہن کے زیورات۔ پالکی جہیز چاندی تار کا جالیدار پردہ پڑا اسمیں دولہن سوار۔ دو پیشخدمتیں ایک خواص ایک لینڈو گاڑی جس میں چاندی کا آئینہ لگا دلیروں کی جوڑی جُتی ہوئی۔ شیشہ آلات تمام استردی اور اسلامبولی اکیس ٹوکروں میں چنبر ٹول لگائی ہوئی۔ باورچی خانہ کے سامان میں دست پناہ پھنکنی تک چاندی کی تھی۔ آگے سارا جہیز اسکے پیچھے گھوڑے پر دولہا ساتھ اکثر روسائے شہر لباب ساتھ اسکے پیچھے دولہن کی پالکی جسکے پیچھے

سات دیگوں میں بھوڑے کا کھانا ۔ غرض دولہن ماں باپ بہنوں سے گلے ملکر رخصت ہوئی اور یہ رخصتی کی بارات پہونچتے نواب لڈن صاحب کے گھر جا لگی ۔ عسکری مرزا کی بہنوں نے دروازہ روکا اونکو سات اشرفی نیگ دیا دولہن کو گودی میں اٹھا کر دولہا نے محل کے اندر پہنچایا ۔ محل میں دولہن کے آنے کا شور مچگیا ۔ کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی تھی ۔ بمشکل دولہن حجلۂ عروسی میں پہنچائی گئی ۔ رہنے والے رہ گئے باقی جملہ مہمان مرد عورت اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوگئے —— صبح کو منہ دکھائی کی رسم ادا ہوئی سینکڑوں روپیہ اشرفیاں منہ دکھائی دلہن کو ملی ۔

چوتھی کی رسم رسم کے موافق جو دولہن اپنے میکے رخصت ہوگئی تھی ۔ چوتھے دن پھر چوتھی کی دولہن بنائی گئی ۔ سسرال سے فردوسیہ بیگم جنت النسا بیگم اکبری بیگم لاڈلی بیگم اور چند عزیز و اقارب دولہن کے گھر آئے ۔ شوکت آرا بیگم عصمت آرا عفت آرا اور چند بیگمات دروازہ پر استقبال کے لئے گئیں ۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک گچھے دار چھڑی جن پر پھول لپٹے ہوے دو طرفہ آکر کھڑی ہوئیں جو ہی سمدھنیں داخل ہوئیں انہوں نے ان کے چوٹوں پر چھڑیاں جمانا شروع کی ایسی کہ بلبلا اٹھیں ، ان لوگوں سے چھڑیاں چھین چھین کر انکو بھی خوب خوب چھڑیاں جمائیں ۔ دولہا بھی تھوڑی دیر میں آیا ۔ دولہا ، دولہن ایک جگہ مسند پر بٹھائے گئے انکو بھی سالیوں نے آپس میں چوتھی کھلوائی ، پہلے دولہن نے دولہا کو چھڑی چھلائی پھر دولہا نے آہستہ سے دولہن کو چھڑی لگائی ۔ پھل پھلیریاں جو حسب رسم و رواج سینیوں میں لاکر رکھی گئی تھیں آپس میں سمدھنوں میں خوب اچھلی ، کسی نے کسی کو بیگن اٹھا کر دم سے پیٹھ پر مارا دوسری نے امرود اسکے سینہ پر دے مارا ۔ غرض تنی چوتھی کھیلی گئی کہ تمام گھر کی زمین پھل پھلیریوں سے پٹ گئی ۔ پھر سب اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئیں ◆

نیشنل اسٹوڈیوز کا تازہ شاہکار "رادھیکا" جسمیں ایک نئی اداکارہ مس نلنی جیونت نے کام کیا ہے۔ ۲۰ فروری سے پانچھے سینما میں کامیابی سے چل رہا ہے۔ — آجکل تین نئی فلموں کی تیاریاں ہیں۔ چنانچہ "پسولی" رانچند ٹھاکر اور امر کی "ضیا" محبوب کی نگرانی میں تیار ہو رہی ہیں "آسرا" للت چندر شاہ تیار کر رہے ہیں۔

واڈیا موویٹون:۔ ہندی زبان میں "راج نرتکی" رائل اوپیرا ہاؤس میں کامیابی سے چل رہی ہے اسٹوڈیو میں "منتھن" رانجی بھائی کی نگرانی میں مکمل ہو چکا ہے اسمیں سردار منصور اور رادھا رانی نے خاص کردار انجام دیئے ہیں۔ ہومی واڈیا اپنی "بمبئی والی" میں مشغول ہیں "دریشکا کی رادھا" بھی سرعت کے ساتھ اپنی ابتدائی منازل ختم کر رہی ہے۔

رنجیت موویٹون کا تازہ شاہکار "پردیسی" "لیکٹن" میں پیش کر دیا گیا ہے اور پبلک میں کافی مقبول ہوا ہے، اسمیں موتی لال ستیہ پربھا اور خورشید کام کرتے ہیں۔ "شادی" اور "سسرال" کی سرعت سے تکمیل ہو رہی ہے، ان دونوں فلموں میں موتی لال کا اہم کردار ہے۔

بمبئی ٹاکیز:۔ مارچ میں "نیا سنسار" نمائش کیلئے پیش ہوگا۔ "نیا سنسار" کی کہانی خواجہ احمد عباس کی لکھی ہوئی ہے۔ اداکاروں میں عالمی شہرت یافتہ رینوکا دیوی اور اشوک کمار اور ڈیسائی قابل ذکر ہیں۔

نو یوگ چترپٹ کولہاپور کے "گنا پھولے کردوں" مراٹھی مزاحیہ شاہکار کو لوگوں نے بہت پسند کیا خاص کر طلباء نے۔ "امرت" قریب الاختتام ہے اور ڈائرکٹر ونائک کا خیال ہے کہ وہ اسے ۱۰ مارچ میں پیش کر سکیں۔ اسمیں مینا کشی — بابوراؤ پینڈھارکر اور خود ونائک کا اہم

سرکو پروڈکشن کے "مدھوسدن" تازہ سوشیل شاہکار کی امپیریل سینما میں نمائش ہو رہی ہے۔ ڈائرکٹر جگل "تلسی" کی تیاری میں مشغول ہیں۔ تارا دیوی ستارہ اور رادھا رانی نے ذہنی انگلش نیر فلم "سوامی" میں خاص کردار دیئے ہیں، دوسری تصاویر میں "قلو پطرہ" جسمیں نسیم اور چندر موہن اداکاری کرینگے ایک خاص چیز ہو گی "ونمالا" اور "مہاتما ودر" جسمیں شانتا آپٹے نے کام کیا ہے وہ بھی اس سال کے پروگرام میں شامل ہیں۔ — ڈیکی بوس گذشتہ ہفتے بمبئی وارد ہو چکے ہیں "ہوم کالز" شروع کرینگے۔

پرکاش پکچرز کے اسٹوڈیو میں آجکل "درشن" کو تکمیلی ٹچ دیئے جا رہے ہیں اس میں جیوتی اور پریم ادیب کام کرتے ہیں، ڈائرکٹر وجے بھٹ کی نگرانی میں "بھرتری" کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

اترے پکچرز:۔ فلمساز اترے، گجانند جاگیردار کی ادا آموزی میں اپنی فلم "چرنوں کی داسی" تیار کر رہے ہیں، امید ہے کہ فلم کامیاب ثابت ہوگی — اداکاروں میں درگا کھوٹے، ونمالا اور جاگیردار خاص ہیں، یہ فلم ہندی اور مراٹھی دو زبانوں میں بنیگی۔

پربھات فلم کمپنی پونہ "پڑوسی" نہایت کامیابی سے چل رہا ہے "سنت سکھو" کی شوٹنگ جاری ہے اسمیں ہنسا واڈکر نے ایک اہم کردار انجام دیا ہے — "عمر خیام" کا غذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور شانتارام کے سامنے پیش کر دی گئی ہیں۔ ساتھ ہی "عمر خیام" کیلئے دوسری تیاریاں مثلاً سیٹنگ، لباس وغیرہ بھی ہو رہا ہے۔

منروا ٹاکیز "الٹی گنگا" عنقریب نمائش کیلئے پیش کیجائیگی "سکندر اعظم" بھی سرعت سے بن رہا ہے "سکندر اعظم" کیلئے ڈائرکٹر سہراب مودی نے لالہ یعقوب کو بھی شامل کیا ہے، آپ اسمیں سلیکس کا کردار ادا کرینگے۔

نیو تھیٹرز کی "زندگی" کامیابی سے جاری ہے اور "لگن" کا بمبئی بیصبری سے انتظار کر رہے ہیں اسمیں ایکبار پھر کانن اور سہگل کا اشتراک ہوگا۔

TANVIR, Bombay Regd No. B. 4013

رسائل
۵۲۶
TANVIR
MONTHLY
BOMBAY-8
JANUARY
1941
مدیرہ
"سحر"
SAHER

Mrs. FATIMA HASHIM ISMAIL

One of our writers. Read her wonderful article about "Adult Education" in this issue.

TANVIR

ماہنامہ تنویر بمبئی

مدیرہ
سحر
نائب مدیرہ
انوری خانم

شرح چندہ
سالانہ مع محصول ڈاک ۲/۸
دو روپیہ
قیمت فی پرچہ ۴/
نمونہ ۳/
ممالک غیر سے ...... دس شلنگ

جلد ۵　　　شمارہ (۱)

فہرست مضامین ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

مہتمم تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اے۔ ون پریس بمبئی میں چھپوا کر دفتر رسالہ "تنویر" ... اسٹریٹ۔ بمبئی سے شائع کیا۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

بدریائے تلاطم چوں گہر زی
نہنگ آسا درونِ بحر و بر زی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

کفن بر دوش و برخونِ جگر زی
بکف سر، نہ بہ شمشیر و تبر زی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

بہ موج زندگی آویزہ در دم
جہان فتنہ خو، چوں فتنہ گر زی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

بہ سربازی نبرد زیست سر کن
بہ بزم و رزمہا باشور و شر زی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

بزن آتش سر خاشاک و گلشن
سکوں بر سوز و چوں برق و شرر زی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

بشو آزاد از فکر نشیمن
بہ بے برگی و بے شاخ و ثمر زی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

چو نکہت اندرون صحن گلشن
چمن بگذار و بے گلہائے تر زی

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

سالِ نو

۱۹۴۱ء نے قتل وخون کے ہنگامہ زار میں آنکھ کھولی ، مظلوموں کی آہ وزاری — بیواؤں کی فریاد وبکا ۔ یتیموں کے نالہہائے دلسوز نے اس کا استقبال کیا — اس نے دیکھا کہ بھائی بھائی کے خون میں ہاتھ رنگ رہا ہے ، انسان نے قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے لئے زہر بنالیا ہے ، انسانوں کا علم وفضل ، سمجھ بوجھ ، تجربہ وطاقت نے دنیا کو جنت بنانے کی بجائے جہنم بنا رکھا ہے ، انسانوں کی قلیل تعداد برائے نام سکھی ہے اور بہت بڑی تعداد دکھی .... سکھی انسانوں کا سکھ کروڑوں انسانوں کے دکھ کی بنا پر قائم ہے اسلئے وہ سکھ ، سکھ نہیں کہلایا جاسکتا ۔

کروڑوں انسان غلام ہیں ، بھوکے ننگے ہیں — نہ ان کے جسم کو آرام ہے نہ انکی روح کو چین حاصل ہے ۔ انکے دل ودماغ بیمار ہیں ، اسی لئے ساری دنیا میں "بدی کی وبا" پھیل رہی ہے ۔ سالِ نو اپنے دامن میں دنیا والوں کیلئے جو برکتیں لایا ہے ان برکتوں کا مستحق اُسے کوئی نظر نہیں آیا ، چونکہ آج کے "انسان" حقیقت میں کیا ہیں ، سنئے ....!

امن پسند وہ ہے جس کے ہاتھ میں تلوار ہے ، بہادر وہ ہے جو کمزور کے خون سے ہاتھ رنگے ، نیک وہ ہے جو بدی کا انسداد کرنے کے بہانے خود بدی پر عامل ہوجائے ، سچا وہ ہے جس نے جھوٹ کو ، کھلے خزانے جائز قرار دیدیا — دیانتدار وہ ہے جس نے ڈاکہ زنی اور چوری (چالاکی سے پرایا مال ہڑپ لینا) کو قانون کی شکل دیدی ، مرد وہ ہے جو عورت کو حقیر سمجھے ۔ عورت وہ ہے جو اپنی نسوانیت کی نمائش کرکے مردوں کو کتوں کی طرح اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کرے ۔ سچا عیسائی وہ ہے جسے یہ گھمنڈ ہو کہ میں ہی خدا کا بیٹا ہوں اور سب ہیچ ہیں — تہذیب کا علمبردار وہ ہے جو انسانوں کو ٹکڑیوں میں تقسیم کردے ، یہ کالا ہے — وہ گورا ہے — یہ ہندو ہے وہ مسلمان — یہ یہودی ہے وہ عیسائی — یہ ہندوستانی ہے وہ عرب ۔ یہ ترک ہے وہ ایرانی — سچا ہندو وہ ہے جو جانور کی جان بچانے کو آدمی کے حقوق کا خون کرڈالے ، اور سچا مسلمان پرکھنے کی یہ کسوٹی ہے کہ صرف ہندو سے نفرت کرتا ہو ، امیر وہ ہے جو اپنی معمولی جائز یا ناجائز ضرورت کو پورا کرنے کیلئے دوسروں کی اہم ضروریات کو پامال کرڈالے اور غریب کا آخری قطرۂ خون بھی چوس لے ۔ غریب وہ ہے جو اپنی حالت سے بے خبر ہوکر امیر کی ڈگڈگی پر ناچے — سالہا سال کے مظالم کو انتخاب کے موقعہ پر ایک پلیٹ بریانی کھاکر بھول جائے اور اپنا قیمتی ووٹ روپیہ سے لیکر چونی تک میں بیچ ڈالے جس سے منتخب ہوکر اسکا ازلی حریف مجالس قانونساز میں جاکر اسکی بربادی اور اپنے محدود فائدہ کا سامان کرے ۔

انسانوں کی یہ حالت دیکھ کر سالِ نو نے اپنے دامن کو سمیٹ لیا ، وہ کیا کرے ؟ اُسے معلوم ہے کہ آج امن وانسانیت کا

پیغام دینا "خلاف قانون" ہے۔ آج تو اسے بھی خونیں ——— مہذب ڈاکوؤں ——— حرص کے بندوں ——— انسانیت کے دشمنوں کا ہمزبان ہو کر یہی کہنا پڑے گا کہ "دوڑو ——— مارو ——— کاٹو ——— اپنے ہی جیسے انسانوں کا خون بہاؤ ——— زمین کو اپنے بھائیوں کے خون سے لالہ زار بنا دو ——— کھڑی کھیتیاں جلا دو، انسانیت کی لاشوں پر پھولوں کے بجائے انگارے برساؤ، تہذیب کا ماتم کرو ——— ساری دنیا میں آگ لگا کر اسے راکھ کا ڈھیر بنا دو اور حقیقی مذہب کی دھجیاں اڑا دو ——— چونکہ وہ انسانیت کا درس دیتا ہے اور جب اس ہنگامہ خون آشام کے بعد موت کا سکوت چھا جائے اور تمہارے سر سے شیطنیت کا بھوت اتر جائے اسوقت بھی اپنی غلطیوں پر نادم ہونے کی بجائے تم اسے اپنی عقلمندی کے نام سے یاد کرنا، تاریخ میں اپنی بہادری کے ڈنکے بجانا اور ایک نئی جنگ کی بنیاد پھر سے ڈال دینا تاکہ نئی نسلیں تمہاری سنت پھر سے ادا کریں، تم انسان .... نائب خدا ہونے کی بجائے شیطان کے غلام بننے پر زیادہ فخر کرتے ہو ...... اس لئے سال نو تمہیں اسکے سوائے اور پیغام بھی کیا دے سکتا ہے؟"

اسوقت جبکہ دنیا میں شیطان (یعنی بدی کی طاقتوں) کا راج ہے اسلئے نیکی کی آواز بلند کرنا لوگ حماقت سمجھتے ہیں اور اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں، مگر نیکی ہمیشہ نیکی رہی ہے اور بدی، بدی ——— نیک لوگوں کی ایک ہی پکار ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں کوئی غیر نہیں ہے، ایک انسان ——— یا ایک انسانی گروہ کا نقصان ہم سب کا نقصان ہے"، ہمیں معلوم نہیں کہ اس صحیح بات کے ہمارے ہمخیال زیادہ ہیں یا کم ہم نئے سال کی آمد پر اپنے ناظرین کو "رسمی مبارکباد" کیونکر دیں، البتہ ہم اپنے ہمخیال ناظرین "تنویر" کے ساتھ اللہ پاک سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کو نیکی پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے!

اور جتنے انسان غلط راستے پر چل رہے ہیں وہ بھی سیدھی راہ پر آجائیں، ہر انسان بلا کسی تخصیص کے دوسرے انسان کے درد دکھ کو اپنا درد تصور کرے۔ سب کیلئے سچی عزت اور راحت اسی میں مضمر ہے ———

کرسمس کا تیوہار

حسب معمول آیا اور چلا گیا۔ دنیا کے سب سے زیادہ امن پسند، محبت کے مبلغ اور انسانیت پر احسان عظیم کرنیوالے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم پیدائش یہی ہے۔ انہوں نے انسانوں کو محبت، نرمی، نیکی، رحمدلی اور "خدمت انسانی" کا پیغام دیا۔ مکمل انسانیت کیساتھ زندہ رہنے کے اصول ہم سب کو بتائے۔ سادگی ایثار اور عدم تشدد کا سبق انسانوں کو پڑھایا، اگر انکی تعلیم پر عمل کیا جاتا تو یہی دنیا بہشت بنجاتی۔

مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں کا گھر یعنی یورپ بجائے سادگی کے پیچیدگی کا مرکز بنا ہوا ہے، عدم تشدد کی بجائے اس ملک کے باشندے ہتھیار بنانے کی دوڑ میں ایک دوسرے کو مات کر دینے کی فکر میں بازی لیجا رہے ہیں۔ روحانیت کی بجائے مادیت عروج پر ہے۔ وہاں کے انسان ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال پیش کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے سینوں پر چڑھ بیٹھنے اور ایکدوسرے کا گلا گھونٹ ڈالنے کیلئے تملا رہے ہیں۔ یورپ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ مہذب "کہلاتا" رہا ہے۔ لیکن انکی اصلیت آج دنیا پر واضح ہو گئی۔ ہم ہندوستانی جو صدیوں سے آزادی کی نعمتوں سے محروم ہیں اور اس لحاظ سے یہ زمانہ ہماری قومی پستی کا زمانہ ہے۔ پھر بھی ہندوستانی ان سے زیادہ مہذب ہیں۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے دوسروں کے بہکانے یا اشتعال دلانے پر ہندو مسلمان آپس میں لڑ بیٹھتے ہیں تو انگریز ہمیں دنیا بھر میں بدنام کرتے ہیں کہ ——— "ہندوستانی غیر مہذب ہیں آپس میں لڑتے رہتے ہیں" ——— ہمارے

لڑنے کیلئے تو انگریزوں نے بہت سی وجوہات بھی پیدا کر رکھی ہیں۔ سب سے بڑی وجہ "افلاس" ہے۔ مگر یورپ تو آزاد ملک تھا، تعلیمیافتہ بھی تھا، دولتمند بھی تھا ــــــ پھر یہ "لپاڈگی" کیسی؟

ہم غریب تو اپنی ضروریات کیلئے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، یورپ والے تو بہت دولتمند ہیں لیکن ان کو حرص نے اندھا کر رکھا ہے پھر ستم یہ کہ "مذہب" کی دہائیاں بھی یہیں سے سنائی دیتی ہیں۔ ہر فریق کہتا ہے کہ "حریف نے میرے گرجا گھروں پر بمباری کی"..... حالانکہ ان لوگوں کا مذہب بھی ایک ہے لیکن انہوں نے اپنے قابلِ فخر پیغمبر کی تعلیم کو پس پشت ڈالدیا ہے اور سیاست کو ہی مذہب بنا کر دنیا کو مغالطے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ حضرت عیسیٰ کی امت کہلانے والوں نے ہی دنیا پر سب سے زیادہ مظالم ڈھائے ہیں۔ جوشش ملیح آبادی نے خوب کہا ہے ؎

ادعائے پیروئ ابنِ مریم اور تو؟
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو!

فنانس بل اور ملک کی رائے عامہ

اسمبلی میں جب فنانس بل پیش ہوا تو کانگریس پارٹی نے اسکی زور و شور سے مخالفت کی۔ فرداً فرداً مسلم لیگ کے معزز اور سربرآوردہ ممبروں نے بھی اسکی پُرزور مخالفت کی جن میں قابلِ ذکر سر محمد یامین خان صاحب اور مولٰنا ظفر علیخان ہیں ــــ اس بل کے ذریعے ملک پر مزید ٹیکس عائد کئے گئے ہیں۔ کرایۂ ریل تو پہلے ہی بڑھ چکا تھا، اب ڈاک و تار...... اور ٹیلیفون کی معمولی قیمتوں میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے ــــ کانگریس پارٹی نے عوام کی سچے معنوں میں نمایندگی کی۔ عوام ویسے ہی مصیبتوں میں مبتلا ہیں ــــ فقر و فاقہ ــــ بیروزگاری ــــ تنگی و مفلسی ــــ پیٹ کو ہے تو تن کو نہیں ــــ تن کو ہے تو پیٹ کو نہیں ــــ تعلیم و تفریح کا ذکر ہی کیا؟ ہمارا ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا ہے مگر ہندوستانیوں کا معیارِ زندگی اتنا پست ہے کہ اسمیں کسی مزید کمی کی گنجایش ہرگز نہیں ہے۔ اسپر اب ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے، طرہ یہ کہ ٹیکس بھی بڑھ رہے ہیں اور ان کا بار انہیں غریبوں پر زیادہ پڑ رہا ہے جو بخوشی اسکے متحمل ہرگز نہیں ہو سکتے ــــ سر محمد یامین خانصاحب نے درست فرمایا تھا کہ سپلائی ڈیپارٹمنٹ کو بڑی بڑی تنخواہ لینے والے ممبران اور دوسرے بڑی بڑی تنخواہ پانے والے ممبروں کی تنخواہوں میں کمی کر کے بجٹ پورا کرنا چاہئے نہ کہ خستہ حال عوام پر بار ڈالکر ــــ رائے شماری پر کانگریسی ممبران نے تو سرے سے ہی مخالفت میں ووٹ دیئے لیکن خوشی کی بات ہے کہ مسلم لیگ بھی غیر جانبدار رہی اس سے فنانس بل اسمبلی میں پاس نہ ہو سکا اگرچہ وائسرائے نے اپنے مخصوص اختیارات سے کام لیکر پاس کر دیا ہے مگر ملک نے بخوشی اسے منظور نہیں کیا، مسلم لیگ اور مسٹر جناح قابلِ مبارکباد ہیں کہ اگرچہ انہوں نے قوم کا ساتھ نہیں دیا مگر گورنمنٹ کا بھی ساتھ نہیں دیا ــ حالانکہ ہماری رائے میں انہیں قوم کا ساتھ دینا چاہئے تھا کیونکہ خود انکے قول کے مطابق وہ مسلمانوں کے نمائندہ ہیں اور ٹیکس جن پر لگیگا اس سے غریب مسلمان بھی مستثنےٰ نہیں ہیں۔ کیا عام غریب مسلمان اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اس تباہ حالی میں چار کی جگہ پانچ پیسے انہیں خرچ کرنے پڑیں؟

اسلام اور پاکستان

اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ تو ہم پھر کبھی روشنی ڈالیں گے اسوقت صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اسلام دنیا کا سب سے زیادہ تبلیغی مذہب ہے اسلام نے اپنے اصولوں کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کیلئے جتنے احکام جاری کئے ہیں اتنے کسی اور مذہب نے نہیں کئے۔ وجہ یہ کہ اسلام دنیا کے کسی ایک خطے یا طبقے کیلئے نہیں آیا اور نہ اسکا تعلق دنیا کی کسی ایک قوم کے ساتھ رہا۔ اسلام اتحاد بین المذاہب، اور بین الاقوامی مذہب ہے

اس لئے اس کے وسیع دائرے میں دنیا بھر کی زبانیں — دنیا بھر کے کلچر اور تمدن و تہذیب آ جاتے ہیں ۔ مذہب اسلام کسی ایک زبان یا کلچر و معاشرت کے اندر مقید نہیں ہے ۔ ایک دھوتی باندھکر سنسکرت بولنے والا بھی مسلمان ہو سکتا اور ایک انگریزی یا جرمن فرنچ یا روسی زبان بولنے والا ۔ اور جاپانی تمدن و تہذیب رکھنے والا بھی مسلمان ہو سکتا ہے ۔ اسلام کے اصولوں میں اتنی لچک ہے کہ سوٹ بوٹ پہننے والا جبہ و دستار، دھوتی مرزائی مکرنا یا پجامہ اور اچکن پہننے والا — پگڑی باندھنے والا — ٹوپی پہننے والا — اور ننگے سر رہنے والا سب ہی اسلام کے اصول اور عقائد مانکر مسلمان کہلائے جا سکتے ہیں ۔

مسلمانوں کو اپنے سچے اور پاک اصول و عقائد کیلئے دنیا کے ہر خطے میں تبلیغ کرنا ہے ۔ زمان و مکان کے لحاظ سے انہیں لباس زبان ، طرز معاشرت میں بھی تبدیلی کرنا ہو گی ، چونکہ جہاں وہ جائینگے اور سکونت اختیار کرینگے جس خطۂ زمین کو اپنا گھر یا وطن بنائینگے اسکی خدمت اور فرائض بھی انپر عائد ہونگے ۔ ان کے اسلامی اصول انہیں یہ ہرگز نہیں کہتے کہ " تم وطن کے غدار بنو ۔ وہاں کی تہذیب اور کلچر کو تباہ کرو —— اور زمان و مکان کا خیال نہ رکھو ۔ اور جس جگہ تم جاؤ وہاں کی ترقی میں رخنہ اندازی کرو ۔ کیونکہ ایسا کرنے سے لازمی طور پر اسجگہ کے لوگ مسلمانوں سے نفرت کرنے لگیں گے پھر تبلیغ کیسی —— ؟

مسٹر جناح نے جو پاکستان اسکیم پیش کی ہے وہ سرے سے ہی اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیمات اسلامی کے خلاف ہے چونکہ آپ کا فرمانا ہے کہ " اسلامی کلچر (زبان اور معاشرت صرف وہیں محفوظ رہ سکتی ہے جہاں کسی قسم کا کوئی اور غیر مسلم اثر نہ ہو " ۔ یہ اسکیم ہماری نظر میں تو مذہبی جنون براہمنوں کے چوکے کی لکیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔ ...

اُردو سچے معنوں میں ہندوستان کی قومی زبان ہے ۔ کیونکہ یہاں کی دو بڑی قوموں نے اسکی آبیاری کی ہے ۔ اس لئے یہ مشترکہ قومیت کی سچی یادگار اور زندہ ثبوت ہے ۔ جو اس حقیقت سے انکار کرتا ہے وہ دراصل ہندوستان کی متحدہ قومی تعمیر اور تشکیل سے منہ موڑتا ہے اور ہندو مسلم اتحاد کا خواہاں نہیں مانا جا سکتا اسلئے وہ ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا خواستگار بھی نہیں ہے

اردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے ۔ چونکہ اُردو نہ تو عرب کی زبان ہے نہ مصر کی نہ ایران کی زبان ہے نہ افغانستان کی ۔ یہ زبان ہندو مسلم ملاپ سے پیدا ہوئی دونوں قوموں نے ملکر اسے پروان چڑھایا اسے سنوارا اور سجایا ، اسلئے یہ " متحدہ قومیت " کی زبان قرار دیئے جانے کی سب سے زیادہ مستحق ہے ۔ جو اس سے انکار کرے یا اس میں رخنہ اندازی کرے وہ متحدہ قومیت کا حامی نہیں کہلایا جا سکتا ۔ اُردو کی مخالفت کرنا بدترین قسم کی فرقہ پرستی مانی جائیگی چونکہ ایسا کرنے والا ایک ایسے ملاپ کے نقطے کو مٹا دینا چاہتا ہے جہاں پر دو قوموں نے اپنے مختلف پرانے فرسودہ لباس کو اتار کر ایک ہی لباس پہنا اور ایک ہی تمدن اور معاشرت اختیار کی جس سے وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں ۔ جہاں پر دو دریاؤں کی دھارائیں ملکر ایک ہو گئیں ۔

اب رہا ہندی اُردو کا سوال ، یہ غلط ہے کہ ہندی اور اُردو دو علحدہ علحدہ زبانیں ہیں ، زبان دراصل ایک ہی ہے ۔ ان کے لباس البتہ علحدہ علحدہ ہیں ۔

انہیں ایکدوسرے کا حریف بتانیوالے خود ہی حریفانہ ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں چنانچہ اردو کی حمایت میں ہندی کی مخالفت یا ہندی کی حمایت میں اردو کی مخالفت مضحکہ خیز بات ہے اردو رسم الخط خاص آرٹسٹوں کا رسم الخط ہے اور اپنی دلکشی اور

خوبصورتی میں نظیر نہیں رکھتا۔ اس رسم الخط کے سیکھنے میں کم و بیش دو یا تین ماہ صرف ہوتے ہیں جو اس کی خوبی اور دلکشی کے لحاظ سے کچھ زیادہ مدت نہیں۔

ہندی رسم الخط دو ہفتہ میں سیکھا جاسکتا ہے اس لحاظ سے یہ بہت آسان ہے۔ اور اس کا ٹائپ ہونے کی وجہ سے طباعت میں بہت سی ویسی ہی آسانیاں اسے حاصل ہیں جیسی انگریزی زبان کو۔ اس لئے یہ رسم الخط طباعت کی ترقی کا ساتھ دیسکتا ہے۔ اخبارات۔ تعلیمی نشر و اشاعت کیلئے یہ بہت موزوں ہے۔ لیکن یہ بھی تو خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں اب ہندو مسلمانوں کو ملکر رہنا ہے۔ اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے اگر ایسا نہ کریں گے تو دونوں کچھ تو تباہ ہوچکے اور اپنی موجودہ روش نہ بدلنے سے بالکل ہی تباہ ہوجائیں گے۔ اس صورت میں یہی ہوسکتا ہے کہ انکی متحدہ قومی حکومت کی زبان "تو ہندی یعنی اردو" ہوگی اور رسم الخط فارسی جسے مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس طرح زبان ہندی اور رسم الخط فارسی ملکر ہندوستان کی مشترکہ قومیت کی سرکاری زبان ہوگی۔ اس سرکاری زبان کو بہت سلیس اور آسان ہونا چاہئے۔ لیکن اسکے معنے یہ نہیں ہیں کہ سنسکرت آمیز ٹھیٹ ہندی۔ یا عربی فارسی آمیز ادبی "اُردو" ناپید ہو جائے۔ ان دونوں کو بھی اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے دینا چاہئے۔

اُردو کی نشر و اشاعت کرنے والی انجمنوں کو خاص طور پر اس امر کی طرف زیادہ خیال دینا چاہئے کہ وہ اردو کو صرف لکھنؤ اور دہلی کی ٹکسالی زبان تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ انہیں چاہئے کہ اردو کے دامن کو اور وسیع کردیں۔ معیاری زبان کا درجہ تو یقیناً دہلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کو ہی حاصل رہیگا۔ باقی صوبوں میں صوبجاتی اردو بولی جائے۔ جیسے بمبئی کی اردو، حیدرآبادی اردو، پنجابی اُردو۔ بنگالی اُردو، مدراسی اردو، ہندوستانی اردو جیسی کہ ریڈیو پر بولی جاتی ہے .... شہری اردو ...... اور دیہاتی اردو جیسے کہ "جٹ صوبہ" وغیرہ۔

اب یہ بولنے، پڑھنے یا سیکھنے والے کی خواہش پر منحصر ہے کہ وہ جس قسم کی زبان چاہے اختیار کرے۔

امید کہ حامیان اردو کو اس سے اتفاق ہوگا۔

(بقیہ صفحہ ۶ شبنم) ایک روز ریحانہ نے آکر "افق زرین" سے کہا۔ مبارک ہو۔۔۔ اب تمہاری شادی دلیپ سے ہی ہوگی، نواب صاحب نے شادی سے انکار کردیا ہے۔۔۔ "افق زرین" پھولی نہ سمائی، اس نے سوچا کہ اب اسکے سنہرے خوابوں کی تعبیر پوری ہونیوالی ہے۔۔۔ آرسی مصحف کے وقت اُس نے دیکھا کہ دولہا وہ نہیں ہے جسے وہ اپنے دل کا مالک مدت سے بنا چکی تھی ...... فرط الم سے وہ بیہوش ہوگئی۔۔۔ اور اس روز رخصتی نہ ہوسکی۔

(۴)

راستے میں دولہا نے اسکے نام کا کارڈ اُسے دکھا کر پوچھا کہ "شبنم" تم ہی ہو۔ مجھے اب تک یہ تو معلوم ہی نہ تھا۔ میں اپنی قسمت پر جسقدر بھی ناز کروں بجا ہے! شبنم نے بتایا کہ اسکے والدین اگرچہ پرانے خیالات کے تھے مگر وہ اسبات پر راضی ہوگئے کہ "شبنم" کے نام سے ادب و شعر کی دنیا میں شہرت حاصل کروں، اسی لئے ابتک کسی کو معلوم ہو سکا کہ "افق زرین" اور "شبنم" ایک ہی لڑکی کے دو نام ہیں۔۔۔ جب وہ سسرال آئی موٹر سے اترتے وقت وہ لڑکھڑانے لگی، اسکے جیٹھ بھی موجود تھے نواب خسرو جاہ نے اسکا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "دلہن لڑکھڑا کیوں رہی ہو؟"۔ اور خود سہارا دیتے ہوئے اسے محل میں لیگئے۔۔۔ سلامی کے وقت دلہن کے منھ سے جب گھونگھٹ اٹھایا گیا نواب صاحب کے ہاتھ سے مرصع ہار چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ انکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا حیرت و استعجاب سے انکے منھ سے نکلا "کون ..... شبنم ؟ !"۔۔۔ شبنم نے گھبرا کر آنکھیں کھولدیں خسرو کو دیکھا۔

اور نظریں جھکالیں، ولیعہد فریدوں جاہ "شبنم" کے شوہر نے ہنسکر اپنے بھائی سے کہا۔ "ہاں شبنم" انہیکا نام ہے اسکا بڑا پر لطف قصہ ہے آپکو سناؤنگا"۔۔۔ خسرو۔۔۔ اف شبنم سر جھکائے اپنی قسمت ...

(بقیہ صفحہ ۱۶)

۱

جم گیا ہر گوشے گوشے میں قدم تہذیب کا ... اڑ رہا ہے آسمانوں میں علم تہذیب کا

توپ کے گولے پڑھاتے ہیں تمدن کا سبق ... کس زباں سے شکر کر سکتے ہیں ہم تہذیب کا

۲

کام چل سکتا نہیں ، دنیا میں دولت کے بغیر ... زندگی پھیکی ہے اسکی آب و رنگت کے بغیر

ایسی دولت سے مگر سو مفلسی بہتر ادیب ... جو نہ مل سکتی ہو خونِ آدمیت کے بغیر

۳

یارب دلِ بسمل کا اثر چھین لے مجھ سے ... کیفیتِ فریادِ سحر، چھین لے مجھ سے

دیکھی نہیں جاتی ترے بندوں کی تباہی ... اچھا ہے کہ "احساس نظر" چھین لے مجھ سے

۴

اعجاز محبت کا دکھایا نہ گیا ... بچھڑی ہوئی روحوں کو ملایا نہ گیا

ایوان بنا ڈالے ھزاروں تم نے ... اجڑے ہوئے سینوں کو بسایا نہ گیا

(خاص)

تعلیم بالغان

از محترمہ مسز فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ (بمبئی)

تعلیم بالغان کی تحریک بمبئی میں بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ مسلمان عورتوں میں اس تحریک کی روح رواں ہماری سرگرم قومی کارکن بہن مسز کلثوم سایانی صاحبہ ہیں۔ جنکی ان تھک کوششوں سے بہت کم وقت میں مسلمان عورتوں کی بڑی تعداد نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ ان نئی تعلیمیافتہ بہنوں کو تقسیم اسناد اور انعامات کی تقریب میں محترمہ بہن فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ نے یہ مضمون پڑھا تھا۔

اس میں ملک کی موجودہ ابتر حالت، اور اسکی اصلاح پر دلچسپ پیرائے اور عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے، میرے خیال میں یہ مضمون اس اشاعت کا سب سے اہم مضمون ہے، جونکہ قومی تعمیر کیلئے ہماری "قومی اہم ضرورت" یعنی تعلیم بالغان پر زور دیا گیا ہے۔ جہالت کی گود میں پرورش پائے ہوئے بچے تعلیمیافتہ ہوکر بھی اچھے "انسان" نہیں بن سکتے، چونکہ جہالت کا زہر انکی تعلیم کو بھی مسموم کر دیتا ہے اسلئے برائی کا انسداد شروع میں ہی کر دینا انسب ہے۔ ہمارے ملک کے نبض شناسوں نے شروع سے ہی غلط تشخیص کی اور ادھورا علاج کیا، اسی لئے اتنا زیادہ وقت گزر گیا، جتنی زیادہ طاقتیں اور تدبیریں صرف ہوگئیں، اتنا فائدہ نہیں پہنچا، اگر مصلحین قوم شروع سے ہی لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی اتنی توجہ دیتے تو ان کا بوجھ بہت ہلکا ہو جاتا اور ایک صدی کا کام چوتھائی صدی میں سر انجام پا جاتا۔ ہماری بہن فاطمہ صاحبہ نے اس مضمون میں بہت وضاحت کیساتھ بحث کی ہے یہ اصلاحی مضمون ہے اسلئے زبان ادبی ہے نہ "لغوی" چونکہ بقول اُن کے سب سے پہلا کام قوم کو "تندرست و توانا" بنا دینا ہے پھر ہمارا ادب بھی بیمار نہ رہیگا۔ علاوہ بریں اس مضمون کی زبان اسلئے خاص طور پر آسان رکھی گئی ہے کہ جن لوگوں کو ایسے مضامین کی ضرورت ہے وہ بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ مجھے صاحبۂ مضمون کی اس رائے سے کلی اتفاق ہے، اس کی زبان کو جوں کا توں رہنے دینا اسلئے مناسب سمجھا کہ مضمون کی "روح" مضمحل نہ ہو جائے۔ (حامد بیگ)

صاحب صدر اور بہنو!

میں تقریر و قریر تو کرنا جانتی نہیں۔ تقریر ایسا لفظ ہے کہ خواہ مخواہ گھبرا دیتا ہے۔ مگر میں بمبئی کی بولی میں تھوڑی سی بات چیت کر کے سمجھانا چاہتی ہوں کہ یہ "تعلیم بالغان" کی تحریک کیوں شروع کی گئی، کس واسطے شروع کی گئی اور اس کے نتیجے اور فائدے قوم کیلئے کیا ہوں گے۔ تعلیمیافتہ لوگ تو ان سب باتوں اور نکتوں کو اچھی طرح جانتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ عام لوگ اب تک اسکی وجہ اور سبب سے ناواقف ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اس کو بڑے لوگوں کا ایک نیا فیشن بھی سمجھتے ہوں۔ اگر وہ لوگ جن کو ہم پڑھاتے ہیں سمجھ جائیں کہ اسکی ضرورت کیوں ہوئی اور اس کے فائدے کیا ہوں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ دل و جان سے ہماری مدد کر کے اس کام کو بڑھانے اور کامیاب بنانے میں ہاتھ بٹائیں گے۔

خیر، بات تو یہ ہے کہ آجکل بمبئی میں "تعلیم بالغان" کا بہت

زور شور مچا ہوا ہے۔ جدھر دیکھو یہی کام ہو رہا ہے۔ جہاں سنو یہی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ جس کو ملو اسی دھن میں لگا ہے کہ بڑے عمر کے لوگوں کو پڑھاؤ پڑھاؤ، خدا واسطے جتنا جلدی اور جتنے زیادہ لوگوں کو پڑھا سکو پڑھاؤ۔ مسز سایانی سارا دن موٹر لئے بچوں کو چھوڑ کر گھر کو چھوڑ کلاسوں میں ماری ماری پھرتی ہیں اور جو تھوڑا بہت فرصت کا وقت ملا تو آ کر میرا سر کھاتی ہیں کہ آج فلاں کلاس میں یہ ہوا اور فلاں کلاس میں یہ ہوا بعض وقت تو میں جھنجلا کر ڈانٹ دیتی ہوں کہ کبھی چین بھی لینے دیگی۔ سوائے اس "تعلیم بالغان" کے اور بھی کچھ بات کریگی یا نہیں؟ مگر پھر اکیلے میں سوچنے بیٹھتی ہوں کہ میرے وطن ہندوستان میں تعلیم بالغان کی ضرورت کیوں ہوئی ہے تو بے تحاشہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ بارِ الٰہی کوئی ایسا جادو میرے ہاتھ میں دے کہ ایک ہی وار میں اپنے وطن کے ہر مرد و عورت کو پڑھا لکھا بنا دوں بہنو! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان ایک زمانے میں دنیائے عالم ملکوں میں گنا جاتا تھا؟ اور آج یہ دن ہے کہ ہمارے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکہ لگا کر ہم کو "تعلیم بالغان" یعنے بڑے عمر کے لوگوں کو پڑھانے کی ضرورت آ پڑی۔ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ جیسے آج ہمارے طالب علم یعنی پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کو جاتے ہیں۔ (ویسے ہی) اسی طرح سے دور دور کے ملکوں کے طالب علم ہماری یونیورسٹیوں میں آیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں جب یورپ کے لوگ چمڑے اوڑھ کر وحشیوں کی طرح جنگلوں میں بستے تھے، ہمارا ہندوستان علم و فن اور فلسفہ کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا اور آج؟ آہ! میری بہنو، وہی ہندوستان دنیا کے جاہل ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیا یہ کلنک کا ٹیکہ نہیں؟ کیا یہ شرم اور رنج و افسوس کی بات نہیں؟

اسکو ہم اپنی بدقسمتی کر کے روتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ ہماری بدقسمتی نہیں یہ ہماری غفلت اور غلط کامیوں کا نتیجہ ہے۔ جب ہم نے علم کا دامن چھوڑ دیا تو علم نے ہم کو چھوڑ دیا جس چیز کی قدر اور پرورش نہیں کی جاتی وہ یقینی اور لازمی طور پر مر جاتی ہے، دو سو سال قبل ہمارا زوال شروع ہوا دو سو سال ہوئے کہ ہماری قوم کی گاڑی آتار پر اترنے لگی — کہاوت ہے کہ "صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے" شکر ہے کہ الحمد اللہ کر کے ہم جہالت کی نیند میں سے اتنا تو جاگے ہیں کہ جنکو بچپن میں پڑھنا چاہئے تھا ان کو بڑی عمر میں پڑھانے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ جو لوگ ان باتوں کو سمجھتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ اس جہالت سے ملک اور قوم کو کیسے کیسے نقصان پہنچے ہیں۔ مگر عام لوگ نہ تو ان باتوں پر سوچتے ہیں نہ ان کو کچھ خیال اور اندازہ ہے۔ افلاس کا رونا تو ہر جگہ سنائی دیتا ہے مگر خیال نہیں آتا کہ یہ افلاس جہالت کا نتیجہ ہے۔ صنعت و حرفت اور ہر قسم کی کاریگری جس کیلئے ہمارا ہندوستان دنیا بھر میں افضل و مشہور تھا، قریب قریب ہماری سرزمین سے غائب ہو چکی ہیں۔ جہاں ہنر نہیں وہاں دولت کہاں سے آسکے؟ جہاں علم نہیں وہاں ہنر کہاں سے آئے؟

بہنو! یہ تو ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ جہاں نہ علم ہو نہ ہنر ہو وہاں بیکاری ضرور ہو گی اور برسوں کی بیکاری سے فطرت میں کاہلی پیدا ہو جاتی ہے، میرے خیال میں سب سے بڑا نقصان جو اس زمانے کے دوران نے کیا وہ یہی کہ کاہلی ہماری گھٹی میں پڑ گئی ہے اور کاہلی جس قوم کی گھٹی میں پڑ گئی اس قوم کا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔

: جہاں بدولت جہالت پھیلی تو عورت کیلئے بھی تعلیم حرام کردی گئی، یوں تو سماج عورت پر جو ظلم کرتی تھی وہ کرتی تھی مگر جب تعلیم کی روشنی تک اس سے چھین لی گئی تب تو حد ہوگئی۔ عورت کو جاہل رکھنے سے صرف عورت کا نقصان نہیں ہوا بلکہ ساری نسل بگڑی — ایک حدیث ہے کہ رسول کریم کے پاس ایک میاں بیوی آئے اور انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ قرآن پاک میں تو تعلیم حاصل کرنا مسلمان مرد اور عورت کیلئے فرض اولین ہے ہمارے دو بچے ہیں اور ہم بہت غریب ہیں، ہمارے پاس اتنا روپیہ ہے کہ ایک بچے کو پڑھا سکیں۔ آپ بتائیے کہ کس کو پڑھائیں بیٹے کو یا بیٹی کو؟ رسول کریم نے فرمایا کہ بیٹی کو۔ وہ دونوں بہت حیران ہوئے اور بار بار پوچھا کہ بیٹی کو؟ بیٹے کو نہیں! ان کی حیرت دیکھ کر رسول اللہ نے اپنے فیصلہ کا سبب سمجھایا کہ بیٹا تو کہیں بھی محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پال لیگا اسکو تو اتنا ہی کرنا ہے مگر لڑکی جو ہے اسکو تو ماں بننا ہے۔ آئندہ نسل کی پرورش کرنی ہے اگر وہ جاہل رہی تو جو بچے اس کے گود میں پلیں گے وہ بھی جاہل ہونگے۔ بہنو! خدا اور رسول نے تو عورت کا درجہ بہت اونچا بنایا اور بہت عزت بخشی مگر ہم نے اپنے ہاتھوں سے اپنے درجہ کو گرایا اور عزت کھوئی۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب میں عورتوں کے منہ سے سنتی ہوں کہ فلاں کام ہم سے کیسے ہوگا ہم تو ناقص العقل ہیں، ہم تو بیوقوف ہیں، جو خود اپنی عزت نہیں کرتا، اسکی عزت غیر کیسے کر سکتے ہیں۔

بہنو! آپنے اسبات پر کبھی ذرا غور کیا کہ خدا نے عورت کو کیوں بنایا، کس واسطے بنایا؟ صرف بچے پیدا کرنے اور مردوں کو کھانا پکا کر دینے کیلئے؟ جب حضرت آدم جنت میں اکیلے تھے تب بھی ان کا پیٹ تو بھرتا تھا، مگر جب اکیلے رہتے رہتے گھبرا کر ان کا جی اکتا گیا اور انہوں نے اللہ سے ایک ساتھی (کیلئے دعا کی) مانگا۔ تب خدا نے بی بی حوا کو پیدا کیا۔ عورت مرد کی ساتھی، مرد کی رفیق زندگی — بنکر پیدا ہوئی، باورچن اور پاؤں کی جوتی بننے کیلئے نہیں پیدا کی گئی۔ پھر جب خدا نے آدمؑ اور حواؑ کی نسل بڑھائی تو وہ اولاد حواؑ کی گود میں سونپی گئی نہ کہ آدمؑ کے۔ خدا جانتا ہے کہ جو روحانی جسمانی اور دماغی طاقتیں، خصلتیں اور عادتیں اولاد کے پیدا کرنے اور پالنے پوسنے کیلئے ضروری ہیں وہ مرد کی فطرت میں نہیں ہیں۔ وہ ساری قوتیں برداشت، صبر و استقلال درد دکھ کی برداشت، ممتا۔ تو اس نے عورت ہی کو عطا کی ہیں۔ بچے چھوٹے ہوتے ہیں وہ کتنا ستاتے ہیں۔ رات دن انکے ساتھ جاگنا پڑتا ہے۔ ان کے ناز برداریاں کرنی پڑتی ہیں۔ سوالات کی بوچھار کے جواب دینے پڑتے ہیں۔ بھلا مردوں میں اتنا صبر کہاں کہ وہ یہ سب کریں؟ آپ جو مائیں ہیں آپکو تو یہ تجربہ ہوگا کہ بچے پیدا کرنا زیادہ مشکل کام نہیں مگر ان کا پالنا بڑا کٹھن کام ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "بچے پالنا لوہے کے چنے چبانا ہے" خدا نے ہم کو اتنا قابل بنایا اور اتنا عقلمند سمجھا کہ دنیا اور زندگی کی سب سے بھاری ذمہ داری ہمارے حوالے کی۔ ہم کو ماں بنایا۔ نسل کی رکھوالی ہم کو سونپی!

ہندوستان کی جاہل مائیں کس منہ سے اللہ میاں کو اپنے فرض کی ادائیگی کا جواب دینگی؟ کیا ہم یہ کہیں گے کہ تو نے تو ہمکو عزت کے قابل سمجھا تھا مگر ہمارے باپ بھائیوں اور شوہروں نے ہم کو سمجھا دیا کہ ہم بیوقوف ہیں اور جاہل ہی رکھے جانیکے قابل!

اس روز لیڈی راما راؤ Lady Rama Rao نے بتایا کہ انگریز بچوں کے مقابلہ میں ہندوستانی بچے کسقدر کمزور مریض اور مریل معلوم ہوتے ہیں کیوں نہ ہوں، کیسے نہ ہوں؟ جن ماؤں کے پیٹ سے وہ آتے ہیں جہل غریبی اور جس فضا میں

وہ پیٹتے ہیں...... میں تو کہتی ہوں کہ ہم ہندوستانیوں ہی کا حق ہے کہ ہم ابتک فنا نہیں ہو چکے ؛ ہماری گرگٹ کی سی جان ہے کہ مارے نہیں مرتی ۔ ہر طرف گندگی ، ہر طرف بیماری پھیلی ہوئی ہے ، جاہل اور کاہل ماؤں سے اتنا تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنے گھروں کی اپنے بچوں کی ، اڑوس پڑوس کی صفائی کا خیال رکھیں جہاں گندگی ہو وہاں بیماری کے جراثیم تو ضرور آئیں گے ۔ ہماری عورتیں اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو وہ سمجھتیں کہ بیماری جراثیم سے ہوتی ہے اور اس کا بچاؤ ان طریقوں سے ہوتا ہے نہ وہ بیچاری جانتی ہیں نہ بچاؤ کر سکتی ہیں ۔

جو عورت پوری طرح سے اپنے بچوں کے اور اپنے گھر کے فرائض ادا کرنا چاہتی ہے ، اسکو کتنی باتیں جاننی پڑتی ہیں ۔ مرد کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنا پیشہ ، اپنا دھندا بیوپار کاریگری جس چیز سے وہ اپنی روزی پیدا کرتا ہو وہ جانے ۔ مگر عورت کو تو "ہر فن مولا" ہونا پڑتا ہے ، پکانا ، ریندنا ، سینا پرونا ، دھونا ، مہمان نوازی ، تیمارداری ، تھوڑی بہت حکمت استانی گیری مختصر سب کچھ جاننا چاہئے ۔ ماں کی گود بچے کا پہلے مدرسہ ہوتا ہے ، جیسا استاد ویسا شاگرد ۔ عالم ماں کا بچہ عقلمند اور لائق ہوگا ، پھوہڑ ماں کا بچہ جاہل ۔

رسول کریم نے کہا کہ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے" تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ واقعی دودھ ، اور شہد کی نہریں اور انجیر کے درخت ماں کے پاؤں تلے بہتے اور اگتے ہیں ۔ نہیں میری بہنو ! اسکا مطلب تو یہ ہے کہ ماں اپنی تربیت سے دنیا کو بچے کیلئے جنت بنا سکتی ہے ۔ ماں کو پورا اختیار ہے کہ وہ بچے کی زندگی کو بنا دے یا برباد کرے ۔ آجکل کی ماؤں ۔ دگی کو جہنم بنا رکھا ہے ، جو اخلاق بچہ ماں کے گھٹنوں کے پاس سیکھتا ہے وہی انسے کام آتے ہیں ۔ اگر ماں نیکی سکھائے ، محبت اور ہمدردی سکھائے ۔ اصول پرستی محنت و دیانتداری ، سچائی ، صفائی ، برداشت صبر ، غصہ پر قابو وغیرہ وغیرہ سکھائے تو بچہ انسان بنکر بڑا ہوتا ہے ۔ اور نہیں تو درندہ یعنی وحشی جانور ، جیسے آجکل بیکار گلی کوچوں میں گندے گالیاں بکتے ، بیڑیاں پیتے ، چوریاں اور بدمعاشیاں کرتے نظر آتے ہیں ، یہ سب عورت کی جہالت کے پھل ہیں ۔

ماؤں سے اگر بچوں کی شکایتیں کرو تو وہ کہتی ہیں کہ ہم کیا کریں ۔ بچے ہمارا سنتے نہیں ۔ ہمارے کہنے میں نہیں ہیں ۔ کہتے میں رہیں بھی تو کیسے ؟ بچوں کا بھی قصور نہیں ہے ۔ جس کی انسان عزت نہیں کرتا ، اسکی بات نہیں سنتا ، ایک چھوٹی سی معمولی بات لے لیجئے ۔ بچہ اسکول سے گھر آتا ہے ، اپنے کسی سبق میں سے ماں سے ایک سوال کرتا ہے ، ماں جواب نہیں دے سکتی ۔ اسکی مدد نہیں کر سکتی ۔ بچے کے دل سے ہمیشہ کیلئے ماں کی عزت اٹھ جاتی ہے ۔ لڑکیوں کی تعلیم شروع ہوئے کچھ ۲۵ ۔ ۳۰ سال ہوئے ہیں مگر ہر طرف یہی پکار ہے کہ جہاں لڑکیاں پڑھنے لگیں ہیں ماں کو پھر خطرے میں نہیں لاتیں ، بتیاتی ہی نہیں چٹکیوں میں اڑاتی ہیں ۔ اسکی بھی یہی وجہ ہے کہ جہاں عزت نہیں وہاں فرمانبرداری کیسے ؟ لڑکیوں کو گھمنڈ ہوگیا ہے کہ ہم پڑھی لکھی ہیں اور ماں جاہل ۔

ماں باپوں کی جہالت سے ہمارے بچوں کے دماغ اور حوصلے کچلے گئے ہیں ۔ اور جسم اور صحت برباد ہو گئے ہیں ، ماں لاعلمی کی وجہ سے بچوں کے سوال کا جواب نہیں دے سکتی ، بچے باپ کے پاس جاتے ہیں تو جھڑکیاں ملتی ہیں ۔ ایک بچے نے مجھے سنایا کہ میں نے ابا کے پاس سکول سے

سیتی ہیں مدد چاہی، بابا نے تھوڑی دیر تو سمجھانے کی کوشش کی پھر غصہ میں آکر کتاب ہی پھاڑ ڈالی ـــــ ایک دفعہ میں بچوں کو اخبار میں سے تصویریں دکھا رہی تھی تو ایک بچی نے کہا کہ یہ اخبار ہمارے گھر بھی آتا ہے اور میں نے یہ تصویریں دیکھی ہیں مگر آجتک ان کا مطلب نہیں سمجھی تھی، میں نے کہا تو پوچھنا تھا، کہنے لگی ـ کس سے پوچھتی؟ اماں کو تو پڑھنا نہیں آتا، بابا کو پوچھتی ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ ان باتوں سے تم کو کیا مطلب ـ بہنو! جیسے پیٹ کو غذا اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے ویسے دماغ کو بھی غذا کی ضرورت ہے۔ پیٹ کی خوراک تو منھ کے راستے پہنچائی جاتی ہے اور دماغ کی آنکھوں، کانوں اور زبان کے ذریعہ سے ـ دیکھنے سننے پوچھنے سے ہمارے دماغ کے تجربے بڑھتے ہیں اور معلومات حاصل ہوتے ہیں ـ

کتابی تعلیم تو عورت سے چھینی ہی گئی دوسرا بڑا ظلم یہ ڈھایا کہ اس کو چار دیواری میں بھی بند کر دیا ـ اس غضب کا پردہ کہ عورتوں تک سے ملنے کی قید اور روک ٹوک ـ ملنے سے اوروں کی باتیں سننے سے بھی کچھ سیکھا جاتا ہے ـ ہماری عورتوں کے تو کان منھ آنکھ سب یہ ڈھک کر رکھ دیئے گئے وہ سیکھیں تو کہاں سے سیکھیں۔ مگر اب عورتوں کو چاہیے کہ وہ خود ان باتوں کو سوچیں اور ان غلطیوں کو درست کریں تاکہ خدا نے ان پر جو ذمہ داریاں رکھی ہیں ان کو پوری کر سکیں ـ تعلیم بالغان کا خدا بھلا کرے کہ اسکی وجہ سے آج ہم اپنی بہنوں تک پہنچنے لگے ہیں اور وہ ہم تک ـ

بہنو! کتابی تعلیم کے ساتھ میل جول بھی رکھئے ـ خیالات کے ادل بدل سے علم جلدی حاصل ہوتا ہے، علم وہ دولت ہے جس کو جتنا برتوگے اتنی بڑھیگی، نہ وہ کوئی چھین سکتا ہے نہ اس کا دیوالہ نکلتا ہے ـ بچوں کے لئے بہترین ورثہ ہے ـ

یا ور کھو جاہل بیٹا، جاہل باپ اور ظالم شوہر بنتا ہے، اور جاہل بیٹی، جاہل ماں اور پھوہڑ بیوی بنتی ہے ـ اور ایسوں سے نسل بگڑتی ہے ـ قوم کے مستقبل کو سنبھالنا اور سنوارنا اور تہذیب کی روشنی سے دنیا کو روشن کرنا عورت کا فرض ہے

سنیما ریویو

"نرتکی": پیش کردہ نیو تھیٹرز لمیٹڈ، ریلیز تھیٹر کلکتہ فلم کیپیٹل ـ ڈائرکٹر دیوکی بوس ـ اداکار ـ لیلا ڈیسائی نجم الحسن جگدیش ـ قابلی چھچھی کا ... جائے نمائش منروا تاکیز لنگٹن روڈ بمبئی ـــــ اس میں ایک رقاصہ کی کہانی فلم بند کی گئی ہے جو ایک مندر کو دیکھنے کیلئے آئی تھی مگر اسے مندر پہنچنے سے روک دیا کیونکہ عورتوں کو مندر میں جانے کی ممانعت تھی ـ اس مندر میں پجاری بستے تھے ـ رقاصہ زبردستی مندر میں جانا چاہتی تھی اسپر دربان نے پھاٹک بند کر دیا ـ رقاصہ نے اپنی ہتک کا بدلہ لینے کی ٹھانی اور اسکے لئے مندر کے پجاری کے چہیتے شاگرد کو ورغلانا چاہا ـ اس پر پجاری کا کام نجم الحسن نے کیا ہے اور خوب نبھایا ہے۔ یہ پجاری پرستش اور انسانی پاک محبت تو اثر کیا مگر دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکی ـــ اس فلم میں نفسیات انسانی پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان جس ماحول میں شروع سے رہتا ہو خواہ وہ کتنا ہی کرخت اور خشک کیوں نہ ہو اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور وہ دلکشی جسمیں بیگانگت پائی جاتی ہو اسپر پوری طرح کبھی فتح نہیں پا سکتی ـ یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ انسانی کیریکٹر کی مضبوطی اسی میں ہے کہ دنیا میں رہکر بھی اسمیں نہ پھنسے ـ

لیلا ڈیسائی نے رقاصہ کا پارٹ خوبی سے ادا کیا ہے اسکے رقص دلفریب ہیں ـ مکالمے بہت برجستہ اور دلچسپ ہیں ـ ڈائرکشن عمدہ ہے فلم ہر لحاظ سے بلند پایہ، دلچسپ اور قابل دید ہے

(بقیہ مضمون شبنم) ـــــ ہیولانہ قلقلی بھنو خندی سے انتظار پرست تاسنت ل بہ ہے تھے خراب کیا جاتا ہے ـ اکیلا پھر دونوں نے سر اٹھایا نظریں ملیں دونوں ہجوم غم سے آغوش ہوگئے یعنی اک دوسرے کو دیکھ خاموش ہوگئے

تعلقاتِ محبت یہ تیری ذات سے ہیں

کسی نے نام لیا ہو تڑپ گیا ہوں میں (ساغر)

میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ تم "میری تمنا" ہو ..

میری ایک ایک سانس تمہاری یاد کے سہارے چلتی ہے۔ تمہارا خیال میری ہستی کے ذرّے ذرّے پر چھایا رہتا ہے۔ تمہاری نظموں نے میرے جسدِ خاکی میں روح پھونکدی ہے۔ تمہارے نغموں نے مجھے مدہوش کر دیا ہے۔ تمہارے افسانے مجھے خیالات اور تصورات کی نرم و نازک اور بسیط فضاؤں میں لیگئے، تمہارے افکار و خیالات ایسے ہیں جس پر دنیائے انسانیت ناز کرتی ہے، تمہاری صورت اور سیرت کائنات کا بہترین روپ ہیں۔

چھ سال سے تم سے ملنے کا اشتیاق میری جان لے رہا تھا...... آج خوش نصیبی سے تم مل گئیں ......، ورنہ تمہارے تصور میں میں خود کھو گیا تھا..... مگر یہ ملاقات...... اور اس کے بعد خلا: .. .. میری روح اس خیال سے کانپ جاتی ہے، "کیا اب ہم پھر کبھی مل سکیں گے؟" —— تم نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا مگر اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ کسی نے صرف تمہاری یاد کیلئے اپنی زندگی وقف کردی ہے اور تمہارے سوائے کسی اور کو اپنا آنکھ نہیں بنا سکتا —— " یہ رقعہ پڑھکر شبنم نے زیرِلب مسکراہٹ کے ساتھ پھاڑ ڈالا —— اور سوچنے لگی —— یہ مرد ذات جذبات کی کسقدر غلام ہوتی ہے، پہلی ہی ملاقات میں یہ بے تکلفی....... آغازِ محبت کا لطف ہی کھو دیا۔ اس شدت کیساتھ محبت کا اظہار کسقدر بھدّا معلوم ہوتا ہے: محبت کی نزاکت اس بھدّے پن کی متحمل کیسے ہوسکتی ہے؟ — جس حد کو پار کرنے کیلئے کئی برس چاہئیں، اس شخص نے اسمیں صرف پانچ منٹ صرف کئے..... گویا کیف و مسرت، لطفِ اشتیاق کی عمر اپنے ہاتھوں اتنی گھٹا دی —— یہ سب سوچتے ہوئے بھی خسرو کا جمیل پیکر اسکے تصور سے نہ مٹ سکا —— اسے اپنے پہلو میں ایک نامعلوم قسم کی چبھن محسوس ہوئی۔

——— (۲) ———

مشاعرے میں آجیت گڈھ کے ولیعہد خسرو جاہ بھی تشریف لائے تھے، انکے آنے کا سب سے بڑا سبب یہ اعلان تھا کہ "ملک کی مشہور شاعرہ اور افسانہ نگار شبنم بھی شریکِ مشاعرہ ہونگی" —— یوں تو مدت سے یہ خلش انکے دل میں موجود تھی، مگر آج بچشمِ خود اسے دیکھا، اسکی دلکش آواز اور کلام کو سنا، انکی خوابیدہ محبت جاگ اٹھی... چلتے وقت وہ شبنم کو خود موٹر میں سوار کرانے آئے اور ہاتھ ملاتے وقت ایک لفافہ اسے دے دیا —— یہی وہ رقعہ تھا ——

——— (۳) ———

اسکے چھ سال بعد سر افتخار علی معہ بیوی بچوں کے لندن سے واپس آئے تو انہیں اپنی اکلوتی لڑکی "افق زیبا" کی شادی کی فکر ہوئی ——. انکی دلی خواہش تھی کہ انکی لڑکی کی شادی نواب صاحب "آجیت گڈھ" سے ہو ...... مگر سہیلیوں کی معرفت لڑکی نے ماں باپ پر اپنا یہ منشا ظاہر کرایا کہ نواب صاحب سے وہ شادی کرنا پسند نہیں کرتی۔ اسکی سہیلیوں نے یہ بھی بتایا کہ ولیعہد کی طرف اس کا رجحان ہے۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۳۶ پر)

مغل لائن لمیٹڈ

حاجیوں کیلئے خوشخبری

حکومت ہند سے مشورہ کرنے کے بعد حاجیوں کے آخری جہاز کی روانگی کا انتظام کر دیا گیا ہے اور مغل لائن حسب دستور بہترین جگہ اور سہولتیں بہم پہنچائے گی۔

جنگ سے پیدا شدہ حالات کے باعث جہازوں کی ٹھیک تاریخ روانگی یا نام نہیں دیئے جا سکتے ہیں۔ حکومت ہند کے اعلان مورخہ ۱۱ر دسمبر کے مطابق جو عازمین حج بمبئی یا کراچی سے روانہ ہونا چاہیں ان کو زیادہ سے زیادہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۴۰ء تک ان بندرگاہوں پر پہنچ جانا چاہیئے

کرایہ حسب ذیل ہوگا

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ	کلکتہ سے جدہ مع واپسی بمبئی
فرسٹ کلاس واپسی مع خوراک	۷۲۵ روپے	۷۰۰ روپے	۷۷۰ روپے
عرشہ واپسی مع خوراک	۱۹۵ روپے	۱۸۹ روپے	۲۲۶ روپے

دیگر تفصیلات کیلئے حسب ذیل پتہ پر خط و کتابت کیجئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی ۶
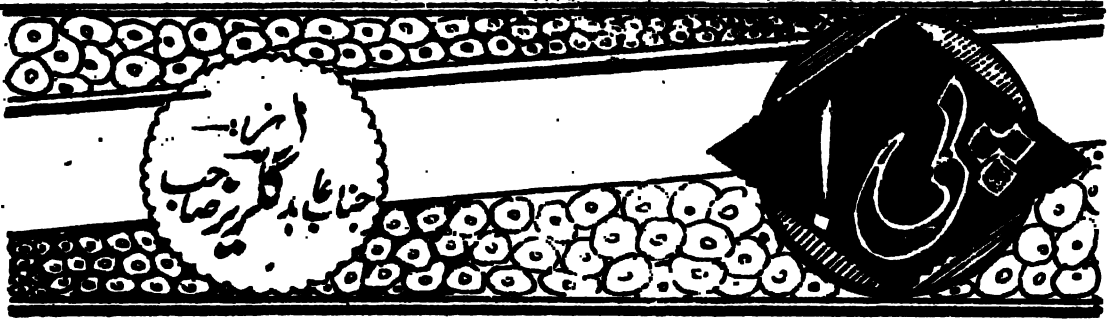
ذوقِ گنہ کو ہمدم و دمساز بنا کے پی
پینے چلا ہے جب تو ہلاہل بنا کے پی

اٹھ اور حریمِ ناز کے پردے اٹھا کے پی
جلووں کے سیلِ نور میں جی بھر نہا کے پی

ساقی کی چشمِ مست سے آنکھیں لڑا کے پی
کیفیتِ شباب کو سرشار پا کے پی

دوزخ کو نذرِ قبول و بیان کشمکش تو ہے
جنت فروش شیخ پہ بجلی گرا کے پی

"تقدیر" نے یہ جام اٹھا اور چڑھا بھی جا
"تدبیر" کی خلش سے نگاہیں چرا کے پی

جامِ شراب حجتِ تکمیلِ عشق ہو
ہر نقشِ پائے ساقی کو کعبہ بنا کے پی

اس جانِ میکدہ کے لبوں سے لگا کے جام
دنیائے میکدہ میں قیامت اٹھا کے پی

جو آج مل رہی ہے اسے کل پہ مت اٹھا
روزِ جزا کے وہم کو دل سے بھلا کے پی

موسم ہے مے ہے بارش تو ساقی ہے مے بکف
کیا دیکھتا ہے توبہ کے ٹکڑے اڑا کے پی

دنیا سمجھ رہی ہے کہ عابد کو ہوش ہے
اک جام تو خدا کے لئے لڑکھڑا کے پی

(خاص)

خواجہ الطاف حسین حالی

از جناب سید اصغر حسین صاحب (بلند شہر)

سر سید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پستی کو دیکھ کر تحریک علی گڑھ شروع کی تھی اور اپنے اس مبارک مقصد کی تکمیل کیلئے اپنے گرد و پیش جہاں مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک اور دیگر افراد کو جمع کر لیا تھا وہاں خواجہ الطاف حسین حالی کا نام بھی کسی صورت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا حالی بھی اسی قومی نورتن کے ایک روشن اور درخشاں ستارہ ہیں۔ بیشک نہیں کہ سر سید علیہ الرحمہ کو ایک ایسے شخص کی ضرورت بھی تھی جو اپنی سحر آفرینیوں سے مجازاً کا کام لیکر جمود کو حرکت میں لائے اور جو اپنی ولولہ انگیز صدا سے دلوں میں جوش پیدا کرے۔ تاثیر کلام نے دنیا میں اکثر بڑے بڑے کام کئے ہیں اور اس کے متعلق متعدد تاریخی واقعات مشہور ہیں۔ حالی کی سحر بیانی نے اگر بائرن کیطرح یونان والوں کو ترکیوں کا قبضہ نہیں دلا دیا اور نہ لارڈ بائرن کیطرح دول یورپ کو یونان کی امداد پر آمادہ کر کے اسکی بغاوت کی شاخ میں حکومت خود اختیاری کا پھل لگایا لیکن اتنا سب کو معلوم ہے کہ جس زمانے میں سر سید کشتی اسلام کو جہالت و ضلالت کے بھنور میں چکر کھاتے دیکھ کر اسکے محفوظ رکھنے کی ساعی میں مصروف تھے اور بہت کم لوگ ان کی پروا کرتے تھے اسی وقت حالی کے کلام جانفزا نے مسلمانوں کی خوابیدہ روح میں وہ زندگی پیدا کر دی کہ سوتے بیدار ہو گئے، بیٹھے اٹھ کھڑے ہوئے اور جو لوگ کھڑے تھے وہ دوڑنے لگے اور جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب۔ شاعر۔ مصلح اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوش ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے

سوانح حیات

حالی کی حیات خود ساختہ ہستیوں کا بڑا روشن نمونہ ہے۔ ان کی حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو انسان ترقی کرنا چاہتا ہے اسکی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی اور وہ ہر ایک مصیبت سے مردانہ وار مقابلہ کرتا ہوا اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ مولانا حالی قصبہ پانی پت میں انصاریوں کے محلہ میں ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نسلاً انصاری اور بطناً سید ہیں۔ آپکے والد کا نام خواجہ ملک علی تھا، ان کے بزرگ کابل اور ہرات سے مہاجرین ہند کے ساتھ آئے۔ چونکہ نیک سیرت بزرگ تھے اس لئے بادشاہ نے پانی پت اور اس کے ملحقہ علاقے کے منصب قضات پر آپ کو مامور کر دیا۔ علاوہ بایں تعین، نماز، عیدین کی امامت اور بزرگوں کے مزارات کی تولیت بھی آپکے سپرد تھی۔ مولانا حالی کے والد خواجہ ملک علی

بچپن ہی میں اختلال دماغ کے عارضہ میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اور آپکی کم عمری ہی میں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ نو سال کی عمر میں مہر مادری سے بھی محروم ہوگئے۔ والدین کی اس بیوقت موت سے انکی باقاعدہ تعلیم و تربیت کا ہونا بظاہر بڑا دوبھر اور غیر ممکن تھا لیکن انہوں نے اپنی ہمت سے وہ کچھ کر دکھلایا جو ہر قسم کی سہولت مہیا ہونے کے باوجود بھی محال ہے۔

والدین کے انتقال کے بعد حالی نے اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کے زیر سایہ پرورش پائی۔ انہوں نے ان کو بڑے لاڈ پیار سے پالا لیکن حالی بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا پتہ اس قطعہ سے چلتا ہے جو انہوں نے ان کے انتقال پر لکھا۔

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت　　مشکل ہے کہ سمجھے دل کی عزیزوں کو نشانی
آئے ہیں جدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے　　موت ایک کے آگے جو دریا ایک کو آنی

ہر بھائی ہے جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا مرجانے کی ہے اس کے نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کے آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سایہ میں کٹی اس کی جوانی
شفقت نے جبکی بھلا مہر پدر کو
دی آنچ کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتا بھی رہا بھائی اگر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی
باقی رہیگا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ قرآن پاک بھی آپنے یہیں پر حفظ کیا۔ اس زمانے میں میر ممنون دہلوی کے بھتیجے سید جعفر علی پانی پت ہی میں مقیم تھے۔ آپ فارسی ادب میں مسلم الثبوت استاد تھے۔ حالی نے ان ہی سے فارسی میں تعلیم پائی اور عربی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پڑھی۔

حالی جب سترہ سال کے ہوئے تو رشتہ داروں کے مجبور کرنے پر آپ کو شادی کرنی پڑی۔ تمام گھر کا گذارہ ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کی ملازمت پر تھا۔ ان کی تعلیم پہلے بھی ان کے حوصلے کے مطابق نہ ہوسکی تھی اور اب اس معاشرتی پابندی کے بعد ضروری تھا کہ وہ اپنی آئندہ تعلیم کو خیرباد کہہ کر فکر معاش کریں۔ لیکن جو انسان بڑھنا چاہتے ہیں ان کیلئے کوئی چیز سد راہ نہیں ہوسکتی اور حصول مقصد کا راستہ خود بخود صاف ہوجاتا ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ:-

"اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف مسدود ہوگئے سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دہلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں کے ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں"

یہاں آپ کی ملاقات مرزا غالب سے بھی ہوگئی تھی اور اکثر آپ غزل لکھ کر مرزا کے پاس اصلاح کیلئے لیجایا کرتے تھے۔ مرزا نے ان کی غزل دیکھ کر فرمایا تھا کہ "اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے" ابھی آپ یہاں تعلیم حاصل کر ہی رہے تھے کہ عزیزوں کی مجبوری سے گھر واپس ہونا پڑا لیکن

دہلی سے روانہ ہونے سے پہلے حالی نے آئندہ کیلئے بہت کچھ مواد فراہم کر لیا تھا۔

ڈیڑھ سال گھر رہنے کے بعد انہیں ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کی کلکٹری کی ایک معمولی سی تنخواہ پر جگہ مل گئی۔ یہاں پر ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے یہ جگہ چھوڑ دینی پڑی اور آپ گھر آ گئے۔ اس کے بعد چار سال تک درس و تدریس میں وقت گذرا، اور تفسیر، حدیث، فلسفہ اور منطق کی کتابیں خود ہی پڑھیں، اسی طرح قدیم علوم سے فی الجملہ انہیں آگاہی ہو گئی۔ شعرائے عرب کے کلام کا بھی کافی مطالعہ کیا جس کا اثر ان پر بہت کافی پڑا۔

فکر معاش کے سلسلہ میں آپ پھر پانی پت سے روانہ ہوئے، اس مرتبہ اتفاقاً ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہو گئی جو جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس تھے اور زبردست عالم اور سنجیدہ مذاق شاعر تھے۔ حالی نے تقریباً آٹھ سال انکی صحبت میں گذارے اور یہی آٹھ سال کا زمانہ ہے جس میں حالی کا ادبی مذاق اور کردار بنا، شیفتہ کے استاد مرزا غالب تھے اور جب وہ اپنی غزلیں مرزا کے پاس بھیجا کرتے تھے تو حالی کی غزلیں بھی ساتھ بھیجدیتے تھے۔ اسی طرح سے حالی کے استاد مرزا غالب ہوئے، شیفتہ ہی کی صحبت میں مرزا غالب سے حالی کی عقیدت بڑھی اور اسی عقیدت کی بنا پر انہوں نے مرزا غالب کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جو ان تمام مرثیوں میں سب سے زیادہ شاندار ہے جو مرزا کی وفات پر لکھے گئے۔ اس مرثیے کے شروع کے چند اشعار یہ ہیں۔

کیا کہوں حال دردِ پنہانی　　وقت کوتاہ و قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد　　دیکھ کر رنگ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال　　گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں　　تاج فغفور و تخت خاقانی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی وفات کے بعد حالی پنجاب گورنمنٹ بکڈپو میں ملازم ہو گئے۔ یہاں اُن کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق درست کیا کرتے تھے اور حشو و زوائد سے پاک کر کے اسے جدید نمونے پر لاتے تھے۔ اس ملازمت کی بدولت حالی انگریزی ادب سے بھی آگاہ ہو گئے اور آئندہ زندگی میں انہوں نے اس سے بڑا کام لیا۔

جب حالی لاہور میں بکڈپو میں ملازم تھے، اسی زمانے میں وہاں مولانا محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائیڈ کی کوششوں سے جدید طرز کے مشاعرے قائم ہونے لگے تھے جن میں شعرائے کرام کو مصرع طرح کی بجگہ کوئی موضوع دیا جاتا تھا۔ حالی کو جدید شاعری کا انس یہیں سے پیدا ہوا اور ان کی "برکھارت" "نشاط امید" "مناظرہ رحم و انصاف" اور "حب وطن" چاروں مثنویاں انہی مشاعروں کیلئے لکھی گئی تھیں۔ حالی کو ان شاعروں سے بڑی دلچسپی تھی لیکن ان کی طبیعت لاہور میں نہ لگی اور جس شخص نے اس زمانے میں دہلی کے ارباب کمال کی دلچسپ صحبتوں کے لطف اٹھائے تھے اسکی دلبستگی کا سامان لاہور میں ہوتا بھی کیا۔ پھر وطن اور اہل وطن کی مفارقت اور سب پر طرہ یہ ہوا کہ اسی زمانے میں چیچک اور ہیضہ کی وباء نے شہر کو اور وحشتناک بنا دیا، اس کا پتہ ان کی ایک غزل کے چند اشعار سے چلتا ہے جو انہوں نے اپنے دل کو بہلانے کیلئے لکھی:—

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد　　نہیں بلبل، میرا گھر بھی چمن ہے
کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت　　مگر جوشش سخن مہرِ دہن ہے
رہے لاہور میں آکر سو جانے　　یہی دنیا بھی دار المحن ہے

یہاں بیگانگی ہے اسقدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور — تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم — خموشی میں مری ذوق سخن ہے
بتاؤں تم کو میں کس باغ کا پھول — جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو میں کس مصر کی بو — جہاں طرح بستہ وطن پژمردہ تن ہے
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام — یہی گر جذبۂ حب وطن ہے

لیکن انہیں لاہور میں زیادہ عرصہ تک قیام نہیں کرنا پڑا۔ چار سال بعد ان کا تبادلہ لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی پر ہو گیا، یہاں بھی جدید طرز میں مشق سخن جاری رہی۔ اسی زمانے کے قیام دہلی میں حالی کی شناسائی سر سید احمد خان مرحوم سے ہو گئی۔ ان دونوں کی دوستی اسقدر پختہ ہو گئی کہ حالی بھی تحریک علیگڈھ کے ایک رکن بن گئے۔ سر سید علیہ الرحمۃ کو ہی حالی سے فائدہ نہیں پہنچا بلکہ حالی کو بھی یہ فائدہ ہوا کہ انہیں اپنے جدید پیام کی اشاعت کیلئے کسی سہارے کی ضرورت تھی تو وہ سر سید احمد خان کی زبردست شخصیت میں مل گیا۔

ابھی مولانا حالی عربک اسکول میں مدرس ہی تھے کہ اتفاق سے نواب آسماں جاہ بہادر مرحوم جو کسی زمانے میں دولت آصفیہ کے مدار المہام اور اسلامی معارف پروری کی روایات کے حامل تھے، کالج دیکھنے کیلئے علی گڈھ تشریف لائے۔ حالی کو اب چونکہ سر سید مرحوم سے ایک خاص تعلق ہو گیا تھا اس وجہ سے وہ بھی اس موقعہ پر وہیں تھے۔ سر سید مرحوم نے انکی ملاقات سر آسماں جاہ بہادر سے کرادی اور آپ کیلئے پچھتر روپیہ ماہوار کا علمی وظیفہ مقرر ہو گیا۔

اس وظیفہ کے بعد حالی نے عربک اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور اب سر سید کی تحریک علیگڈھ میں ایک نمایاں حصہ لینے لگے۔ یہ سر سید احمد خان کے ساتھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڈھ کیلئے چندہ جمع کرنیوالے ڈیپوٹیشن کے ہمراہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں جاتے اور جلسہ کر کے اپنے مطلب کو ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔ جلسہ کی کاروائی شروع ہونے سے پہلے قوم کی حالت موجودہ کے متعلق حالی کی کوئی نظم ضرور پڑھی جاتی تھی جس کا مقصد حاضرین کے قلوب کو گرمانا ہوتا تھا، چنانچہ ان کے دیوان میں بہت سی ایسی نظمیں ملتی ہیں جو ایجوکیشنل کانفرنس یا اسی طرح کے دوسرے قومی جلسوں میں پڑھی گئی تھیں، رفتہ رفتہ یہ قومی جلسوں کی ایک رسم بن گئی اور حالی سے اسطرح کی نظمیں لکھنے اور پڑھنے کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ ان نظموں میں بعض معرکۃ الآرا بھی ہیں چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں جلسہ میں بمقام دہلی پڑھا ہوا ترکیب بند جس کا پہلا شعر؎ —

یہ خاک آج جس پہ ہے مجمع اہل آرا
یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا

ہے ان کے دیوان میں موجود ہے جو حالی کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ سنہ ۱۳۰۹ھ میں جب مولانا حالی علی گڈھ ڈیپوٹیشن کیساتھ جنکو خود سر سید علیہ الرحمۃ کی سرکردگی حاصل تھی حیدرآباد گئے تو آپ کا وظیفہ بھی پچھتر روپیہ سے سو روپیہ کر دیا گیا اور سنہ ۱۹۰۴ء میں آپ کی علمی و ادبی خدمات کو دیکھ کر گورنمنٹ برطانیہ نے آپ کو شمس العلماء کا معزز خطاب بخشا۔

اس دنیا میں کوئی چیز دائمی نہیں، یہاں جو کچھ ہے وہ فانی ہے، جو پیدا ہوتا ہے اسکو یہاں سے جانا بھی ہوتا ہے اور اسی اٹل قانون قدرت کے تحت بالآخر آپ نے اسقدر قومی اور ادبی خدمات انجام دینے کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اخلاق و عادات | مولانا نہایت شریف صورت آدمی تھے اور

جیسی ان کی صورت شریفانہ تھی اسی طرح ان کا دوسروں کے ساتھ برتاؤ بھی نہایت شریفانہ تھا۔ آپکے دوسروں کے ساتھ سلوک میں جو خصوصیت نمایاں تھی وہ یہ تھی کہ آپ جس اخلاص و پیار سے کسی بڑے آدمی سے ملتے تھے اسی محبت و شفقت سے اپنے ملازموں سے بھی پیش آتے تھے۔

مولانا نہایت بے تعصب واقع ہوئے تھے۔ مذہبی معاملات میں کسی کا دل دکھانا نہ چاہتے تھے۔ حالانکہ مولانا نے اپنی عمر کے اکثر و بیشتر حصہ میں مسلمانوں کو مخاطب رکھا ہے اور انکی پستی دیکھ کر خون کے آنسو روئے ہیں۔ بعض اوقات مسلمانوں کو لعن و طعن بھی کی ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپنے کسی دوسری قوم کے افراد کو برا بھلا کہا ہو۔ کسی دوسرے مذہب کی وہ بھولکر بھی برائی نہ کرتے تھے۔ یادگار غالب میں مولانا نے ایک واقعہ خود نقل کیا ہے جس سے اُن کی بے تعصبی پر کافی روشنی پڑتی ہے اور جس سے ہر انسان کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

وہ لکھتے ہیں کہ۔

" ایک روز مجھ سے ایسی غلطی ہوگئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشہ میں سرشار تھا۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے صرف اہل سنت کو اور اہل سنت میں سے صرف حنفیہ کو اور ان میں سے بھی صرف ان لوگوں کو جو صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں نجات اور مغفرت کے لائق جانتا تھا۔ گویا دائرہ رحمت الٰہی کو کوئن وکٹوریہ کی وسعت سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتا تھا "

مولانا اپنے مخالفین کی بھی واقعی خوبیوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ اس کا ثبوت اس مرثیہ سے مل سکتا ہے جو مولانا نے حکیم محمود خان دہلوی کے وفات پر لکھا۔

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زمان
واقعات زندگی کردے بجے گر اس کے بیاں
سمجھیں اک افسانہ ناواقف اسے اور داستاں
ہے تعجب خیز، الحق سیرت محمود خاں
یا وہ وہ اک جوہر الگ تھا جوہر انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جوہر کان سے

اس مرثیہ کو پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ مولانا تحریک علی گڑھ کے زبردست حامی تھے اور حکیم محمود خان دہلوی اس کے زبردست مخالف اس حمایت اور مخالفت کی بنا پر دونوں اصحاب کے باہمی تعلقات میں کشیدگی اور بے لطفی پیدا ہوگئی تھی لیکن مولانا نے اس کشیدگی کا کوئی خیال نہ کیا اور ان کی موت پر ایک شاندار مرثیہ لکھا اور ان کی خوبیوں کا ان الفاظ میں ذکر کیا۔

مولانا کی بے تعصبی کی ان کے خاندان میں ابتک زندہ مثالیں موجود ہیں۔ ان کے خاندان میں شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے پیرو پائے جاتے ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مولانا کے والدین شیعہ تھے، لیکن ان کا انتقال آپ کی کمسنی میں ہوگیا اور آپ کی اپنے بڑے بھائی کے زیر سایہ پرورش ہوئی جو بعد میں سنی ہوگئے تھے۔ ان کی تربیت کے اثر سے آپ کا رجحان بھی اہل سنت کی طرف ہوگیا۔ آپ مسلمانوں میں مذہبی اختلاف کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریقہ نماز کے علاوہ اور کسی اختلاف کو پسند نہ کرتے تھے اس لئے آپ نے اپنی اولاد کو بھی اہل سنت ہونے کی ترغیب نہ دی اور جس کو جو طریقہ پسند آیا وہ اسطرف ہولیا جس کے نتیجہ میں

ان کی اولاد میں ہی شیعہ اور سنی دونوں طریقہ کے اصحاب موجود ہیں۔ ان کی پسری اولاد عموماً سنی اور دختری اولاد شیعہ ہے۔

آپکے دوستوں میں ہندو اصحاب بھی تھے اور آپ ان سے بھی بالکل اسی طرح محبت کرتے تھے جسطرح اپنے مسلمان دوستوں سے مثال کے طور پر ماسٹر پیارے صاحب دہلوی، لالہ مدن گوپال صاحب ایم۔ اے اور لالہ سری رام صاحب ایم اے کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔ آپکے شاگردوں میں بھی ایک ہندو لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی تھے جن سے آپ بالکل اپنے رشتہ داروں کی طرح محبت کرتے تھے۔ ان کے انتقال پر آپنے جو خط ان کے لڑکے چندولال صاحب کو لکھا اس کے ایک اقتباس کو دیکھکر پتہ چلتا ہے کہ آپکو ان سے کتنی محبت تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میرے دہلوی دوستوں میں افسوس ہے کہ خاص اور مخلص دوست کم ہو گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ ایسے وضع دار محبت کے سچے حاضر و غائب یکساں اور اپنے اسکول کے فدائی بہت کم ہو سکتے ہیں"

مولانا مرحوم ایک صاحب باطن ولی تھے، آپ میں تحمل اور بردباری بے حد تھی۔ جب آپ کی مشہور عالم تصنیف "مسدس مدوجزر اسلام" مطبع سے باہر آئی تو سپر بری طرح سے ٹوٹے ہوئے اور ہمارے شعرائے کرام نے جو صرف عاشقانہ خیالات کی ترجمانی ہی کو شاعری سمجھتے تھے مولانا کی شاعری پر بڑی نکتہ چینی کی لیکن آپنے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا اور اگر کہا بھی تو یہ کہا کہ:۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے سب
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

یا یہ فرمایا کہ ۔۔۔۔

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

مولانا قناعت اور استغنا کی صفات سے متصف تھے، جب نواب آسمان جاہ بہادر کے ذریعہ سے آپ کا سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو آپنے عربک اسکول دہلی کی ملازمت ترک کر دی اور اسی پر ہی اپنی گذر کی، وہ خوددار بھی واقع ہوئے تھے، اگر وہ چاہتے تو ان کی ذرا سی تحریک پر علیگڑہ کالج یا پنجاب کی پروفیسری مل جاتی یا سر سید مرحوم کے ذریعہ سے حیدرآباد میں کسی بڑے عہدہ پر مامور ہو سکتے تھے لیکن آپنے اسے جائز نہ سمجھا۔

مولانا جہاں تک ہو سکتا تھا دوسروں کی مدد پر کمربستہ رہتے تھے۔ مزاج میں انکسار اسقدر تھا کہ آپنے کبھی اپنے آپکو معمولی انسان کی حیثیت سے بڑھکر نہیں سمجھا، حالانکہ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ میں شیخی، تکبر اور تعلی کا نام تک نہ تھا اور آپ اسقدر سنجیدہ اور متین واقع ہوئے تھے کہ کوئی ناواقف ان کی گفتگو سے یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ یہ ایک زبردست شاعر اور غیر معمولی انسان ہیں۔

مختصر آیہ کہ مولانا زبردست اخلاق کے مالک تھے اور ان میں قدرت نے سیرت کی تمام خصوصیات کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں۔

سب سے آخر میں ایک روایت لکھدینا کافی ہوگا جو خواجہ الطاف حسین حالی کی سیرت اور اخلاق پر بجائے خود ایک مکمل اور جامع تبصرہ ہے۔ خواجہ غلام السیدین سر راس مسعود مرحوم کی زبانی رقمطراز ہیں کہ ایک مرتبہ جسٹس سید محمود نے اپنے والد ماجد

سر سید علیہ الرحمہ سے فرمایا کہ :-

" ابا جانی اگر خدا مجھ سے یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے ان میں سے کونسا ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کرنے کیلئے تیرا دل تیار ہے تو میرے پاس جواب حاضر ہے اور وہ یہ ہے کہ شخص الطاف حسین حالی ہے "

سید محمود نے ایسی آزاد طبیعت پائی تھی کہ ان کا سر نیاز بڑی سی بڑی بارگاہ میں بھی خم نہیں ہوا اور ان کا یہ کہنا اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتا ہے۔

شاعری پر اثرات

حالی جدید اور اُردو شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ قدیم شاعری کی پر زور مخالفت کی لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہمیشہ سے اسی رنگ اور اسی طرز کی شاعری کرتے تھے جسکے وہ آج پیشوا مانے جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے آج انہیں اسقدر شہرت حاصل ہے۔ حالی جس زمانے میں پیدا ہوئے اسوقت بہادر شاہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ قاعدہ ہے کہ جیسا بادشاہ ہوتا ہے، رعایا بھی اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے شعراء اور علماء و فضلا کو اپنے دربار میں جمع کر رکھا تھا۔ وہ خود بھی بڑے اچھے شاعر تھے اور ظفر تخلص کرتے تھے اور چونکہ اچھے اچھے نامور شعراء جمع تھے شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اس لئے ایک معمولی اُردو داں بھی شعر کہتا تھا۔ یہ تھا اسوقت کا ماحول جب حالی پیدا ہوئے۔

حالی نے جب ہوش سنبھالا اور دہلی آئے تو اپنے کو ان شعراء کے درمیان پایا جو لکیر کے فقیر کی طرح اسی راستہ پر گامزن تھے جو اُن کے اسلاف نے اپنی جودت طبع سے نکالا تھا اور ساغر و مینا۔ گل و بلبل۔ عشق و محبت اور شاہد رعنا کا اپنے کلام میں بار بار ذکر کرکے خوش ہوتے تھے اور اپنی غزلیات اپنا اپنا کارنامہ سمجھ کر دوسروں کو سناتے تھے اور داد سخن پاتے تھے۔ شعراء کا تو خیر یہ حال تھا ہی لیکن سامعین کی بھی یہ حالت تھی جس شعر میں گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کا ذکر نہ ہوتا تھا اس کو شعر کہنے میں بھی پس و پیش کرتے تھے۔ حالی نے جب یہ حالت دیکھی تو قدرتاً خود بھی اسی راستہ پر پڑ لئے۔ اس زمانے کی حالت اور اپنی شاعری شروع کرنے کا ذکر حالی خود اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ :-

" با ایں ہمہ صداقت میں یکسب اجازت دیتی تھی کہ شاہد رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیر زال کی صورت میں کیا جائے اور شراب ارغوانی کی جگہ سرکۂ بے نمک سے ضیافت طبع کی جائے۔ غرضکہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب یہ کبھی سودا اُچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لئے جس پر رہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلہ کے ساتھ راہ کی ہمواری اور رہگذر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنیکا کبھی خیال بھی نہ آیا۔"

(باقی آئندہ)

خاص برائے تنویر

پاس ہیں وہ کہ دور کیا جانے
عشق بعد و حضور کیا جانے

میرے ذوقِ نیاز پیہم کو!
ان کا ناز و غرور کیا جانے

ساقیا اہتمام بادہ کشی
زاہدِ بے شعور کیا جانے

آتشِ غم کی سوز سامانی!
شعلۂ برقِ طور کیا جانے

نشۂ دردِ عشق کو واعظ
مستیٔ چشمِ حور کیا جانے

دل کے ظلمت کدے کو اے اختر
حسن کی موجِ نور کیا جانے

آسام کی پیچیدہ اور بل کھاتی ہوئی گھاٹیوں میں وہ خاموش سر جھکائے ہوئے جا رہی تھی، افق مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں اسکے افسردہ چہرے کے گندمی رنگ کو اور زرد بنا رہی تھیں اور سبک خرام بادصبا کے ہلکے ہلکے اور نرم نرم جھونکے اسکی پریشان زلفوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ جیسے بادۂ شباب سے مخمور نوجوان کسی شوخ طرار دوشیزہ سے چہل کرتا ہو۔ آسمان پر بادلوں کے سفید چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اسوقت ایک شفاف ندی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ جسکی ترنم روانی میں ایک کیف آگیں نغمہ پنہاں ہو اور وہ ساز سے نکلنے کیلئے بے چین ہو۔ مگر یہ روح افزا منظر اسکو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے ناکافی تھے، اور وہ گردن جھکائے ہوئے اپنے خیالات میں مستغرق ——— کسی خیال میں کھوئی ہوئی چلی جا رہی تھی، وہ رنجیدہ تھی اور اسکو اپنے ہم وطنوں پر وہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں اس جنگ آزادی سے متاثر ہو کر اور اس میں حصہ لے کر اپنا بیداری کا ثبوت نہیں دیتے، وہ بہت عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ ——— آج فلاں شہر میں کئی نوجوانوں نے اپنے کو آزادی کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیا ——— آج فلاں شہر میں نوجوانوں کے ایک گروہ نے ظالم حکومت کے سنگین ایوانوں کو متزلزل کر دیا اور فلاں جگہ کے سرفروش اور خوددار فرزند آزادی کیلئے اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے پھر رہے ہیں، یہ واقعات سنکر اسکے دلمیں جوش پیدا ہوتا۔ اور وہ خیال کرتی کہ کاش میں بھی اس ظالم و مظلوم کی لڑائی میں حصہ لے سکتی۔

وہ چلتے چلتے یکلخت رک گئی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور صہبائے شباب سے مخمور آنکھیں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اٹھائیں۔ شفق کی خون جیسی سرخی میں ڈوبا ہوا سورج اپنی آخری کرنوں سے اسکو کوئی پیغام نو ——— دیتا ہوا معلوم ہوا۔ اسکے نازک لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جیسے کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل نہ پاکر اپنی کمزوری چھپانے کیلئے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا ہے اسنے اپنی پریشان زلفیں برابر کیں اور پھر اپنا راستہ طے کرنے لگی۔

۲

وہ آسام کی پردہ بت قوم سے تعلق رکھتی تھی اور اسنے اپنے خاندان کے فرسودہ رسم و رواج کے خلاف ایک مشن اسکول میں نویں کلاس تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسلئے سرزمین آسام کے بھولے بھالے لوگوں کی نظروں میں اسکی بہت وقعت تھی اور وہ خیال کرتے تھے کہ یہ نیلی آنکھوں والی دوشیزہ! ——— شاید کوئی دیوی ہے جو ہماری نیکیوں کا معاوضہ عطا کرنے کیلئے، ایک عورت کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے، وہ خود بھی ایک روشن دماغ لڑکی تھی، اسے

اپنی اس تھوڑی سی عمر میں جبکہ وہ اپنی زندگی کی انیسویں بہار دیکھ رہی تھی۔ اپنی قوم کو ایسے سبق دینے کہ پہاڑی لوگوں کا یہ خیال یقین میں تبدیل ہوگیا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ:۔

"خدا نے ہم کو اسلئے پیدا نہیں کیا کہ تمام پیشوں کو چھوڑ کر ہم صرف اسکی پرستش کو ہی اپنی روزی کا وسیلہ بنالیں۔ اسطرح خدا ہم سے خوش نہیں ہوتا، ہم کو چاہیے کہ تمام زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لیکر نہ صرف اپنی زندگی کو کامیاب بنائیں بلکہ اسطرح خدا کو بھی خوش کریں تاکہ وہ ہماری نیکیوں کا دنیاوی معاوضہ عطا کرے"

اسکے اس عقیدہ نے اسکی قوم میں ایک ہنگامہ مچادیا تھا۔ انہیں دنوں میں ملک کے آزادی پسند طبقہ نے حکومت کو چیلنج کیا کہ، ہمارا مطالبہ حریت منظور کیا جائے۔ ورنہ ہم اپنے پیارے وطن پر قربان ہونے کو تیار ہیں ان کا مطالبہ جائز تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی آواز صدائے بازگشت ہوکر رہ گئی۔ اور حکومت نے اسکا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا، بس ایچر کیا تھا۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں ایک طوفان برپا ہوگیا اور انقلاب پسند دھڑا دھڑ جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ سرفروشوں کو پھانسیاں دیگئیں۔ آزاد خیال نوجوانوں کے جسموں کو بینتوں کی سزا برداشت کرنا پڑی۔ گریشہ ان باتوں کے باوجود نہ اترا ——— وہ روز ان کے حالات اخباروں میں پڑھتی اور دل ہی دل میں اپنی کمزوری پر پیچ و تاب کھاکر رہجاتی۔ آج رات کو اسکی برادری میں کسی کی شادی کی تقریب تھی اور اسنے تہیہ کرلیا تھا کہ، وہ آج ضرور ضرور وقت کا پیغام لوگوں کو سنائے گی۔ اور ان سے استدعا کریگی کہ تم خواب غفلت سے چونک کر اپنی بیداری کا ثبوت دو ——

۳

سورج غروب ہوئے بہت دیر ہوچکی تھی۔ آسمان پر تاریکی اپنا تسلط جمانا چاہتی تھی، مگر ننھے ننھے ستارے اسکو اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہونے دیتے تھے، وہ اس گاؤں کے بالکل قریب پہونچ چکی تھی، جہاں کہ شادی ہورہی تھی، لوگ اپنے ہاتھوں میں بڑی بڑی مشعلیں لئے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے، تاشوں کی کرخت آواز کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی تھی۔ اور تاشوں کی کرخت آواز میں بانسری کی سریلی آواز ——— کسی مظلوم کی ہلکی سی چیخ کے مانند سنائی دیتی تھی، وہ سب کی نظروں سے بچتی ہوئی ایک پوشیدہ جگہ میں جاکر بیٹھ گئی، کیونکہ اسکو یقین تھا کہ اگر لوگوں کو اسکی موجودگی کا علم ہوجائیگا تو۔ تمام کام چھوڑکر وہ اسکی تعظیم وتکریم کرنے لگیں گے۔ اس لئے اسنے ابھی اپنے کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ آدمیوں کی مختلف قسم کی آوازیں اور بچوں کا شور تاشوں کی آواز میں ملکر فضا میں ایک عجیب قسم کا تنوع پیدا ہوگیا تھا۔ گاؤں میں اسقدر مشعلیں روشن کیگئیں تھیں کہ انہیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ شاید یہاں آگ لگ گئی ہے، کچھ دیر بعد پہاڑی لوگوں کا ناچ شروع ہوا۔ یہ لوگ اپنے جسم سے جانوروں کی کھال لپیٹے ہوئے تھے۔ گلے میں ہڈیوں کی مالائیں پہنے ہوئے اور سروں پر لانبے لانبے پروں کی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کے ہاتھ میں خوفناک برچھی نما ایک ایک ہتھیار تھا۔ جسکو وہ لڑائی کے انداز میں گھمارہے تھے۔ یہ لوگ مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے اور ناچنے میں قسم قسم کی آوازیں منھ سے نکالتے تھے۔ یہ خاموش اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی اور ان لوگوں کی غفلت پر دل ہی دل میں آنسو بہارہی تھی۔ ایک گھڑی رات گذرنے کے بعد دولہا کی برات آئی اور سب لوگوں نے مسرت سے اسکا استقبال کیا۔ اب شور بند ہوگیا تھا۔ ہر شخص یا تو دولہا کی خاطر و مدارات میں مشغول تھا، یا براتیوں کی تواضع کررہا تھا۔ تاشے اور بانسری بجانا بھی اسوقت موقوف کردیا گیا تھا۔ اور بجانے والے خاموشی سے دولہا کی صورت

دیکھ رہے تھے جو شیر کی کھال لپیٹے ہوئے اور سر پر سفید پروں کا تاج رکھے ہوئے نہایت شان و تمکنت سے بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک پروہت آیا اور اس نے بیاہ کی رسومات ادا کیں، اور دلہن کو لاکر دولہا کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ شادی کے تمام رسمیں ادا ہو چکیں تھیں ——— وہ براتیوں کو اپنا پیغام سنانے کے ارادہ سے کھڑی ہوگئی، اسنے انکی طرف جانے سے پہلے دونوں ہاتھ اٹھاکر دعا مانگی۔

"اے خدا ——— اگر کروڑوں انسانوں کا مطالبۂ آزادی سچا ہے اور میرا جذبہ صادق ہے ——— تو مجھ میں ہمت پیدا کر اور میری زبان میں وہ طاقت عطا کر جس سے میں اُن لوگوں کو اُن کے حقوق کا احساس کرا سکوں"

یہ دعا مانگ کر وہ کچھ مطمئن سی ہوگئی۔ جیسے اسکو یقین آگیا اسکی آواز پر یہ تمام لوگ لبیک کہیں گے، وہ براتیوں کی طرف چلی اور بہت جلد ان کے پاس پہونچ گئی جس طرح ایک صنم پرست پوجا کرتے وقت خلاف توقع بت میں جلوۂ حقیقی دیکھ کر فرط خوشی سے چیخ اٹھے، بالکل وہی اثر اسوقت براتیوں پر اسکو دیکھ کر ہوا اور جوش مسرت سے سب نے چلا کر کہا:۔

"دیوی ———!"

اور سب کے سر عقیدت مندانہ انداز میں جھک گئے جیسے وہ اسکی تعظیم کر رہے ہیں، وہ سب کے بیچ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ ہر شخص پر کامل خاموشی چھائی تھی، جیسے وہ اسکے منہ سے کچھ سننے کیلئے منتظر ہیں۔ سب کو خاموش دیکھ کر اس نے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لئے منہ کھولا، مگر ——— ایک مرتبہ اور اسکو اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور اس کا نصف منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ——— لیکن فوراً ہی اسنے اپنی حالت درست کرلی اور غصہ میں چیخ کر کہا۔

"بھارت کے غلام بیٹو ——— غیر انسانوں کے گیدڑ بچو!!"

تمام مجمع کانپ گیا۔ ان میں سے [illegible] نے آجتک اسکو غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ سب لوگ پوری توجہ سے اسکی بات سننے لگے ——— وہ کہہ رہی تھی۔

"دیوی ——— ہمیں خوشی ہے کہ تمہیں ہم پر اعتماد ہے خدا کیلئے اپنا پیغام سناؤ ہم لوگ اس پر عمل کرنے کیلئے بیچین ہیں"

——— "ہاں، سنو! ——— اسکی آواز جوش میں کانپنے لگی، یہ میرا پیغام نہیں، وقت کا پیغام ——— نہیں، نہیں، خدا کا پیغام ہے؛ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ تم زیادہ عرصہ تک جبر و تشدد کا شکار بنے رہو۔ تم ان لوگوں کے غلام بنے رہو جو تم میں سے نہیں ہیں۔ تم انکے محکوم رہو۔ جنہوں نے تمہارے آبا و اجداد کے خون سے ہولی کھیلی ہے اور ان کی محنت و مشقت کی کمائی غصب کرکے آج تم پر حکومت کر رہے ہیں ——— خدا نہیں چاہتا کہ وہ زیادہ عرصہ تک تم کو اپنے حق سے محروم رکھے اور تم اپنی دولت و ثروت کھو کر مظلومانہ زندگی بسر کرو، اس لئے سنو! ——— اور کان لگا کر سنو ——— یہ خدا کا پیغام ہے کہ تم اس طوق غلامی کے ٹکڑے ٹکڑے کردو۔ جو غیروں نے تمہاری گردن میں زبردستی ڈالدیا ہے، تم ان سے انتقام لو۔ اپنے آبا و اجداد کا ——— جنکی مظلوم روحیں صرف اسلئے بیچین ہیں کہ تم کب اپنا انتقام لوگے ——— خدا کا یہ پیغام ہے کہ تم بیدار ہوجاؤ اور اپنی کھوئی ہوئی عزت و دولت واپس لیکر انسانوں کی سی زندگی بسر کرو۔ آخر تم کبتک جانوروں کی سی زندگی بسر کروگے ——— ؟ تمہاری ماں! ——— تمہاری اس حالت کو نہیں دیکھ سکتی، وہ تم سے قربانی کا مطالبہ کر رہی ہے ——— ماں اپنا حق مانگ رہی ہے، کیا تم ماں کی بات ٹھکرا دوگے"؟

تمام لوگ جوش میں آکر کھڑے ہوگئے اور دیوانہ وار چلائے:۔

"دیوی! ——— دیوی!! ——— اب ہم میں زیادہ سننے کی

تاب نہیں ـــــ ہم قسم کھاتے ہیں اپنے وعزم کی کہ یا تو حاکمانہ زندگی بسر کریں گے ، یا اپنی آزادی پر قربان ہو جائیں گے !! "

۴

بہت جلد آسام کے قرب وجوار میں اسکی تحریک پھیل گئی ، اور لوگ جوق در جوق اسکی آواز پر لبیک کہنے لگے ـ اپنے مقصد میں خلاف توقع اسقدر جلد کامیابی سے وہ بہت متاثر ہوئی اور اسنے حریت پسند عوام کا ایک بہت بڑا گروہ جمع کر لیا ، اور یہ اعلان کیا کہ اگر حکومت نے جلد از جلد ہمارے حقوق تسلیم نہ کئے تو ہماری طرف سے سول نافرمانی شروع کر دیجائیگی ـ اسکی اس آواز نے حکومت کے کان کھڑے کر دیئے اور حکومت نے محسوس کیا کہ اگر جلد از جلد اس خطرہ کا تدارک نہ کیا گیا تو آسام بھی اسی آگ کی نظر ہو جائیگا جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے ـــــ چنانچہ بہت جلد حکومت نے پہل کی اور ان لوگوں کے لئے جو اس تحریک میں شریک تھے ـ سخت سزاؤں کے احکامات نافذ کر دیئے گئے ـ جن لوگوں پر شبہ ہوا ، ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا ، صرف یہیں تک بس نہیں کیا گیا ، بلکہ جس گاؤں یا قصبہ میں حریت پسندوں کے مکانات تھے ان کو لوٹ لیا گیا اور جگہ جگہ آگ لگا دی گئی جس میں کئی لوگ جھلس کر مر گئے اور سینکڑوں خاندان برباد ہو کر در در بھیک مانگنے پر مجبور ہوئے ، مگر ان کے جوش و استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا ـ بلکہ وہ اور زیادہ سرگرمی سے حکومت کے خلاف ظاہری حصہ لینے لگے ـ آخر حکومت کے اس جور و استبداد سے تنگ آکر وہ بھی مجبور ہو گئی کہ حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دے ـ اسنے بالکل آخری مرتبہ حکومت کو نوٹس دیا کہ وہ ایک ہفتہ میں اپنا ظالمانہ رویہ بدل دے ورنہ اس چراغ کو ہمیشہ کیلئے گل کر دیا جائیگا " ـــــ اس کا خیال تھا کہ بیرون آسام میں ہر جگہ حکومت کو شکست ہو رہی ہے ، مگر اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی ، جب اس نے دیکھا کہ حکومت نے

اپنا رویہ اور زیادہ سخت کر دیا ہے لیکن اس نے اپنے نوٹس کے موافق ایک ہفتہ تک صبر کیا اور حکومت کے تمام جائز و ناجائز قواعد کی پوری پوری پابندی کی ـــــ لیکن ایک ہفتہ کے بعد صبح جبکہ سورج ابھی اس منظر کو دیکھنے نکلا بھی نہ تھا ، دو سو کے قریب اشخاص نے حکومت کے ذلیل طاغوتی قوانین کی دھجیاں اڑا دیں اور نہایت خوشی سے بیرحم حکومت کی دعوت منظور کر لی ـــــ شام تک لوگوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہونچ گئی ، جنہوں نے حکومت کے ہر اس قانون کی خلاف ورزی کی جو ان کی آزادی کے راستہ میں سد راہ تھا ـ اسدن سے آسام بھی انہیں شعلوں کے نذر ہو گیا جو تمام ملک میں بھڑک رہے تھے ـ

دوسرے روز صبح لوگوں نے دیواروں پر بڑے بڑے سفید پوسٹر چسپاں دیکھے جو حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے :-

" اگر وہ ایک سال تک کسی بھی مجمع میں تقریر یا حکومت کیخلاف کوئی سازش کریگی تو اسکو مروجہ قانون کے مطابق گرفتار کر لیا جائیگا "

اس اعلان کے بعد اسکے تمام ساتھیوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں ـــــ اس نے بھی حکومت کے اس اعلان کو پڑھا ـــــ اور حقارت سے ٹھکرا دیا ، وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے تمام ساتھی ایک ایک کر کے گرفتار کئے جا رہے ہیں ، اس لئے اس نے زیادہ خاموش رہنا بزدلی سمجھا اور اپنا ایک بیان شائع کیا اور اس کے آخر میں لکھا کہ :ـــ

" وہ ۲۲ ستمبر کے ہونیوالے جلسہ میں تقریر کریگی " ، تمام شہر میں اس کے اس بیان سے ہیجان پیدا ہو گیا اور لوگ بے چینی سے اسدن کا انتظار کرنے لگے ، جسدن کہ یہ باغی عورت غلط قانون کی دھجیاں اڑائے گی !! ـــــ لیکن افسوس کہ عوام کی اس انتظار کی گھڑیاں ختم نہ ہوئیں ، حکومت کو اسکی طرف سے خطرہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ

نہیں چاہتی تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک آزادی کی فضا میں سانس لے ——— چنانچہ جس دن اس نے قانون کے خلاف ورزی کا اعلان کیا اس کے تیسرے روز دات کو جبکہ وہ اپنا پروگرام بنا رہی تھی، اسکو گرفتار کر لیا گیا اور اسکے ساتھیوں کو اسکی گرفتاری کا علم اس وقت ہوا جبکہ وہ شہر سے دور سینٹرل جیل پہنچ چکی تھی ——— !!

یہ بہادر بہن کون تھی رانی گڈالو ——— ! جو آج بھی آسام کی کسی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اپنی جوانی کے دن گذار رہی ہے، ہندوستان حالانکہ اپنی اس بہادر بیٹی کو بھول چکا ہے لیکن اس کے ہموطن اب بھی اس کو فخر سے یاد کرتے ہیں۔ ——— شاید انہیں معلوم نہیں کہ گڈالو حکومت کی نظروں میں ایک باغی عورت ہے ——— لیکن ایسی باغی عورت جسپر قوم کو ناز ہے !! ——— اور طبقۂ صنفِ نازک اس سرفروش اور خوددار عورت پر ہمیشہ فخر کرے گا جس نے ایک حکومت کو مقابلہ کا چیلنج دیا ——— !!! +

بقیہ مضمون شادی ———

بذریعہ خط لڑکی کے والدین کو اطلاع دی کہ لڑکا قابل اطمینان نہیں ہے اور ساتھ ہی بہت سے اندیشہ ناک واقعات کے ظہور پذیر ہونے کی پیشین گوئی کی، لیکن وہی بقول کسی کے کہ "خدا اچھا اور اس کے کام اچھے !" حافظ صاحب کی تمام آرزوؤں کا خون ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے تو سوچا تھا کہ "مردہ جائے جنت میں یا دوزخ میں ہمکو اپنے حلوہ مانڈے سے کام" لیکن وہاں تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ حقیقت کے چہرہ سے نقاب اٹھتے ہی حالات۔ کچھ سے کچھ ہو گئے، پھر نہ ہم نے حافظ صاحب کے پاس جانیکی تکلیف گوارا کی اور نہ وہ خود ہمارے پاس تشریف لائے۔ بہرحال شادی کے لئے تاریخ کا تعین ہو گیا اور ہم لوگ بمبئی سے روانہ ہو گئے۔

جہاں پر ہمارے دوست کی شادی طے پائی تھی وہ بہت معمولی سا شہر تھا تاہم شادی کا کافی اہتمام کیا گیا اور ناصر جوابؔ "دولہا میاں" کے معزز خطاب سے سرفراز کئے گئے تھے کچھ اور ہی نظر آ رہے تھے، بیچارے کی ایسی درگت بنائی گئی تھی کہ صورت نہیں پہچانی جاتی تھی، ہم ان سے بھلا کیا ہمدردی کر سکتے تھے جبکہ خود انہوں نے اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ ہمکو تو ایک عرصہ کے واسطے مختلف قسم کے موضوع مذاق کیلئے مل گئے تھے۔

شادی کے سلسلہ میں کیا کیا رسمیں ادا کی گئیں ؟ اور کس طرح سے دولہا کو بیوقوف بنایا گیا ؟ اسکی تفصیل ہماری قابلیت سے باہر ہے البتہ صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ شادی ہوتے آخری لمحات میں تو ہمارے دوست کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اگر وہ کسی کو ہنستا ہوا دیکھتے تو یہی سمجھتے کہ میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے !۔

رخصت کے دوسرے دن ہماری تیز نظروں نے دولہا میاں کے زیرلب تبسم کو آخر بھانپ ہی لیا۔ قبل اس کے کہ وہ ہم سے کچھ کہیں، ہم نے آہستہ سے کہا کہ "کیوں جناب ! کہاں گئیں آپکی وہ شیخیاں کہ "بغیر دیکھے شادی ہی نہیں کر سکتا۔ اور کہاں ہے وہ آپکے تصورات کی حور ؟ "

ہمارے دوست نے جواب دیا کہ " دیکھئے آئندہ آپ "انکی" شان میں "حور" جیسا غیر موزوں لفظ استعمال کریں ورنہ .... "

ہم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا " ورنہ اس لفظ کی توہین ہوگی !" ناصر نے مصنوعی غصہ کا اظہار کرنیکی کوشش کی ہی تھی کہ بہت سے مہمان آ دھمکے اور بات گئی گذری ہو گئی۔ +

+ بہرحال ایک شادی ہو چکنے کے بعد ہم نے اخذ کیا وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے یعنی شادی نہ کرنا اگر سوسائٹی کا کوئی جرم ہے تو چونکہ یہ جرم شادی کر کے سوسائٹی کو خوش کرنے سے بدرجہا بہتر ہے ! +

LILA DESAI See her in New Theatre's NARTAKI running at Minerva Talkies

SADHONA BOSE

She is coming in Wadia Movitone's RAJ NARTAKI at Royal Opera House

Jayoti & Zahur Raja.
See them in National Studio's POOJA
at Pathe Cinema.

Ramola & Monica Desai. See them in
Film Corporation's QAIDI at Lamington.

۲۸ نومبر سے پاتھے سنیما میں ہنگامہ برپا کر رہی ہے
کیا آپ نے ابھی تک نہیں دیکھی؟
نیشنل اسٹوڈیوز لمیٹڈ کی تیسری ہنگامہ پرور سوشل تصویر
پوجا
ڈائرکٹر
اے آر کاردار
کہانی اور مکالمے
ادیب شہیر
ایم۔ صادق
گانے
شاعر رومان
خان شاطر غزنوی
کسی مفکر نے کہا ہے "محبت اندھی ہوتی ہے" دوسرے فلسفی نے کہا "انتقام بھی اندھا ہوتا ہے" اور پھر جب کبھی۔ دو دلچسپ اندھے ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو کیا گل کھلاتے ہیں؟
کبھی آپ نے اس کمال و قوت کی انتہائی عروجی کیفیت بھی دیکھی ہے! "پوجا" دیکھ کر کاردار کی ذہنی روشنی میں اندازہ کیجئے گا۔ انسانی زندگی کے لئے ان دونوں میں سے کونسا اندھا زیادہ خطرناک ہوتا ہے
روزانہ تین شو
ہفتہ اتوار خاص شو ۱ بجے دن
"پوجا" کے ۔ ورح پرور نغمے ہز ماسٹرز وائس کے ریکارڈوں پر سنئے!
پلیشنگ کنندگان نیشنل اسٹوڈیوز بمبئی
تقسیم کنندگان منوہر جن بیچھے دہلی

انقلاب ناگہانی

خاص

از حضرت "عکاس فطرت" مرزا عنبر چغتائی بھوپالی

خوشا وہ دن! کہ جب دل بے نیاز ہر دو عالم تھا
یقیں آتا نہیں مجھکو کبھی حاصل مسرت تھی
خبر کیا تھی کہ رہ رہ کر یہ باتیں یاد آئینگی،
مرے ساتھ اسطرح تھا بے نیاز دو جہاں کوئی

کسی کی تھی خوشی میری، کسی کا غم مرا غم تھا
تعجب سا ہے، دنیا میں کسی کو مجھ سے الفت تھی
تمنا بن کے رہجا ئینگی دل میں سے خواب ہو جائینگی
نہ تھا آنے کو جیسے "انقلاب ناگہاں" کوئی

تبسم ریزیوں میں دفعتاً رنگِ ملال آیا
کہا کچھ زیر لب خاموش سے یہ غمگیں ترنم نے،
"ستمہائے زمانہ سے نہ ہم مجبور ہو جائیں،
خیال آنے ہی چھا جاتی ہے دل پر خامشی کیسی!
ابھی حاصل ہے جو یہ لطف صبح و شام کیا ہوگا!
مگر ـــــ ہاں، آپ کا کیا! آپ ہم کو بھول جائینگے،

کسی کو باتوں باتوں میں کہیں اِکدم خیال آیا
جسے دُہرایا اس انداز سے لرزاں تکلم نے؛
کہیں ایسا نہو اک دوسرے سے دور ہو جائیں!
مرے معبود! اگر ایسا ہوا تو زندگی کیسی!!
خیال آتا ہے رہ رہ کر کہ پھر انجام کیا ہوگا!!
ہمیں تڑپیں گے، چھپ چھپ کر ہمیں آنسو بہائینگے"

جو دل تڑپا تو لب پر آگیا بے اختیارانہ:
تمہیں ہم کس لئے بھولیں گے! کیوں تم سے جدا ہونگے!!
بہے گی اس طرح کشتی ہماری بحرِ فانی میں،
غم دنیا سے گذریں گے بہت ہی بے نیازانہ،
محبت کی جو اِن دونوں دلوں میں روشنی ہوگی
مسرت ہوگی ہم کو دیکھ کر کیا کیا بہاروں کو
کرینگے اسطرح آراستہ باغ محبت کو،
ہماری سعیٔ الفت کو مگر ناکام ہونا تھا

"نہیں، ایسا نہیں ہوگا ـــــ سنا کچھ تم نے ریحانہ!
ہماری ایک کشتی ہوگی، تم ہی ناخدا ہوگے
کہ جیسے ابر کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں
کہ ریحانہ کا عنبر ہوگا اور عنبر کی ریحانہ
نہو گا چاند پھر بھی چاند جیسی چاندنی ہوگی
ہماری زندگی پر رشک آئے گا ستاروں کو
فرشتے دیکھنے آئیں گے اس دنیا کی جنت کو،
مری ریحانہ، ہم دونوں کا یہ انجام ہونا تھا!

شادی کے لغوی معنی ہیں خوشی! اور اصطلاحاً شادی نام ہے اس رسم کا جسمیں مرد اور عورت سوسائٹی کے قانون کے مطابق ایک دائمی رشتہ میں منسلک کئے جاتے ہیں یا خود ہوجاتے ہیں — بالفاظ دیگر شادی نام ہے اس "بندھن" کا جو ملک کی رسموں کے مطابق مرد و عورت کو ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنا دیتا ہے یا پھر شاعرانہ زبان میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ شادی نام ہے اس عہد و پیمان کا جسکی روسے جنس لطیف اور جنس کثیف کے مابین ایک دائمی رشتہ قائم ہوتا ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "یہ دائمی رشتہ" کس قسم کا ہوتا ہے؟ یا اسکی حدود کیا ہیں؟ —— تو واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک اس عجیب و غریب رشتہ کی تعریف کیلئے کچھ موزوں الفاظ وضع نہیں کئے گئے، حالانکہ یہ رشتہ اسقدر قدیم ہے کہ پرانی سے پرانی کتب میں اسکا تذکرہ آپ کو مل جائیگا —— بہرحال اس رشتہ کو قائم کرنے کیلئے ایک آدمی کو جن حماقتوں کا مرتکب ہونا پڑتا ہے انکا مجموعی نام ہے "شادی"! یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ازدواجی رشتہ مثل ایک عمارت کے ہے اور اس عمارت میں داخل ہونے کا جو دروازہ ہے اس کا نام ہے "شادی"! بعض قوموں کے لئے اس مکان کے دو دروازے ہوتے ہیں یعنی ایک جانیکا اور ایک آنے کا! اور بعض قومیں ایسی ہیں جن کے واسطے واپس آنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، تا زندگی اس عمارت کے اندر مقید رہنا پڑتا ہے خواہ قیدی اسکو گوارا کریں یا نہ کریں۔ بہرحال ہمیں اسوقت اس مکان سے کوئی بحث نہیں ہے، فی الحال تو صرف اس خوشنما دروازہ کا تھوڑا سا تذکرہ مقصود ہے جسکے ظاہری حسن پر آجکل کے نوجوانوں کی حریصانہ نظریں پڑتی رہتی ہیں، اس دروازے میں کچھ ایسا عجیب و غریب طلسم ہے جو ہر نوجوان کو اپنی طرف کھینچتا ہے ہر ایک اسی فکر میں رہتا ہے کہ کب موقعہ ملے اور کب اس دروازہ میں قدم رکھے —— پھر کوئی تعجب کی بات تھی کہ اگر ہمارا دوست ناصر بھی اس طلسمی [illegible] میں داخل ہونے کیلئے مجسم آرزو بنا ہوا تھا —— ناصر اگرچہ تعلیم یافتہ تو تھا تاہم روشن خیال ضرور تھا اور موجودہ [illegible] روشن خیالی میں جس قسم کے جراثیم پائے جاتے ہیں وہ ماشاء اللہ ہمارے دوست میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھے، مثلاً اس کا دعوی تھا [illegible] کو دیکھے بغیر شادی ہرگز نہ کروں گا۔ اسکے علاوہ [illegible] صفات [illegible] ضروری [illegible] پڑھی لکھی ہو [illegible] سیرت کے لحاظ سے فرشتہ اور صورت کے لحاظ سے [illegible] [illegible] ہو جسوقت محو کلام ہو تو [illegible] سے پھول جھڑ [illegible] وغیرہ وغیرہ [illegible] آپ متعجب [illegible] تعلیم یافتہ [illegible]

[illegible]

محال ہے ۔ اس لئے ہر روشن خیال نوجوان کو ہمیشہ ناکامی ہی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے ، وہ اپنے تصورات میں جس دیوی کی پرستش کرتا رہتا ہے جب وہ ، اسکو نہیں ملتی تو اس کی زندگی کے تمام خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں اور اسکی ازدواجی زندگی نہایت تلخ ہو کر رہجاتی ہے ۔ چنانچہ ہمارے ۔۔ دوست ناصر نے بھی اپنی شریک زندگی کی تلاش میں تمام بمبئی کی خاک چھان ماری لیکن ان کو اپنی مطلوبہ شئے کہیں نہ دستیاب ہو سکی ، اکثر لڑکیوں کو صرف دیکھنے کا اتفاق ہوا بلکہ ان سے گفتگو کرنے کا موقع بھی مل گیا ۔ لیکن ہمارے دوست کے خیال و تصور کے معیار پر کوئی بھی پوری نہ اترتی تھی ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور نکل آتا تھا ، بہرحال انٹرویو (یعنی امتحانی ملاقات) میں ہر لڑکی فیل ہو جاتی تھی ، یہی حال دیکھ کر ہم نے اپنے دوست کو رائے دی کہ وہ شادی کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دے ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا ، لیکن نوبت یہانتک پہنچے ـــــ " ۔

" یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے "

زمانہ گزرتا گیا اور شادی کی خواہش بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی ، جب ہم نے دیکھا کہ اب یہ مرض لا علاج ہو گیا ہے تو سوچا کہ لاؤ جہاں ہے تو یاس وہاں ہو استیا ناس ! ـــــ کیس ، ہم بھی اس کار خیر میں اپنے دوست کا ہاتھ بٹائیں ممکن ہے کہ حالات پلٹا کھا جائیں اور ہمارے دوست کے خیالات میں بھی کوئی انقلاب رونما ہو جائے چنانچہ ہم نے بمبئی سے بہت دور ایک شہر میں لڑکی کی تلاش شروع کی ـــــ اسکو حسن اتفاق کہئے یا ہماری کوششوں کا نتیجہ ! کہ امید کی ہلکی ہلکی جھلک دکھلائی دی ، اسمیں شک نہیں کہ کبھی کبھی قسمت کا پانسہ ایسی جگہ گرتا ہے جہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا ـــــ لڑکی صورت ، سیرت اور خاندان وغیرہ کے لحاظ سے اچھی تھی گویا سونے پر سہاگہ ـــــ پڑھی لکھی اور خانگی امور سے واقف اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بھی اس رشتہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی ۔ ہم اس پسندیدگی کے تمام اسباب سے تو واقف نہیں تھے ، تاہم یہ ضرور جانتے تھے کہ وہ بمبئی دیکھنے کی بہت شائق تھی ، بہرحال ہم نے اپنے دوست کو سمجھایا کہ " بھائی صاحب ! حور وقصور تو شاید آپ کو جنت میں بھی نہ مل سکیں کیونکہ آپنے دنیا میں کوئی ایسے نیک کام ہی نہیں کئے جن کے صلہ کی توقع کی جا سکے اسلئے بہتر صورت یہی ہے کہ جو بھی پیاری جیسی بھی شریک زندگی آپ کو اس دار المحن میں مل جائے اسکو ہاتھ سے نہ چھوڑیئے ورنہ آدھی کو چھوڑ پوری پہ جائے اور نتیجہ میں نہ آدھی ملے نہ پوری پائے والا مضمون رہیگا اور پھر ایک ایسی شئے کی جستجو ہی بیکار ہے جس کا وجود ہی دنیا میں نہیں پایا جاتا ۔ اس مختصری زندگی میں جو بھی مل جائے وہ غنیمت ہے ، بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی بہت ہوتی ہے "

ناصر کی سمجھ میں کچھ آیا اور کچھ نہ آیا ، بہرحال وہ نیم راضی ہو ہی گیا ، اب بڑا سوال لڑکی کے دیکھنے کا تھا لیکن خارجی ذرائع سے ہم کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ قطعی غیر ممکن ہے ۔ لڑکی کے والدین مشرقی تہذیب کے آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتے تھے وہ کبھی بھی اپنی قدامت پرستی سے باز نہ آسکتے تھے ، لڑکی کو دکھانا تو درکنار ، اسکی تصویر بھی بتلانے کیلئے ہرگز آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ اسطرح انکی وضعداری میں فرق آتا ، یا پھر انہیں بزرگوں کی زبان میں یوں کہنا چاہیئے کہ ۔

" عزت و آبرو پر پانی پھر جاتا "

بہرحال ہمارے دوست کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے ارادے کے قدم پھر لڑکھڑانے لگے ، ہم نے بھی اپنے ترکش کے تمام تیر برسانا شروع کرکے ان کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ نصیحتیں اگر حقیقت کا پہلو لئے ہوئے ہوں تو تلخ ہونیکے

باوجود کچھ نہ کچھ اثر ضرور رکھتی ہیں، ہمارے طویل لیکچر کا خلاصہ یہ تھا کہ:
"دیکھو اس سنہری موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دو، ہم اس زندگی میں بہت سے کھیل کھیلتے ہیں کسی میں ہار ہوتی ہے کسی میں جیت! اور سچ پوچھو تو شادی بھی زندگی کا ایک جوا ہے جس میں ہار اور جیت دونوں کا امکان ہے کیونکہ لڑکی کو دیکھ کر آپ صرف شکل و صورت کا اندازہ کر سکتے ہیں، لیکن سیرت جو سب سے اہم چیز ہے اس کا علم آپکو ازدواجی زندگی ہی میں ہو سکتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکی کو دیکھ کر پسند کرنے کے باوجود ازدواجی زندگی ناکام ثابت ہوتی ہے۔ بہت سی شادیاں محبت کی بنیاد پر ہوتی ہیں لیکن وہ بھی سو فیصدی ناکام رہتی ہیں، ہم روزانہ اخبارات میں دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب نے عورت اور مرد کو اسقدر آزادی دے رکھی ہے کہ یورپ کے لوگ کورٹ شپ کے بغیر شادی نہیں کرتے لیکن اسکے باوجود ان کی خانگی زندگی بیحد تلخ ہوتی ہے اور وہاں کی عدالتوں میں جس کثرت سے عورت و مرد کے جھگڑوں یا طلاق کے معاملات پر مقدمے پیش ہوتے ہیں اسکے عشر عشیر بھی ہمارے ہندوستان میں نہیں ہوتے۔ مغربی تہذیب کے علمبردار خواہ کتنا ہی ہندوستانی تہذیب کا مذاق اڑائیں لیکن اپنی گردن سے اس طوق کو اتار کر نہیں پھینک سکتے جو آزادی کی دیوی نے ان کو عطا فرمایا ہے وہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو ضرور دیکھ سکتے ہیں لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھنے سے قاصر ہیں ـــــ واضح ہے کہ کورٹ شپ کے زمانہ میں عورت و مرد کی حیثیت محض ایکٹر و ایکٹریس جیسی ہو جاتی ہے وہ اپنی فطرت کو اسقدر بلند بنا کر ایکدوسرے کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کسی کو حقیقت کے سمجھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ تصنع اور بناوٹ کے سبب ایک دوسرے کے حقیقی خط و خال نمایاں ہی نہیں ہو سکتے اسی وجہ سے ایکدوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے کے بجائے سخت غلطی اور دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے لیکن شادی ہونیکے بعد ہی ان کی حیثیت معمولی انسانوں جیسی ہو جاتی ہے۔ یعنے وہ انسان ہیں غلطی بھی کر سکتے ہیں اور پھر غلطی کرنے کی چھپی ہوئی خواہش کو اپنی سرشت سے نکال بھی نہیں سکتے! بہرحال جب انکی اصلیت ایکدوسرے پر ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ خود کو ایک عمیق غار میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ یہ احساس انکی زندگی کو بیحد تلخ بنا دیتا ہے اور نتیجہ میں وہ ایکدوسرے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ ہے مغرب کی نام نہاد تہذیب کا مختصر سا خاکہ!" بس یہیں تک کہنے پایا تھا کہ ناصر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ: ــــ "یہ سب کچھ صحیح تسلیم کرنے کے باوجود میرا سوال جوں کا توں باقی رہجاتا ہے یعنے لڑکی کو دیکھنے سے کم از کم شکل و صورت کے متعلق تو کچھ اندازہ ہو ہی جاتا ہے"۔

اسپر مجھکو بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کہا ــــ "واہ حضرت! واہ!! رات بھر قصہ سنا اور صبح بھی پوچھتے ہو کہ زلیخا عورت تھی کہ مرد تھا۔ خوب! جب عورت کی سیرت بدل سکتی ہے تو صورت کے بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ حسن تو سب سے زیادہ ناپائدار چیز ہے اس کا تو کبھی بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا عورت کا جو حسن شادی سے قبل ہوتا ہے وہ شادی کے بعد کبھی نہیں رہ سکتا اور حسن کی بنیاد پر جو شادی ہوتی ہے وہ تو سب سے زیادہ ناکام ثابت ہوتی ہے کیونکہ اگر حسن کو زوال نہ بھی ہو تب بھی انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ حسین سے حسین شکل بھی کبھی نہ کبھی اسکی نظروں سے گر جاتی ہے۔ بہرحال جب ایک خاص قسم کے حسن سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو وہ اسمیں بھی کوئی نہ کوئی تبدیلی چاہتا ہے۔ غرضکہ حسن کی بنیاد پر شادی کرنا میرے نزدیک سب سے بڑی حماقت ہے!"

ہم لوگ ابھی اس قسم کی گفتگو میں مصروف تھے کہ ڈاکیہ نے ایک خط لاکر دیا کھولکر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ ناصر کی ہونیوالی سسرال سے آیا ہے۔ خط کو ہم دونوں نے شروع سے آخر تک پڑھا۔ خط کا خلاصہ یہ تھا کہ شادی کی تاریخ وغیرہ بالکل طے ہو چکی ہے اور اب

صرف ہم آئیں۔ سارے بمبئی سے روانہ ہونے کی دیر ہے۔ ناصر نیم راضی تو پہلے ہی تھا اب جو یہ خط دیکھا تو اس نے بھی سوچا کہ اچھا جو ہو سو ہو لاؤ قسمت کے جنگل میدانِ شادی یہ بازی لگا کر بھی دیکھ لیں شاید دلی مراد بر آئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا والا مضمون تھا کیونکہ جب ہمارے ناصر کو ہر طرف سے مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا تو اب سوائے اپنی قسمت پر شاکر ہونے کے اور کونسی صورت باقی تھی: پھر بھی ناصر نے احتیاطاً شادی کی تاریخ میں ایک ماہ کی توسیع کے لئے تحریر کر دیا

اس دوران میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا:— لڑکی والوں کی طرف سے ایک بزرگ صورت فرشتہ خصلت ہستی کو بمبئی روانہ کیا گیا تاکہ وہ لڑکے کے متعلق مزید تحقیق کرکے والدین کو اطلاع دیں۔ وہ بزرگ صورت انسان بڑے نمازی اور پرہیزگار تھے اور ماشاء اللہ حافظ بھی تھے۔ اسلئے ہم اب "حافظ صاحب" ہی کے متبرک نام سے ان کا تذکرہ کریں گے۔

حافظ صاحب نے ناصر سے ملاقات کی اور جسقدر سوالات بسلسلۂ شادی ہو سکتے تھے کئے۔ غرضیکہ ہر طرح سے اپنا اطمینان کر لینے کے بعد لڑکی کے والدین کو خط لکھ دیا۔ انہوں نے خط میں کیا لکھا تھا؟ یہ ہمکو اسوقت معلوم ہوا جب لڑکی کے والدین کی جانب سے خط آیا جس میں ہمارے دوست پر بہت زیادہ بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا تھا۔ ہم اول اول تو بہت حیران ہوئے اور بیساختہ مرزا غالب کا یہ شعر ہماری زبان پر آ گیا کہ ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

لیکن بہت جلد ہمکو معلوم ہو گیا کہ یہ تمام کارپردازی محترم حافظ صاحب کی تھی، یعنی آنجناب نے اپنے خط میں ہمارے دوست کی تعریف کے بجائے اتفاق سے مذمت کر دی تھی (اتفاق کا لفظ اسلئے استعمال کیا گیا کہ یہ انکی غلطی نہ تھی بلکہ ان کے ناہنجار قلم کی تھی) ہاں تو فی الحال ہم تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ قصہ مختصر یہ کہ جب ہم حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا تو بظاہر انہوں نے بھی حیرت و استعجاب کا اظہار کیا لیکن دل کا حال یا تو وہ جانتے تھے، یا اُن کی معصوم "ریش مبارک"! ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے قلم کی افترا پردازی پر دل ہی دل میں کچھ ندامت محسوس کی ہو لیکن بظاہر جو کچھ ہوا وہ یہ کہ ہمارے مجبور کرنے پر یا محض اخلاقاً انہوں نے ایک دوسرا خط تحریر فرمایا (واضح رہے کہ یہ خط ہمارے وفادار اور مخلص قلم سے لکھا گیا تھا) بہرحال انہوں نے اس خط میں لڑکی کے والد کو جو کچھ تحریر کیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آخر شادی میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ اسطرح ہچکچانے سے کیا فائدہ؟ بھئی

"ہونے ہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟!"

اور دیکھو اگر اب بھی تم نے چوں و چرا سے کام لیا تو پھر بندہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں!........" وغیرہ وغیرہ۔ یہ خط حاصل کرکے ہم نے اپنے خط کے ساتھ خود رجسٹری کرکے روانہ کیا۔ لڑکی کے والدین کو جب یہ خط ملا تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کیونکہ حافظ صاحب کے گذشتہ اور موجودہ خط میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیجئے کہ حافظ صاحب نے ایسا کیوں کیا؟ بات یہ تھی کہ ماشاء اللہ خود حافظ صاحب کی بھی ایک صاحبزادی تھیں جن کی شادی بمقابلہ کسی دوسری لڑکی کے زیادہ ضروری تھی۔ حافظ صاحب نے سوچا کہ چلو یہ لڑکا اچھا مل گیا۔ جن جن خوبیوں کی ہمیں تلاش تھی، جب وہ تمام اس لڑکے میں پائی جاتی ہیں تو پھر کیوں نہ اسکو اپنا ہی داماد بنا لیا جائے لیکن یہ کام اسی وقت ممکن تھا جب بلدی طے شدہ بات چیت پر پانی پھیر دیا جائے۔ چنانچہ اسی غرض سے انہوں نے

بھوپال کے مضافات میں ایک ندی ہے جو عام طور پر پلک متی کے نام سے مشہور ہے۔ جس قصبہ سے یہ گذرتی ہے اس کا نام بھی پلک متی ہی ہے۔ سچ پوچھئے تو پلک متی پر لفظ "قصبہ" کا اطلاق بھی نہیں ہوتا، بلکہ اسکی حیثیت مثل ایک گاؤں کے ہے۔ ایک عرصے سے ہم نے دیہاتی زندگی کا لطف نہیں اٹھایا تھا، لہذا بڑے ابا کے اصرار پر ہم پلک متی چلنے کیلئے تیار ہوگئے۔ ہمارے بڑے ابا صاحب محکمہ مال کے سپرنٹنڈنٹ تھے جو پلک متی ہی میں واقع تھا۔ بہرحال ہم مع اپنی تین بہنوں یعنی قرشیہ، زبیدہ ور رابعہ کے وہاں پہنچ گئے۔ لیکن جسقدر ذوق و شوق سے وہاں گئے تھے اسیقدر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے رعب و داب کی وجہ سے ہم کچھ تفریح نہ کرسکے، حالانکہ ہم کو یہاں تفریح ہی کی لالچ سے لایا گیا تھا ـــــ ہمارے بڑے ابا صاحب دن بھر گڑ بنوانے میں مصروف رہتے تھے اور جب گڑ بن کر آتا تھا تو اسی مکان میں رکھا جاتا تھا جہاں ہم قیام پذیر تھے۔ آپ جانیئے گاؤں ہی تو تھا۔ کمرہ گڑ سے لبریز ہوگیا۔ ہمارے ساتھ جو ملازمین آئے تھے وہ سب واپس بھوپال چلے گئے تھے لیکن ہم لوگوں کو مجبوراً وہیں رہنا پڑا۔ مختصر سے قطعۂ زمین میں چار لکڑیاں کھڑی کرکے اوپر پھوس کا چھپر ڈالدیا گیا تھا۔ بس یہی تھا ہمارا عالیشان محل! پاس ہی ایک آم کا درخت بھی موجود تھا جو کیریوں سے لدا ہوا تھا۔ والان اس قطع کا تھا جیسا کہ عام طور پر ریلوے پلیٹ فارموں کے اسٹیشن پر سامان رکھنے کی جگہ ہوتی ہے ـــــ ایک روز عجیب دلچسپ واقعہ پیش آیا، ہماری بڑی بہن یعنی قرشیہ سے بڑے ابا بہت خائف رہتے تھے، کیونکہ وہ انکی شرارتوں سے خوب واقف تھے یہی وجہ تھی کہ وہ سب کو تفریح کرانیکے لئے باہر لے گئے لیکن ان کو گھر پر چھوڑ دیا۔ یہیں یہ کہنا غلط تھا کہ اپنی عزیز ترین بہن کو چھوڑ کر ہم تفریح کیلئے چلے جائیں، چنانچہ ہم بھی رہ گئے، ہم جلے بھنے تو بیٹھے ہی تھے لہذا فرصت کے ان قیمتی لمحات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم دونوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک عجیب طریقہ نکالا کہ ایک نظم بعنوان "ترانۂ پلک متی" لکھنا شروع کی جسمیں موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرنیکے علاوہ دیہاتی زندگی کا بھی مختصر خاکہ کھینچنے کی کوشش کی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم اس کوشش میں کہانتک کامیاب رہے، ہم لوگوں نے اپنا "تخلص" "آپنا" رکھا۔

بہر حال عین اسوقت جب ہم نہایت دردناک آواز سے اس ترانہ کو گا رہے تھے۔ بڑے ابا صاحب مع تمام عورتوں اور بچوں کے آموجود ہوئے ہم حیران تھے کہ خدایا یہ لوگ اسقدر جلد کیسے واپس آگئے۔ خیر یہ عقدہ تو ابھی تک حل نہ ہوسکا لیکن ہمکو یقین آگیا کہ ہماری پوری نظم وہ لوگ سن چکے تھے، کیونکہ بعد میں بڑے ابا صاحب کی نادرشاہی خفگی نے ہماری

شعریت کا گلا گھونٹ کے رکھ دیا، اب لگے ہاتھوں وہ "ترانۂ پبلک ہستی" بھی سن لیجئے:-

"ترانۂ پبلک ہستی"

(قافیہ وغیرہ کی قیود سے آزاد)

سارے جہاں سے بدتر ہے چندپور[۱] ہمارا — ہم قیدیاں ہیں اسکی وہ پاسباں ہمارا

کمرے میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل غذا میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی، گر ہو جہاں ہمارا

چھپر وہ سب سے اونچا ہمسایہ کیسریوں کا — حسرت سے ہر پینگ کو پھر گھورنا ہمارا

دالان کیا ہے گویا اک ٹراموے کا جنکشن — ٹھیرا ہوا جہاں ہے یہ کارواں ہمارا

خفگی سے ڈرنہ اے آپا کی! ہم نہیں ہیں — سو بار کر چکے ہیں وہ امتحاں ہمارا

دو چار لڑکیاں جب مل جل کے بیٹھتی ہیں — بھاتا نہیں کسی کو یوں کھیلنا ہمارا

اے گندی گندی نہر وہ دن ہیں یاد تم کو — کرتے تھے ہم وضو جب بہتا وہاں ہمارا

گودی میں کھیلتے ہیں جن کی ہزاروں مینڈک — گندہ ہے ان کے دم سے سارا مکاں ہمارا

تفریح کا یہاں پر کچھ بھی نہیں ہے ساماں — کہتے تھے چند پودے کو سب گلستاں ہمارا

لائے تھے کھیلنے کو ہم گیند اور بلّے — ممکن نہیں ہے لیکن یاں کھیلنا ہمارا

کملیا[۲]، رشید[۳]، آنا[۴] سب بھگ گئے یہاں سے — باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا

لاری میں کوئی محرم ہرگز نہیں تھا اپنا — ہم چار لڑکیاں تھیں اور رہنما ہمارا

۱؎ پبلک ہستی کا دوسرا نام چندپور ہے:

۲؎ ۳؎ ۴؎ یہ ملازمین کے نام ہیں۔

آواز

از جناب حفیظ عزیزی صاحب رامپوری

رات تھی اور وہ بھی جاڑوں کی کالی ٹھنڈی رات، کمرہ بجلی کے قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے لطیف اور خوشگوار جھونکے مستانہ وار چھیڑ چھاڑ کرتے پھر رہے تھے، "سائیں"، "سائیں" کی سرد آوازوں سے فضا متحرک تھی غنچے چٹک چٹک کر پیغام مسرت دے رہے تھے۔ برآمدے کی ٹین پر ہلکی ہلکی بوندیوں کی پیہم آوازدل میں ایک جذباتی ہیجان بپا کر رہی تھی۔

میں کرسی پر کمبل میں لپٹا ہوا اس دلکش، اور روح افزا منظر میں کھویا ہوا نہ جانے کیا گنگنا رہا تھا کہ میرے خیالات کا لامتناہی تسلسل ایک مترنم آواز نے منتشر کر دیا۔ برابر والے مکان میں کوئی جیسی آواز میں گا رہا تھا۔

"پریتم روٹھے ---- دنیا روٹھی

روٹھ گیا جگ سارا"

آواز بے حد دلکش اور پرسوز تھی۔ جس سے میرے شکستہ دل کے سازوں کو چھیڑ دیا۔ میں تڑپ اٹھا۔ اور برآمدے میں آ کر ٹہلنے لگا، آواز اب تیز ہوتی جا رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کی ہر شے عالم وجد میں ہے اور سارا ماحول موسیقیت میں ڈوبا ہوا زبان حال سے پکار رہا ہے۔—

"پریتم روٹھے —— دنیا روٹھی

روٹھ گیا جگ سارا"

ساری فضا گاتی ناچتی دکھائی دے رہی تھی۔ کالی کالی مست گھٹائیں بھی جھوم جھوم پڑتیں اور نثار ہو ہو کر بارش کی ایک جھڑی لگا دی۔ مگر وہ پیاری پیاری آواز اب بھی مینھ کی سفید چادر سے چھن چھن کر مجھ تک آ رہی تھی —— میں اس اس رنگین آواز میں جذب، مدہوشی و بیخودی کے عالم میں سر ابر جھول رہا تھا کہ گانا ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ بند ہو گیا ایسا معلوم ہوا کہ جیسے "کسی" نے مجھے کبھی نیند سے اٹھا کر بٹھا دیا ہو، میری دنیا سونی ہو گئی اور میں ساکت و مبہوت کھڑا رہ گیا کہ پھر وہی بدمست کرنیوالی حسین آواز بڑے پُردرد لہجے میں فضا میں گونجی۔—

"پریتم روٹھے —— دنیا روٹھی

روٹھ گیا جگ سارا۔"

میں دوڑ کر کمرے میں سے ہارمونیم اٹھا لایا اور بجانا شروع کر دیا۔ ہارمونیم کی آواز سنکر گانے والا خاموش ہو گیا۔ فضا میں اداسی سی چھا گئی۔ دل رہ گیا اور انگلیاں سرد پڑ گئیں۔ مگر میں بجاتا ہی گیا۔—

"پریتم روٹھے دنیا روٹھی

روٹھ گیا جگ سارا"

میں اسی کو بار بار بجاتے گیا مگر آہ!! وہ رنگین آواز دوبارہ نہ گونج آئی۔ اب بھی کبھی کبھی جاڑوں کی سہانی راتوں میں وہی درد بھری

آواز میرے کانوں میں اکثر گونجتی رہتی ہے اور میں بے اختیار گنگنانے لگتا ہوں۔— "پریتم روٹھے —— دنیا روٹھی —— روٹھ گیا جگ سارا" ✚

ریویوز

نظم اردو

(مصنفہ حکیم سید ابوالعلا ناطق لکھنوی۔ کتابت و طباعت اور کاغذ صاف اور نفیس۔ قیمت دو روپیہ۔ مطبوعہ ظفر المطابع لکھنؤ)

اردو شاعری کی تاریخ ہے شعر میں ۔۔۔۔

اردو زبان کی تاریخ اور شاعری کے ارتقاء پر مختلف زبانوں میں مختلف لوگوں نے ابتک جو کتابیں لکھی ہیں وہ سب کی سب نثر میں ہیں، لیکن یہ اس سلسلہ میں پہلی کتاب ہے جو تمام و کمال نظم میں ہے اور مسدس کے کل ۸۰۰ بندوں پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ ابتداء سے لیکر دور آخر تک زبان کی پیدایش، اسکی اشاعت کے اسباب و ذرایع کا حال اور شاعری کی نشو و نما اور ارتقاء کو پیش کیا گیا ہے، نیز تحقیق و تلاش کے ساتھ ان تمام شعراء اور تصانیف کا نام بھی دیا ہے جن کا تذکرہ اس ضمن میں ضروری تھا۔ یہی نہیں بلکہ جن شعراء اور تصانیف کا ذکر نظم میں آیا ہے حواشی کے ذریعہ انپر روشنی ڈالی گئی ہے اور کلام کا نمونہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ ابتداء میں ملک کے نامور شعراء و ادباء اور اصحاب علم و فضل کی تقریظات اور تعارفات ہیں، جن سے اسکی خصوصیت و افادیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد خود حضرت ناطق کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جسمیں شعر کہنے کی دشواریاں۔ اردو شاعری کی خصوصیات اور شاعری کے تجربات ہیں۔ پھر "نظم اردو" شروع ہوتی ہے اور اسطرح کہ بائیں طرف ہر صفحہ پر جلی حروف میں مسدس کا ایک بند اور شعراء قدیم کے کلام کا نمونہ ہے اور مقابل کے صفحہ پر حواشی ہیں جو بجائے خود ایک مبسوط اور قابل قدر کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہایت مفید معلومات کا خزانہ ہیں۔ آخر میں ان شعراء اور کتابوں کی، جن کا تذکرہ حواشی میں ہے، نیز "نظم اردو" کے ماخذ کی فہرستیں ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب نہ صرف علمی و ادبی لحاظ سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے بلکہ تحقیق تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا بہترین نمونہ ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک شاعر جس کا دماغ صرف نازک ہو سکتا ہے کسطرح تحقیق و تلاش کی زحمت گوارا کرکے شاعری کے دوش بدوش ایسی جامع اور مکمل چیز پیش کر سکتا ہے اور اسقدر دلچسپ انداز میں کہ شعریت اور رنگینی بھی زائل نہونے پائے بلکہ موضوع کے خشک اور ٹھوس ہونے کے باوجود اشعار میں نظم کی وہ خصوصیات جنہیں حسن بیان، نزاکت خیال اور بندش الفاظ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے قائم ہے حتیٰ کہ تغزل کی شان بھی نظر آئے۔ مثلاً یہ بند ملاحظہ ہو:۔۔۔

میل میں صبح عرب کے کب تھی شام ہند کم
مختلف ہونے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رخ بہم
دلربائی کو بتان ہند پہنچے تا حرم
ہو گئے تھے ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم
منسلک آپس میں تھے شیخ و برہمن اسطرح
ہم بغل، ہمدوش ہیں چولی سے دامن جسطرح

تاریخ کو اس طرح نظم کیا گیا ہے کہ اسمیں مختلف قوموں اور زبانوں کے

امتزاج سے نئی زبان کے پیدا ہونے کی کیفیت بھی بیان ہوگئی ہے :-

ہند تیرہ صوبوں سے مسلموں کا ہے مقام
واعظوں سوداگروں اور صوفیوں کا ہے قیام
اہل ہند اہل عرب ہیں سب کے سب ابنائے سام
ہم نسب ، ہمجنس ہند و کیا کبھی ہوتے نہ رام
کیوں نہ پھر کھلتی زبان جب دل سے غنچے کھل گئے
تھے ہزاروں سال کے بچھڑے ہوئے گل مل گئے

لسانیات کے مطالعہ کا طریقہ اور تحقیق کا گر ملاحظہ ہو :-

پوچھنا تاریخ سے پیدایش اردو کا حال
کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال
جس زبان کی آفرینش کا تجھے آئے خیال
اسکے اسباب و علل اور فلسفے کو دیکھ بھال
ملک میں اردو زبان افواج کی بھرتی ہوتی تھی
یک بیک الفاظ کی بارش ہوا کرتی نہ تھی

اس کے بعد یہ بند دیکھئے :-

ہوگا جن قوموں کی فطرت میں ازل سے اتحاد
جب وہ اک جگہ ہو جائیں گی آباد شاد
پس اگر عہد حمول آن کو آ جائے گا یاد
خواہ وہ عجمی ہوں یا ترکی ہوں یا ہندی نژاد
دونوں قومیں ہم سخن ہم داستاں ہو جائینگی
ملکے دونوں کی زبانیں یک زباں ہو جائینگی

فلسفہ کی خشکی تو نظم کی رنگینی برداشت نہیں کرسکتی مگر بند ۱۲ کے آخری شعر میں یہ فلسفہ کہ نثر سے نظم کیونکر بنی کس شاعرانہ حسن و خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ شعریت کا خون بھی نہیں ہونے پایا :-

نثر ہی کے سلسلہ میں نظم کی کڑیاں بنیں
اسقدر بکھرے یہ موتی خود بخود لڑیاں بنیں

اب ذرا زبان و بیان کی چاشنی اور لفظی مناسبتوں سے لطف اٹھائیے :-

اس طرح کام اسکا چلتے چلتے بر سو چل گیا
نقش یوں بیٹھا او دھ میں نام اردو چل گیا
تھے بہاری نرم دل جیرا نیہ قابو چل گیا
حد یہ ہے بنگال پر بھی اس کا جادو چل گیا
آج اگر آئی ادھر تو کل اُدھر چلتی ہوئی
اُف یہ اتنی سی زباں اور اسقدر چلتی ہوئی

یا :-

جو زباں آور ہے قسمت اسکی زور آور نہیں
مالک گوہر ہے جو وہ صاحب جوہر نہیں

مگر پہلے بند کو بھی سن لیجئے کہ یہی "نظم اردو" کی تصنیف کا اصل مقصد ہے :-

گفتگو ناطق یہ ہے آغاز اُردو کب ہوا
جستجو یہ ہے کہ ظاہر راز اُردو کب ہوا
انجمن میں نغمہ آرا ساز اُردو کب ہوا
سانہ بوم ہند ہم آواز اُردو کب ہوا
ایک ہی دھن سنتے سنتے پک گئے ہیں کان سُن
دعوئی ایجاد اُردو کی لگی ہے سب کو دھن

اور آخری بند میں کتنی سچی بات کہی ہے :-

جن کے سینے میں ہے دل مٹھی میں انکی زر نہیں
ہاتھ میں جن کے ہے زر پہ زعفران کا سر نہیں
جو زباں آور ہے قسمت اس کی زور آور نہیں
مالک گوہر ہے جو وہ صاحب جوہر نہیں

دونوں بے بس ہیں کسی سے کچھ نہ کہنا چاہیئے
تم گو لئے ناطق بس اب خاموش رہنا چاہیئے

غرض "نظم اردو" اردو زبان و ادب کا ایک زبردست کارنامہ ہے جو اپنے طرز ادا، طرز بیان اور طرز تحریر میں سب تذکروں سے نرالا، انوکھا اور سچا ہے، پھر یہی نہیں بلکہ اسمیں تاریخ کی تاریخ اور شاعری کی شاعری ہے۔ ضرورت ہے کہ ملک میں اسکی قدر کیجائے اور جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے ان تعلیمگاہوں میں داخل نصاب کیا جائے کہ اس سے نہ صرف طلبہ مستفیض ہوں گے بلکہ اساتذ کیلئے بھی یہ کارآمد ثابت ہوگی۔ ناظرین "تنویر" سے پرزور سفارش کیجاتی ہے کہ ہر خیرخواہ اردو اسے خرید کر پڑھے۔

(ن-م-ش)

نیشنل سٹوڈیوز کا "سنسکار" بہت کامیاب رہا۔ ۲۰ دسمبر سے "پوجا" کی نمائش پاتھے سینما میں ہو رہی ہے، اس فلم کے ڈائرکٹر مسٹر کاردار ہیں، سردار اختر اور ظہور راجہ ہیرو ہیروئن کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔

سٹوڈیوز میں مسٹر محبوب "مرد" تیار کر رہے ہیں۔ اور ڈائرکٹر رامچند ٹھاکر "کسوٹی" بنا رہے ہیں۔ ویرندر ڈیسائی "رادھکا" کی طیاری میں مصروف ہیں۔

واڈیا موویٹون کی "راج نرتکی" قریب قریب طیار ہے عنقریب اس فلم کی نمائش رائل اوپیرا ہاؤس میں کیجائیگی، اس فلم میں پرتھوی راج اور سادھنا بوس کام کرتے ہیں۔

اسٹوڈیوز میں فلم "منقش" بھی طیار ہو رہی ہے۔ جس میں رادھا رانی کام کرتی ہیں۔

پربھات فلم کمپنی کا "پڑوسی" جو "ہندو مسلم اتحاد" کی فلم ہے، قریب قریب طیار ہے۔ اسکی نمائش عنقریب کیجائیگی۔

سٹوڈیوز میں "سنت سکھو" کی طیاری ہو رہی ہے اسے مسٹر ڈاملے اور فتح لال طیار کرینگے۔ مسٹر ابراہیم پٹیل اور خواجہ احمد عباس حسیب عمر خیام کے سلسلے میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔

رنجیت موویٹون کی آنیوالی فلم "امید" ہوگی اسکے ڈائرکٹر مسٹر منی بھائی دیا سیں ہیں، جنہوں نے "ندی کنارے" طیار کی تھی اس فلم میں ایشور لال۔ پربھا۔ نورجہاں۔ کیسری۔ وجینت کام کرتے ہیں۔ "شادی" فلم کو جینت ڈیسائی طیار کر رہے ہیں، اسمیں مادھوری موتی لال۔ خورشید۔ ایشور لال کام کرتے ہیں۔ پرنسپل ایک آنکھ

مسٹر جینت ڈیسائی کیلئے "ڈوبتا چاپا بازار" کی کہانی وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ مسٹر چترنجیب ڈوشی کی دو فلمیں ایک سوشل، اور ایک کومیڈی تیار ہیں جنمیں موتی لال۔ خورشید۔ نورجہاں۔ سیتہ لتا پریمان۔ ای بلمورہا کام کرتے ہیں —— نور محمد چارلی اپنی کومک فلم کے بنانے میں مصروف ہیں جسمیں شمیم کام کرتی ہے۔ رتی بھائی، مسٹر کمال امروہی کی لکھی ہوئی کہانی "باپ اور بیٹا" طیار کرینگے۔

منروا مووٹیون کی نئی فلم "الٹی گنگا" طیار ہو چکی ہے۔ عنقریب اسکی نمائش کیجائیگی۔ اسٹوڈیوز میں "سکندر اعظم" طیار ہو رہی ہے۔

پرکاش پکچرز کی "مالا" عنقریب آنیوالی ہے، اسمیں روز کام کرتی ہے۔ مسٹر وجے بھٹ "بھرت ملاپ" کی طیاری میں مصروف ہیں۔

بمبئی ٹاکیز کا "بندھن" بدستور چل رہا ہے اس لئے اس کمپنی کے نئے فلم "پنر ملن" کی نمائش مجسٹک سینما گرگام میں کی گئی ہے۔ "پنر ملن" میں سنیہ پربھا اور کشور ساہو کام کرتے ہیں۔

نیو تھیٹرز کی نئی معرکتہ الآرا فلم "زندگی" کی نمائش سنٹرل ٹاکیز میں ہو رہی ہے اسکی بڑی تعریف سنی جاتی ہے۔ سینما پر پبلک کا ہجوم رہتا ہے۔ اس فلم کے اداکار لیلا ڈیسائی۔ نجم الحسن۔ جگدیش اور واسطی ہیں۔

آشا لتا پکچرز کی شاندار پیشکش "گھر جوائی" ایک مزاحیہ فلم آشا پکچرز کی اولین پیشکش ہوگی۔ اس کا افسانہ مسٹر آتریے کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور اس میں اداکاران خصوصی سوبھنا سمرتھ۔ وتملا اور ایندوکر ہیں مسٹر انا صاحب چیتکر اسکی موسیقی کے ذمہ دار ہیں اور مسٹر کمار سین سامرتھ اس کے ڈائرکٹر ہیں جو جرمنی کے مشہور اسٹوڈیو "اوفا" میں کامیاب مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ **آتریے پکچرز** کی زبردست پیشکش۔ مسٹر آتریے جس سرعت اور تیزی سے اپنے پہلے فلم کی تیاری کر رہے ہیں اس سے فلمی حلقے بہت متعجب ہیں۔ انکا پہلا فلم جو جنوری ۱۹۴۱ء میں تیار ہوگا مسٹر گجانن جاگیردار کی زیر ہدایت مکمل ہو رہا ہے۔ اسمیں مسٹر آتریے۔ شانتا اور وتملا کام کرتے ہیں۔ اس کا مرہٹی عنوان "پایاچی داسی" اور ہندوستانی عنوان "چرنوں کی داسی" ہے *

* ان دونوں فلموں کی اشاعت اور تقسیم پیرا ماؤنٹ پکچرز بمبئی نمبر ۴ کے پاس ہے

واڈیا کا سہ زبان اخلاقی شاہکار
آرہا ہے
آرہا ہے
WADIA
MOVIETONE
راج نرتکی
جس میں:-
ہندوستان کی ماہر رقص ممثلہ
سادھنا بوس
کیساتھ پرتھوی راج - ابن چودھری - نایامپلی - پریتما داس گپتا اور جینتا وغیرہ نے
اپنی اداکاری کے حیرت انگیز کمال پیش کئے ہیں — ہر منظر روح پرور — ہر مکالمہ ایک نشتر
ہر گانا دلگداز — اور عظیم الشان سیٹنگ سب پر مستزاد — کہانی انقلاب انگیز
ہندوستانی زبان میں نمائش کے لئے پیش ہوگی
رائل اوپیرا ہاؤس بمبئی میں

اُف - اوہ !

چند ہفتے پہلے میں اپنی بیوی کے معاملے میں بہت ہی
پریشان تھا، وہ اپنی خوراک کبھی نہیں کھا سکتی تھی
اور اس کی طبیعت بہت چڑچڑی ہوگئی تھی۔

آہا - ہاہا

تب میرے ایک دوست نے اُسے کروشن سالٹ دینے کی
سفارش کی۔ میں نے اس کی نصیحت پر عمل کیا۔ اور اب میری بیوی کی پہلی
حالت میں انقلاب ہوگیا ہے۔ اس کی بھوک اسے واپس مل گئی ہے
اور اب وہ ہر وقت بچوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہتی ہے۔
کروشن سالٹ کے ہلکے اور پورے اثر سے سستی، طبیعت کا
مضمحل ہونا اور چڑچڑا پن جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا اثر نظام ہاضمہ پر ہوتا ہے
کروشن سالٹ آپکے جسمانی نظام کو ٹھیک کرکے آپکے موافق
کردیتا ہے۔ آپکو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ صبح اُٹھتے ہی
پہلا کام یہ کریں کہ تھوڑی مقدار کروشن سالٹ کی لے لیں۔ اس سے
آپ ہمیشہ خوش و خرم رہیں گے۔
کروشن سالٹ آپکو کیمسٹوں، اسٹورز اور بازار میں مل سکتا ہے

کروشن سالٹ کا شکریہ

KRUSCHEN

...Bombay

Regd No. B 4013

Mr SAGHIR NIZAM
تنویر
TANVIR
MONTHLY

ایک زمانے سے عورت کے حسن کو دوبالا کرنے والی متعدد چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں لیکن جب جلد ہی بھدی ہو اور اس میں دلکشی نہ ہو تو یہ تمام چیزیں بیکار ہیں چکنی صاف اور ملائم جلد ہی حسن و جمال کی ضامن ہے۔

مسامات میں جو میل جمع ہوتا رہتا ہے وہی بھدے پن، مسامات کے پھیل جانے اور مہاسوں کا باعث ہوتا ہے اور خشکی اور کھردرا پن آفتاب کی تمازت اور خشک ہوا سے پیدا ہوتا ہے پانڈس کے دونوں کریموں کا باقاعدہ استعمال آپ کی جلد کو گلاب کی پنکھڑی کی طرح تر و تازہ اور ملائم بنا دے گا۔ ان کریموں میں یہ اجزا ہیں جو نہ صرف جلد کو اندر اور باہر کی طرف سے صاف کر دیتے ہیں بلکہ وہ جلد کو مضر اثرات سے محفوظ بھی رکھتے ہیں۔

ہر رات اور ہر صبح پانڈس کولڈ کریم کا استعمال کیجئے۔ اسے انگلیوں کے پوروں سے چہرے اور گردن پر آہستہ آہستہ ملئے، کچھ دیر لگا رہنے دیجئے تاکہ وہ مسامات میں جذب ہو کر میل کو ڈھیلا کر دے۔ اس کے بعد پونچھ ڈالئے۔ دن کے وقت پانڈس وانشنگ کریم استعمال کیجئے۔ یہ آپ کے چہرے اور گردن پر ایک نہایت لطیف تہہ جما دے گی جو دھوپ آندھی اور گرد و غبار سے یقینی طور پر حفاظت کرے گی۔

پانڈس کریموں کا استعمال فوراً شروع کر دیجئے۔ کچھ ہی ہفتوں میں آپ کا چہرہ ملائم اور پرشباب نظر آنے لگے گا۔

★ پانڈس کریمیں ★

مغل لائن لمیٹڈ

گذشتہ سال حکومت کے بحری بیڑے "دی رائل انڈین نیوی" اور دی رائل ایر فورس کے زیر حفاظت سفر حج میں کوئی تکلیف دہ صورت پیدا نہیں ہوئی۔ اور مغل لائن کے کارکنان فخر کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ حکومت ہند کے مشورے کے بعد حج کے جہازوں کی روانگی کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور وہ حسب معمول حاجیوں کے لئے بہترین نشستوں اور اس قسم کی دوسری سہولتوں کو مہیا کریں گے۔

جنگ کی موجودہ صورت حال کے باعث جہازوں کے صحیح ایام روانگی کا اعلان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عازمین حج کو مندرجہ ذیل تاریخوں تک بندرگاہوں پر پہنچ جانا چاہئے۔ تاخیر زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے لئے ہو سکتی ہے۔

بمبئی :- پہلی روانگی ۱۰ نومبر ۱۹۴۱ء　　کراچی :- پہلی روانگی ۱۱ نومبر ۱۹۴۱ء

" :- دوسری روانگی ۱۷ " "　　" :- دوسری روانگی ۱۸ نومبر ۱۹۴۱ء

کلکتہ صرف ایک روانگی ۱۶ نومبر ۱۹۴۱ء

کرایہ ذیل میں درج ہے

	بمبئی سے جدہ تک	کراچی سے جدہ تک	کلکتہ سے جدہ تک
فرسٹ کلاس واپسی بمعہ طعام	۷۴۴ روپے	۷۱۶ روپے	۷۹۵ روپے
ٹورسٹ واپسی بمعہ طعام	۲۰۳ روپے	۱۹۶ روپے	۲۳۵ روپے ۸ ر

اس کے علاوہ ہر ایک حاجی کو جدہ پہنچنے سے ساحل تک سے جانے کا فریکرایہ علیحدہ ادا کرنا چاہئے۔ مزید معلومات کے لئے

ٹرنر موریسن اینڈ کمپنی ۱۶۔ بینک اسٹریٹ بمبئی سے دریافت کیجئے

SIKANDAR
منروا موی ٹون کا تاریخی کارنامہ
سکندر
ڈائرکٹر :-
سہراب مودی
ہندوستان کے اس سنہری دور کا عکس جمیل ہے
جب ہر وطن پرست مجاہد ملک کی آن کے لئے اپنی جان
بھینٹ دینا ادنیٰ خدمت تصور کرتا تھا
اداکاران :- سہراب مودی - پرتھوی راج - ونمالا - مینا - صادق علی - شیلا
ظہور راجہ - لالہ یعقوب - گجندرکے - این سنگھ - شاکر -
علّو بائی - غلام حسین - ابوبکر وغیرہ

منروا ٹاکیز

(خاص تنویر کے لئے)

پروازِ شوق

رشحاتِ خامہ حضرت ساغر نظامی مدیر ایشیا میرٹھ

بلند از وفا و جفا ہو گئے ہم
محبت سے بھی ماورا ہو گئے ہم

اشاروں، اشاروں میں کیا کہہ گئے وہ
نگاہوں، نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم

ترے دل میں رہ کر نظر میں سما کر
تمنائے ارض و سما ہو گئے ہم

تری آمد آمد کا اعلان سن کر
چمن میں نسیم و صبا ہو گئے ہم

چٹکنے نہ پائی تھیں کلیاں چمن میں
کہ اُس جانِ گُل سے جدا ہو گئے ہم

گئے مست بادلوں کا بہروپ بن کر
ترے بازوؤں تک رسا ہو گئے ہم

حقیقت نہ تھی آشنائی کے قابل
حقیقت سے کیوں آشنا ہو گئے ہم

محبت کی کچھ تلخیوں کی بدولت
مغنّیٔ شیریں نوا ہو گئے ہم

تباہی بھی ہے اک نشانِ ہدایت
لٹے اس قدر رہنما ہو گئے ہم

جو اُبھرے تو طوفان و سیلاب ہو کر
جو ڈوبے تو رازِ بقا ہو گئے ہم

سفینے کو خاموش دیکھا تو بڑھ کر
بنامِ خودی، ناخدا ہو گئے ہم

صدا دو محبت کے تاریخ داں کو
کہ پھر سے اسیرِ بلا ہو گئے ہم

سمجھنا ترا کوئی آساں ہے ظالم
یہ کیا کم ہے خود آشنا ہو گئے ہم

جنونِ خودی کا یہ اعجاز دیکھو
کہ جب موج آئی فنا ہو گئے ہم

نہیں کم یہ ہستی کی معراج ساغرؔ
کہ خاکسترِ میکدہ ہو گئے ہم

خاص تنویر کے لئے

بڑی بیگم

از جناب سید محمد صاحب بھوپال

بھلا بڑی بیگم کو کون نہیں جانتا۔ محلہ تو محلہ شہر کا کوئی بچہ یا بوڑھا ایسا نہ ہوگا جس نے اُن سے نیاز حاصل نہ کیا ہو یا کم از کم اُن کی دو چار چبھتی ہوئی باتیں نہ سنی ہوں۔ عمر تو اُن کی صرف ستر یا اسّی کے لگ بھگ تھی لیکن باتیں اُن کی عمر سے کہیں زیادہ قدیم ہوتی تھیں نوجوان لڑکیوں کے لئے تو وہ ایک بہترین کھلونا تھیں۔

ان کے چہرے کے متعلق صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ امتداد زمانہ نے جابجا طوفان اور زلزلہ کے نشانات چھوڑ دیئے تھے۔ ان کے دہانہ کے متعلق زیادہ تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ طویل زیادہ تھا یا عریض۔ جب وہ ہنستی تھیں یا غصہ ہوتی تھیں تو اُس کا طول زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ جماہی لیتی تھیں تو کوئی کافر ہی ہوتا جو اُس کے عریض ہونے سے انکار کر بیٹھے۔ اوّل تو وہ ہنستی ہی بہت کم تھیں کیونکہ انھوں نے اپنے حصہ کی ہنسی عمر کے ابتدائی حصہ میں شاید نہایت فراخ دلی سے خرچ کر ڈالی تھی اب اگر وہ ہنستی بھی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا رو رہی ہیں اور وہ بھی بدرجۂ مجبوری صرف لوگوں کو یہ دکھانے کے لئے کہ ہم کو بھی ہنسنا آتا ہے اکثر و بیشتر تو اُن کے ہنسنے یا رونے میں یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوتا تھا کہ آیا وہ ہنس رہی ہیں یا رو رہی ہیں۔ ہنسنے رونے پر ہی کیا منحصر ہے اُن کی تو ہر بات دنیا سے نرالی ہوتی تھی۔ جس وقت وہ محو کلام ہوں تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ کس وقت ان کے لہجہ میں محبت اور ملائمت کا اظہار ہوتا ہے اور کس وقت نفرت اور خشونت! بڑے بڑے فلسفی اور ماہر نفسیات اُن کی طبیعت اور مزاج کو سمجھنے سے قاصر ہے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب وہ برس پڑیں گی اور کب اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوگا۔ جب باتیں کرنے کے لئے تلتی تھیں تو کیا مجال کہ تھک تو جائیں۔ آپ لاکھ بولنا چاہیں۔ لیکن آپ کی آواز کا وہی حشر ہوگا جو نقارخانہ میں طوطی کی آواز کا ہوتا ہے۔

بڑی بیگم چونکہ ایک بہت بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور بہت سی جاگیروں کی مالک تھیں اس لئے گھر میں روپیہ کی ریل پیل تھی۔ خاندان بھی خدا کے فضل سے بہت بڑا تھا۔ بیٹے بیٹیاں۔ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ یوں تو کوئی نانی اور کوئی دادی کہہ کر پکارتا تھا لیکن عام طور پر وہ بڑی بیگم کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ — ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ خاندان کی چند نوعمر لڑکیوں نے طے کیا کہ کسی نہ کسی طرح سے بڑی بیگم کو ہنستا دکھانا چاہئے۔ سب کچھ طے کرنے کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ جوں کا توں رہ گیا کہ بلی کی میاؤں کو کون نبھائے گا۔ مطلب یہ کہ بڑی بیگم کو آمادہ کرنے کی مہم کون سر کرے۔ اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے کی ہمت کسی کے اندر نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن تک یہ اسکیم بالکل ٹھنڈی پڑی رہی۔ لیکن لڑکیوں کی ایک پارٹی ایسی بھی تھی جو نہایت شد و مد کے ساتھ اس تحریک میں حصہ لینے کے لئے بے چین تھی۔ چنانچہ روز نئی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اور طرح طرح کی تجویزیں پیش کی گئیں۔ لیکن کوئی بھی قابل عمل ثابت نہ ہوئی۔ بالآخر اتفاقاً ہاتھ سے پیٹ ہوا کہ یوں ہی ایک دن جو لڑکیاں جن کی زبان کبھی تھمتی ہی نہ ہو ان کو ایک دھڑ

کی شکل میں بڑی بیگم کی خدمت میں بھیجا جائے۔ جو سینما کے متعلق تمام غلط بیانیوں کی تردید کرے۔ اور سینما کے مخالف پروپیگنڈہ کی دھجیاں اُڑائے۔

جس وقت یہ پرہ کا پرہ بڑی بیگم کے حضور میں پہنچا ہے تو وہ خود حیران تھیں کہ آج یہ سب بلائیں ایک ساتھ اُن کے سر پر کیوں نازل ہو رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کی علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد ایک نے دوسری کی صورت دیکھنا شروع کر دی۔ ہر ایک یہی چاہتی تھی کہ ابتدا کسی دوسری کی طرف سے ہو اور وہ بعد میں بولے۔ ایک دوسری کو اشاروں ہی اشاروں میں بولنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ لیکن خود کچھ کہنے کی کسی کو ہمت نہیں تھی۔

خدا خدا کرکے محمودہ نے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے کہا "دادی جان! آپ گھر میں بیٹھے بیٹھے بھی گھبرا جاتی ہوں گی نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ نہ سیر نہ تفریح، تمام دن گھر کو سنبھالنا ایک ایک کی خبر گیری کرنا۔ آج وہ بیمار ہے تو کل اُس کی حالت خراب ہے۔ ایک جان اور دنیا بھر کے کام!"

بڑی بیگم کچھ بولنے کو ہی تھیں کہ حمیدہ نے جوڑ لگایا "اے ہے ان کی تو کچھ نہ پوچھو دو گھڑی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ دنیا بھر کی فکریں ہی کیا کم ہیں کہ یہ موئی خونچے والیاں، کپڑے والیاں، چوڑی والیاں اور نہ معلوم کتنی والیاں بیچاری کو دم نہیں لینے دیتیں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ....! حمیدہ ابھی یہیں تک کہنے پائی تھی کہ نوشابہ نے گویا اُس کے منہ کا نوالہ چھینتے ہوئے کہا "اے بہن یہ تو جلے پاؤں کی بلیاں ہیں جو کبھی ٹک کر بیٹھنا جانتی ہی نہیں"

بھلا نور جہاں اب کیوں خاموش بیٹھنے والی تھیں جھٹ بول اُٹھیں۔ دادی جان! اگر بُرا نہ مانیں تو کہوں کہ کبھی کبھی تو آپ گھر سے باہر تفریح کو ہو آیا کریں آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔"

بڑی بیگم نے پان کو منہ کے ایک جانب سے دوسری جانب منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"نا بیٹی اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے مگر اس بڑھاپے میں ہم کیا تفریح کریں گے جب ہمارے دن تھے تو ہم نے بھی خوب گل چھرّے اڑا لئے۔ اب قبر میں پاؤں لٹکا کر کیا خاک سیر کریں گے"

نسیمہ نے فوراً ہی پہلو بدلتے ہوئے کہا "آپ کو کسی زمانہ میں گانا سننے کا تو بہت شوق تھا لیکن شائد آپ نے کبھی سینما کے گانے نہیں سنے کیسے میٹھے میٹھے گانے ہوتے ہیں کہ بس روح خوش ہو جاتی ہے"

سلمیٰ نے مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا "اب تو سینما کے قصے بھی اس قدر نصیحت آموز ہوتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ شیطان بھی کوئی کھیل دیکھ لے تو ہمیشہ کے لئے تائب ہو جائے"

رضیہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اور زیادہ نمایاں کرتے ہوئے کہا "نانی اماں، آج کل "مکتی" نامی ایک فلم چل رہی ہے اُف وہ کس غضب کا کھیل ہے کہ مرد تو مرد عورتوں کا یہ حال ہے کہ اوپر تلے گرتی ہیں" "مکتی" کا نام سنتے ہی عذرا کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے اپنی پُر شوق نظروں کو کچھ عجیب ہی ساحرانہ انداز سے بڑی بیگم کی طرف پھیرتے ہوئے کہا "سچ کہتی ہوں دادی جان "کانن دیوی" نے تو اس کھیل میں کمال ہی کر دیا ہے۔ بس سچ مچ اپنی ساجدہ کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ وہی بات چیت، وہی چال ڈھال اور وہی گانا!"

عذرا مشکل سے بات ختم کرنے پائی تھی کہ ساجدہ نے اُس کے زور سے چٹکی لی کہ وہ بلبلا اٹھی۔ بڑی بیگم کچھ کہنے کو ہی تھیں کہ ریحانہ نے جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

تو پھر نانی اماں ایک دفعہ تو یہ کھیل دیکھ لیجئے"

بڑی بیگم نے کسی قدر ترش روئی کے ساتھ جواب دیا "اے ہے

چھوڑو بھی اس ذکر کو۔ کہاں تک سینما کی جان کو روتی رہو گی۔ مجھے تو اس کے نام سے ہی نفرت ہے سوائے بے حیائی کی باتوں کے اس میں اور رکھا ہی کیا ہے؟"

ثریا نے اپنی مخمور آنکھوں کو گویا دو قانونی گواہوں کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا "نہیں دادی جان یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ اب ہندوستانی فلم وہ پہلے جیسے نہیں رہے۔ اب میں آپ سے کیا کہوں۔ ایک مرتبہ چل کر خود اپنی آنکھوں سے ہی جو دیکھ لیجئے پھر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ...... !"

بڑی بیگم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "واہ بی بی واہ! اگر تمھیں پسند ہے تو تم جم جم دیکھو مجھے کیوں کانٹوں میں گھسیٹتی ہو۔ تم تو بس اُنگلی پکڑتے پہنچا پکڑتی ہو ذرا میں نے منہ کیا لگا لیا ہے کہ چلیں ہیں بی بی باتیں بنانے؟"

عذرا نے اپنی مترنم آواز سے ایک مرتبہ پھر تمام مجمع کو مسحور کرتے ہوئے کہا "ہماری زندگی میں چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ معمولی سے معمولی غلط فہمیاں، بڑے بڑے آلام و مصائب کا پیش خیمہ ہو جاتی ہیں۔ پھر حق و ناحق کی کشمکش ہوتی ہے غرضیکہ زندگی کے تمام نشیب و فراز کا عکس ہم ایک مختصر سے پردہ پر اس خوبی سے دیکھ لیتے ہیں کہ زندگی کے تاریک سے تاریک اور روشن سے روشن پہلو پر ہماری نظر پہنچ جاتی ہے۔"

بڑی بیگم نے اپنی پیشانی پر خوفناک شکنیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اے ہے اب تم اپنا لیکچر ختم بھی کرو گی یا میرا تمام مغز چاٹ کر ہی دم لو گی۔ غضب خدا کا۔ اتنی سی جان اور سوا گز کی زبان! تمھارا تو وہی حال ہے کہ بات لاکھ کی، کرنی خاک کی، بیٹی میں نے تو اپنی زندگی کے ستر سالوں میں ایسے ایسے نت نئے سینما دیکھ لئے ہیں کہ ان کے سامنے تمھارے سینما کے جھوٹے سچے قصے کوئی حقیقت نہیں رکھتے؟" بڑی بیگم کے تیور دیکھ کر سب کی سٹی پٹی گم تھی کسی کو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ خدا خدا کر کے بڑی بیگم کی سب سے لاڈلی پوتی ساجدہ نے دوسری لڑکیوں کے اشاروں سے مجبور ہو کر ایک عجیب شاعرانہ انداز سے کہا "تو کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ آج ہماری پیاری دادی جان نے اپنے بچوں کی درخواست کو ٹھکرا دیا؟"

بڑی بیگم نے کچھ عجیب گومگو کے عالم میں ساجدہ کی طرف دیکھا اور پھر گویا اس کشمکش سے پیچھا چھڑانے کے لئے بیحد محبت آمیز لہجہ میں بولیں "بی بی کچھ تو سوچو۔ بھلا دنیا نہیں کہے گی کہ لو بوڑھی گھوڑی لال لگام! اس عمر میں یہ شوق! کیا میں اسی دن کے لئے زندہ رہی تھی۔ اور اگر بفرض محال میں سینما چلی بھی گئی تو تم لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا؟" نجمہ جو ابھی تک خاموش بیٹھی۔ سب کی گفتگو سن رہی تھی نہایت خوش لہجہ میں بولی۔

"نانی جان کیا اب یہ بتلانے کی بھی ضرورت ہے کہ سینما میں آپ کی موجودگی سے ہم لوگوں کو کتنی مسرت ہوگی!"

بڑی بیگم نے نہایت عالمانہ انداز سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ارے مجھے کیوں بناتی ہو۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں۔ میں تم سب کی چالوں سے واقف ہوں۔ آخر کی پرکالہ ہو آتش کی۔ آسمان پر تھگلی لگانا تمھارا ہی کام ہے۔ مجھے بیوقوف بنانے کے لئے سینما لے جانا چاہتی ہو تمھارا تو وہی حال کہ بغل میں چھری منہ پر رام رام ــــ لیکن خیر میں ساجدہ بیٹا کے کہنے سے چلی چلتی ہوں پر زیادہ دیر وہاں ہرگز نہ ٹھہروں گی۔"

رشک سے ہر ایک کی نظریں بی ساجدہ پر پڑنے لگیں اس طرح بڑی بیگم کی رضامندی سے تمام لڑکیاں خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ مگر بڑی بیگم کا لحاظ نہ ہوتا تو شاید ناچنے سے بھی نہ چوکتیں

غرضکہ اُسی روز سینما جانے کی تمام تیاریاں شروع ہوگئیں۔

سہ پہر شام ہی تمام گھر میں ایک کہرام سا مچا ہوا تھا ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ "آج بڑی بیگم سینما جا رہی ہیں" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی بیگم کا سینما جانا بہت بڑے تحیرات عالم میں سے تھا یا یوں سمجھنا چاہیے کہ بڑی بیگم کا سینما پر دھاوا کرنا گویا ہٹلر کا روس پر حملہ کرنے کے مترادف تھا قصہ مختصر یہ کہ خدا خدا کر کے بڑی بیگم کی سواری سینما کے احاطہ میں پہنچی وہاں پہلے ہی سے پورا ایک درجہ عورتوں کے لئے مخصوص کرا لیا گیا تھا۔ خدا کے فضل سے کم و بیش دو درجن عورتیں اور بچیاں اُن کے ساتھ مع مبالغہ چار درجن بچے تھے۔ کچھ دیر تک سینما ہال میں شور و غل کے باعث ایک طوفانِ بے تمیزی برپا رہا۔ لیکن اندھیرا ہوتے ہی جونہی سکرین پر روشنی پڑی تمام ہال میں سکوت طاری ہوگیا۔ صرف عورتوں کے درجہ میں آہستہ آہستہ باتوں کی کچھ بھنبھناہٹ سی سنائی دیتی تھی۔ اس وقت کوئی بڑی بیگم کی نظروں کو دیکھتا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ جس وقت کھیل شروع ہوا تو بڑی بیگم نے پردہ کی طرف بالکل اس انداز سے دیکھا۔ جیسے کوئی جج کسی خون کے مقدمہ کا فیصلہ سناتے وقت ملزم کی طرف دیکھتا ہے۔ بڑی بیگم کے دائیں جانب ساجدہ اور بائیں جانب عذرا بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ محمودہ۔ نجمہ۔ نورجہاں۔ حمیدہ۔ سلمیٰ۔ ریحانہ وغیرہ بھی چاروں طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔

اس وقت بڑی بیگم کی بدحواسیاں قابل دید تھیں۔ اس پر لڑکیوں کی چہ میگوئیاں آگ پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ کھیل کا ابتدائی حصہ یا تو بڑی بیگم سمجھ ہی نہ سکیں یا اگر سمجھیں بھی تو شاید اُن کے نقطۂ نظر سے وہ حصہ نا قابل توجہ تھا۔ اس لئے اُن کو اعتراض کرنے کی ضرورت بھی نہیں پیش آئی۔ لیکن جب ڈرامہ اس حصہ پر پہنچا جہاں آرٹسٹ پریشانت ایک عریاں تصویر بنانے میں منہمک تھے تو بڑی بیگم نے منہ پھیر کر نہایت خشمناک لہجہ میں کہا۔

"اے ہے اس مُردوے کو تو دیکھو جوان جوان چھوکریوں کی تصویریں بناتا ہے اور وہ بھی اس بے حیائی کے ساتھ۔ خدا اس کا منہ کالا کرے ــــ اور اس بے شرم چھوکری کی ناک بھی خدا جانے ہے کہ نہیں۔ کیا مزے سے ٹک ٹک دیکھ رہی ہے۔ سچ ہے اُتر گئی مُنہ کی لوئی تو کیا کرے گا کوئی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ مردوں کے سامنے جوان لڑکی کی نظر نہیں اُٹھتی تھی۔ اور اب تو بی بی وہ زمانہ آیا ہے کہ بارہ برس کی بٹیا اپنے مُنہ سے بر مانگتی ہے (عذرا کی جانب دیکھ کر) کیوں بٹی کیا تم اسی کھیل کی تعریف کر رہی تھیں"

عذرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "دادی جان اسی کا نام تو "آرٹ" ہے۔ اور یہی ایک ڈرامہ کا کمال ہے۔ تعجب ہے کہ آپ اس کو بُرا کہتی ہیں"

بڑی بیگم نے کسی قدر تُرشروئی سے کہا "ارے چھوکری تجھے ہو کیا گیا ہے کہیں تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ــــ بٹی ایسی باتیں نہیں کہتے۔ اس میں بھلا کونسی بات کمال کی ہے۔ بھئی خیر میں جانتی نہیں کہ یہ آرٹ کیا بلا ہے لیکن ہاں اگر اس کو تم آرٹ کہتی ہو تو خدا اُس آرٹ سے بچائے جس میں انسان اپنی شرم و حیا کو خیرباد کہہ دے"

اِدھر تو بڑی بیگم آرٹسٹ کی جان کو رو رہی تھیں اُدھر آرٹسٹ کے خسر صاحب اور ان کی لڑکی یعنی آرٹسٹ کی بیوی صاحبہ تشریف لے آئیں یہ لوگ آرٹسٹ کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ یہ دیکھ کر بڑی بیگم کو قدرے اطمینان ہوا کہ ابھی دنیا میں اُن کے ہم خیال لوگ بھی موجود ہیں۔ کچھ دیر کے بعد میر دادر سرونٹ کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:۔

چترا :- (پرشانت کی بیوی) ہاں تمہارے جیسا آدمی انسان کو دکھ ہی دینا جانتا ہے۔

پرشانت :- کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔

چترا :- یہ سب کچھ تو میں جانتی نہیں، میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں یا آرٹ کو؟

پرشانت :- پھر وہی فضول باتیں!

چترا :- میں تمہاری باتیں نہیں سننا چاہتی!

پرشانت :- میں تمہیں نہیں جانے دوں گا!

چترا :- میری خوشی نہ ہو تب بھی۔

پرشانت :- ہاں میری خوشی ہی تو تمہاری خوشی ہے۔ تم میری استری ہو، تم میری ہو۔ میرا دُکھ سُکھ تمہارا دُکھ سُکھ ہے میری دنیا ہی تمہاری دنیا ہے!

چترا :- (حقارت آمیز مسکراہٹ سے) اوہ یہ تمہارے خیالات ہیں!

پرشانت :- ہاں! اور صرف میرے ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے سوامی اور استری کا یہی رشتہ چلا آرہا ہے۔

چترا :- اِس ترقی کے زمانہ میں تمہیں ایسا کہتے شرم نہیں آتی!

پرشانت :- نہیں! اگرچہ تمہارے بزرگوں نے یونیورسٹی کی ڈگریاں نہیں حاصل کی تھیں پھر بھی وہ مسرت کے ساتھ زندگی بسر کرنا جانتے تھے۔ اپنا گھر تباہ کرکے بھٹکتے نہیں پھرتے تھے اس کے علاوہ عرصہ تک انسانی تہذیب برائیوں کی نظر فریبیوں میں محو ہو کر خوابِ غفلت میں پڑا رہا لیکن پھر آنکھیں کھل گئیں نیک و بد کی تمیز ہوگئی۔ اِس طرح یہ تمہاری نئی روشنی والی تہذیب کا فریب بھی ایک دن اپنے اصلی روپ میں نظر آجائیگا!

اس گفتگو کو سننے کے بعد بھلا بڑی بیگم کہاں خاموش بیٹھ سکتی تھیں فوراً ہی تو کھل پڑیں۔ وہ تو خیریت سے کھیل کے درمیان وقفہ ہوا تو بڑی بیگم کو بہت کچھ کہنے کا موقعہ مل گیا انھوں نے تہذیب جدید کی خوب ہی تو بھتی بیچی۔ نہایت غصہ سے بھر کر بولیں:-

"لو بی بی سُن لو! یہ بھی وہی کہتا ہے جو ہم کہتے تھے کیا اب بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں گی۔ ہم بڑھیوں کی بات تو تم کو بھلی نہیں معلوم ہوتی تھی اب خدا نے سینما کی زبان سے سُن لو۔ مگر تمہارا تو وہی حال ہے کہ آنکھوں کے آگے ناک سوجھے کیا خاک! تم کو تو بس اپنے مطلب کی سوجھتی ہے۔ بچو! جب سے یہ انگریزی تعلیم ہندوستان میں آئی ہے اور ہم نے اپنی تہذیب اور معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی تہذیب میں رنگ جانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں سے گئے پانڈے حلوا ملا نہ مانڈے!

مردوں نے تو انگریزوں کی ریس کرکے اپنی لٹیا ڈبوئی ہی تھی۔ لیکن عورتوں نے بھی اُن کی دیکھا دیکھی اپنی مٹی پلید کرلی۔ اونٹ تو رختے تھے مکڑی بھی دغنے آئی!

پھر ہماری عقلمندی ملاحظہ ہو کہ اچھی اچھی باتوں کو تو ہم نے چھوڑ دیا۔ اور بُری بُری باتیں ہم نے اُن سے سیکھ لیں۔ ہم انگریزوں کو خوش کرنا چاہتے تھے مگر خود اُن کی نظروں میں ذلیل ہوگئے۔ ہم جاہل تو تھے ہی اُس پر یورپ کی تہذیب نے ہم کو کہیں کا نہ رکھا وہی مثل ہوئی کہ ایک تو تھا دیوانہ تس پر آئی بہار! بس پھر کیا تھا آپے سے باہر ہوگئے۔ لیکن بی بی یاد رکھو اونچے سے گرا سنبھل سکتا ہے نظروں سے گرا نہیں۔ اب تم لاکھ اپنے کو بے گناہ ثابت کرو تو کیا ہوتا ہے۔ بھیڑیا کھائے تو نہ کھائے تو منہ لال!

تم نے انگریزوں کا لباس پہن کر اور چہرہ پر رنگ روغن مل کر اُن کی سی صورت تو بنالی لیکن اُن کے سے گُن اپنے اندر نہیں پیدا کئے

تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ جن میں چمک نہیں وہ سب کنکر ! لیکن اب تم کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جادو وہ' جو سر پر چڑھ کر بولے ! یہ تو تمھارا حال ہے اُس پر مردوں کو بُرا بھلا کہنے میں تم سب سے آگے ہو حالانکہ نہ وہ تمھاری سنتے ہیں نہ تم اُن کی ـــــ بس یوں سمجھو کہ اندھا گونگے بہرہ بجانے والا معاملہ ہے ! تم خود بتاؤ کہ آخر انگریزی تعلیم نے تمھارے دماغ کے کتنے طبق روشن کر دیئے ؟ تم میں سے کتنی عورتیں ایسی ہیں جنہوں نے تعلیم کو فیشن کی غرض سے نہیں بلکہ اپنی بہنوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے حاصل کیا ہے ؟ تم نے تو تعلیم سے صرف یہ سیکھا ہے کہ سر کے بال کٹوا کر چہرہ پر پاؤڈر، ہونٹوں پر سرخی مل لی اور پھر جا و بیجا انگریزی کے الفاظ بول کر لوگوں پر اپنا رعب قائم کرنا شروع کر دیا۔ ذرا سی انگریزی کیا پڑھ لی کہ بس اترانے لگیں بقول کسے اوچھے کے پاس تیتر، باہر باندھوں کہ بھیتر ! یہ ہے تمھاری انتہائی ترقی۔ تم اپنے چہرے پر لاکھ رنگ و روغن کر لو۔ پر وہ کھال بدل سکتی ہے۔ جس پر غلامی کی پھٹکار برس رہی ہے۔ تم اپنی پیشانی سے کلنک کے اُس ٹیکہ کو کیوں کر نکال سکتی ہو۔ جس پر جہالت کی مہر لگی ہوئی ہے !

میں کہتی ہوں کہ آخر ایسے حُسن سے کیا حاصل جس سے ہم اپنی اصلیت کو بھول جائیں بھاڑ میں جائے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ مگر تمھارا تو وہی حال ہے کہ ننگی نہائے گی تو نچوڑے گی کہاں ! ـــــ خیر بہت جلد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کاٹھ کی ہنڈیا ایک ہی دفعہ چڑھتی ہے "

بڑی بیگم ابھی تک کہنے پائی تھیں کہ تمام ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ اور پھر کھیل شروع ہو گیا جب وہ ناظروں کے سامنے آیا جس میں پہاڑی جھرنا نے آرٹ " بھشاشا " کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کی چالیں شروع کر دیتا ہے مگر ـ پھر ڈر رہا گیا۔ اور بس یکدم برس ہی تو پڑیں۔

" اے ہے یہ عورت ہے یا کوئی بلا۔ اس بیچارے کے پیچھے یوں ہاتھ دھو کر پڑی ہے کہ توبہ ہی بھلی اور باتیں سنو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بیچاری کچھ جانتی ہی نہیں بالکل بھولی رکھی ہے۔ جبھی تو مردوں نے کہا کہ بھیڑ کی لات کیا اور عورت کی بات کیا ! ایسی ہی عورتوں نے تو ہماری جنس کو بدنام کیا ہے۔ ایک مچھلی تمام تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ اللہ رے تیرا سید ھاپا۔ دیکھنے میں تو کیسی بھولی سچی معلوم ہوتی ہے اور پیٹ میں پگن بھرے ہیں۔ سچ ہے آدمی جانے بسے سے اور سونا جانے کسے سے۔ لیکن بے حیائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ غیر مردوں کے ساتھ ایسی پیار و محبت کی باتیں ! اسی لئے تو کہتی ہوں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔

اس پر بی صاحبہ کے نخرے ملاحظہ ہوں مگر مردوا بھی چھا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بات تو یہ ہے کہ آنکھ نہیں جس کی ساکھ نہیں آ سکی، بی بی کی شرم و حیا کا تو یہ حال ہے اس پر مردوں سے وفا کی اُمید رکھتی ہیں۔ جب اپنے ہی دام کھوٹے تو پرکھنے والے کا کیا دوش ؟"

اس اثنا میں محمودہ نے بڑی بیگم کی توجہ ڈرامہ کی طرف دلائی ڈرامہ کی ہیروئن چترا اپنے ہونے والے شوہر بی پول سے باتیں کر رہی تھی جو اُس کے سابقہ شوہر یعنی آرٹسٹ سے بدگمانی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں کے درمیان حسب ذیل مکالمہ ہوا۔

بی پول : ـ چترا اُس کا خیال کرنا بھول ہے وہ ایک آوارہ آدمی تھا۔ اُس کی کونسی بات اچھی تھی جس کے لئے تم محبت کرتی ہو۔

چترا : ـ میں کہتی ہوں کہ اُس کی کونسی بات بُری تھی ؟

بی پول : ـ اُس نے تمھاری دلجوئی نہیں کی۔

چترا : ـ وہ سمجھتے تھے کہ میرا دل اور اُن کا دل ایک ہے اس لئے

دلجوئی کی ضرورت نہیں ہے۔

بی پول:۔ اُس نے کبھی تمہاری دیکھ بھال نہیں کی۔

چترا:۔ وہ جانتے تھے کہ میرا فرض اُن کی دیکھ بھال کرنا ہے!

بی پول:۔ اُس نے اپنا کوئی فرض ادا نہیں کیا۔

چترا:۔ وہ محبت سے ہر فرض ادا کردیتے تھے!

بی پول:۔ وہ تمہارے کہنے پر بھی نہیں چلتے تھے۔

چترا:۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ سوامی ہیں اور میں ان کی استری۔

بی پول:۔ وہ تمہاری ذلت اور مار پیٹ کرتے رہتے تھے۔

چترا:۔ وہ سمجھتے تھے کہ خود اپنے ہی جسم کو اذیت پہنچا رہے ہیں۔

بی پول:۔ خیر سب کچھ تو میں جانتا نہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کروگی یا نہیں؟

چترا:۔ ضرور ضرور کروں گی۔ میرے شادی نہ کرنے کی کوئی وجہ تو ہو ہی نہیں سکتی۔

پڑھی لکھی ہوئی نئی تہذیب کی روشنی نے میرے تمام تاریک اصولوں اور بُرے رسم و رواج کو دور کردیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ولایت ہو آئے ہیں اور آپ کے پاس دولت بھی ہے۔ ایسی حالت میں اگر شادی نہ کروں تو شرم سے سماج میں مُنہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گی؛

یورپ کی عورتوں نے ہندوستانی عورتوں کے سوامی کیلئے اندھی محبت کو کنیزانہ ذہنیت کہا ہے۔ ہندوستانی رسموں کو بُرا بھلا کہا ہے۔ ہم لوگ اگر آج اُن کی اندھی تقلید نہ کرسکے۔ اُن کے قدم بقدم نہ چلے تو پھر نئی تہذیب اور نئی روشنی کے دلدادہ کیونکر کہلائینگے؟

گفتگو سُن کر بڑی بیگم نور آہی بول اُٹھیں:۔

" لو بی بی اور سنو۔ خود اپنی ہی جیسی لڑکی کی زبان سے اپنا کچا چٹھا سُن لو۔ کیا اب بھی شوہر پر حکومت کرنے کے خواب دیکھو گی۔ پہ سچ ہے ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ مردوں نے تم کو اس لئے تعلیم نہیں دلائی کہ تم ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ جس ہتھیار سے تم ان کو مارنے کی فکر میں ہو وہی تمہارے سر پر آگرے کیا تم نے نہیں سنا کہ آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے اچھو! اب بھی سنبھلنے کا وقت ہے اگر چاہو تو سیدھی راہ پر آجاؤ۔ کام وہ کرو جس سے دن بھلا ہوں۔ میں تو پھر یہی کہوں گی کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو اُسے بھولا نہ کہو اگر تم نے اب بھی کچھ نہ سمجھا تو پھر تم کو خدا سمجھے "

بڑی بیگم یہیں تک کہنے پائی تھیں کہ دھماکہ کی آواز سے وہ چونک پڑیں۔ نظر اُٹھا کر پردے کی طرف جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھی کا شکار کھیلا جارہا ہے۔ بڑی بیگم نے سہمی سہمی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:۔

" اے ہے یہ شکار بھی کیا بڑی لت ہے۔ غریب جانور کی جان گئی اور میاں کی تفریح ہوئی۔ آگ لگے ایسی تفریح کو" کچھ دیر تک بڑی بیگم نہایت خاموشی سے کھیل دیکھتی رہیں لیکن جب تماشا کا آخری منظر نظروں کے سامنے آیا تو وہ بے چین ہو گئیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آرٹسٹ پرشانت نے اپنی بیوی چترا کی جان بچانے کے لئے خود اپنی جان دیدی۔ اُس کے آخری جملے یہ تھے:۔

چترا:۔ کہو پرشانت! یہ ناز تم نے کس پر کیا؟

پرشانت:۔ کسی پر بھی نہیں میرا ناز اُٹھانے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ چترا! تم نے آزادی چاہی تھی نا؟

چترا:۔ نہیں!

پرشانت:۔ ہاں تم نے نہیں بھی چاہی تھی تو تمہاری تہذیب نے چاہی تھی! تمہاری تعلیم نے چاہی تھی!! تمہارے اصولوں نے چاہی تھی!!! یہ کہہ کر پرشانت وہاں چلا جاتا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا سب حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور تماشہ ختم ہو جاتا ہے۔

بڑی بیگم اس کھیل سے کافی متاثر ہوئیں اور اُنھوں نے وعدہ کیا کہ:

* آئندہ بھی اگر ایسا ہی کوئی کھیل آیا تو وہ ضرور ضرور دیکھیں گی!۔ فقط

خاص

طنزِ لطیف

از حضرت ادیب مالیگانوی

غم دے کے، غمگسار ہوئے بھی تو کیا ہوئے
تڑپا کے بیقرار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

کرنا تھا داغ بن کے کسی دل میں روشنی
شمعِ سرِ مزار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

سینے میں دل کے نام سے اب خاک بھی نہیں
اب آپ شرمسار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

ہونا تھا آپ اپنے چمن میں شگوفہ کار
شرمندۂ بہار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

مٹتے کسی کے عشق میں اے دل تو بات تھی
بربادِ روزگار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

دل بھی ہے پاش پاش، سفینہ بھی پاش پاش
طوفانِ غم سے پار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

ویرانیاں دیارِ محبت میں ہیں وہی
تم ابرِ غیرتِ بہار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

آنکھیں ہزار ذوقِ تماشا بھی ہوں کہیں
ایسے میں آشکار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

ہیں سرنگوں ہنوز، تمھارے نیازمند
تم اہلِ اختیار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

ہنس ہنس کے بیکسی کا اڑانا ہے مضحکہ
رو رو کے کامگار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

ہے سامنا فریبِ محبت کا ہر قدم
اک ان سے ہوشیار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

برہم اگر سکونِ دو عالم نہ ہو سکا
یوں حسن پر نثار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

ہے زندگی ادیب کی اب بھی حجاب میں
ہم اس کے رازدار ہوئے بھی تو کیا ہوئے

جواہر ریزے

از جناب محمد عمر صاحب صدیقی

نپولین کا قول تھا کہ خدا ہمیشہ قوی ترین فوج کا طرفدار ہوتا ہے وہ ہمیشہ چست، مستعد، مستقل مزاج اور پکے ارادے کے آدمی کی حمایت کرتا ہے۔ اگر ہم اُن آدمیوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں جو خوش نصیب کہے جاتے ہیں، تو ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ اُن کی کامرانی کا راز غربت و پستی پر اُن کی فتح مندی، اور ان کی ان تھک کوششوں میں مضمر ہے خوش نصیب آدمی بدنصیب آدمی کی نسبت زیادہ صائب الرائے اور ذہین و طباع ہوتا ہے۔ اُس کا فیصلہ زیادہ درست اور متوازن ہوتا ہے اُس میں ترتیب و تنظیم کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے دماغ کا عمل صحیح اور پختہ ہوتا ہے وہ زیادہ منطقی طریقہ پر سوچتا ہے۔ زندگی اتفاقات کا کھیل نہیں ہے۔ خالق کائنات نے ہم کو محض زمانے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیا ہے کہ ہم اس کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح گرتے پڑتے رہیں۔ اور ہماری کوششیں فضول اور لغو ہوں۔

یہاں کوتاہیٔ ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

+

فاتح ہمیشہ ابتدا ہی سے فتح مندانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔

+

ہماری مذہبی کتابوں میں عاجزی، انکساری، خاکساری کمتر بینی کے خیالات کثرت سے داخل کر دیئے گئے ہیں اور ہمارے مزاجوں میں قدم بوسی، کورنش، عجز اور رفتادگی بہت زیادہ راسخ ہو گئی ہے آدمی اس لئے نہیں پیدا کیا گیا تھا کہ وہ ذلت و پشیمانی کے ساتھ اپنے سر کو جھکائے بلکہ اُس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اظہار الوہیت کے لئے وہ بنایا گیا تھا۔ متوازی تاکہ ہر چیز کو ایک وقار کے ساتھ دیکھے خواہ وہ اُس کا خالق و معبود ہی کیوں نہ ہو۔

+

ایک شخص کے لئے یہ بدترین بات ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی یہ بٹھا دے کہ وہ بدقسمت پیدا ہوا ہے۔ اور تقدیر اس سے برگشتہ ہے۔ ہماری ذہنیت کے علاوہ کوئی تقدیر نہیں ہے۔ ہم خود اپنی قسمت ہیں۔ ہم اپنے مقدر کے کارساز ہیں ہم اپنی تقدیر کے معمار ہیں۔

+

کوئی شخص خوش حال نہیں ہو سکتا۔ جب کہ اس کی توقعات افلاس سے وابستہ ہیں۔ ہم کو وہی ملتا ہے جس کے ہم متوقع ہیں۔ اور عدم توقع عدم استحصال ہے۔

+

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"

+

ہمت، استقلال اور خود اعتمادی کا جذبہ حصول کامرانی کے لئے بجلی کی سی طاقت رکھتا ہے۔

مسمٰی تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی نمبر ۳ سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ رسالہ تنویر تھرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸ سے شائع کیا۔

اللہ میاں کے نام ایک خط!

"ابلیس لاج"
دوزخ

از عزیزہ حمیدہ الیاس صاحبہ

محبوبِ جفاشعار!

اُف..... کیا بتاؤں کہ میں تجھ سے کس قدر محبت کرتا ہوں مگر تو ہے کہ تجھ پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا...... آخر تو مجھ سے کیا چاہتا ہے......؟ میں تو تجھ سے صرف رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہوں...... تیری ایک نگاہِ مہر پر سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہوں.... میں نے تیرے تمام مظالم سہے..... ہر ذلت برداشت کی..... تمام جفاکشی جھیلی ...... تو نے مجھے بڑی بے رحمی سے ٹھکرا دیا..... آخر میرا ایسا کون سا قصور تھا......؟ جس کی کہ مجھے تو نے یہ سزا دی......؟ تیرا ہی تو حکم تھا کہ میرے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکاؤ اور کسی کی میرے برابر تعظیم مت کرو.....؛ جب کہ تیرے سوا غیر کے آگے سر جھکانا گناہ میں شامل ہے تو کوئی کیوں کر وہ حرکت کر سکتا ہے......؟ تو ہی بتا کہ جب میں تیری ہر ادا ...... ہر آن..... ہر ادنیٰ سے کرشمے پر جان نثار کرنے کو حاضر ہوں پھر بھلا میں یہ کیوں کر اور کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ تیرے سوا کسی اور کی تعظیم کی جائے اور میرا سر کسی اور کے آگے جھکے......؟ یہ کیسے ممکن تھا...؟ اس میں میرا کیا قصور ہے.....؟ تو نے ہی تو میرے دل میں تیری محبت کا ایک بے پناہ سمندر موجزن کر رکھا ہے...... ہر جاندار کے دل کو تو نے محبت کے لطیف جذبے سے معمور کیا ہے...... ہر انسان کو تو نے اختیار کلی دے رکھا ہے کہ وہ جو چاہے کرے..... جب انسان تیری بنائی ہوئی چیزوں سے محبت کرتے ہیں۔ تو پھر اگر میں نے خود تجھ سے محبت کی تو کون سا گناہ کیا......؟ جب انسان کسی خوبصورت ہستی کو دیکھتا ہے...... یا گلاب کے ایک خوبصورت پھول کو...... تو وہ بے اختیار ہو جاتا ہے..... اور گھنٹوں اسی مجسمۂ حسن کی تعریف میں ہمہ تن معروف رہتا ہے..... مگر یہ تو تیرا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے..... تیرے حسنِ دلفریب کا ایک کروڑواں حصہ بھی ان میں موجود نہیں...... لیکن میں تو تیرے شمعِ حسن کا پروانہ ہوں...... تو نے انسان کو پیدا کیا..... ان کے سینہ میں دل..... اور دل میں امنگ۔ حسرت۔ آرزو..... محبت..... جیسے لطیف جذبات بھر دیئے..... تو ان کو راہِ راست کی طرف لیجاتا ہے اور تو ہی ان کو آزمائش کے کانٹوں میں گھسیٹتا ہے..... تو سب چیزوں پر قادر ہے..... تو ہی سب کچھ کرتا ہے..... تو پھر تو کیوں لوگوں کو گناہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے......؟ اور اگر گناہ بھی تیرے ہی حکم سے ہوتے ہیں تو پھر ان گناہوں کی سزا بندے کو کیوں دیتا ہے......؟ تو نے انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ تو جیسا چاہے ان سے سلوک کرے..... وہ بیچارے تیری نظروں میں ایک کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے...... تیری مثال اس بچہ کی طرح نہ ہونا چاہیئے جو کھلونوں سے کھیلتا ہے..... جو انتہائی شوق سے اپنے ہاتھوں سے تمام کھلونے جما کر ایک عالی شان محل تیار کرتا ہے..... مگر پاؤں کی ایک ٹھوکر سے تمام کھیل بکھیر دیتا ہے..... وہ تو ایک کمسن بچہ ہے.... ناقص العقل ہے..... مگر تیری تو یہ شان نہیں...... تجھے لازم نہیں

کہ تمام چیزیں مخلوق و آرزو سے بنائے ..... اور پھر کون کی آن میں تمام
بنا بنایا کھیل بگاڑ دے ..... ؟ جب تو انسان کو ہر بُرائی سے روکنا چاہتا
ہے تو پھر تو نے دنیا میں بدی پیدا ہی کیوں کی ..... ؟ تو ان کے دلوں
میں ایسے جذبات کیوں ڈالتا ہے جو ان کو بدی کی طرف مائل کرتے
ہیں ..... اور ان کو راہِ راست سے ہٹا کر گمراہ کرتے ہیں ..... ؟
اور پھر ان کے تمام بُرے افعالوں کا الزام تو میرے سر تھوپ دیتا
ہے ..... ! مجھے بھی تو تو نے ہی لعنت کا طوق عطا کیا ہے ....
تیری ہی نوازش سے میں "ابلیس" کے درجہ کو پہنچا ..... ! بس کیا میری
تمام جاں فشانی اور محبت کا تو نے یہی صلہ دیا ..... ؟ اور پھر تیرا تو یہ دعویٰ
ہے کہ "میں کریم ہوں ..... رحیم ہوں ..... جو محبت کہ ایک ماں کو اپنی
اولاد سے ہوتی ہے وہ میری محبت کا صرف ایک حقیر حصہ ہے ... یعنی میں
اپنے بندوں پر ماں باپ سے زیادہ شفیق و مہربان ہوں .... ماں تو
اپنے بچہ کی برائی نہیں دیکھتی ...... وہ تو محبت میں دیوانی ہوتی ہے .....
اس کی آنکھوں پر مامتا کے پردے پڑ جاتے ہیں ...... اور اس کو اپنے
بچہ کے تمام عیب ہنر دکھائی دیتے ہیں اور اگر بچہ سے قصور بھی ہو جاتا ہے
تو ماں اسے فوراً معاف کر دیتی ہے ۔ لہٰذا تو ان کو دوزخ کی آگ
میں کیوں کر جلا سکے گا ؟ خود انسانوں کے لئے تیرا کہنا ہے کہ "میں مشرک
کو کبھی نہ بخشوں گا" میں مشرک کا سب سے بڑا مخالف ہوں میں تیرا مرتبہ کسی
کو دینا گوارا نہیں کر سکتا لیکن تو یہ بھی برداشت نہ کر سکا کہ میں نے
تیری محبت میں دیوانہ ہو کر ...... تیرے عشق کا سودائی بن کر تیرے
حکم کی تعمیل سے انکار کیا ...... ؟ تجھے تو چاہئے کہ اپنے بندوں پر
رحم و کرم کرے .... اور ان پر بخشش کے موتی لٹائے .... گناہ گار
بندے ہی سب سے زیادہ رحم کے مستحق ہیں ..... مگر تو نے تو مجھے وہ سزا
دی ہے کہ تمام دنیا مجھ سے پناہ مانگتی ہے .... تو نے ہی مجھے اس
بات پر آمادہ کیا ہے کہ میں تمام لوگوں کو بہکاؤں ... اور ان کو برائی
کی طرف مائل کر کے راہِ راست سے بھٹکائے جاؤں ..... میں تو جذبۂ
رقابت میں انسان کو جس بُرے نتیجے تک پہنچاؤں کم ہے ..... مگر تجھے
بھی تو اپنے بندوں کی پروا نہیں ...... تو نے میری محبت کو ٹھکرا دیا
مگر میں پھر بھی اپنی سچائی اور وفاداری پر قائم ہوں .... کس تندہی سے
میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوں .... گو تو نے مجھ پر سراسر ظلم
کیا ..... میرے سپرد وہ کام کیا ہے جو کوئی انسان بھی اپنے ذمہ نہ لیتا .....
لیکن میری محبت کو دیکھ کہ ایسے بُرے کام کو بھی بلا چون و چرا کئے جا رہا
ہوں ...... کیا مجال جو زبان پر لفظ شکایت آ جائے .... پھر کیا وجہ
ہے کہ تو میری طرف نظرِ التفات نہیں کرتا .... کیا تو صرف ریاکاری
اور جھوٹے سجدوں پر مرتا ہے ..... ؟ کیا تو صرف دغابازی اور دروغ گو کی
تسبیح پر فدا ہے ..... ؟ کیا تو آج کل کے جھوٹے اور لغو پیر فقیر اور مولویوں
کا شیدائی ہے ..... ؟ جن کا ظاہر کچھ اور ہے اور باطن کچھ اور ... ؟ شائد تو
بھی جھوٹی محبت کو پسند کرتا ہے ...... تو بھی ان دغابازوں کی سفید ریش اور چکنی
چپڑی باتوں میں بہل جاتا ہے ... تو ان کے فریب میں آ کر سچی محبت کو
ٹھکرا دیتا ہے ۔ تیرے وہ چہیتے بندے جنہیں تو نے "اپنے نائب" کے ممتاز
خطاب سے نوازا ہے دیکھ کہ آج کل قبیح برائیوں، قتل و غارت گری اور فتنہ
و فساد میں کسی طرح مجھ سے کم نہیں رہے ۔ میرا تو صرف ایک ہی گناہ ہے کہ تیری
محبت میں ہی تیرے اُس حکم کی تعمیل سے انکار کیا جو میرے رقیب "انسان" کا رتبہ
بڑھاتا تھا جو میرے تیرے درمیان حد فاصل بن گیا تھا ۔ خیر میں بھی دیکھوں گا
کہ آخر تو یہ بے نیازی کب تک روا رکھے گا .... میں بھی تمام مظالم سہنے کے
لئے کمربستہ ہوں .... آخر میری محبت بھی تو کوئی چیز ہے ۔۔ وہ ضرور رنگ
لا کے رہے گی ؎ ہم بھی دیکھیں گے پلٹتی ہیں نگاہیں کیوں کر

غیر کرتے ہیں میری طرح سے آہیں کیوں کر

اور میں ضرور تجھے پا لوں گا .... اب اجازت چاہتا ہوں ۔ گستاخی معاف !

فقط عاشقِ دلگیر "شیطان"

ہر دل عزیز "اردو"

از حضرت علامہ احمد شبلی صاحب

یہ اُردو بھی عجب شیریں زباں ہے فصاحت جس کے لفظوں سے عیاں ہے
بتاؤ تو لغت ایسی کہاں ہے کہ جس میں ہر زباں کا کچھ نشاں ہے
نکل کر فوج سے شہروں میں آئی
ترقی تھوڑے ہی عرصے میں پائی

تھے اس کے قدر داں ہندو مسلماں ہر اک شعبے میں تھی اردو نمایاں
اور اس کے تھے مفتون سخنداں بلاغت اس کی تھی مقبول دوراں
مگر اک فرقے کی اب یہ ہے کوشش
مٹانے کی اسے کرتا ہے سازش

بنائی جاتی ہے بولی نئی اب کہ جس میں گفتگو کرنے لگیں سب
مگر در اصل ہے اس سے یہ مطلب مٹا دیں ہند سے اردو کی ڈھب
زباں ہرگز نہ وہ نابود ہوگی
کہ جس میں زندگی موجود ہوگی

عرب اور شام، انگلستان و ایران بلوچستان اور توران و افغان
ممالک روس، اور چین و جاپان غرض جس جا پہ جانے کا ہو امکاں
تمہیں کوئی نہ کوئی اس زباں کا
وہاں پر بولنے والا ملے گا

مرہٹی اور گجراتی زباں کا فقط ان کے ہی خطے میں ہے چرچا
تلنگی بولی جاتی ہے اُسی جا جہاں بستی ہے اس بولی کی پرجا
مگر اردو زباں وہ بے وطن ہے
ہر اک پردیس میں اس کا چلن ہے

خوشا وہ حامی و انصار اردو — مسلماں ہوں، کہ ہوں غمخوار ہندو
رہیں اس سے نہ غافل اک سرِ مو — اشاعت اس کی کرتے جائیں ہر سو

کہ یہ بھی زندگی پائے دوامی!
نہ واقع ہو کہیں اس میں بھی خامی

مجھے افسوس آتا ہے انہی پر — جنھیں اُردو سے ہے نسبت سراسر
گھروں میں جن کے تھی اردو ہی یکسر — وہی اس کے مخالف اب ہیں اکثر

"من از بیگانہ گاں ہرگز نہ نالم"
مسلمانوں ہی سے شکوہ ہے ہردم

حیاتِ ہند ہے اردو کے دم سے — ہوا مشہور ہند اس کے قدم سے
اسے کیا واسطہ دیر و حرم سے — ہے مشترکہ زباں اپنے جنم سے

جو سچ پوچھو تو اردو ہی زباں ہے
کہ بھارت جس سے معروفِ جہاں ہے

جنھیں اردو سے ہے بے جا عداوت — مٹانی چاہتے ہیں اس کی شہرت
محض اس واسطے ہے اس سے نفرت — کہ ہے قرآن سے اردو کو نسبت

مگر اردو کا ہے اللہ، والی
کسی صورت نہیں یہ مٹنے والی

"تنویر" کیلئے

"شعاعیں!"

از: محترمہ عندلیب صہبا لکھنوی

"حقیقی نجات!"

خواہ وہ کیسی ہی ہو۔ لیکن — میں سمجھتا ہوں کہ — حقیقی نجات، صحیح راہ عمل کے اختیار کرنے ہی میں ہے! مہربان قلوب، سچی محبت، ہمدردی و خلوص — دنیا کی افضل ترین۔ چیزیں ہیں — ان کے سامنے — تاج و تخت بھی — لایعنی ہے!

"شمیم"

"حیات جاوید"

ہمارے نیک اعمال، ہم کو حیات جاوید بخش سکتے ہیں — خواہ ہماری زندگی کے ایام، مختصر ہی — کیوں نہ ہوں ہم جذبات، احساسات اور خیالات کی دنیا میں، اپنا مسکن بنا سکتے ہیں — دائمی اور مستقل — !! محض نیے "حسن عمل" سے اللہ کی دھڑکن کے ساتھ — ہیں — وقت کا اعتبار کرنا چاہیے! جذبات وہ قلب ہے صحیح راہ عمل پہ گامزن ہوتا ہے! اور جس کے خیالات — نہایت ارفع و اعلیٰ ہیں — وہی — زیادہ زندہ رہتا ہے!

"پی۔ جے۔ جیلی"

افسانہ

قربانی

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ملک میں آزادی کے لئے جوش اپنے پورے زور پر تھا۔ جہاں جاؤ نعروں سے سارے شہر گونج رہے تھے۔ نوجوانِ ہند کے دل بلیوں اُچھل رہے تھے۔ اور آزادی بالکل نزدیک ہی معلوم ہوتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ملک میں ایک طوفان سا آگیا تھا۔ جس سے نازک بدن کملا بھی محفوظ نہ رہی۔ اُس کے دل میں بھی آزادی کی آگ جلنے لگی۔ وہ متوالی ہوگئی۔ گھر بار کی سُدھ نہ رہی۔ اُسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اُس کا خاوند جو سرکاری ملازم تھا اُسے کبھی اجازت نہ دے گا۔ لیکن اُس کے دل میں تو جوش اور اُمنگیں تھیں۔ اُس نے سوراج کا جھنڈا ہاتھ میں لیا اور اُسی جگہ آکھڑی ہوئی۔ جہاں آزادی کے متوالے آزادی کے راگ گا رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی نوجوانوں کا جوش دُگنا ہوگیا۔ نعرے بلند ہوگئے اور ان میں سے جو پولیس کے گھیرے خوف کی وجہ سے کھسکنے کی کوشش میں تھے۔ وہ بھی لوٹ پڑے اور نعرے لگانے والوں میں شامل ہوگئے۔

جس جگہ شہد ہو وہاں مکھیاں بھی جمع ہوجاتی ہیں۔ مقناطیس کشش کا مرکز ہے۔ جہاں کملا تھی مست، متوالی۔ وطن پریم سے بے سُدھ وہ نعرے لگا رہی تھی اور ملک کے گیت گا رہی تھی وہیں سب لوگ رکتے تھے۔ وطن کے متوالے بھی اور تماشبین بھی۔ لازمی تھا کہ جہاں بھیڑ ہوجائے وہیں پولیس بھی آئے۔ اُس بھیڑ کو چیرتے ہوئے ایک پولیس انسپکٹر بھی گھوڑا دوڑا آیا۔ اُسی مجمع میں سب کو جوش دلانے والی کملا کو دیکھ اُس کے غصے کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اُس کی بیوی ہی سرکار کے خلاف ہو۔ جس سرکار کے نمک پر وہ پل رہا تھا۔

از کماری پریم لتا صاحبہ گرور بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

کملا کے دل کے دو دیوتا تھے۔ دونوں ہی برابر کے حصہ دار۔ دونوں کے لئے ہی کملا کے دل میں پریم اور عزت تھی ایک تھا اُس کا خاوند رائے جگدیش لعل پولیس انسپکٹر اور دوسرا دیوتا تھا ملک۔ بد قسمتی یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن۔ دونوں میں آپس میں تعاون نہ تھا۔ کملا کسے چھوڑے اور کس کی پوجا کرے۔ وہ ایک دیوتا کی پوجا کر رہی تھی کہ دوسرے دیوتا نے گرج کر کہا۔ کملا یہ کیا۔ کیا تو مجھے نہیں جانتی۔ میں وہ ہوں جو ننگ کی کھال اُتروا دوں۔ اور تیری یہ ہمت کہ جس گناہ عظیم کے لئے میں دوسروں کی سرکوبی کروں۔ وہی ناپاک حرکت تو کرے"!

کملا نے نہایت عاجزی سے کہا "بھگوان! میرے دیوتا۔ میں مجبور ہوں۔ تمہارے لئے میرے دل میں محبت ہے لیکن میں اپنے اس محبوب کو کبھی چھوڑ نہیں سکتی۔ پرماتما کے واسطے مجھے اس راستہ سے مت ہٹاؤ۔ مجھے اس دیوتا کی بھی پوجا کرنے دو۔ اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں بلکہ بھلا ہی ہوگا"

جگدیش بولا "او ہو۔ سامری وطن کی متوالی۔ تیری اتنی گستاخی" یہ کہتے ہی جگدیش نے کملا کی نازک کلائی کو جھٹکے سے کھینچا اور گھسیٹتے گھسیٹتے گھر کی طرف لے چلا۔ کسی کی ذرا بھی ہمت نہ پڑی کہ کملا کو اس کے پنجے سے چھڑائے۔ سب پاگلوں کی طرح دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کملا نے نہایت انکساری سے کہا "ناتھ ایک بات تو سنو۔۔۔۔۔۔۔۔"

لیکن جگدیش نے حاکمانہ لہجہ میں چلتے رہنے کا حکم دیا۔

کملا نے کہا "میری بات نہ سنو گے تو شاید پیچھے بہت پچھتانا پڑے" اس نے

بہتر ہے کہ سُن لو

لیکن جگدیش سُننے والا تھا نہیں۔ وہ تو ڈر رہا تھا کہ سرکار کو خبر ہو گئی تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑ گیا۔ گھو منج کردہ بولا: "کمبخت تو مجھے مٹی میں ملا کر چھوڑے گی۔ نوکری گئی تو تو بھی کھانے پینے سے محتاج ہو جائے گی۔ یہ ریشمی کپڑے، عمدہ فرنیچر، اعلیٰ گھر اور عیش و آرام نہ ہیں گے۔ تو خود تو تباہ ہو گی ہی مگر مجھے بھی تباہ کر دے گی۔ وہ دن کیا اچھا تھا کہ میری قسمت میری شادی تجھ سے ہوئی۔ تو نے کبھی میری کسی پارٹی میں شامل ہو کر میرے دوستوں کو اپنے ہاتھ سے شراب کا ایک پیالہ بھی پیش نہ کیا۔ میں اُن کے گھر جاؤں تو اُن کی تہذیب یافتہ بیویاں کیسے سلیقے سے میری عزت کرتی ہیں۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ہمارے ہمراہ سینماؤں میں جاتی ہیں۔ زندگی کا مزہ تو اُن ہی لوگوں کے لئے ہے۔ اِدھر میں ہوں کہ ہر وقت تیرے دیش کے راگ کان کو کھائے ڈالتے ہیں۔ اچھا اب تو نے اگر گھر سے باہر قدم بھی رکھا تو دیکھ لینا کہ کیسی سخت سزا دوں گا۔"

مسٹر جگدیش لعل کہنے کو تو سب کچھ کہہ گئے۔ لیکن انھیں اپنی بیوی سے دراصل اُنس اور محبت تھی۔ وہ بھی مصیبت میں پھنس گئے تھے اگر بیوی کی خواہشات کی عزت کرتے ہیں تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں اگر عزت نہیں کرتے تو اُن کی محبوبہ کے دل کو بہت صدمہ پہنچتا ہے آخر انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ کملا کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے، کملا کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہ بےفکر ہو گئے اور سمجھے کہ اب کملا پھر ایسی حرکت نہ کرے گی۔

کملا کے دل کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ خاوند کا حکم ماننے یا ملک کی آواز سنے۔ آخر اُس نے یہ ہی فیصلہ کیا کہ اس وقت تو ملک کی دردناک حالت میں ساتھ دینا ہی مقدم فرض ہے۔ چنانچہ وہ دوسرے دن پھر اس مجمع کی لیڈر تھی جو متوالوں کی طرح نعرے لگا رہے تھے اور پولیس کی لاٹھی سے بےخوف ہتھیلی پر جان لئے کھڑے تھے وہ دیش کے گیت گا رہے تھے۔ اور اُن کی کپتان کملا تھی۔

اتنے میں شور و غل مچ گیا اور لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے شروع ہو گئے۔ پولیس نے مجمع پر لاٹھی چلانی شروع کر دی تھی۔ جگدیش لعل بھی بڑھ بڑھ کر ہاتھ دکھا رہے تھے۔ لاٹھی چلاتے چلاتے اُن کا وار ایک عورت پر چل گیا جو پیٹھ کئے کھڑی تھی۔ دھڑام سے زمین پر مُنہ کے بل گر گئی۔ اور مُنہ سے خون کی دھاریں نکلنے لگیں۔ پولیس کپتان لعل نے جب اُس عورت کو سیدھا کیا تو جگدیش لعل کے ہوش اُڑ گئے وہ تو اُن کی اپنی کملا تھی جس پر انھوں نے نادانستہ وار کر دیا تھا جلدی سے زمین پر بیٹھ گئے اور کملا کی نبض ہاتھ میں لے لی۔ لیکن یہ کیا نبض بند تھی۔ کملا کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ سانس آنا بند ہو گیا تھا لیکن اُس کے چہرے پر بےخوفی، ہمت اور شرافت کے آثار ایسے تھے گویا وہ ابھی زندہ ہے۔

جگدیش لعل کی دُنیا لٹ گئی۔ وہ جسے پیار کرتے تھے آج وہ اُن کی اپنی لاٹھی سے اِس دنیا میں نہ تھی۔ جگدیش کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے۔ وہ اپنی محبوبہ کی طرف دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہ ہنستے تھے نہ روتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑے ہو گئے سب لوگ یہ حیران تھے۔ کملا کی موت اپنے خاوند کے ہاتھوں؟ کئی نوجوانوں کے خون کھول رہے تھے۔ کئی تو یہ سوچ رہے تھے کہ اِس پاپی کو بھی اسی کملا کے ساتھ ہمیشہ کے لئے سُلا دیا جائے لیکن قوم کے راہبر کا حکم تھا کہ کسی پر بھی ہاتھ نہ اُٹھانا۔ اس لئے مجبور تھے مجمع میں سے کوئی بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ بالکل سناٹا تھا سوئی بھی گرے تو اُس کی بھی آواز سنائی دے جاتی۔ لیکن یہ کیا جگدیش لعل اپنی وردی اُتار رہے تھے اُن کے چہرے پر سنجیدگی تھی آخر انھوں نے ایک کانسٹیبل کو اپنی وردی۔ ٹوپی اور بید دیتے ہوئے کہا کہ "کپتان صاحب کو یہ سب واپس کر دینا

یہ کہتے ہی اُنھوں نے وہ جھنڈا اٹھایا جو کملا کے ہاتھ میں تھا اور زمین پر گرا ہوا تھا۔ بولے "کملا۔ تیرے نازک اور پاک ہاتھوں کا یہ جھنڈا کبھی نیچا نہیں ہو سکتا۔ یہ اونچا ہی رہے گا۔ اپنے گناہ کی تلافی اور تیرے مقصد کی پاسبانی اب میں کروں گا۔" یہ کہتے ہی اُنہوں نے زور سے نعرہ لگایا "بولو بھارت ماتا کی جے"۔ اس نعرے کے ساتھ سب لوگ شامل ہو گئے۔ اُس دن کا نعرہ شہر والوں کو آج تک یاد ہے۔

پتہ نہیں کملا نے اپنے خاوند کے الفاظ سنے یا نہ سنے لیکن اتنا تو ٹھیک ہے کہ اُس کی روح سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اپنے خاوند کی تبدیلی پر اُس پر پھول برسا رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ کسی کی بھی ارتھی اتنی دھوم دھام سے نہیں نکلی جتنی کے کملا کی کیونکہ وہ اپنے ایک محبوب (خاوند) کے ہاتھوں اپنے دوسرے محبوب (ملک) پر قربان ہو گئی تھی۔

"یہ تھی کملا کی قربانی"

غزل

از جناب روشن اختر صاحب شیکھو

اُن کا معصوم عتاب کیا کہنا　　اُس پہ شرم و حجاب کیا کہنا

موجِ صہبا کی طرح دب دب کر　　وہ اُبھرتا شباب کیا کہنا

مستیاں بن کے چھا گیا ہر سو　　اُن کا کافر شباب کیا کہنا

غیرتِ آئینۂ جمال اُن کا　　رشکِ صد آفتاب کیا کہنا

یہ تجلّی فروش روئے مُبیں　　خرمنِ ماہتاب کیا کہنا

سُرخ شعلے ہیں عارضِ گلگوں　　شعلہ سامانِ شباب کیا کہنا

لبِ لعلیں پہ لرزہ برِ انجام　　خاموشی کا جواب کیا کہنا

کِھل رہے ہیں تمام دل کے کنول　　جلوۂ ماہتاب کیا کہنا

بارہا غم میں مسکرا اُٹھا　　دلِ پُر اضطراب کیا کہنا

ہر متاعِ سکوں سے بہتر ہے　　دولتِ اضطراب کیا کہنا

کس قدر جاں نواز تھا روشنؔ
آرزوؤں کا خواب کیا کہنا

خاص

"مسئلہ تنازع للبقا"

راستہ چھوڑ دو یا آگے بڑھو!

از محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ لدھیانوی

کارگاہ حیات میں مقابلے اور مسابقت کی جاری شدہ شدت کی وجہ سے قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ دنیا میں کوئی فرد یا جماعت ایک سمت پہ قائم نہیں رہ سکتی اسے یا تو آگے بڑھنا یعنی ترقی کرنا ہوگا "یا دوسروں" کے لئے راستہ صاف کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا یعنی قعر ذلت میں گرنا ہوگا۔ انسان کی عمرانی زندگی کے ارتقائی ادوار کلیۃً اسی شدت مسابقہ کے آئینہ دار ہیں۔ اقوام کے جسمانی دماغی اور تمدنی مقابلے سے کوئی زمان و مکان خالی نہیں کہا جا سکتا۔ ہر عنصر و تمدن دوسرے تمدن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے اپنی ذات میں جذب و پیوست کرنے میں حق بجانب ہے۔ ہر کمزور تحریک دوسری تحریک کی ضبط و نظم کے بعد اپنی ہزیمت کے اعتراف کے سوا چارہ نہیں رکھتی یہ بھی صحیح ہے کہ شاہراہ حیات میں آگے بڑھنے یا باقی رہنے کے لئے ماحول سے مطابقت ضروری ہے اور جو لوگ اپنے ماحول سے مطابقت کر لیتے ہیں یعنی اپنے حرکات و عادات و جذبات کو اپنے ماحول کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں فطرت ان کو باقی رہنے کے لئے منتخب کر لیتی ہے لیکن یہ "تنازع للبقا" یا "جنگ مسابقت" مہذب اور متمدن انسانوں کی دنیا میں ضروری نہیں کہ صحیح ثابت ہو کیونکہ انسانوں کی دنیا میں عقل خداداد اور جذبہ رحم کو بھی دخل ہے۔ اس "جنگ مسابقت" یا ڈارون کے نظریہ ارتقا کے یہ معنی نہیں کہ جو لوگ اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی اہلیت یا طاقت نہیں رکھتے ان کو ان کے ناموافق ماحول کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے تاکہ انسانوں کی مجموعی ترقی کی راہ مسدود نہ کر دی جائے۔ گو یہ انتخاب فطرت کا نظریہ صحیح ہے اور قدرت کا یہ عمل ہر زمان و مکان میں جاری رہتا ہے لیکن یہ نظریہ ڈارون کے نظریہ ارتقا یا تنازع للبقا کی دلیل یقیناً نہیں ہو سکتا۔ فطرت یقیناً افراد کو باقی رہنے کے لئے منتخب کرتی ہے لیکن یہ انفرادی انتخاب اس کا مقصد انسانوں کی بحیثیت مجموعی ترقی کے سوا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہماری انفرادی ترقی مجموعی ترقی کی طرف ایک اشارہ ہے۔ لہٰذا متمدن ترقی یافتہ افراد و اقوام حکومتوں اور جمہوری باشندوں کا فرض ہے کہ مسئلہ تنازع للبقا کی حقیقت و روح کو اچھی طرح سمجھیں اور اپنی کامرانی حیات کے نشے میں پسماندہ افراد و جماعات و حیثیت والوں کو ان کے ناموافق ماحول کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں اور اس طرح ہر جگہ زمانہ حیات کو حصول فتح و ظفر کے لئے کافی و وافی مواقع مہیا کرتے ہوئے اپنے مقصد بقا کی تکمیل کریں۔

نیلوفر

از جناب ریاض جنیدی صاحب

میں تنہا گھوم رہا تھا۔ بہکا ہوا سا۔ جو نینیتال کی پہاڑیوں پر گھومتا رہتا ہے۔ ایک دن میں نے ایک زمین نیلوفری تختہ کو دیکھا۔

وہ پھول ایسے ہی چمک رہے تھے۔ جیسے آسمان پر تارے ۔۔۔ وہ بہکا ہوا دلکش طرح تھے جھیل کے کنارے۔ ہزاروں ۔۔۔ میں نے ایک ہی نظر میں انہیں لاکھوں کی تعداد میں دیکھا وہ مستانہ وار رقص کر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے ۔۔۔

جھیل کی لہریں بھی ان کے دوش بدوش رقصاں تھیں ۔۔۔ لیکن ان میں وہ بات کہاں۔ وہ مخمور سی تھیں۔ ایک شاعر کے لئے اس منظر کا باقی رکھنا کس طرح ممکن ہے اس کو خود ہی طرح جانتا ہے۔ میں ان پھولوں کو دیکھتا رہا۔ اور نہایت ہی انہماک سے دیکھتا رہا۔ اور یہ محسوس کر سکا ہوں کہ کس قدر قیمتی کا مالک ہو گیا ہوں۔

اب بھی جب کبھی میں اپنے صوفے پر دراز رہتا ہوں ۔۔۔ خالی الذہن ۔۔۔ یا کچھ فکر میں ۔۔۔ تب وہ منظر میرے پردۂ تصور پر رقصاں نظر آتا ہے ۔۔۔ جو دولت تنہائی ہے ۔۔۔ اور میرا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے ۔۔۔ اور نیلوفر کے پھولوں کی طرح رقص کرنے لگتا ہے ۔۔۔

(ورڈز ورتھ)

پہلی پرواز

از جناب سید اصغر علی صاحب سکندرآبادی (پٹنہ)

بحری بگلے کا بچہ اپنی چٹان پر تنہا تھا۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن ایک دن قبل ہی اڑ گئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اڑنے میں خائف تھا۔ ہمت کر کے جب وہ چٹان کے کنارے کی طرف آگے کو بڑھا۔ اور اپنے پر پھڑ پھڑانے کی کوشش کی تو وہ ڈر گیا۔ سمندر کی انتہائی وسعت نیچے موجیں مار رہی تھی۔ اور نیچے اس قدر فاصلہ تھا۔ میلوں نیچے۔ اس کو یقین ہو گیا کہ اس کے بازو اسے سہارا نہ دے سکیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنا سر جھکایا۔ اور اس چھوٹے سوراخ میں بھاگ کر واپس آ گیا جہاں وہ رات کو سوتا تھا۔ اس وقت بھی جب اس کے دونوں بھائی اور بہن جن کے بازو اس کے بازوؤں سے کتنے ہی چھوٹے تھے۔ کنارے کی طرف دوڑتے اور اپنے بازو پھڑ پھڑاتے اور اڑ گئے۔ وہ اس جان جوکھم کے کام میں بڑھنے کے لئے جو اس کو اس قدر خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ اپنی ہمت نہ بندھا سکا۔ اس کے ماں باپ اس کو اونچی آواز سے پکارتے ہوئے، ملامت کرتے ہوئے اور اگر وہ نہ اڑے تو چٹان پر اس کو بھوکا مار دینے کی دھمکی دیتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ مگر وہ وہاں سے کسی طرح بھی نہ ہل سکتا تھا۔

اس واقعہ کو چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت سے اس کے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔ ایک دن پہلے اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے بھائیوں اور بہن کے چاروں طرف اڑتے ہوئے ان کو پرواز کے فن میں ماہر بناتے اور یہ بتاتے ہوئے کہ لہروں کو چھوتے ہوئے کس طرح اڑتے ہیں۔ اور مچھلی پکڑنے کے لئے کس طرح غوطے لگاتے ہیں سکھلاتے ہوئے تمام دن دیکھا تھا۔ اس نے یہ سچ مچ اپنے بڑے بھائی کو پہلی مچھلی پکڑتے اور ایک چٹان پر کھڑے ہو کر نگلتے ہوئے دیکھا تھا جبکہ اس کے ماں باپ فخریہ آواز میں کڑکڑاتے ہوئے اس کے گرد اڑ رہے تھے اور صبح کو تمام خاندان اس کو اس کی بزدلی پر چڑاتا ہوا سامنے کی چٹان کے نیچے والے سطح پہاڑ پر گھوم رہا تھا۔

سورج اب آسمان پر بلند ہو رہا تھا اور اس کی چٹان پر جو جنوب میں تھی بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس نے گرمی محسوس کی کیونکہ اس نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پہلے چٹان کے دوسرے کونے پر مچھلی کی سوکھی ہوئی دم کا ٹکڑا ملا۔ اب کھانے کا ایک حصہ بھی باقی نہ بچا تھا اس نے اس ناہموار اور گرد آلود گھونسلے کو کھکوڑ کر جس میں وہ اور اس کے بھائی اور بہن انڈوں میں سے نکلے تھے ایک ایک چپہ چھان مارا۔ اس نے دبیز دار انڈوں کے سوکھے ہوئے چھلکوں تک کو کترا، یہ اپنے آپ کو کھانے کے برابر تھا۔ اس کے بعد وہ چٹان کے ایک سرے سے دوسرے تک گھوما اس کا چٹان جیسا بھورا جسم۔ اس کی لمبی بھوری ٹانگیں نزاکت سے بغیر اڑے ہوئے ماں باپ کے پاس پہنچنے کی ترکیب معلوم کرنے کے لئے آگے کو اٹھ رہی تھیں۔ لیکن اس کے ہر طرف چٹان کا ایک ڈھلان تھا اور نیچے سمندر تھا۔ اور اس کے اور اس کے ماں باپ کے درمیان ایک بڑا گہرا اور چوڑا خلا تھا۔ اگر وہ چٹان کی سیدھی جانب شمال کی طرف جا سکتا ہے تو وہ یقیناً ان کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ چٹان بالکل سیدھی کھڑی تھی لہٰذا اس کی چوٹی کا فاصلہ نیچے سمندر سے زیادہ تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چٹان کے کنارے کی طرف بڑھا اور ایک ٹانگ کو اپنے بازوؤں میں چھپاتے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑے ہو کر اس نے ایک آنکھ بند کر لی۔ پھر دوسری بھی اور سو جانے کا بہانہ کیا پھر بھی انھوں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اس نے اپنے دو بھائیوں اور بہن کو اپنے سر گرد نوں میں لئے اونگھتے دیکھا۔ اس کا باپ اپنی کمر کے سفید پروں کو چونچ سے سنوار رہا تھا۔ صرف اس کی ماں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنا سفید سینہ باہر نکالے سب کے ایک معمول سے اوپنچے ٹیلے پر کھڑی تھی۔ کبھی کبھی وہ ان مچھلی کے ٹکڑوں کو چیرتی تھی جو اس کے قدموں میں پڑی تھیں اور پھر اپنی چونچ کو چٹان سے رگڑتی تھی۔ کھانے کے منظر نے اس کو دیوانہ کر دیا۔ وہ کھانے کو اس طرح چیرنے اور اپنی چونچ کو کبھی کبھی تیز کرنے کے لئے رگڑنے کو کس قدر پسند کرتا تھا وہ باریک آواز سے کر کڑایا۔ اس کی ماں بھی کر کڑائی اور اس کی طرف دیکھا ــــــ

"گا۔ گا۔ گا" وہ اس سے کچھ کھانا لانے کی درخواست کرتے ہوئے چلایا "گو۔ او۔ لا" وہ جواباً تمسخر سے چلائی۔ لیکن وہ غم آلود انداز سے پکارتا ہی رہا۔ اور تقریباً ایک منٹ بعد اس نے ایک مسرت بخش آواز لگائی۔ اس کی ماں نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا تھا اور اسے لے کر اس کے پاس اڑ کر آ رہی تھی۔ اپنے پنجوں کو چٹان پر مارتے ہوئے وہ اس کے نزدیک پہنچنے کی کوشش میں جونہی اس کے پاس آئی۔ وہ شتابانہ آگے کو جھکا لیکن جب وہ چٹان کے قریب اس کے بالکل مقابل تھی تو رک گئی۔ اس کی ٹانگیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے بازو غیر متحرک تھے۔ چونچ میں مچھلی کا ٹکڑا اس کی چونچ کی پہنچ میں تھا۔ یہ تعجب کرتے ہوئے کہ وہ زیادہ قریب کیوں نہیں آئی اس نے اس کا حیرت سے ایک لمحہ انتظار کیا۔ اور پھر بھوک سے دیوانہ ہو کر وہ مچھلی کی طرف جھکا۔ ایک زور دار چیخ مار کر وہ باہر اور نیچے کی طرف فضا بسیط میں گرا۔ اس کی ماں جھپٹ کر اوپر چلی گئی۔ جونہی وہ اس کے نیچے سے گزرا اس نے اس کے پروں کا سرسراٹا سنا۔ تب اس پر انتہائی خوف طاری ہو گیا۔ اور اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ وہ کچھ نہ سن سکتا تھا۔ لیکن ایسا چند لمحے ہی رہا۔ اگلے دفعہ اس نے اپنے بازو باہر کو کھلے ہوئے محسوس کئے۔ ہوا اس کے سینہ کے پروں سے ٹکرائی۔ اور پھر اس کے پیٹ کے پروں سے۔ وہ اپنے نیچے کی طرف نہیں گر رہا تھا۔ اب وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کچھ سراسیمہ سا محسوس کیا۔ تب اس نے ایک مرتبہ اپنے بازو مارے اور اوپر اونچا ہو گیا اس نے مسرور کن چیخ لگائی۔ اور پھر بازو مارے۔ وہ اور اونچا ہوا۔ اس نے اپنا سینہ نکالا۔ اور ہوا سے ٹکرایا۔

"گا۔ گا۔ گا۔ گو۔ او۔ لا" اس کی ماں بازوؤں سے پرشور آواز پیدا کرتی ہوئی اس کے قریب تیزی سے نکل گئی۔ اس نے اس کو ایک دوسری چیخ سے جواب دیا۔ پھر اس کا باپ چیختے ہوئے اس کے اوپر اڑنے لگا۔ تب اس نے اپنے دونوں بھائیوں اور بہن کو اپنے چاروں طرف اڑتے ہوئے، جھپٹتے اور مچھلی کا شکار کھیلتے اور اوپر کو چڑھتے اور غوطہ لگاتے دیکھا۔

اس وقت وہ یہ بالکل بھول گیا کہ وہ ہمیشہ سے اڑنے کے لائق نہ تھا۔ اور باریک آواز سے شور مچاتے ہوئے خود غوطہ لگانا اور اوپر چڑھنا اور چکر کاٹنا شروع کر دیا۔

وہ اب سمندر کے قریب تھا۔ اور بالکل اس کے اوپر اڑ رہا تھا اور وہ اس کے بالکل مقابل تھا۔ اس نے اپنے نیچے نہایت وسیع ہرا سمندر دیکھا۔ جس کے اوپر چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی تھیں اور اس نے اپنی چونچ ادھر ادھر گھمائی اور خوشی سے چیخنے لگا۔ اس کے ماں باپ اور اس کے بھائی اور بہن اس کے سامنے اس سبز فرش پر اتر گئے تھے وہ باریک آواز سے پکار کر اس سے اختلاف کر رہے تھے اس نے ہرے سمندر پر کھڑے ہونے کے لئے اپنی ٹانگیں لٹکائیں۔ اس کی ٹانگیں اس میں

...ہر ڈوب گئیں۔ وہ خوف سے چیخا اور اپنے بازو پھڑپھڑا کر پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ بھوک سے کمزور اور تھکا ہوا تھا۔ اور اس عجیب ورزش سے اور بھی تھک کر اٹھ نہ سکا۔ اس کی ٹانگیں سبز سمندر میں ڈوب گئیں اور پھر اس کا پیٹ اس سے چھو گیا اور وہ زیادہ نہ ڈوبا۔ وہ اس پر تیر رہا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف اس کا خاندان چیخ چیخ کر اس کی تعریف کر رہا تھا اور ان کی چونچیں اس کو مچھلیوں کے ٹکڑے پیش کر رہی تھیں

اس نے اپنی پہلی پرواز کی تھی

ترجمہ

"ناصح"

"ناصح" پر مختلف شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ جو ناظرین کے پیش نظر ہے

از ...... صاحبہ

ہمدم کو اس سے مطلب، ناصح کو کیا شکایت
میرا مٹانے والا مجھ کو مٹا رہا ہے!!
؟

منع کرتا ہے مجھے یار کے گھر جانے کو
ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو
؟

اس دست کلام سے جی تنگ آگیا
ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا! گیا
مومن

ناصحا مت کر نصیحت دل بہت گھبرائے ہے
نیک و بد سب مجھے نہیں جب دل کہیں لگ جائے ہے
؟

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
غالب

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا!!
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے
اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے
مومن

اک روز مجھے اس کوچہ میں ناصح کو لیکر جانا ہے
کچھ دل کو راہ پہ لانا ہے، کچھ دلبر کو سمجھانا ہے
؟

ناصح نے جو کہا ہے وہ بجا ہے مگر بتائیں
سمجھاؤں کس طرح سے دل بیقرار کو
ہجر

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟
غالب

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح!
گر نہیں یقیں حضرت آپ بھی لگا دیکھیں
؟

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی؟
داغ

میں تو دیوانہ تھا اسکی عقل کو کیا ہو گیا؟
قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہو گیا
مومن

قدم رکھنا سنبھل کر میکدہ میں حضرت ناصح
یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں
؟

غایت حلم

ہر کہ بجز اشدت جگر بہ جفا
ہمچو کان کریم زر بخشش

کم مباش از درخت سایہ فگن
ہر کہ سنگت زند ثمر بخشش

افسانہ مسلسل

بے خبری

از نسیم

میرا ساگر جھیل کے تھوڑے فاصلہ پر ایک درخت کی جڑ میں ایک سنیاسی بیٹھا ہے۔ پاس ہی کنڈل رکھا ہے۔ اب میں نے بال بھی کٹوا لیئے ہیں۔ سر میں خاک ڈال لی ہے۔ منہ پر گرد مل لی ہے۔ گیروے کپڑے پہنے ہوں وہ اب مجھ کو نہ پہچان سکے گا۔ اُس کے محل کے ارد گرد گھوموں خواہ اُس کے سامنے جاؤں۔ خواہ اُس کی تفریح گاہوں کی خاک چھانوں کوئی طاقت اب مجھے اس کے دیکھنے سے نہیں روک سکتی۔ آہ یہی جگہ تھی جہاں سے ہماری زندگی کا باب شروع ہوتا ہے۔ اسی جگہ جھیل کے کنارے کبھی وہ تھا اور میں۔ سنتی ہوں کہ وہ روزانہ یہاں سیر کو آتا ہے مگر مجھے یہاں آئے ہوئے ۲۰ دن ہو گئے ہیں۔ مگر وہ نہ آیا۔ کیا میری محبت سچی نہیں؟ آخر اس میں اثر کیوں نہیں ہے؟.... دفعۃً سامنے سے غبار سا اڑتا نظر آیا۔ "یا الٰہی میرا خورشید ہو"۔ نوعمر سنیاسی کے چہرے پر تازگی سی آگئی۔ یقیناً خورشید ہی ہے۔ سنیاسی چپ چاپ درخت کی جڑ میں چھپا بیٹھا رہا...... خورشید آیا۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا یا الٰہی رحم کر آج کملا اسی جنگل میں مجھے مل جائے جہاں آج ہی کے دن ۷ سال قبل ملی تھی......

اُف ناممکن! محال!!

اچھا پیاری کملا آج تیری ہی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے مرتا ہوں۔ اسی جھیل میں ڈوب کر خودکشی کرتا ہوں۔ جہاں تو نے خودکشی کرنا چاہی تھی...... میں نے تجھے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ کاش تو مجھے اس وقت مل جائے اور مجھے موت کے منہ سے بچا لے.... مجھے نئی زندگی دے دے!! آہ ایسی میری قسمت ہی کہاں۔ ورنہ تو مجھے چھوڑ کر ہی کیوں جاتی ــــ اُف! میں یہ تو بھول ہی گیا کہ تو مجھ سے ملنے سے پہلے ہی دوسرے کی ہو چکی تھی۔ تجھ پر میرا کیا حق؟ کملا معلوم نہیں تو اس وقت کہاں ہو گی؟ تو اس وقت اپنے شوہر کے رشکِ ارم گھر میں ہو گی تیرا خوش نصیب شوہر اپنی قسمت پر پھولے نہ سماتا ہو گا۔ تیرے گلستان شباب میں بہار آئی ہو گی۔ پھول جیسے پیارے بچے جب تجھے "ماں" جیسے پیارے خطاب سے مخاطب کرتے ہوں گے۔ اُس وقت تیرا دل باغ باغ ہو جاتا ہو گا۔

دیوی...... تو کیا جانے میں کون ہوں؟ کس قدر تیری پرستش کرتا ہوں۔ اپنے پجاری کو تو نے درشنوں سے بھی محروم ہی رکھا!! آہ آج سے ۷ سات سال قبل تیرے بچپن کے زمانے کا حادثہ.... جس نے میری زندگی تباہ کر دی۔ تجھے کب یاد ہو گا؟ اگر تیرے ذہن میں اُس کی کوئی دُھندلی سی تصویر ہو گی بھی تو ایک ناخوشگوار واقعے کی شکل میں۔ بچپنے کی لاابالیانہ بھول۔ طبیعت کا تلون سمجھ کر اُسے فراموش کر دینا چاہتی ہو گی تاکہ تیری موجودہ لطف زندگی میں کمی نہ آئے۔ اچھا کملا تو جہاں بھی رہے خوش رہے پھولے اور پھلے!!

میری جان! میں اپنی عزیز جان تجھ پر قربان کرتا ہوں.....
کہتے ہوئے جھیل کی سیاہ اور خوفناک لہروں میں کود پڑا۔

نوعمر سنیاسی دور تھا اُس کی نظریں خورشید پر تھیں مگر اُس کی مجنونانہ گفتگو بوجہ دوری نہ سن سکا..... جیسے ہی خورشید پانی میں کودا سنیاسی کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی۔ وہ بجلی کی سی پھرتی سے جھیل کی طرف بڑھا اور پانی میں کود پڑا۔ پُرزور وقت وہ خورشید کو کنارے تک لایا۔ اور بڑی مشکل سے اُسے خشکی تک لا سکا۔ اور کنارے پر لٹا دیا۔ سنیاسی دُبلا پتلا تھا۔ اور خورشید اگرچہ کمزور

ہو گیا تھا مگر کسی وقت میں شاندار جسم کا مالک تھا کٹھا ابھی تو کہاں تک سنیاسی
اُسے اٹھا نہ سکا۔ خورشید کو جب ہوش آیا تو کہنے لگا ظالم ..... تو کون
ہے کیوں مجھے ستا رہا ہے للہ مجھے مرنے دے ...... میں زندگی سے
خوب سیر ہو چکا ہوں .... "نہیں مہاراج آپ نہیں جانتے خودکشی
کرنا جرم ہے".... سنیاسی بولا۔ .... "ہوا کرے ..... مجھے مرنے
دو" خورشید نے جواب دیا "ہرگز نہیں" سنیاسی نے استقلال سے کہا!!

خورشید اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے جانے لگا ..... مگر سنیاسی نے پوری
طاقت سے اُسے پکڑ لیا.......... "بابا کیا کرتا ہے کیوں کسی کے ذاتی فعل
میں دخل دیتا ہے"۔ خورشید نے لجاجت سے کہا۔ "تم خدا کی مصلحت اور اس
کے کاموں میں کیوں دخل دیتے ہو؟ اُس نے تمہیں پیدا کیا ہے، وہی جب
مارے تب مرنا۔ ہم سنیاسی ہیں ہمارا فرض ہے کہ خلق خدا کو پاپ سے بچائیں"
..... خورشید مرزا ذرا آگے بڑھ گیا۔ سنیاسی دوڑ کر اُس کے پیروں میں لپٹ گیا کہ اب خورشید کے لئے ایک قدم بھی بڑھانا مشکل ہو گیا۔ سنیاسی نے
کہا مہاراج! میں زندہ رہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے آپ کو جان دیتے
ہرگز نہ دیکھوں گا۔ آپ جسم میں مجھ سے زیادہ طاقتور سہی روح پر طاقت
سے نہیں روک سکتا۔ اس لئے جیسی آپکی مرضی، مگر اتنا سن لیجئے کہ میری
ہتیا کے بھی ذمہ دار آپ ہوں گے۔ خورشید کو چھوڑ کر چیخا "مہاراج خودکشی
سے پہلے میں پانی میں ڈوب کر جان دیتا ہوں۔ پیچھے سے آپ بھی خودکشی
کرلیں۔ کہتے ہوئے سنیاسی جھیل کی طرف دوڑا۔ خورشید نے گھبرا کر دوڑ کر اسے
پکڑ لیا۔ ذرا ٹھہرو جاتا تھا، گھبراہٹ کے ساتھ ہی ساتھ ہلکا سا تبسم بھی خورشید
کے مایوس لبوں پہ آیا اور اُس نے سنیاسی کی طرف بغور دیکھا...... سنیاسی
کی عمر مشکل کوئی ۱۵ یا ۱۶ سال کی ہوگی نہایت حسین چہرہ تھا مگر چہرہ اور
گفتگو سے اولوالعزمی، مترشح ہوتی تھی۔ اُسے ایک چٹان پر بٹھاتے ہوئے
خورشید مرزا نے پوچھا مہاراج آپکا نام کیا ہے اور کہاں سے آئے ہیں اس
قدر کمسنی میں سنیاس کیوں لے لیا۔ ماتا پتا کہاں ہیں۔ مجھے اپنی زندگی
کا سب حال سنایئے۔ شاید میری زندگی پلٹا کھا جائے اور مجھے صبر آجائے
میرا دل کہتا ہے کہ آپ کی کہانی نہایت سبق آموز اور دلچسپ ہوگی۔ ... سنیاسی
نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ مہاراج میری کوئی کہانی نہیں ہے۔ مجھے نہیں
معلوم کہ میرے ماتا پتا اور رشتہ دار کون ہیں کہاں ہیں۔ نہ میں سنیاس کی
وجہ جانتا ہوں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں سنیاسی ہوں ..... اور بس
.... بابا دنیا کیا اور اس کے بکھیڑے کیا۔ حقیقت کی آنکھ میں یہ سب
وہم ہے کوئی کسی کا نہیں۔ خود غرضی اور مطلب پرستی کی دنیا ہے ــــ

خورشید سنیاسی کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اور اُسے اپنے محل
میں لے آیا۔ ہر چند سنیاسی نے اصرار کیا کہ بابا فقیروں کو محلسرا سے
کیا کام مگر خورشید نہ مانا اور کہنے لگا۔ مہاراج میں نے محض آپ کی خاطر
خودکشی جیسی لعنت سے ہاتھ کھینچا ہے۔ آپ اب مرتے دم تک میرے
ساتھ رہیئے۔ مہاراج ہم سادھوؤں اور شاہوں کا کیا میل؟... ہمارے
تمہارے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوستی کیوں کر نبھے گی" سنیاسی بولا
خورشید نے آخر میں سنیاسی کے پیر چھو کر کہا مہاراج ہم اس خیال سے متفق نہیں ہمارا
عقیدہ یہ ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

سنیاسی اور خورشید مرزا دونوں ساتھ رہتے ہیں یکجا کھاتے پیتے
ہیں۔ اکثر سیر کو جاتے ہیں اکثر دنیا کی بے ثباتی پر گھنٹوں گفتگو کرتے
ہیں۔ نواب صاحب نے بہت ہی منتیں کیں کہ مہاراج اگر سنیاسی
بھیس ہی رکھنا ہے تو میں نئے نئے اور عمدہ کپڑے اسی رنگ کے
بنوائے دیتا ہوں۔ کم از کم اس لبادے کو تو اتار دیجئے۔ بالوں میں
اور منہ پر مٹی لگانا چھوڑ دیجئے۔ مگر سنیاسی بگڑ جاتا ..... کہ میری باتوں
میں دخل نہ دو - ..... ہفتہ ہو چکا ہے۔ سنیاسی کو خورشید مرزا کے
محل میں آئے ہوئے۔ اُسے تو معلوم ہی تھا کہ خورشید یہی ہے جس سے

میں محبت کرتی ہوں مگر وہ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا تھی کہ خورشید کسی اور ہستی سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس سے قطعاً بے خبر تھی کہ وہ ہستی در اصل وہی تھی جو ہر وقت محبوب کے پاس رہتی۔ اور خورشید کو کسی کے لئے تڑپتا دیکھ کر اس کا دل بے چین ہوتا اُسے اپنی گذشتہ بے عزتی بھی یاد آتی۔ خورشید کا معمول ہو گیا تھا کہ صبح نیند سے بیدار ہوتے ہی ننگے پیر ننگے سر سنیاسی کی خوابگاہ میں جاتا آداب بجا لاتا۔ اس کے درشنوں کے بعد کوئی اور کام کرتا۔ ایک دن حسب معمول نواب صاحب سنیاسی کی خوابگاہ میں گئے تو یہ دیکھ کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ سنیاسی پلنگ پر نہیں ہے — اور وہی جو اہرات کا صندوقچہ جو اس نے تقریر بنائی ہے بہات جو نکد یا تھا پلنگ پر رکھا ہے۔ اور اس کے اوپر ایک لفافہ بھی رکھا ہے۔ جلدی سے اُس نے خط کو کھولا۔ بہت ہی خوبصورت اور خوشخط تحریر میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی تھی۔

میرے خورشید! تم نے مجھے آج سے سات سال قبل مرنے سے بچا کر تباہ و برباد کر دیا۔ .... میرا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ .... میں سمجھی تھی کہ تم میرے بن جاؤ گے ...... مگر افسوس ..... میری ایسی قسمت نہیں ہے..... تم کسی دوسری ہستی کے بن چکے ..... اب جبکہ میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہوتی ہوں۔ مختصراً اپنا صحیح حال بتاتی ہوں۔ میں ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ بدقسمتی سے ماں باپ بے وقت مجھے داغ مفارقت دے گئے۔ ظالم چچا نے مجھ پر بہت ظلم کیا اور میں نے برداشت کیا مگر یہ آخری ظلم میں برداشت نہ کر سکی ...... یعنی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے نالائق لڑکے سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں تو میں نے مجبوراً اس گھر چھوڑ دیا۔ اُس کے بعد جو ہوا وہ آپ کو معلوم ہے ——— میں چونکہ اپنی مصیبت میں مبتلا تھی .... آپ کو افشائے راز کے خوف سے پہلے صحیح حال نہ بتایا اور نہ نام ..... در اصل میرا نام نجمہ ہے ... نواب صاحب "آپکی" کہلانے جو وعدہ آپ نے سات سال قبل کیا تھا آپ کو تا دم مرگ نہ بھولوں گی"...... ایسا کہتے ہوئے مرتی ہوں .... اور جس جھیل میں پہلے ڈوبی تھی۔ اُسی میں ڈوب کر جان دیتی ہوں۔ مگر اب مجھے کوئی نہ بچا سکیگا

آپکی ...... اور صرف آپ کی نجمہ

نواب صاحب پاگل سے ہو رہے تھے ..... جلدی سے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر جھیل کی طرف بھاگے ..... آہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کی لڑائی ہے ..... یا الٰہی نجمہ ابتک زندہ ہو ...... پیدل گئی ہے ... معلوم نہیں کب چلی ہے۔ یا خدا! جھیل تک ابھی نہ پہنچی ہو ..... کاش اس وقت نجمہ زندہ ملجائے!! ان کا دل ٹھکانے نہ تھا ...... شہسوار ہوتے ہوئے بھی دو تین جگہ گرے پھر اٹھے پھر گرے ...... شب خوابی کا لباس تن پر ہے۔ منہ پر گرد پڑی ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں ..... چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ ہونٹ خشک ہیں ..... راستہ طے ہی نہیں ہوتا ...... وقت گذرا جاتا ہے۔ بہزار دقت جھیل نظر آئی۔ دیکھا کہ نجمہ سنیاسی جھیل کے ایک حصے میں جہاں سینہ سینہ تک پانی تھا کھڑی ہے۔ ان کی جان میں جان آئی۔ اور دونوں ہاتھ دور سے ہی بلند کر کے چلانا شروع کر دیا۔ ..... نجمہ! نجمہ! خدا کے لئے ذرا ٹھہرو ... میں تو تمہاری ہی محبت میں مر رہا تھا ..... بخدا تمہارے سوا اور کسی کو نہیں چاہتا!! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ہی کملا ہو ..... خورشید کملا کا ہی دیوانہ تھا۔ تمہیں سخت غلط فہمی ہوئی۔ ٹھہرو ٹھہرو کملا! نجمہ! خدا کے لئے ذرا صبر کرو .... آواز بھلا نجمہ تک کہاں پہنچی تھی۔ اُس نے جو دیکھا کہ خورشید اُسے بچانے کے لئے آ رہا ہے۔ ہاتھ بلند کیا۔ ہاتھ میں چمکدار خنجر تھا۔ خورشید اس نظارہ سے کانپ گیا۔ ایک ہی لمحہ میں خورشید یہ کہتے ہوئے گھوڑے سے تڑپ کر اترا کہ میری کملا! ذرا ٹھہرو! پانی میں قدم رکھا ..... اسی لمحہ یہ آواز بھی نجمہ کے کان میں آئی۔ مگر خنجر اسی لمحہ سینے میں پیوست ہو چکا تھا نور کا مینار پانی میں گر پڑا۔ خورشید افتاں و خیزاں نجمہ کے پاس پہنچا

(باقی)

افسانہ

جنونِ تماشہ

از جناب صابر کوسگوی (دکن)

جعفر تیزی کے ساتھ سینما کے احاطہ میں داخل ہوا، اُس کا سانس پھول رہا تھا اور سر کے بال بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے پیشانی پر آ پڑے تھے، بوکھلاہٹ کے باعث اُس کی کچھ عجیب سی حالت ہو گئی تھی، کل اُسے دیر سی کے باعث کھیل کا ٹکٹ نہ مل سکا تھا اور آج بھی جعفر کو گھر سے نکلنے میں کچھ دیری ہو گئی۔ اُس کی بیوی بہت دنوں سے علیل تھی، آج اُس پر اچانک اختلاج کا دورہ ہوا تھا۔ دوا کے استعمال کرنے پر جب اُس کی بیوی کو قدرے افاقہ ہوا، تب اُسے سینما چلنے کا خیال آیا۔ ان دنوں شہر کے عالی شان تھیٹر گھر میں ایک بہترین تماشہ پیش کیا جا رہا تھا، جو دلچسپ اور رنگین ہونے کے باعث مسلسل کئی ہفتہ چلتا رہا۔ دونوں وقت سینما کے ہال اور احاطہ میں کافی رش Rush رہتا۔ آج بھی جعفر کو ذرا سی دیر سے پہنچنے کی وجہ سے پہلے تماشہ کا ٹکٹ نہ مل سکا۔ ٹکٹ ماسٹر سے اُس نے کئی مرتبہ التجا کی، جس کے جواب میں اُس سے کہا گیا: "چار آنہ والا ٹکٹ ختم ہو چکا ہے، البتہ تمہیں آٹھ آنہ والا ٹکٹ مل سکتا ہے" مگر اس وقت جعفر کی مٹھی میں صرف ایک چونی تھی۔ پھر اُس نے نہایت بے اطمینانی کے ساتھ کہا "اچھا"، لیکن اُسے ناکامی نصیب ہوئی۔ نغموں کی دلکش تانیں ہال کے دریچوں اور دروازوں سے چھن چھن کر جعفر کی بیتابی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں، اُس کا دل تماشائیوں کے لطیف قہقہوں پر بیتابانہ مچل رہا تھا، وہ کتنا مجبور تھا۔۔۔ کیونکہ اس وقت اس کی جیب میں تماشہ دیکھنے کے لئے دو چونیاں نہ تھیں، کچھ دیر تک وہ حسرت و یاس بھری نظروں سے دیواروں پر آویزاں کی ہوئی خوبصورت فلمی تصاویر کو تکتا رہا۔

ایک حسین و جمیل لڑکی کا جاذبِ نظر چہرہ اُس کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی زبان سے ایک دبی ہوئی آہ نکل کر فضاء میں گم ہو گئی۔ مبہم خیالات اُس کے دماغ میں گشت لگا رہے تھے، دفعتہً وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔۔۔ اور نہ جانے کیا سوچ کر گھر کا راستہ لیا۔ مکان کے در و دیوار پر ایک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ خاموشی کے ساتھ وہ مکان کے اندر داخل ہوا، مٹی کے تیل کا چراغ مکان کے ایک کونے میں رکھا ہوا ٹمٹما رہا تھا۔ اُس کی بیمار بیوی ایک بوسیدہ چٹائی پر پڑی پڑی کراہ رہی تھی۔ اور اُس کے پیروں کے پاس ایک مریل کتا پڑا بھوک سے ہانپ رہا تھا۔ جعفر نے گھر کی حالت پر اندازہ لگایا۔ اور نہ بیوی کی مزاج پرسی کی، اُس کا دھیان کسی اور طرف بٹا ہوا تھا۔ "تماشہ کا بھوت" اُس کے سر پر سوار تھا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ آج کسی طرح تماشہ دیکھ کر رہوں گا، اس خیال کو لئے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ بیوی کے کپڑوں کا صندوق کھولا، ایک میلا سا چاندی کا کڑا جو گھس جانے کے باعث ناکارہ سمجھا گیا تھا، نکال کر اپنی جیب میں رکھا۔ اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔ کھلی فضا میں پہنچ کر اُس نے پسینے کی لاتعداد بوندوں کو اپنی کوٹ کی میلی آستین سے صاف کیا۔

سیٹھ چمنی لال کی دکان پر پہنچ کر اُس نے اپنی بیوی کا زیور رہن رکھنے کے لئے دیا۔۔۔ سیٹھ نے حسبِ عادت سود و ضمانت کر کے ایک چونی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔۔۔ اور وہ خوشی خوشی سینما چلتا بنا۔۔۔۔۔

کھیل کے اختتام کی گھنٹی بجی۔۔۔ اور تماشائیوں کی ایک ریل

باہر نکل آئی۔ جعفر تماشائیوں کے چہروں کا بسرعت جائزہ لیتا رہا، اُن کے چہرے دل کیفیات کا اظہار کر رہے تھے، دفعتہ جعفر کے کندھوں کو جنبش ہوئی۔

خوب سے دوست، اُس کے دوست انور نے مخاطب کیا۔

ارے تم، انور! جعفر نے پُرجوش مصافحہ کیا۔ کہو یار کھیل کیسا ہے؟

کھیل — نغموں اور نغمتوں میں ڈوبا ہوا کھیل ہے — انور نے جواب دیا، تم دیکھو گے تو عش عش کرو گے۔

شوق تماشہ نے جعفر کو کسی قدر تڑپا دیا ——

سچ کہتے ہو، جعفر نے اپنی چونی والی مٹھی کس کر کہا ——

بھئی، سچ اور جھوٹ کو تو اُس وقت مانو گے، جب "رقص" کا نظارہ دیکھو گے" والا دل بھرا گیت سنو گے،

جعفر نے کچھ بے تاب ہو کر انور کو ایک خفیف سا دھکا دیا — وہ بیحد خوش تھا، کیونکہ آج اُس کے پاس سکنڈ کلاس والے ٹکٹ کے دام تھے۔ ٹکٹ گھر کے پاس بہت زیادہ بھیڑ تھی — جعفر ان سب سے آگے کھڑا ہوا تھا — دریچے کے دونوں پٹ کھل گئے۔ جعفر نے فوراً اپنی چونی والا ہاتھ اُس کے اندر بڑھایا لیکن ٹکٹ ماسٹر نے یہ کہتے ہوئے اُس کی دونوں چونیاں واپس کر دیں کہ اُن میں سے ایک ٹانکے کی ہے، اُف! یہ سُن کر اُس کے پیروں تلے زمین نکل گئی — اور آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ انسانوں سے زیادہ جب اُمیدوں کا خون ہوتا ہے تو اُس کا دل دیوانہ ہوتا ہے، آہ اُس کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا — یہی دو چونیاں سلسلے اُس کی اُمیدوں کا سہارا تھیں۔ اُس کا دماغ چکرانے لگا — بُری طرح وہ لوگوں کے ہجوم میں پھنسا ہوا تھا، مشکل کے ساتھ وہ پسینے میں شرابور ہو کر باہر نکلا — اپنی بیچارگی اور غربت پر اُسے رونا سا آنے لگا — غم و یاس میں ڈوبی ہوئی نگاہیں، اُن افراد پر پڑ رہی تھیں، جو خوشی خوشی ٹکٹ لے کر سینما ہال میں داخل ہو رہے تھے، اُسے اُن کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ اور جعفر کو اپنی قسمت سے زیادہ اُس بے رحم ٹکٹ ماسٹر اور دغا باز مارواڑی چنی لال پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے اُس کی حسرتوں کا گلا گھونٹا، مرتی کھمبے کے پاس کھڑا ہو کر اُس نے بغور چونی کو دیکھا۔ واقعی اُس پر ٹانکہ لگی ہوئی ہے، اُسے یاد آیا، یہ چونی مارواڑی نے دی ہے، عجلت میں اُس نے خیال نہیں کیا — اور فوراً ہی لے لیا۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ اس دغا بازی کی ضرور سزا دے گا جعفر کے بازار پہنچنے تک چنی لال کی دکان بند ہو چکی تھی — دل و دماغ میں وہ عجیب قسم کا خیال لئے ہوئے گھر پہنچا، گھر کے دروازے بدستور کھلے پڑے تھے۔ اور مٹی کے تیل کا چراغ کبھی کا گل ہو چکا تھا۔ اُس کی بیمار بیوی ستون کا سہارا لئے بیٹھی کھانس رہی تھی، پیروں کی آہٹ پا کر گھر کا کتا بھونکنے لگا۔ لیکن مالک کی آواز پہچان کر چپ ہو گیا ——

بتی روشن کرو — اُس نے مرے ہوئے لہجہ میں بیوی سے کہا

تیل ختم ہو گیا ہے، بیوی نے جواب دیا — خاموشی کے ساتھ وہ لباس تبدیل کرنے لگا اور اُس کی بیوی نے کھانا لا کر سامنے رکھا، جس کو اُس نے اندھیرے ہی میں ختم کر دیا ——

دیر تک وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچتا رہا، شاید اس لئے میں غریب ہوں، ایک معمولی چپراسی، اور غریب کو، دنیا کی کسی مسرت و دلچسپی میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں — غریب کی غربت ہی سوسائٹی کی نگاہوں میں جرم اور سب سے بڑا گناہ ہے، اُس کے حرکات و سکنات، قدم قدم پر قابل گرفت سمجھے جاتے ہیں — یہ امتیاز — یہ اختلاف — غریب اور امیر میں — یہ ناانصافی — یہ خود پرستی — انسان — پھر اپنے آپ کو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کرے —— سب جھوٹ، خدا بناؤٹی ڈھونگ ہیں — مطلبی — مکار دنیا — یہ سرمایہ دار، یہ مل اونر اور کارخانہ دار — غریبوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے سیٹھ ساہوکار — آخر کیا ہمیں ستاتے رہیں گے —؟

تو پھر انقلاب کیوں نہیں آتا — اِن کی دنیا میں — یہ لیڈر

بچا تھا۔ یہ مولانا ــــ کس ڈھنگ کی باتیں ہیں، اُف ــ ہماری ایسی
چالوں سے سیٹھوں اور سیٹھانیوں کے ٹھیکیداروں کو اُلٹے پیر سولی پر لٹکا دوں " ــــ
جعفر دیر تک ان خیالوں میں اُلجھا رہا، صبح جب وہ بیدار ہوا،
ایک عزم راسخ اُس کی آنکھوں میں نمایاں تھا ــــ چھتی لال، اپنی دکان
پر بیٹھا ہوا اسپاری گھول رہا تھا۔ جعفر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر دوسرے
گاہکوں کی طرف متوجہ ہوا،
" لالہ، اسے بدل دو، جعفر نے اپنی چونی کو سیٹھ کے آگے ڈال دیا،
سیٹھ، تیوری پر بل لاتے ہوئے بولے، کیا ہے ؟
یہ چونی، جعفر نے کہا، کھوٹی نکلی ہے،
کھوٹی ــــ کیسی کھوٹی ؟ چھتی لال نے تعجب کا اظہار کیا، کب
لی تھی، تم نے مجھ سے یہ چونی،
جعفر کو طیش سا آگیا، انجان نہ بنو لالہ، کل جو تم نے دی تھی ؟
مجھے یاد نہیں، لالہ نے لاعلمی ظاہر کی،
دغاباز ــــ جعفر نے انتہائی طیش کی حالت میں کہا۔
غریبوں کو فریب دے کر مکر جاتا ہے۔ یاد نہیں۔ کل رات کو اگر وہی دے کر
یہ چونی دی تھی ــــ
جھوٹ کہتے ہو، لالہ نے کھلے الفاظ میں انکار کیا۔
اب جعفر کے ضبط و صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، اُس نے طیش کی حالت میں سیٹھ جی
کے گال سہلائے، وہ اس کے لئے پہلے سے ہی تیار ہو کر آیا تھا۔ اور اُس
نے دو ہاتھ اُٹھایا ــــ دوسرا طمانچہ رسید تھا، ذرا سی دیر میں دکان پر
بھیڑ لگ گیا ــــ وہ تو اچھا ہوا کہ راستہ والوں نے معاملہ کو رفع دفع کر دیا
جعفر غم و غصہ میں بھرا ہوا گھر لوٹا ــــ انتقام کی آگ، اُس
کے سینے میں دہک رہی تھی ــــ اُس کا فیصلہ اٹل تھا ــــ
ایک ہفتہ کے بعد پولیس نے جعفر کو اسی جرم میں گرفتار کیا کہ وہ چھتی لال کی
دکان کو رات کے وقت آگ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے پایا گیا تھا

"احساسات"

از جناب عمر قدسی اجمیری

یہی وقت ہے میکشو میکشی کا ــ کہ مرکز ہے صحن چمن دل کشی کا
میرے ہوش برباد کر دینے والے ــ مجھی پہ ہے الزام کیوں بیخودی کا
رہیں یہ تماشا ہے چشم تصور ــ مبارک رہے عالم مری بیخودی کا
انھیں سے انھیں کی تمنا ہے توبہ ــ [illegible] کی سادگی کا
نظام محبت کے آئین توبہ ــ کہ مجرم ہوں الزام وارفتگی کا
خموشی کی طاقت نہ امکان نالہ ــ الٰہی یہ منظر مری بیکسی کا
نہیں تاب کوئی نظر بھر کے دیکھے ــ شباب اور وہ بھی مکمل کسی کا
بہت مختصر تھا بہت مختصر تھا ــ کتاب وفا میں ورق زندگی کا
نظر میں کھٹکتے ہیں یہ چاند تکے ــ سمجھتا ہوں اسے برق طلبی کا
وہ چشم نظر باز کو کوستے ہیں ــ گلہ ہے انھیں اپنی بے پردگی کا

شب ہجر غماز گریہ ہے قدسی
یہ منظر مرے آنسوؤں کی نمی کا

بقیہ سوانح حیات حضرت آرزو جلیلی مرحوم

حیدرآباد میں اورینٹل کانفرنس کا گیارہواں جلسہ ہونے والا
ہے۔ آرزو صاحب کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ اس
کانفرنس کے شعبہ موسیقی میں آپ ایک پیپر
" Contribution of Muslims to Indian Music. "
کے عنوان سے پڑھنے والے تھے۔ تھوڑا سا حصہ اس مضمون کا لکھا تھا

سوانح حیات

از قلم جناب سید مظفر حسن صاحب مظفر

جناب محمد شرف عالم آرزو جلیلی، مرحوم

۸ جولائی ۱۹۰۶ء کی شام کو محمد جلیل وکیل مرحوم کے دیہاتی مکان واقع محمد پور غازی حوالہ ضلع دربھنگہ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام شرف عالم رکھا گیا۔ یہ لڑکا آگے چل کر واقعی شرف عالم ہی ہوا۔ محمد جلیل اپنے وقت کے مشہور وکیل تھے۔ آرزو میں جلیلی کا اضافہ اسی جلیل کی وجہ سے ہے۔ عام طور پر یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ حضرت جلیل کے شاگرد ہیں۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے مگر ارادہ ہی رہا :۔

ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے سے شروع ہوئی۔ بعد میں دربھنگہ اسکول میں داخلہ ہوا۔ مگر اس درمیان میں تحریک ترک موالات شروع ہوگئی۔ ان کے والد محمد جلیل صاحب خلافت تحریک کے بڑے حامیوں میں تھے چنانچہ ان کے حکم کے مطابق شرف عالم صاحب نے اسکول کو خیرباد کہا اور نیشنل اسکول میں داخل ہوگئے لیکن دوسرے سال دربھنگہ ضلع اسکول سے پرائیویٹ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد آئی۔ ایس۔ سی بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا بی۔ ایس۔ سی [illegible] سکینڈ کلاس فرسٹ لائے۔ پھر ام۔ ایس سی میں سکینڈ کلاس لائے۔ بی۔ ال میں بھی سکینڈ کلاس لائے۔ غرضکہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اس طرح کامیابی حاصل کرنے کے بعد سائنس کالج پٹنہ میں کئی برس ریسرچ اسکالر رہے اس کے بعد جنوری ۱۹۳۱ء میں ہادی ہاشمی ہائی اسکول گیا میں ہیڈ ماسٹر رہے لیکن اسی سال جولائی میں گورنمنٹ ریسرچ اسکالر ہوکر ریونشا کالج کٹک چلے گئے۔ یہاں ۱۹۳۳ء تک کام کرتے رہے چونکہ وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی ہیں لئے استعفیٰ دے کر چلے آئے۔ ۱۹۳۵ء میں بہار نیشنل کالج پٹنہ میں فزکس کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اخیر وقت تک وہیں رہے۔

کالج لائف :۔

کالج میں Chemical اور Physical سوسائٹی کے سرگرم ممبر رہے۔ مختلف مواقع پر سوسائٹی میں بہترین مضامین پڑھ کر کثیر تعداد میں میڈل اور سرٹیفکیٹ حاصل کئے۔ دوران تعلیم میں ایک مضمون لکھا جس کی سرخی تھی۔

"Electrical resistence on Nickle and Cobalt in magnatic fields published in the Zeits_F- Fysik Berlin."

۱۹۲۷-۲۸ء کے کالج سیشن میں ایک ٹرپ گئی جس میں ان کا بھی انتخاب ہوا۔ واپسی پر اپنی رپورٹ کلکتہ ٹراموے کمپنی پر سنائی اس رپورٹ پر پی۔ ان۔ ملک میڈل ملا۔

ادبی دنیا میں :۔

اردو ادب کو آرزو جلیلی سے جس قدر فائدہ پہنچا ہے اس سے پوری ادبی دنیا واقف ہے۔ اردو کا ہر ہمدرد آج آرزو کی جوانمرگی

پر آنسو بہاتا ہے۔ آرزو صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ ثابت کیا کہ امانت کی اندر سبھا کو واجد علی شاہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اردو میں پہلی دفعہ انھوں نے "قدیم چینی شاعری کے متعلق" سالنامہ ساقی ۱۹۳۶ء میں ایک طویل عالمانہ مضمون لکھا۔ "بلجیم کا مفکرِ اعظم اور اس کی ذہنی مخلوق" کے نام سے مٹرلنک پر ایک زبردست تنقید لکھی جو ادبِ لطیف کے سالنامہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ تنقید جناب تمنائی کی مترجمہ کتاب "پلیاس میلا سانڈے" کے دیباچے کی حیثیت سے شامل ہے۔ جس کو لاہور بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔

جولائی ۱۹۳۲ء رسالہ اردو حیدرآباد میں "پوچوئی" کے نام سے چینی شاعری و دیگر شعرا کے متعلق ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ یہ مضمون "قدیم چینی شاعری" سے زیادہ طویل ہے۔ "حسن رائگاں" کے نام سے موپاسان کے ایک افسانہ کا ترجمہ سب رس ۱۹۳۶ء میں جس کے مدیر سعادت بھی تھے شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ اتنا مقبول ہوا کہ مختلف رسالوں نے تھوڑے سے الٹ پلٹ کے بعد شائع کیا۔ خود [illegible] اسی طرح مختلف قسم کے مضامین رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ جن کی فہرست اس مختصر مضمون میں دینی مشکل ہے۔ ان کے تراجم زیادہ ہیں۔ خاص کر موپاسان کا ترجمہ زیادہ کیا ہے۔ تحقیق طبعزاد افسانوں و مضامین کی تعداد کم ہے۔ ان کی شاعری کے متعلق لوگوں کو کم واقفیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کہا اس کا بہت ہی کم حصہ شائع ہوا۔ "کلمات کو" ادبی دنیا میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ ان کی ابتدائی نظموں میں سے ایک نظم ہے جو جوش کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ "عظمتِ نسواں" بہت اعلیٰ پایہ کی نظم ہے۔ جو اب تک شائع نہیں ہوئی۔ اب ساغر میں شائع ہو گی۔ تنویر مئی ۱۹۳۹ء میں میرے اصرار پر پاس بھیج دیا تھا۔ امید کرتا ہوں وہ بھی تنویر مہربانی کر کے مجھے اس کی ایک کاپی بھیج دیں گی۔ تاکہ مجموعہ کلام میں شائع ہو سکے۔

غرض کہ آرزو مرحوم کے ادبی کارناموں کو اس مضمون میں واضح کرنا مشکل ہے۔ زبان کی واقفیت میں انگریزی، اردو، اور فارسی کے علاوہ ہندی، بنگالی، جرمنی اور فرنچ سے کافی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ موپاسان کے افسانوں کا ترجمہ براہ راست فرنچ سے کیا ہے۔

موسیقی :-

موسیقی کا ذوق بہت زیادہ تھا۔ ستار بہت عمدہ بجاتے تھے ایک کتاب "Reconstruction of Indian Music." کے نام سے لکھا ہے۔ کتاب کی زبان انگریزی ہے مگر مرتب شدہ نہیں ہے۔ اس میں ہندوستانی موسیقی پر اعلیٰ قسم کی فنی بحث کی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی تھیوری میں جو غلطیاں تھیں ان کو بیان کیا ہے اور ان کے نقائص کو دور کیا ہے اور قاعدے مرتب کئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس کتاب کو وہ شانتی نکیتن جا کر ٹیگور کو تحفے کی حیثیت سے پیش کریں گے اس کی وجہ دریافت کرنے پر کہا تھا کہ اس کتاب کی قدر صرف وہی کر سکتا ہے۔ جس وقت الموڑا میں ادے شنکر اور علاء الدین خاں کو ستار سنایا ساتھ ہی اپنی ایجاد کردہ راگ راگنیاں بھی تو بے ساختہ علاء الدین خاں کے منہ سے کلمات تحسین نکل پڑے۔ اور انھوں نے بڑی خوشی سے سرود بجایا۔

پوری زندگی انہیں ادبی کاوشوں اور دوسرے کمال کی تحصیل میں گذار دی ۱۹۳۹ء میں مرہٹی زبان کی ادبی کانفرنس احمد نگر میں ہوئی تھی۔ دعوت نامہ آپ کے نام بھی آیا۔ آپ وہاں تشریف لے گئے۔ "ہندوستانی اسٹیج پر پردہ کا استعمال" پر تقریر کی۔ اسی طرح انڈین سائنس کانگریس منعقدہ کلکتہ ۱۹۳۸ء میں شرکت کی اس کانگرس میں نفسیات کے شعبہ میں ایک پیپر پڑھا۔ غرض اس طرح بہت سے ادبی جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ باقی بر صفحہ ۲۹

رنجیت کی از حد ظرافت آمیز پیشکش
SUSRAL
سسرال
ڈائرکٹر
چترنبھج دوشی
اداکاران :-
مادھوری - موتی لال
نورجہاں - کانتی لال
اقبال بی بی
وغیرہ
رائل اوپیرا ہاؤس
(چوپاٹی)

خاص

بچوں سے دوستی!

از جناب ڈاکٹر رادھا کرشن گروور بی۔ ایس۔ سی آنرز۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ آنرز۔

علم الاطفال (PADAGOGY.) میں یہ مضمون خاص اہمیت رکھتا ہے۔ معزز مضمون نگار کو بچوں سے زیادہ ہونے کی وجہ سے اس علم کے مطالعہ کا خاص شوق ہے۔ پہلے بھی آپکے مضامین بچوں کے متعلق تنویر میں شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں سے دوستی کرنا ہو تو اس نفیس مضمون کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے ——————— (مدیر)

کسی مدبر نے نہایت ٹھیک کہا ہے کہ کسی شخص کی اصلی اور نسلی شرافت کا امتحان کرنا ہو تو یہ دیکھو کہ وہ آدمی دل سے عورتوں کی عزت کرتا ہے کہ نہیں، اور اس کو بچوں سے بھی محبت ہے کہ نہیں، جس میں یہ دو وصف نہیں ہیں وہ شریف تو ہرگز نہیں بلکہ انسان کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہے مستورات کی دل سے عزت کرنے کا مطلب علم حیوانات کے نقطۂ نگاہ سے کیا ہے، اس کو پھر کسی وقت پیش کیا جائیگا۔ آئیے آج بچوں سے محبت اور دوستی پر ہی کچھ وچار کریں۔

آپ کسی نہ کسی محلہ میں ضرور رہتے ہیں جہاں آپکے دوستوں اور اڑوسیوں پڑوسیوں کے بچے بھی ہیں۔ ذرا اپنے دل میں غیر جانبدارانہ طریقہ سے سوچئے کہ جب آپ دفتر سے یا اپنے کام سے گھر آتے ہیں۔ تو راستہ میں کتنے بچے آپ کو دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑتے ہیں اور آپ کی انگلی پکڑ کر آپکے ساتھ کچھ قدم چلنے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ اگر محلہ کے سو بچوں میں سے پانچ بھی آپ سے مانوس نہیں ہیں تو بُرا نہ مانیئے گا۔ آپ اچھے شہری نہیں ہیں جس آدمی کا کوئی بچہ دوست نہیں یعنی کوئی بچہ اس پر دوستی کے لئے اعتبار نہیں کر سکتا۔ وہ انسان، انسان کہلانے کے لائق نہیں ہے۔

لیکن آپ یاد رہے نہ بھولیں۔ بچوں سے دوستی کرنا اگرچہ مشکل کام ہے لیکن غیر ممکن نہیں۔ صرف بچوں کے دل کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

بچے کی دوستی کا فخر صرف اس کو حاصل ہو سکتا ہے جس پر بچہ کو پورا پورا اعتماد ہو جائے۔ بچے کا اعتبار جیتنا بھی مشکل سے ہے اور ذرا سی غلطی سے اڑ جاتا بھی جلدی ہے۔ لہٰذا بچے کی محبت کو پانا بھی مشکل ہے اور اس کو نبھانا بھی مشکل ہے۔ ہاں اگر آپ ان دونوں باتوں میں کامیاب ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے لئے بہشت کا دروازہ کھل گیا۔ وہ انسان بڑا خوش قسمت ہے۔

جس کو بچوں جیسے معصوم، سادہ، دھوکہ، فریب سے مبرا دوست ملیں جن کی محبت ہر بشر محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے بالکل نزدیک ہے۔ وہ ایسے پیار محبت چشمہ کا خدا تعالی ہے جو دنیا کی برائیوں گناہوں اور کیوں سے بالکل صاف ہے۔ جس انسان نے ایسے لذیذ درخت کا پھل نہیں چکھا۔ وہ بیچ مچ بدقسمت ہے۔

بچہ چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو۔ وہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا نہیں چاہتا۔

علم الاطفال (Padagogy) میں یہ ایک بنیادی اصول ہے جب تک آپ اس کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ وہ آپ کا دوست نہیں بن سکتا۔ یہ تو بات نہایت صاف ہے کہ غلام کبھی دوست نہیں ہو سکتا۔ بچہ اگر آپ کی ملکیت ہے تو آپکے برابر نہیں۔ دوستی برابر والے سے ہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا بچے سے دوستی کرنے کے لئے اس کو برابری کا درجہ دینا ہی ہوگا۔

بس یہیں آکر مشکل پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ کا دوست آپ کا ہم عمر ہو تو وہ آپکے جذبات کو سمجھ سکتا ہے اور آپ اس کے، یہاں عمر میں آپ

ہوتے ہیں۔ بچہ چھوٹا ہی سہی لیکن وہ اپنے آپ کو چھوٹا نہیں سمجھتا۔ وہ دنیا میں نو وارد ہے۔ آپ دنیا سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لہٰذا اپنی بزرگی اور دیرینہ تجربہ کاری کی وجہ سے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ بچے کے دل کو سمجھیں اور اس کی ذہنی سطح تک پہونچکر اس کے جذبات کی قدر کریں۔ بچوں کی دنیا میں پہونچ کر آپ ان کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ تو آپ کو ذرا بھی مشکل پیش نہ آئے گی۔ مثال کے طور پر آپ کا بچہ آپ سے اپنے ہمجولیوں کی باتیں چھیڑتا ہے آپ اس کو معمولی سمجھکر بچے کی بات سنی ان سنی کر دیتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے۔ اس صورت میں بچہ کبھی آپ کو اپنا ہمدرد یا دوست نہیں سمجھ سکتا۔ فرض کیجئے کہ آپ کا چھوٹا بھائی آپکے صاحبزادے کی سب باتیں خوب دھیان سے سنتا ہے بچہ کی ہر ایک بات کا جواب بچے کی ذہنی سطح کے مناسب ہی دیتا ہے بچہ کے منصوبے اور طریقے پر بچوں کی طرح بحث کرتا ہے اس سے بچہ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اس سے دلچسپی لے رہا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کا اپنا بچہ ہوتے ہوئے بھی آپ سے مانوس نہ ہوگا بلکہ آپکے چھوٹے بھائی سے زیادہ مانوس ہو جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں آپکے بچے کی دوستی کا مستحق آپ کا بھائی ہو آپ نہیں۔

ایک اور چھوٹی سی مثال پیش خدمت ہے۔ آپ جب بھی اپنے بچے سے یا کسی بچے سے بھی مخاطب ہوتے ہیں۔ تو اس کی عمر کے مطابق اس کو "تو" کہتے ہیں۔ وہ آپ کا لہجہ حاکمانہ یا بزرگانہ ہوتا ہے۔ بچہ آپ کو بزرگ سمجھکر آپکے رعب اور خوف سے آپ کو "جناب" ضرور کہیگا۔ اب آپ کا بھائی اس بچے سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کو "آپ" کہکر۔ بچہ اس کو بھی "جناب" ہی کہتا ہے۔ لیکن فرق زمین آسمان کا ہے آپ کو جناب "خوف کی وجہ سے اور اس کو جناب دوستانہ محبت کی وجہ سے اور دل سے کہتا ہے۔

میرا ایک ذاتی تجربہ "قارئین" کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ میں نے ایک انتظام کیا کہ میرے ایک دوست کا بچہ ایسا کھیل کھیلے کہ گویا وہ ایک دوکاندار ہے۔ سودا لگا ہے اور وہ خریداروں کو سودا دے رہا ہے۔ یہ انتظام شام کے وقت کیا گیا۔ سونے کا وقت ہو گیا اور جیسا کہ میں نے دوست سے کہہ دیا تھا اس نے اپنے بچے کو کہا "چلو بیٹا دکان بند کرو۔ اب سو جاؤ"۔ بچہ ناخوشی کے ساتھ کھیل کا سب سامان وہیں چھوڑ چھاڑ کر بستر پر جا لیٹا اس کے والد صاحب نے رات بھر دیکھا کہ بچہ بڑا بے چین تھا۔ اسے ٹھیک نیند نہ آئی اور کبھی کبھی ڈر کر جاگ اٹھتا تھا۔

یہی کھیل میں نے اپنے دوسرے دوست کے بچے کے لئے تجویز کیا لیکن شام ہوتے ہی والد نے اپنے بچے سے کہا "جناب آج تو آپ نے بڑا کام کیا آج سودا بیچ لیا۔ خوب خریدار تھے آپ نے سب خریداروں کو خوش بھیجا بھائی آج آپ بہت تھک گئے ہیں۔ اب دوکان بڑھا دیجئے چلئے کھانا کھائیے اور آرام سے سو جائیے۔ کل صبح انشاء اللہ پھر دوکان کھولنا اور خوب مال بیچنا"۔ بچہ نہایت اطمینان اور خوشی سے اپنے والد کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اپنا سامان یکجا کیا۔ الماری میں رکھا اور کھانا کھا کر چین سے سو گیا رات بھر وہ گہری نیند سویا۔ صبح سویرے وہ تر و تازہ اور نہایت خوش تھا۔

دیکھئے ایک والد کے ہمدردانہ اور دوستانہ رویہ نے بچے کو کتنا دوست بنا لیا۔ جبکہ اس سے بچے کے اندر اپنے پر بھروسہ بھی پیدا ہوا۔ دوسرے بچے نے محسوس کیا کہ والد اس کے دل کو سمجھ نہیں سکتا۔ اپنے پر یقین جاتا رہا شاید ایسا بچہ دنیا میں کوئی بڑا کام کر ہی نہ سکے۔

بچوں کو دوست بنانے کے لئے دوسرا اصول جو یاد رکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ بچہ کبھی کبھی جلدی اعتبار نہیں کرتا وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ آپ اس کے دلی رازوں کو اور خواہشات کو افشا کر دیں۔ اسی لئے وہ آپ کے گھورنے، خواہ مخواہ کے سوالات اور تلاش کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ عملی طور پر بچوں کے ڈاکٹروں کو اس بارے میں خاص طور پر بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ کامیاب ڈاکٹر جس طریقہ سے بچوں کو دوست بناتے ہیں۔

اُس کے بیان سے بات صاف ہو جائیگی۔ جب مطلب میں بچہ اپنے والد یا والدہ کے ساتھ آتا ہے، تو ڈاکٹر بچہ کے کمرہ میں گھستے ہی اگر اُسی کو غور سے دیکھنا شروع کر دے یا بچہ سے سوال کرنے لگے یا جھٹ بچہ کا پیٹ دیکھنے لگے تو یقین مانئے کہ بچہ ڈاکٹر کے پاس آئے گا ہی نہیں، سوالوں کا جواب دینا یا پیٹ دکھانا تو در کنار رہا۔ کامیاب ڈاکٹر بچہ کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ بچہ کے والد سے باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بچہ خیال کرتا ہے کہ یہ ڈاکٹر کوئی اپنا ہی ہوگا۔ جس سے والد صاحب اس طرح بے تکلف باتیں کرتے ہیں۔ اس خیال کے آنے کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر نے ایک اہم فتح کر لی۔ اب ڈاکٹر باتوں باتوں میں بچہ کی پڑھائی، اُس کے کھیل کود کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اس بات سے محتاط رہتا ہے کہ بچہ کے متعلق بات کرتے ہوئے اُس کا ذکر عزت سے کرے اور بچہ کی پڑھائی وغیرہ کی تعریف کرے۔ ابھی تک بچہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ ڈاکٹر اُس کے والد کا کوئی دوست ہے لیکن وہ اب خیال کرتا ہے کہ یہ ڈاکٹر تو اُس کا بھی کوئی مہربان ہے۔ بچہ اب آہستہ آہستہ ڈاکٹر کے پاس کھسک آتا ہے۔ ڈاکٹر اُس کی طرف اب بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ بچہ کے والد کو کوئی چمکیلی یا خوبصورت چیز دکھاتا ہے جیسے کوئی کھلونا وغیرہ، بچہ کا والد اسے دیکھ کر قدرتی طور پر ڈاکٹر کو واپس کریگا۔ لیکن اس سے بچہ کے اندر زور سے خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی اس کھلونے کو دیکھے بچہ کہتا کچھ نہیں بلکہ ڈاکٹر کی طرف للچائی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بس ڈاکٹر نے میدان مار لیا۔ وہ جلدی ہرگز نہیں کرتا کیونکہ جلدی کرنے سے کام بگڑ جاتا ہے بلکہ بڑے اطمینان سے کھلونا ہاتھ میں لیکر بچہ سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے "جناب یہ کیسا خوبصورت کھلونا ہے۔ میں نے فلاں دکان سے لیا تھا کیا آپ اسے دیکھیں گے" بچہ چاہتا تو یہی تھا۔ وہ کھلونا لیکر دیکھتا ہے اور ڈاکٹر اسے بات چیت کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ کھلونے کے متعلق بات ہوتی ہے۔ پھر بچہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا جاتا ہے بچہ اس کو سہہ جاتا ہے۔ پھر بیماری کے متعلق بات شروع کی جاتی ہے۔ بچہ جواب دیتا ہے۔ زبان دکھاتا ہے۔ پیٹ دکھاتا ہے۔ ڈاکٹر اس بات کا دھیان رکھتا ہے کہ کبھی سخت ہاتھ نہ لگائے۔ جس سے بچہ کا اعتماد جلد ہی اٹھ نہ جائے۔ مطلب یہ کہ وہ بچہ ڈاکٹر کو اپنا دوست سمجھنے لگ جاتا ہے اور جب بھی کبھی بیمار ہو اُس ڈاکٹر کے پاس جانے میں اُسے تسلی ہوتی ہے۔

اس بیان سے عیاں ہے کہ بچہ کو دوست بنانا کتنا صبر آزما، حوصلہ اور بردباری کا کام ہے، بچہ کو برابری کا درجہ دینا پڑتا ہے اور بچہ کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ ہم اُس کے خیر خواہ ہیں۔ دشمن نہیں، بچہ کی مشکلات کے بارے میں اُن سے دوستانہ بحث کر کے بچہ کے دماغ سے ہی اُن مشکلات کا حل نکالنا پڑتا ہے جس سے بچہ یہ نہ سمجھے کہ ہم اُسے نصیحت کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم بھی اُس کی مشکلات پر اُسی طرح سے دوچار کرتے ہیں جیسے وہ ہماری ذاتی مشکلات ہوں۔ اُن مشکلات کا حل ہمارے پاس ہوتے ہوئے بھی بچہ کو نہیں بتاتے کیونکہ پکا پکایا حلوہ کھانے میں اتنا مزہ نہیں جتنا کہ خود حلوہ بنا کر کھانے میں۔ اس سے بچہ کی دماغی نشوونما بھی ہوتی ہے اور بچہ کو غور و خوض کی عادت پڑتی ہے وہ زندگی کی مشکلات پر خود غور و فکر کرنے کے لائق ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے ہی کئی نئی ایجادیں کر سکتے ہیں۔ اور قوم کو ترقی کی شاہراہ پر لے جاتے ہیں۔

موجودہ حالت کیا ہے۔ والدین بچوں کو دوست نہیں سمجھتے۔ اُن کی ہر ایک بات پر اُن کو بیوقوف سمجھ کر جھڑک دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ بچوں کے بھی اپنے بچگانہ مشکلات اور پیچیدہ معاملات آتے ہیں۔ جنھیں بچہ اپنے ڈھنگ سے ہی حل کرنا چاہتا ہے۔ آخر وہ عمر رسیدہ تو ہے نہیں کہ ہماری طرح سوچے اور فیصلہ کرے۔ اگر اُسے اپنے طریقہ سے سوچنے کا موقعہ نہ دیا جائے گا تو اُس کی دماغی ترقی کیسے ہو سکتی ہے۔ تجربات کیسے حاصل کر سکے گا۔ البتہ ہم بچہ کے دوست بن کر اُس کی پوزیشن میں اپنے آپ کو ڈال کر اُس کی سیرت [illegible] میں ہی اُس کی مشکلات حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اُس بچہ کا اور قوم کا بھلا اسی میں ہے کہ ہم بچہ کا اعتماد حاصل کر کے اُس کے دوست بن جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کے دوست بننے سے فائدہ۔ جیسا عرض کیا جا چکا ہے اگر بچہ کو بات بات پر دبایا جائے اور یہ احساس کرایا جائے کہ وہ کم عقل ہے تو قدرتی طور پر اُس بچہ میں کسی معاملہ پر سوچنے کی قوت پیدا ہی نہ ہوگی۔

وہ ہر وقت بزرگوں کی صلاح اور راہبری کا متلاشی بنا رہے گا۔ جب تک آپ بچوں کو انگلی سے لگائے پھریں گے۔ تب تک بچے میں اپنی مدد آپ کرنے کی ہمت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ایسا بچہ ذرا سی مشکل کا پڑنے پر ماں کے پاس ہی بھاگ کر آجائے گا یا دوستوں سے پٹ کر گھر میں گھستا پھرے گا۔ موقع پر کیا کرنا ہے اُسے کچھ سوجھےگا ہی نہیں۔ اگر آپ اُسے برابری کا درجہ دیں گے اور دل میں یہ بات بٹھائیں کہ بچے قوم کے آئندہ شہری اور رکن بننے والے ہیں۔ تو آپ کبھی برداشت نہ کریں گے کہ یہ بچے دماغی اپاہج رہیں اگر آپ کے دل میں ملک اور قوم کی محبت ہے تو آپ بچوں کو اعلیٰ درجہ کے شہری بنائیں گے۔ آخر نئے خیالات اور نئی معلومات کا کام نئے خون اور نئے دماغ ہی کر سکتے ہیں۔ آپ اور ہم جو دنیا کے تھپیڑوں سے مرجھا چکے ہیں۔ جسم کمزور دماغ بے لچک اور تنگ نظر اور یہ نگاہ والے ہیں کہاں دنیا کی دوڑ میں حصہ لے سکتے ہیں اسی لئے تو قدرت نے موت ایجاد کی ہے کہ ہمارا صفایا کر کے نئی نسل اور پود کے لئے جگہ بنا دے۔ اگر اُس پود کو ہم نے دبا رکھا۔ اُس کی دماغی نشو و نما نہ ہونے دی تو یقین جانئے کہ قوم آج بھی غارت ہے اور کل بھی، ہر ملک میں بزرگوں کی سب اُمیدیں بچوں پر ہی لگی رہتی ہیں۔ بڑی عمر کا آدمی ڈرپوک ہوتا ہے، نوعمر بے خوف چست، اور دلیر ہوتا ہے، قوم کو مرجھائے پھول نہیں چاہئیں۔ تازہ کلیوں کی ضرورت ہے جو کھلیں اور اپنی مہک اور خوبصورتی سے باغ عالم کی رونق کو دوبالا کریں۔ قوموں کی آزادی میں بڑی عمر والوں نے روڑے ہی اٹکائے ہیں۔ لیڈروں نے ہمیشہ نوجوانوں کے بل بوتے پر ہی آزادی حاصل کی ہے۔ کیا آزاد ممالک کی تواریخ اس بات کی گواہ نہیں ہیں۔ پھر ہم کیوں اپنے ہونہاروں کے دماغ پر قفل لگائیں۔ ہم ان میں آزادانہ اور اونچا سوچنے کی طاقت اور ہمت پیدا کیوں نہ کریں۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم بچوں کو آزادی دیں، برابری کا درجہ دیں۔ البتہ ایک خطرہ ہے کہ بچے کہیں اس آزادی کو ناجائز طور پر استعمال نہ کریں۔ اور اس آزادی کی آڑ میں آوارہ بدچلن، سُست اور گمراہ نہ ہو جائیں۔ بزرگوں کا کام صرف اتنا ہے کہ بچوں کو آزادانہ سوچنے دیں۔ لیکن جہاں وہ گمراہ ہونے لگیں اُنہیں دوستانہ طریقہ سے راہ راست پر لائیں۔ جس سے وہ ہماری بات اس اعتبار پر مانیں کہ ہم اُن کے خیر خواہ ہیں۔ اسی لئے بچوں کا دوست بننا نہایت ضروری ہے۔ کیا ہمیں اسی سے کم فائدہ ہے کہ ہم یہ دیکھ کر خوش ہوں گے کہ ہم کیسی ہوشیاری سے بچوں کے دوست بن کر اُن کو راہ راست پر رکھتے ہیں اور اُن کے لئے آزاد اور نیک شہری بننے کا ماحول اور حالات پیدا کرتے ہیں۔

اصل میں بات یہ ہے کہ اگر آپ بچوں کو نصیحتوں پر نصیحتیں کریں تو وہ کند ذہن اور کند عقل کے ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ ان کو آزاد چھوڑتے ہیں تو وہ آوارہ اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ دونوں ہی مشکلات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کوئی عمدہ طریقہ نکالنا چاہئے۔ جس سے بچوں کی دماغی نشو و نما بھی آزادانہ ڈھنگ پر ہو اور بچے کند عقل اور آوارہ بھی نہ ہوں۔ اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بزرگ بچوں کے دوست بنیں۔ چونکہ بچوں کی بھی روح غالب کے اس شعر کو گنگناتی ہے ؂

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی غمگسار ہوتا کوئی رازدار ہوتا

کیا قوم کے دانشمند اور تعلیم کے پاسبان نیز والدین اس طرف دھیان دیں گے۔ کاش ہم یہ سمجھتے کہ بچوں کے دوست بننے میں ہی قوم اور ملک کی بھلائی ہے۔

اس ماہ ہمیں اس خبر سے بے حد قلق ہوا کہ اُردو کے نامور محقق اور ادیب شرف عالم صاحب آرزو جلیلی ۱۵ اگست کو اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر دے۔ ادارہ تنویر اُن کے غم میں شریک ہے۔

آپ کی مختصر سوانح حیات جناب مظفر حسن صاحب مظفر نے تحریر فرمائی ہے جو اسی اشاعت میں ہدیۂ ناظرین ہے۔ آرزو صاحب نام و نمود کی دنیا سے بے پرواہ اور بے نیاز محقق ادیب و شاعر تھے۔ دکنوں کے اہل رسے کبھی کبھی آپ کی چیزیں شائع ہو جاتی تھیں لیکن آپ کی ادبی کاوشیں لوح کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ اُمید کہ مظفر حسن صاحب تنویر کے لئے مرحوم کی غیر مطبوعہ نگارشات مرحمت فرمائیں گے۔ مدیر

(مسلسل ناول)

نغمۂ موت

از جناب مولانا عبدالباری صاحب

ابراہیم بے خواب کی دنیا سے چونکا تو اُس نے دیکھا کہ رات بہت زیادہ آچلی تھی۔ وہ نیچے کی منزل پر آیا۔ ایک کیبن سے روشنی کی کرنیں، چھن چھن کر آرہی تھیں۔ جوں ہی وہ اُس کے قریب پہنچا کیبن کا دروازہ کھلا۔ اور مس کوسٹیلا کا حسین اور گل فروز چہرہ برآمد ہوا۔ ابراہیم بے کو دیکھتے ہی اُس نے بہت دھیمی آواز سے کہا کہ "کمرہ میں حبس کی کیفیت ہے، کھڑکی کا شیشہ کھولتے کھولتے تھک گئی، مگر نہ کھلا۔ ناخن بھی کٹ گیا، شاید تم سے کھل جائے۔"

ابراہیم بے کیبن میں داخل ہوا، اور اُس نے فوراً کھڑکی کا دروازہ کھول دیا۔ جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ مس کوسٹیلا کا قدم بھی ڈگمگا رہا تھا۔ وہ اسی بہانے سے ابراہیم بے کی طرف گر گئی۔ ابراہیم بے نے فوراً سنبھالا اور اپنے بازو پر روک لیا۔ مس کوسٹیلا تھوڑی دیر اسی طرح، ابراہیم بے کے آغوش میں پڑی رہی اور اُس کے بعد اُس نے دبی زبان میں کہا کہ:-

"تم کتنے مضبوط ہو، بازو کیسے سڈول ہیں۔"

"تو کیا تم نے مجھے بالکل مزدور اور لاغر ہی سمجھ رکھا تھا"

مس کوسٹیلا نے، ابراہیم بے کو ہمدردی، محبت اور رحم کی ملی جلی نگاہ سے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اُس نے کہا

"تم واقعی بڑے بہادر ہو اس طرح ہشاش بشاش رہتے ہو جیسے تمھیں کچھ دُکھ ہی نہ ہو۔"

ابراہیم بے۔ "یہ تم کیا کہتی ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔"

مس کوسٹیلا چپ تھی اور ابراہیم بے تعجب سے اُس کو دیکھ رہا تھا۔ مس کوسٹیلا کے لب تھرتھرا رہے تھے: جیسے وہ بمشکل سے، ضبط کر رہی ہو۔ ابراہیم بے کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اور مس کوسٹیلا اسی طرح دم بخود کھڑی تھی۔ آخر اُس سے ضبط نہ ہوسکا اور آخر میں بیگوں آنکھوں سے گلابی رخساروں پر، آنسو کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔ ابراہیم بے نے اُس کو اپنے قریب کھینچ کر، تسلی دینے کی کوشش کی اور محبت آمیز لہجہ میں پوچھا

"تم ایسی دل برداشتہ کیوں ہو رہی ہو؟ کوئی تکلیف ہے؟ مجھ سے تو کہو، آخر بیٹھے بیٹھے، یہ آنسو کیوں نکل آئے؟"

مس کوسٹیلا نے، ابراہیم بے کی انگلیوں کو دباتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا کہ:-

"مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ . . کہ تمھیں کیا دُکھ ہے۔ شمبرگ نے رازدارانہ طور پر سب بتا دیا ہے"

یہ کہہ کر وہ پھر رو پڑی اور روتے ہوئے اُس نے کہا کہ:-

"لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم اچھے نہیں ہوسکتے۔ میرے ایک رشتہ دار کو بھی یہی بیماری تھی لیکن انھوں نے تو ۷۲ برس کی عمر پائی۔ تمھیں بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔"

ابراہیم بے ذہین تو تھا ہی، فوراً معاملہ کی تہ کو پہنچ گیا اور محبت سے مس کوسٹیلا کے مخملی، اُبھرے ہوئے بازو کو سہلاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"یہ تمھاری بڑی مہربانی ہے کہ میرے جیسے اجنبی کیلئے تمھارا دل بھر آیا۔"

"اب تم اجنبی نہیں ہو"

اجنبی تو ہوں، بہر حال، شوبرگ سے یہ سنکر کہ میری عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے، تمہارا دل رحم اور ہمدردی کے جذبے سے لبریز ہو گیا۔ لیکن سوچو تو، ہمیں موت سے کیوں گھبرانا چاہئے۔ موت کو انتظار کی تکلیف کیوں دیں؟ اُسی سب کے آغوش ہیں۔ ہر طرح کے دُکھ سے آرام ملتا ہے"

"لیکن تم کو اُمید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے"

"اُمید؟ یہ وہ لفظ ہے جو شرمندۂ معنی نہ ہوا!"

"تمہاری بے پروائی قابل تعریف ہے"

"نہیں، میں غافل یا بے پروا نہیں ہوں، میں آخر وقت تک مقابلہ کروں گا۔ مجھے ڈاکٹروں کی رائے سے کچھ مطلب نہیں۔ میں اُن کی رائے سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہوں، سنا تم نے؟"

مس کوسٹیلا، اب بھی رحم اور محبت کی ملی جلی نگاہ سے اُس کو دیکھ رہی تھی، تھوڑے سے سکوت کے بعد اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

"میں چاہتی ہوں......کہ..... اگر میری جان تمہارے کام آسکے تو"

بیوقوف کوسٹیلا، تم اتنا گھبرا گئیں، حوصلے سے کام لو۔ تمہاری جان کی ضرورت نہیں۔ تمہارے یہی آنسو میری بیماری کو اچھا کر دیں گے محبت کی ایک نظر، بڑے سے بڑے دُکھ کو آرام دے سکتی ہے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ ڈیفنی، کہ میرے لئے ان بڑی بڑی شفاف آنکھوں سے محبت کے آنسو چھلک پڑے۔ ان آنسوؤں نے تو تمہارے حسن کو اور بھی چمکا دیا۔ بھیگی ہوئی پلکیں، بھیگے ہوئے رُخسار، حسین چہرے کو حسین تر بنا دیتا ہے۔ تم، غازہ، پاؤڈر، رنگ، اسنو کی جگہ آنسوؤں سے، اپنے چہرے کی دل آویزی کو کیوں نہیں بڑھاتی ہو؟ ہنستے ہوئے چہرے کی دل آویزی تسلیم ہے، لیکن اُداس اور مغموم چہرے کی لطافت و سحر آفرینی کا کیا پوچھنا ہے۔ لیکن اس طرح بیکار آنسوؤں کا بہانا بھی تو اچھا نہیں۔ مانا کہ اس سے حسن و دل آویزی بڑھ جاتی ہے، لیکن جس طرح گلاب کی پتیاں، شبنم پڑنے سے مرجھا جاتی ہیں، اُسی ملال و اندوہ کی کثرت سے، چہرہ مرجھا جاتا ہے، اور آخر، ایک اجنبی کے لئے اس قدر اپنے دل کو دکھ دینے کی ضرورت بھی کیا ہے"

"تم مجھے نہیں چاہتے ہو۔ شریر اور ناکارہ لڑکی سمجھ کر نفرت کرتے ہو۔"

"نہیں، ڈیفنی، تم نے غلط سمجھا میں تمہیں چاہتا ہوں، لیکن میں..."

"لیکن؟ بولو، چپ کیوں ہو گئے؟ یہی کہو گے نا کہ تم کو انگریز لڑکیوں سے نفرت ہے"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں اُس عورت کے آغوش محبت کو پسند نہیں کرتا۔ جو از راہ رحم، کشادہ ہوا ہو۔ اچھا اب تم آرام کرو۔ دیکھو۔ اب پھر کچھ بیکار کی باتیں سوچ سوچ کر، اپنے دل کو نہ دکھانا۔ اچھا رخصت"

ابراہیم بے، مس کوسٹیلا کو تسلیاں دے کر چلا گیا۔ راستے میں ڈاکٹر شوبرگ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اُس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا:۔

"اچھا یہ بات ہے۔ خوب دل کھول کر مزے اڑاؤ، کہ

خوش باش دمے کہ زندگانی این ست

آٹھواں حصہ

کئی دنوں کے بعد بندرگاہ اسکندریہ کا ساحل نظر آیا۔ مس ڈیفنی اور مس لوئز کی باچھیں کھل گئیں۔ جہازی زندگی کی یکسانیت سے وہ تنگ آچکی تھیں انسانوں کی چہل پہل، بازار کی رونق، ناچ تماشے کی دلچسپیوں کے لئے دل گدگدانے لگا۔

اگرچہ، یہ پروگرام میں نہ تھا، لیکن حسن اور حسین عورتوں کی خواہش کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ اندر سیڈا جہاز اسکندریہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوگیا۔ شومبرگ نے، دو دن ٹھہرنے کی اجازت دی تھی۔

اسکندریہ کی بندرگاہ، مشرق و مغرب کا سنگم ہے۔ یہاں مشرقی تہذیب، اور مغرب کی نوزائیدہ تہذیب دونوں کے جلوے نظر آتے ہیں، جہاز کا لنگر انداز ہونا تھا کہ، چھوٹی چھوٹی کشتیاں، مسافروں کو اتارنے کے لئے دوڑی ہوئی پہنچیں، ساحل پر قلیوں کا ہجوم تھا ادھر ادھر مجمع میں پولیس کے آدمی بھی کھڑے تھے۔ ہوٹل کے نمائندے بھی زرق برق لباسوں میں، مسافروں کو پھسلانے اور بہکانے کے لئے ساحل پر بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

ڈاکٹر شومبرگ کونٹ مانٹرکیپ، مسٹر برنیٹ، ابراہیم بے عرشے پر کھڑے، ساحل کا دل آویز منظر دیکھ رہے تھے مس کوسٹیلا اور بیگم لولو بھی، پاس ہی انتظار میں کھڑی تھیں، کہ کب کشتی لگے اور وہ ساحل پر اتر پڑیں، مس کوسٹیلا نے شومبرگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

" کتنے دن ہوگئے کہ مجھے ناچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پاؤں کی نس نس دکھ رہی ہے۔ کیوں، لولو ہے نا "

" بالکل درست، ڈاکٹر! تمہیں کیا معلوم، بیچاری مس کوسٹیلا نے، پورے ۲۴ گھنٹے، اپنی آرائش پر صرف کئے ہیں "

" باتیں تو تم خوب بناتی ہو، لولو "

تھوڑی دیر کے بعد، مس کوسٹیلا، بیگم لولو، نواب مانٹرکیپ، ڈاکٹر شومبرگ وغیرہ، شام کے لباس پہنکر، ڈرائنگ روم میں آئے، شومبرگ ان لوگوں کو یہیں چھوڑ کر، ابراہیم بے کے کمرے میں گیا۔

ابراہیم بے کوئی ناول پڑھ رہا تھا، شومبرگ نے دستک دی تو اس نے دروازہ کھول دیا، شومبرگ نے، معذرت خواہ انداز میں کہا کہ:۔

" آج میں نے کچھ دوستوں کو، محمد علی کلب میں ڈنر کی دعوت دی ہے۔ تمہارے بغیر یہ محفل پھیکی رہے گی مگر تمہارا، شہر میں داخل ہونا، شاید مناسب نہ ہو "

" تمہاری محبتوں کا دلی شکریہ، واقعی میرا جانا مناسب نہ ہوگا۔ دس بیس آدمی تو پہچان ہی لیں گے "

" تم نے آج کا اخبار تو نہیں دیکھا ہوگا۔ اب تک اخباروں میں تمہارے فرار ہونے کا چرچا جاری ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہیں ہو، اور جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلفی سے مانگ لینا۔ ایک بات میں کہہ دیتا ہوں کہ اگر تم سے نچلا نہ بیٹھا گیا، اور رات کے سناٹے میں تم باہر نکل گئے تو پھر میں قاہرہ کے ترکی سفیر کو تمہارا نام اور پتہ صاف صاف بتا دوں گا۔ دس بارہ دن کے بعد حالت بدل جائے گی، لوگ تمہارا قصہ بھول چکے ہوں گے، اس وقت اگر تمہاری خواہش ہوئی تو خوشی سے تم کو یہاں سے چلے جانے کی اجازت دونگا لیکن میں یہ تو پسند نہیں کرسکتا کہ اب جبکہ تم کو ترکی حکومت کی تلوار سے صاف بچا کر نکال لایا ہوں، تم کو پھر انہیں درندوں کے سپرد کردوں کم از کم ایک برس تو تمہیں آزادی سے زندہ رہنا ہی چاہئے۔

آدھی رات ڈھل چکی تھی، چاند کی کرنیں سمندر کے پانی سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں، اسکندریہ کی بندرگاہ پر بھی چہل پہل جاری تھی اس قدر پر کیف منظر کے باوجود ابراہیم بے اپنی کیبن میں، غمگین و اداس بیٹھا ہوا تھا۔ بار بار وہ اخبار پر نظریں جما کر پڑھنا چاہتا تھا، لیکن نظروں میں تو کوئی اور ہی سمایا ہوا تھا، دل کہیں تھا، آنکھیں کہیں تھیں۔

(باقی)

سن رائز پکچرز کا لاجواب شاہکار
گھر کی لاج
سماج کی ٹھکرائی ہوئی
ایک حسین دوشیزہ کی
درد بھری کہانی
جسے سن رائز پکچرز نے
زر کثیر صرف کر کے تیار
کیا ہے اس میں پربھات اور
نیو تھیٹرز کے نامور اداکاروں نے لاجواب کام کیا ہے۔
اداکاران:۔
شانتا ہبلیکر۔ نذیر۔ جگدیش
مرزا مشرف۔ کلیانی۔
بے۔ بی کوشلیا۔ ہادی
مجید وغیرہ
ڈائرکٹر:۔
دی۔ ایم۔ ویاس
امپیریل سنیما لیمنگٹن روڈ

لمعات

قومیت کا بھوت

یورپ اس بھوت کا جنم داتا ہے اور غالباً اس کا سب سے بڑا سبب یورپ کی تنگ مایہ سرزمین ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ضروریات کی چیزیں کم ہوں گی اور انسان بھوکے مریں گے تو انسانیت کا جذبہ اُن میں کم ہو جائے گا اور ہر انسان خود غرض بن کر حیوان کی طرح اپنی زندگی اور بقا کے لئے کوشش کرے گا۔ اس لئے وہاں کے لوگ جغرافیائی سہولت کے نقطۂ نظر سے چھوٹی چھوٹی قوموں میں بٹ گئے۔ اور ہم چو من دیگرے نیست کا خبط اتنا بڑھا کہ انسانیت کو ختم کر دیا۔

یورپ کی یہ وبا اگر یورپ میں ہی رہتی تو اس کا جواز سمجھ میں آ سکتا تھا مگر یورپین قوموں کی کوششوں اور پروپگنڈا نے اسے تمام دنیا میں پھیلا دیا۔

ہندوستان والوں کو اس وبا کا شکار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ ہندوستان کی مٹی زرخیز ہے اور یہاں کے باشندوں کا "ظرف آدمیت" اتنا بڑا ہے کہ چیونٹی کو مارنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ فراخ دل ہیں اور اپنی دولت میں باہر والوں کو بھی حصّہ دیتے ہیں۔ دیا دھرم اور اہنسا یہاں کے مذہب کی بنیاد ہے۔

رہا اسلام وہ قومیت سے زیادہ انسانیت کا حامی ہے اُس کے نزدیک ہر مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطّے کا ہو، بھائی بھائی ہے۔ ہم خیال و ہم عقیدہ انسانوں دماغی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ یہ رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے اس اصول کو کون نہیں مانتا۔ اس لئے تمام دنیا کے مسلمان دماغی اور روحانی طور پر ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ اور ایک دوسرے کے مددگار۔ ایسے لوگ پان اسلام ازم کہیں یا کچھ اور مسلمانوں کو یہ جذبہ اپنے اندر سے ہرگز نہیں نکالنا چاہئے۔ جو اس کی مخالفت کرے وہ طاغوتی قومیں بھی جانی چاہئیں۔ جن کا مقصد مسلمانوں کی شیرازہ بندی کو منتشر کر کے انہیں کمزور کرنا اور مٹا دینا سمجھا جا سکتا ہے۔

اخوت اسلامی ہندوستانی مسلمانوں کی حب الوطنی میں ہرگز حائل نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان اپنے گھر کی حفاظت کے ساتھ پڑوسیوں کے حقوق کی بھی نگہداشت کرتا ہے اور اپنی ہم خیال برادری کا بھی خیر خواہ اور مددگار ہو سکتا ہے۔

اسی مثال کو سامنے رکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کو دینی اور دنیوی قدم اُٹھانا چاہئے۔ وہ بیک وقت سچے محب وطن، سچے انسان، اور سچے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ تینوں باتیں لازم و ملزوم ہیں اگر ان میں سے ایک بھی نہیں تو باقی دو نامکمل بلکہ ناقص ہو جاتی ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ساری دنیا میں اکثریت مسلمانوں کی ہے مگر اس پر بھی یہ قوم ابتر حالت میں ہے۔ اور ہر جگہ غلام ہے۔ حجاز جو مسلمانوں کے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُسے باقی تمام دنیا کے مسلمانوں کی رہبری کرنا چاہئے تھا۔ مگر افسوس —— مصر۔ افغانستان۔ ایران۔ عراق۔ شام۔ یمن۔ فلسطین۔ ٹرکی ان سب پر قومیت کے بھوت کا منحوس سایہ مسلط ہے۔ اور یہی ان کی تباہی اور بربادی کا خاص سبب ہے۔ رہ گیا ہندوستان اور اس کے مسلمان، سو یہ غلام ہیں انھیں اپنے گھر کے بندوبست کی بھی اجازت نہیں ہے۔ باہر کے معاملات میں یہ زبان کیسے ہلا سکتے ہیں۔ ان کے لئے "قومیت کا جذبہ اس حد تک ضروری ہے کہ اپنا گھر (وطن) آزاد کرا سکیں۔ تاکہ پھر گھر سے باہر پڑوسی اور اپنے دماغی روحانی رشتہ داروں یعنی اور مسلمانوں کی بھی مدد یا فرائض کا خیال کر سکیں۔

یورپ کی چھوٹی چھوٹی قوموں نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کو تقسیم کر کے اُن کی طاقتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے

تاکہ اُن پر حکمرانی میں آسانی ہو۔

اس لحاظ سے اُن کے ذہن اور سیاست میں ہندوستان کی تقسیم کا نقشہ ضرور ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں ان کا عین مفاد ہے۔ ہندوستانیوں کو چاہئے کہ وہ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ہم وطنی کے ناطے سے بھائی ہیں بھائیوں کو مل کر ایک ہی گھر میں رہنا ہے۔ ورنہ اگر اس "سوت کی انٹی" کے تار بکھیرے تو دشمن دونوں کو جلد آسان ہی سے توڑ تاڑ کر رکھ دیگا اتفاق میں طاقت اور برکت ہے اور جب یکی ہوگی ہمارا وطن آزاد ہوگا تب ہی ہم باہر کے مسلمانوں کی بھی مدد کر سکیں گے۔ یا اُنھیں صلاح مشورہ دے سکیں گے۔

کچھ دن ہوئے بی بی سی سے

پریزیڈنٹ روزویلٹ کے روزمرہ کے پروگرام کو نشر کیا گیا تھا۔ اس میں اناؤنسر نے شروع میں ہی یہ کہا کہ روزویلٹ صبح سات بجے اُٹھتے ہیں۔ ہمیں اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی شخصیت اتنی دیر تک خراٹے بھرتی ہے اس کے برعکس جسے پریزیڈنٹ روزویلٹ چت کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ہٹلر، وہ صبح چار بجے اُٹھتا ہے۔ ہم روزویلٹ صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اگر ہٹلر کو شکست دینا چاہتے ہیں تو انھیں پہلے اس دائرے میں اُس سے جیتنا چاہئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ سات بجے تک سونے والا۔ چار بجے جاگنے والے۔ اور نیند جیسی دلکش چیز پر حاوی ہونے والے کو کیسے جیتے گا؟

اگر پریزیڈنٹ صاحب کو دیر تک سونا اچھا معلوم ہوتا ہے تو بھی ہمارا اُن کو دوستانہ مشورہ ہے کہ جب تک جنگ ہے وہ کم از کم پہلے چار بجے اُٹھ جایا کریں، جنگ کے بعد وہ ۸ بجے تک سو کر اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں۔

کرکٹ سے ہمیں یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہمارے ملک کے راجواڑے جو ہمیشہ گہری نیند سوتے رہتے ہیں، ذرا چونکے ہوئے ہیں۔ اور انھیں وطن اور ہندو مسلم اتحاد کا کچھ خیال آیا ہے۔ اسی سلسلے میں جام صاحب نوانگر نے اس سال بمبئی کے ہندوستان کے سب سے بڑے کرکٹ پینٹنگولر میچ کو فرقہ وارانہ بنیاد پر کھیلنے کے خلاف آواز بلند کی ہے اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی ریاست سے اس فرقہ وارانہ بنیاد پر ہونے والے کھیل میں شرکت کے لئے اپنے یہاں کے ایک آدمی کو بھی اجازت نہ دینگے۔

ہم ہندوستان کی دیگر تمام انجمنوں کو جو اس کھیل میں شرکت کرتی ہیں مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بھی جام صاحب کی تقلید کریں۔ اور فرقہ وارانہ ٹیمیں نہ بنا کر کھیل کھیلیں۔ آخر تمام دنیا میں میچ ہوتے ہیں اور یہ کہیں نہیں سنا گیا کہ یورپ کے فلاں شہر میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ اور گریک چرچ مذہبی بنیاد پر ٹیمیں بنا کر کبھی کرکٹ کے میدان میں اُترے ہوں!

بمبئی یونیورسٹی

نے اب تک اور صوبوں کی یونیورسٹیوں کی طرح علوم مشرقی کے امتحانات کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔ بمبئی میں اب ہر قوم اردو اور ہندی سیکھ رہی ہے۔ چونکہ سب جانتے ہیں کہ ہندوستانی قومی زبان ہے۔ اس لئے اب بمبئی یونیورسٹی کو بھی اردو ہندی کے امتحانات کے لئے انتظام کرنا چاہئے تاکہ بمبئی کے رہنے والوں کو ادیب فاضل، منشی فاضل، اور ہندی پربھاکر وغیرہ امتحان دینے کے لئے دہلی، لاہور، الہ آباد، لکھنؤ یا مدراس وغیرہ کا طویل سفر نہ کرنا پڑے ان امتحانات کے بعد انگلش میٹرک، ایف۔ اے، بی۔ اے کے لئے بھی یہیں جانا پڑتا ہے۔ اس سے بڑی دقت ہوتی ہے اور ہندوستان کی خاص زبانوں اور اس کے قدردانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

ہم مقامی انجمن ترقی اردو اور اس کے روح رواں پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی توجہ اس طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی اردو اخبارات اور رسائل سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس ضروری امر کی طرف توجہ دیں اور یونیورسٹی کو اس امر پر مجبور کریں کہ وہ پنجاب اور یوپی بلکہ مدراس کی طرح یہاں بھی اردو فارسی کے امتحانات، ادیب، ادیب عالم ادیب فاضل، منشی، منشی فاضل، منشی عالم، کی منظوری دیدے۔ تاکہ *

* صوبہ بمبئی کے رہنے والے یہ امتحانات یہیں دے سکیں۔ اور بعد میں انگلش کے امتحانات بھی یہیں دے کر ڈگریاں حاصل کر سکیں۔

نصف الملاقات

مسز ڈاکٹر شیروانی صاحبہ

تنویر کی سب سے زیادہ قدردان، مہربان، خیرخواہ اور محبت کرنے والی بہن ہیں آپ کی محبت اور عنایات کا شکریہ ادا کیا ہی نہیں جاسکتا۔ آپ نے اپنے محبت نامے میں تحریر فرمایا ہے کہ "تنویر کے چندے میں اضافہ کر دیا جائے تاکہ جنگ کی وجہ سے جو مالی مشکلات درپیش ہیں اور اس سلسلے میں جو مجھے دماغی و جسمانی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ اس میں کچھ تخفیف ہو جائے اور میں یکسوئی سے ناظرین تنویر کی خالص ادبی خدمت کر سکوں۔

جواباً عرض ہے کہ چندہ اس قدر کم ہونے پر بھی اردو داں طبقہ کی طرف سے حوصلہ افزا جواب نہیں ملتا۔ اس لئے میں ان کی جیب پر مزید بار ڈالنا ناپسند کرتی ہوں۔ جب تک میرے قویٰ ساتھ دیں گے میں یہ بار صرف اپنے آپ تک محدود رکھوں گی۔

ہاں اتنا عرض کرنا چاہتی ہوں کہ اگر ہر خریدار صرف ایک ایک خریدار اپنے تنویر کے لئے اور مہیا کرے تو اُن کی تھوڑی سی توجہ تنویر کے لئے بڑی مدد ہوگی اور اُن پر بھی مزید کسی قسم کا بار نہ پڑے گا۔

برادر محترم سید محمد صاحب بھوپالی

کی نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس ماہ تنویر کے دو خریدار بنائے آپ ایسے ہمدرد مضمون نگار اور مددگار بھائی کی عنایات کا شکریہ ادا کرنے کو الفاظ کہاں سے لاؤں؟ بہن قریشہ خاتون صاحبہ سے ابتک ملاقات نہیں ہو سکی۔ ملنے کی کوشش میں ہوں۔

محترمہ بہن فاطمہ قیصری صاحبہ اور شاہ بانو صاحبہ

حلقۂ تنویر میں شامل ہونے کی دلی مبارکباد اور شکریہ قبول فرمائیں۔

عزیز بہن! سلام جہاں (حیدر گوڑہ)

نے اس ماہ اپنے تنویر کو ایک خریدار دیا ہے اس کے لئے ممنون ہوں۔ عزیزہ حبیب جہاں بھی تنویر کو پیار کرنے لگیں اُنہیں میرا پیار پہنچے۔ اپنی بینا اور تبسم کی تصویریں عنقریب تمہیں بھیجوں گی۔ میں بھی تم سے ملنے کی بیحد مشتاق ہوں بینا!

برادر عزیز صہبا

سنہری زنجیروں میں جکڑے جانے کی مبارکباد قبول فرمائیے عندلیب صاحبہ کی نگارشات لطیف اسی اشاعت میں دیکھ لیجئے۔ خط نہ لکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ بہن نے بھائی کو بُھلا دیا۔ جام و مینا۔ صہبا کو سلام کہتے ہیں۔

عزیزہ سعیدہ مظہر صاحبہ (حیدرآبادی)

تمہارے کئی خط ملے۔ یہ خط محبت کے چھلکتے ہوئے جام تھے۔ تم مجھ سے بغیر ملے نہیں رہ سکتیں۔ مگر میں تو تمہیں ہر دم اپنے پاس پاتی ہوں۔ ملاقات کا آخر میں لکھنا تمہیں گوارا نہیں ...... کیوں ......؟ سب سے پہلے لمحات پڑھتی ہو؟ بھئی ...... مجھے ڈھونڈنے کے لئے ذرا تو تکلیف اٹھاؤ دل چاہتا ہے تنویر کے صفحات میں تم سے آنکھ مچولی کھیلوں۔ کبھی کہیں اور

کبھی کہیں چھپ کر بیٹھ جایا کروں۔ اور تم ان اڑتالیس صفحوں کی گلیوں میں مجھے ڈھونڈتی پھرو۔ مگر صرف تمھاری وجہ سے سب کو پریشان کرنا نہیں چاہتی خدا کرے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کرو۔ تصویریں بھیج دینگی جلدی کیا ہے۔ حضرت قلق پر جو مضمون لکھا ہے ابتک نہیں ملا۔ جلد بھیج دو۔

عزیزہ بہن شریف النساء (بھونی بنجبر)

آپ کے محبت نامے کا جواب بروقت نہ دے سکی۔ اپنی اس کوتاہی پر سخت نادم ہوں اور معافی کی طلبگار۔

تمہاری پھوپھی جان کا مضمون ضرور شائع ہوگا۔ آپ نے جس محبت آمیز الفاظ میں تنویر کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خاص اثر اپنے قلب پر پاتی ہوں۔ خدا آپ ایسی ہمدرد بہنوں کو سلامت رکھے۔ آپکو میرا انداز تحریر پسند ہے دل چاہتا ہے۔ صرف آپ کے لئے ہی بہت کچھ لکھ ڈالوں۔ مگر فرصت اور فراغت میسر نہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کروں گی۔ اطمینان فرمائیں ———

معزز بھائی ابن احسان محمد رضا صاحب (پٹنہ)

خط کا جواب علیحدہ بھی دوں گی لیکن اس محفل میں بھی آپ کو شریک کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیا اس کا شکریہ قبول فرمایئے۔ "قلمی سہیلوں کی انجمن" کا قائم ہونا باعث مسرت ہے۔ اس کا اشتہار اور تعارف آئندہ ماہ تنویر میں دے دیا جائے گا۔

عزیزہ بہن کشور آرا (حیدرآباد دکن)

تمہارا خیال ہوگا میں تمہیں بھول گئی ——. مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ تمہاری یاد نہ آتی ہو۔ روز سوچتی ہوں کہ آج تمہیں خط لکھوں مگر لکھ نہیں پاتی...... خدا کرے تم سب بعافیت ہو

میری کوتاہیوں کو معاف کر دو۔ اور اپنی خیریت سے مطلع کرو۔

عزیز و محترم بہن سکینہ بیگم ... (کریم آباد)

ایسی گئیں کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا ....

کیا پوری ملاقات نے آپ کی طبیعت ایسی سیر کردی کہ اب نصف الملاقات کو بھی آپ کا دل نہیں چاہتا ——؟

پیاری بہن عابدہ (ج۔ ب)

ادھر دیکھئے . . اُف! آپ تو بے طرح ناراض ہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ اچھا پھر آؤں گی۔

برادر محترم احسن علی مرزا صاحب

نامہ گرامی ملا۔ یقیناً اس قابل ہے کہ تنویر میں شائع کر دیا جائے آئندہ ماہ شائع کر دیا جائے گا۔ اس اشاعت میں جگہ کی کمی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ معاف فرمایئے۔

بھائی جے آر۔ ڈیسائی

تنویر کے خاص ہمدرد مضمون نگاروں میں سے ہیں۔ مدت سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ پتہ معلوم نہیں کہ خط لکھا جائے۔ سیشرم۔ حیدرآباد دکن اور واشی تینوں جگہ تنویر بھیج رہی ہوں تاکہ آپ اپنا پتہ لکھیں۔

عزیزہ بہن نجمہ (میرٹھ)

محبت نامہ ملا۔ شکریہ۔ سرگزشت شروع تو کر دوں مگر آج کل اس کے لئے مناسب ماحول نہیں پاتی۔ زبردستی کا لکھا ہوا اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے خود سرگزشت کے نامکمل رہنے کا قلق ہے۔ دعا کیجئے ذرا دم لینے کی مہلت

نصیب ہو تو اس سلسلے کو پورا کر دوں۔ "بے خبری" تمھیں پسند آیا ہے۔ مجھے تو یہ افسانہ پسند
نہیں چونکہ میرا سب سے پہلا افسانہ ہے سب حد خامیاں ہیں اس وقت میں کوئی تازہ افسانہ نہیں
بھیج سکتی تھی ورنہ اگر میں تنویر کا ہر لہ
تھا کہ اپنا کوئی افسانہ شائع کروں،
اس لئے مجبوراً اسے شائع کروا ہی
تم نے تنویر کے خریدار بنائے ہیں۔
شکریہ، چاہے تو کہ دو تو
وی پی کر دئے جائیں یا بمبئی کو دے
چندہ بھجوا دو۔ جیسا مناسب سمجھو
اور جس میں تمھیں سہولت ہو، دیکھو
تنویر تمھارا ہے، تمھارے ہاتھ میں
اس کے مفاد محفوظ رہیں سکا مجھے یقین ہے

جناب شباب بنائی صاحب

تنویر آپ کی نیم نوازشیں
قابل داد شکریہ۔ آپ کی نظمیں اور
غزلیں پسندیدہ ہیں۔ دو نوں تیرہ
آپ نے اپنا پتہ لفافے پر لکھا اور
وہ دفتر کی غلطی سے ضائع ہو گیا
گزشتہ بار آپکی غزل شائع ہوئی
تھی مگر پرچہ آپ کو نہ بھیجا جا سکا۔
اب اپنا پتہ خط پر لکھئے۔

عزیز ترین بہن سعیدالنساء
مسز ڈاکٹر زیدی (حیدرآباد)

بالآخر تم بھول ہی گئیں۔ مگر میں
ابھی تک تمھیں اسی شدت سے یاد کرتی ہوں۔
ذرا غور کرو کتنے برس تم نے خط نہیں لکھا

ڈاکٹر رادھا کرشن صاحب

آپ کے مضمون "زندگی کے راز" کا ابتدائی حصہ انتخاب ہے بمعہ فوٹو جلد روانہ فرمایئے۔

پنچولی کے آنے والے شاہکار "خاندان" کی
بمبئی میں نمائش کا دار و مدار
خزانچی
کے رحم و کرم پر ہے
کا ساتواں
مسلسل کامیاب مہینہ
کرشنا ٹاکیز
(دو باشو تھیٹر)
نمائش کار
فیمس پکچرز لمیٹڈ

جہاں مرد اور عورت کی زندگی
تمناؤں اور آرزوؤں کی امواج پر لہراتے ہوئے ایک
ہوجاتی ہے۔ وہاں محبت ــــ کا
SANGAM
سنگم
بنتا ہے
نوایگ چترپٹ
کا تیار کردہ
آٹھ نومبر سے
۸
شروع
نگراں :۔
وِنایک
ڈائرکٹر :۔ چونزکر
محبت اور زندگی
رنگین اور منظرفریب
ملاحظہ فرمائیے!
اداکاران :۔
میناکشی، وتسلا کمٹیکر، سلوچنا، دامنا ماولنکر
ونایک وغیرہ
نیو ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں
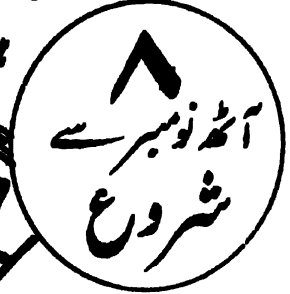
بال نہایت خوبصورت دکھائی دیتے ہیں
کوکونٹ آئل شیمپو
اور
خوشبودار کوکونٹ ہیر آئل کے استعمال سے
TATA PRODUCTS
ٹاٹا کو سیلز ڈیپارٹمنٹ
پی۔ او۔ بکس ۵۲۸ بمبئی

TANVIR. Bombay

Regd No. B 4013
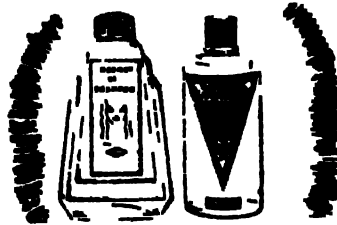
نو انچ کمر کم ہو گئی

کھانے کا کوئی پرہیز نہیں
فربہی پھر بھی کم ہوتی گئی
کروشین کی بدولت بہتری

جب کسی عورت کا موٹاپا بڑھتا چلا جائے تو اس کا درزی اپنے فیتہ سے اس راز کو جلد ہی معلوم کر لیتا ہے۔

اگر آپ اپنے لڑکپن کے تناسب کے ختم ہونے کے خطرے سے پریشان ہیں اور آپ کا جسم بے ڈھنگا ہوتا جا رہا ہے تو نیچے دیے ہوئے خط کو پڑھئے۔ اس میں وہ لکھتی ہیں "مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس کے بعد وہ اس کا سبب بھی بیان کرتی ہیں۔

"...میں نے کروشین سالٹس کا استعمال شروع کیا تین مہینے کے استعمال سے پہلے ہی میں اپنی نشوونما پر حیران تھی۔ تمام فالتو موٹاپا دور ہو گیا تھا۔ تین مہینے سے کم کے عرصہ میں ہی میری کمر اور پیٹ کے گرد آٹھ یا نو انچ کی کمی ہو گئی تھی۔"

اب میرے تمام احباب بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں نے کھانے میں کسی قسم کا پرہیز نہیں کیا۔ میں نے جو چاہا جہاں چاہا اور جب چاہا کھانا کھایا۔ یہ بڑا ہی حیرت انگیز طریقہ پر آسان اور کسی طرح بھی نامناسب نہیں تھا۔ مسز اے۔ ڈی

کروشین کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جسم سے کھانا نکال کر ہی الگ کر دے۔ اس کا فعل سسٹم کے کسی ایک حصہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا مقوی اثر رگ رگ ریشہ، ہر نس اور ہر اعصاب پر پڑتا ہے یہ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر سسٹم کو موٹاپا پیدا کرنے والی فاضل خوراک تمام زہریلے اثرات اور دیگر مضر تیزابی مادہ سے پاک اور صاف کر دیتا ہے۔

آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ آپ کے وزن کو نارمل کرنے کے دوران میں ہی کروشین آپ کو حیرت انگیز قوت اور نئی طاقت مہیا کر دے گا۔

کروشین سالٹس تمام دوا فروشوں، سٹوروں اور بازاروں سے مل سکتا ہے۔

کروشین سالٹس